شمع حقیقت

اصلاح عقائد کے موضوعات پر بلند پایہ علماء کی
تصانیف کے اقتباسات

قاضی محمد علی

جملہ حقوق محفوظ ہیں

پہلا ایڈیشن	اکتوبر ۱۹۹۰ء
دوسرا ایڈیشن	۱۹۹۲ء
تیسرا ایڈیشن	اکتوبر ۱۹۹۸ء۔ بعد ترمیم و اضافہ
تعداد	ایک ہزار
قیمت	۹۰ روپے

ناشر

انجمن تحفظ ناموس صحابہ

مومن پورہ۔ گلبرگہ ۴۸۵۱۰۴

خطاب بہ اہل ایمان

اس کتاب کے مخاطب محض اہل ایمان ہیں، اور مقصد یہ ہے کہ جو لوگ سنت کے پابند اور جماعت سے وابستہ ہیں، انہیں غور و فکر کی دعوت دی جائے

ملت اسلامیہ اس وقت نشاۃ ثانیہ کے دور میں ہے اور یہ نشاۃ نا ممکن ہے، جب تک تاریخ کی تنقیح نہ ہو، اور قرون اولیٰ کے واقعات صحیح اور تعمیری صورت میں امت کے سامنے نہ رکھے جائیں۔

ان ارید الا الاصلاح ما استطعت وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب ٥

"حضرت معاویہ کی سیاسی زندگی" سے

توہمات کے تاریک و تنگ ڈیرے میں
مغالطوں کے فسوں کار سخت گھیرے میں
خیال و خواب کے عبرت نشاں اندھیرے میں
ابھی تو "شمع حقیقت" جلائی ہے ہم نے

(مخدوم محی الدین)

ترتیب مضامین

خطاب بہ اہل لمان	۷
عرض مرتب	۲۰
ابن جریر طبری	۴۱
ابن عربی	۵۷
اخوان الصفا	۶۱
عجمی اسلام	۶۴
مقام نبوت کی عجمی تعبیر	۷۲
اسوہ حسنہ	۷۶
واقعہء افک	۸۲
امامت	۹۲
امام زہری	۱۰۰
ام کلثوم اور حضرت عمرؓ کا نکاح	۱۰۴
اویس قرنی	۱۰۷
ام ہانی	۱۱۱
امی	۱۱۵
اہل بیت	۱۲۳
اہل سنت والجماعت	۱۲۷
بداء	۱۲۹
بدعت	۱۳۶
شب برات	۱۴۹
برامکہ	۱۵۳
آل بویہ	

بیعت	۱۵۸
بیعت رضوان	۱۶۰
تحکیم	۱۶۴
تصوف	۱۶۷
صوفی اولیاء کے فرمودات (بلا تبصرہ)	۱۸۲
تعزیئے اور علم	۱۹۳
مذہب تفضیلیہ	۱۹۶
تقیہ	۱۹۹
تین تیرہ نو اٹھارہ	۲۰۵
جوانان اہل جنت کے سردار	۲۰۹
فتنہ۔ وضع حدیث نے فتنہ۔ انکار حدیث کو جنم دیا	۲۱۱
مشہد حسینی	۲۱۷
منصور حلاج	۲۲۰
حلول	۲۲۲
خارجی	۲۲۴
رسول اکرمؐ سے نکاح کے وقت حضرت خدیجہؓ کی عمر	۲۲۹
خطبات جمعہ	۲۳۳
خلیفہ منصور کا مکتوب نفس ذکیہ کے نام	۲۳۹
دلدل	۲۴۶
درود	۲۴۹
ذکر	۲۵۴
ذوالفقار	۲۵۶
رافضی	۲۶۰
رجب کے کونڈے	۲۶۲
رجعت	۲۶۷

رسول اکرمؐ صلوۃ میں کس کو پیٹھ پر بٹھاتے تھے	۲۶۸
رسول اکرمؐ کی کفالت	۲۶۹
رسول اکرمؐ کی صاحبزادیاں	۲۷۳
رسول اکرمؐ کے نواسے اور نواسیاں	۲۷۵
زید۔ عمر۔ بکر	۲۷۸
حضرت زینبؓ کا نکاح رسول اکرمؐ سے	۲۷۹
سید	۲۸۱
سیدۃ النساء کون؟	۲۸۵
سیدہ سکینہ	۲۹۲
ابتدائی سیرت نگار	۲۹۵
شبر و شبیر	۲۹۶
شہداء کی زندگی	۲۹۸
شہربانو	۲۹۸
شیعہ احادیث	۳۰۵
شیعہ اذان	۳۱۰
شیعوں کا ایمان قرآن مجید پر ہے نہ ہو سکتا ہے	۳۱۲
الصلوۃ۔ السلام۔ التحیات	۳۱۷
ظہور امام	۳۲۲
رسول اکرمؐ سے نکاح کے وقت حضرت عائشہؓ کی عمر	۳۲۴
عبداللہ بن سبا	۳۳۰
عذاب قبر	۳۳۹
عزاداری	۳۴۲
مسلمانوں کا سرکاری نشان (علم)	۳۴۵
حضرت علیؓ کو کاندھوں پر اٹھانا	۳۴۶
حضرت علیؓ کی فضلیت	۳۴۹

مشہد علیؓ	۳۵۱
کوفی شیعان علی	۳۵۸
غدیر خم	۳۵۹
غیبت	۳۶۳
مصحف فاطمہ	۳۶۶
فاطمیین	۳۶۸
فدک	۳۷۱
فرضی نمازیں	۳۷۷
قادیانی ہی کافر کیوں ؟	۳۸۳
قبر پرستی	۳۸۸
قبلہ و کعبہ کی بے حرمتی	۳۹۰
قرامطہ	۳۹۱
کتمان	۴۰۰
واقعات کربلا	۴۰۳
مولود کعبہ	۴۱۲
مباہلہ	۴۱۵
متعہ	۴۱۹
مہدی کی آمد کے متعلق روایتیں	۴۲۴
میلاد	۴۳۱
ناد علیؓ	۴۳۴
نہج البلاغہ	۴۳۶
بنو ہاشم اور بنو امیہ	۴۳۹
ولایت	۴۴۴
سیدنا یزید کی بہ حیثیت جانشین نامزدگی	۴۴۹
کتابیات	۴۵۴

عرض مرتب

تطہیر تاریخ کا کام صدیوں بعد شروع ہو چکا ہے۔ شمع حقیقت روشن ہو چکی ہے وہ بہت قریب آ رہے ہی جب اہل باطل، عقائد کے فساد سے آزاد ہو کر رہیں گے اور اپنے اپنے علماء سے پوچھیں گے کہ تم نے اتنے عرصہ تک ہمیں کیوں دھوکہ میں رکھا

جن مقاصد کے تحت دشمنان اسلام نے عقائد کو بگاڑا تھا وہ اب پوری طرح واضح ہو چکے ہیں۔ اس سلسلہ میں اللہ کے فضل سے ہمارے پاس ہر سوال کا جواب موجود ہے اور ہم ہر معترض کو مطمئن کر سکتے ہیں صرف ایک سوال کا تشفی بخش جواب نہیں کہ ہمارے اکابر نے دروغ کو اتنے عرصہ تک فروغ کا موقع کیسے دیا؟

افکار باطلہ کی تطہیر کا کام اس سے پہلے بڑے پیمانہ پر کیوں نہیں ہوا؟ اور ہمارے علماء نے عام طور پر تغافل کا رویہ کیوں اختیار کیا؟ جس کے نتیجہ میں یہ عبرتناک صورت حال پیدا ہو گئی کہ اہل باطل نے جو باتیں رائج کرنا چاہیں ہم میں رائج ہو گئیں "خرافات" ہمارے عوام کی اکثریت کے عقائد کا جزو بن گئیں اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ آج ہم کو "حقائق" اجنبی اور انوکھے معلوم ہو رہے ہیں۔

ہمارے علماء نے عام طور پر تغافل کا رویہ اختیار کیا؟۔ واقعہ یہ ہے کہ علماء نے دین کے معاملہ میں مثبت روش اختیار کی۔ عقائد باطلہ کی مخالفت اس وقت کی، جب ایسا کرنا ناگزیر ہو گیا۔ وہ جانتے تھے کہ دینی امور میں کچھ باتیں بہت اہم ہوتی ہیں کچھ نسبتاً کم اہم ہوتی ہیں، اور کچھ غیر اہم۔ دینی بصیرت کا تقاضہ ہے کہ ترجیحات کو پیش نظر رکھا جائے اور شائد ہمارے علماء نے یہی کیا۔

ترجیحات کو جاننے کے لیے قرآن مجید میں اشارے ملتے ہیں اور رہنمائی حاصل

ہوتی ہے ۔اللہ تعالیٰ نے رسول اکرمؐ کے اسوہ حسنہ کو مسلمانوں کے لیے نمونہ بنایا اور قرآن مجید میں اسوہ حسنہ کے رہنما اصول بتا دیئے ہیں روایت و درایت کے مقررہ طریقوں سے رسول اکرمؐ کی جو باتیں ہم تک پہنچی ہیں اور جن کی مطابقت قرآن مجید سے ہوتی ہے ان کی بنیاد پر اپنی زندگی کا لائحہ عمل تیار کرنا امت مسلمہ کا دینی فرض ہے۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے اس بات کی حفاظت کا ذمہ نہیں لیا کہ حیات طیبہ کا کونسا واقعہ کب وقوع پذیر ہوا۔اس کے یہ معنی ہوئے کہ دین میں رسول اکرمؐ کے اسوہ حسنہ کی حیثیت تو مسلمہ ہے لیکن یہ باتیں کہ آپ کی ولادت باسعادت کس مہینہ کی کس تاریخ کو ہوئی ۔آپؐ کی کفالت کس نے کی ۔آپؐ سے نکاح کے وقت حضرت خدیجہؓ اور حضرت عائشہؓ کی عمریں کیا تھیں ۔آپؐ نے حضرت زینبؓ سے نکاح کن حالات میں کیا تھا۔آپ کی چار صاحبزادیوں اور نواسہ، نواسیوں کی تفصیل کیا تھی اور وہ کب پیدا ہوئے تھے۔آپ نے خانہ کعبہ کی تطہیر کے وقت کس کو اپنے کاندھے پر اٹھایا تھا۔یا صلوٰۃ ادا کرتے ہوئے آپؐ کس نواسہ یا نواسی کو کاندھے پر بٹھاتے تھے آپؐ نے اپنی تلواریں (ذوالفقار) یا اپنا خچر (دلدل) کس کو دیا تھا وغیرہ ۔ہمارے علما جانتے تھے کہ اس قسم کی معلومات انسانی تاریخ کے دوسرے واقعات اور حالات کی طرح ظنی ہیں اور دلچسپی کا موجب ہو سکتی ہیں۔لیکن خالص دینی نقطہ نظر سے اہمیت کی حامل نہیں ۔یہی وجہ ہے کہ ہمارے علماء نے ان باتوں پر سرسری سے زیادہ توجہ نہیں دی۔

اس کے برخلاف دشمنان اسلام نے اسلام کا لبادہ اوڑھ کر شعوری طور پر ایک متوازی اور خود ساختہ اسلام کی بنیاد ڈالی ۔اور صاف ستھرے دین کے مقابل مہمل مجموعہ عقائد کو پیش کیا تو انھوں نے سیرت نبویؐ ہی سے اپنے کام کی ابتداء کی ۔ جزئیات ہی کو لے کر ان میں مخصوص تخیل کے تحت موشگافیاں کیں ۔واقعات کو توڑ مروڑ کر پیش کیا۔اس طرح خرافات نے جنم لیا، جن سے فرزندان اسلام کے دینی عقائد میں بگاڑ پیدا ہوا ۔جو باتیں اپنی اصلی حالت میں اور چیدہ چیدہ طور پر دینی نقطہ نظر سے چنداں اہمیت کے حامل نہ تھیں وہی باتیں بگڑی ہوئی حالت میں منفی

انداز میں مجموعی طور پر دین میں رخنہ اور عقائد میں فتنہ بن گئیں ۔جب حقیقت تھیں اور متفرق تھیں تو ویسی توجہ اور التفات کے لائق نہ تھیں ، لیکن جب ایک خاص نظریہ سے ان کے خرافات کا مجموعہ بنا کر خود اپنوں کے ذہنوں پر مسلط کر دیا گیا تو ان کی تنقیح اور مخالفت ناگزیر ہو گئی۔

ہمارے علماء نے یہ کام کیا اور دیر سے اسی لئے کیا کہ یہ باتیں عام حالت میں زیادہ التفات کے لائق نہ تھیں ۔اگر عام مسلمان قرآن کی بنیادی تعلیمات اور اقدار اسلامی سے پوری طرح واقف رہتے اور دین سے وابستہ رہتے اور مسلمانوں کی مرکزیت قائم رہتی تو خرافات کی نشاندہی اور ان کی مخالفت کی نوبت ہی نہ آتی ۔ ذہنوں پر حق کا غلبہ ہو تو عقائد باطلہ وجود ہی میں نہ آئیں گے ۔اسی طرح تاریخی حقائق پر نظر رہے تو نتائج اخذ کرنے میں لغزش نہیں ہوتی ۔ مشکل اس وقت پیش آتی ہے جب خود ساختہ عقائد کو اساس دین اور حقائق تاریخ پر مسلط کر دیا جائے ۔ ان خرافات اور عقائد باطلہ کو موضوع بحث بنانے اور مسلمانوں کے سامنے پیش کرنے کی ضرورت اس لئے بھی محسوس کی گئی کہ چیزیں اپنے اضداد سے پہچانی جاتی ہیں ۔ **بضدھا تتبین الاشیاء** خرافات اور ان کی ماہیت سے واقفیت اس لئے ضروری ہے کہ حقیقت کی تلاش میں خرافات کے خارزار سے بھی گزرنا پڑتا ہے ۔خرافات کی نقاب کشائی فرقہ ہائے باطلہ کے مسلک ، عقائد ، اعمال اور عزائم کی وضاحت امت مسلمہ کے لئے غور و فکر کا سامان بہم پہنچانے کی ایک کوشش ہے تا کہ ان سے سبق حاصل ہو۔ جو اندراجات شامل اشاعت ہیں وہ صرف بطور نمونہ درج ہیں ۔یہ عبرت کا مقام ہے کہ خرافات کی تعداد دو چند سہ چند ہی ہو سکتی ہے ۔یہاں صرف نشاندہی مقصود ہے تا کہ

ببین تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا

کی حقیقت آشکار ہو۔

ان اندراجات کو پیش کرنے سے کسی فرقہ کے پیروؤں کی دل آزاری ہرگز

مقصود نہیں واقعہ یہ ہے کہ امت مسلمہ کی کثیر تعداد جو ان عقائد باطلہ سے متاثر ہوئی ہے ہمدردی کی مستحق ہے۔ ہر مسلمان کا یہ اولین فرض ہے کہ جن حقائق تک رسائی کی سعادت اس کو حاصل ہوئی ہے، ان کو دوسروں تک پہنچادے اور اپنا رویہ رکھے کہ وما علینا الا البلاغ۔

واقعہ یہ ہے کہ عقائد باطلہ کا ایک ایک محدود گروہ پر تو اتنا گہرا اثر ہوا کہ اسلام کے متوازی ایک ایک علیحدہ مذہب ہی بن گیا۔ ان میں بدعات قبیحہ اور مذموم رسومات کو خودساختہ مذہب کی بنیاد بنادیا گیا۔ اور اس معاملہ میں اکثر و بیشتر رازداری برتی گئی۔ پھر طرفہ یہ کہ ان تمام خرافات کے باوجود ان محدود گروہوں نے خود کے مسلمان ہونے کا دعویٰ کیا اور خود کو بزعم خود اسلام سے منسلک رکھا۔ اس طرح متوازی اور مخالف عقائد کی صورت گری کر کے ہر گروہ نے خود کو ناجی قرار دیا تو امت ایک عجیب و غریب صورت حال سے دوچار ہوئی اور یہ بات اسلام کے لیے نہایت درجہ نقصان دہ ثابت ہوئی۔

ایک طرف تو یہ ہوا۔ دوسری طرف خود مسلمانوں کے سواد اعظم پر ان خرافات کے اثرات پڑے اور یہ اثرات ان کی دین سے وابستگی کے تناسب معکوس میں پڑے۔ یعنی جو مسلمان دین سے زیادہ وابستہ تھے ان پر یہ اثرات کم اور جو دین سے کم وابستہ تھے ان پر یہ اثرات زیادہ پڑے۔ اس طرح ان عقائد باطلہ کا خود مسلمانوں پر مضر اثر ہوا۔ اس کے نتیجہ کے طور پر اسلامی تعلیمات کو غیروں کے سامنے پیش کرنے کا کام رک گیا۔

غیر کا ذکر کیا غیر تو غیر ہے
جو ہمارا ہے وہ بھی ہمارا نہیں

دوسرا افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ آج عقائد باطلہ کے اثرات سے عوام تو ایک

طرف ہمارے علماء اور دانشوروں کی ایک بڑی تعداد متاثر ہے۔ مسلمانوں کے اکثر اصحاب علم کو ان عقائد باطلہ کی تفصیل اور ان کے مضمرات کا پوری طرح احساس اور ادراک نہ ہوسکا اور ستم بالائے ستم یہ کہ ان اصحاب کو اپنی ناواقفیت کا احساس تک نہیں۔ حالیہ دور میں پریس کی سہولتوں اور دوسرے اسباب کی بنا پر ان عقائد باطلہ کی مکمل تصویر سامنے آچکی ہے اور باطل عقائد کے مضر اثرات واضح ہوچکے ہیں۔ لیکن روایت پرستی کی وجہ سے ہمارے علماء اس مسئلہ کا حقیقت پسندی کے ساتھ مطالعہ کرنے تیار نہیں۔

عربی کا مقولہ ہے:۔

دنیا میں ہر شئے شئے ہے۔ جہالت کوئی شئے نہیں۔

ناواقفیت اور جہالت کو کسی شکل میں بھی روا نہیں رکھا جاسکتا۔ اگر یہ ناواقفیت ایسی باتوں کے سلسلہ میں ہو جو دینی عقائد کو متاثر کرتی ہیں جیسا کہ متاثر کرچکی ہیں تو ظاہر ہے کہ ایسی ناواقفیت زیادہ خطرناک ہوگی۔

اندلس میں جو مسلمانوں کا جو عبرت ناک انجام ہوا اس سے عیاں ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کس طرح کفار کے ہاتھوں فجار کو سزا دلوائی۔ جب کبھی اور جہاں کہیں مسلمان قرآن مجید سے دور اور خرافات میں مبتلا اور بداعمال ہوئے ایسی ہی بربادیاں نازل ہوئیں۔ آئندہ بھی اگر دین سے غفلت بڑھتی گئی اور عقائد باطلہ کو اپنا گیا تو مسلمان ان اعمال سے محروم ہوجائیں گے جن کے بغیر زندگی کامیاب و کامران نہیں ہوسکتی۔

یہ ایک افسوس ناک حقیقت ہے کہ جس طرح علمی سطح پر عصر حاضر کے ذہن اور ماحول پر چھ نظریات (۱) کارل مارکس کا نظریہ اشتراکیت (۲) کارل مارکس کا نظریہ اضافیت (۳) میکڈوگل کا نظریہ جبلت (۴) میکاولی کا نظریہ وطنیت (۵) فرائیڈ کا نظریہ تفوق جنسی اور (۶) ڈارون کا نظریہ ارتقاء۔ ان نظریات میں حق و باطل کا امتزاج ہے ان

نظریات کا اثر بہ تمام و کمال موجود ہے۔ بالکل اسی طرح امت مسلمہ کے ذہن اور ماحول پر عقائد کی سطح پر فرقہ ہائے باطلہ کا اثر بہ تمام و کمال موجود ہے۔ان عقائد میں بھی حق و باطل کا امتزاج ہے۔جس طرح متذکرہ چھ نظریات ان حقائق کی بنیاد پر جو ان میں موجود ہیں فروغ پا رہے ہیں بالکل اسی طرح فرقہ ہائے باطلہ کے نظریات بھی فروغ پا رہے ہیں مثلاً:۔

مورخین نے ان واقعات کو بیان کرنے میں حق و باطل کی آمیزش کر دی۔ سلف سے کچھ صحیح خبریں حاصل کیں اور پھر جھوٹی اور بے بنیاد باتوں کو ان سے جوڑ دیا۔ صحیح خبروں کی وجہ سے ان کے بیان کو قبول کر لیا گیا اور اس جھوٹی باتوں نے بھی راہ پائی۔

اس صورت حال کے پیش نظر امت مسلمہ کو یہ بات تسلیم کرنے میں پس و پیش نہ ہونا چاہیئے کہ عقائد باطلہ میں بھی کچھ نہ کچھ اور کہیں نہ کہیں شامل کیا گیا ہے یہ وہ چند حقائق ہیں جن کی بناء پر باطل عقیدے مسلمانوں میں فروغ پا رہے ہیں اور صحیح عقائد کے مدمقابل ہیں۔ مسلمان جب کسی فرقہ کو باطل سمجھتے ہیں تو ان حقائق کو بھی نظرانداز کر دیتے ہیں جو اس فرقہ کے پاس موجود ہیں۔

فرقہ ہائے باطلہ نے اپنے آپ کو دین اسلام کے ذریعہ درست کرنے کی بجائے دین کو اپنی وجہ سے خراب کر دیا۔یہاں تک کہ آج اسلام ان باطل عقیدوں کی وجہ سے توہمات کا مجموعہ نظر آتا ہے جس طرح مسلمانوں کا دینی فریضہ ہے کہ وہ "الفرقان" کی روشنی میں (جو حق و باطل میں فرق کرنے والی کتاب ہے) عصری علوم سے باطل کو علیحدہ کریں۔ اسی طرح مسلمانوں کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ الفرقان کی روشنی میں فرقہ ہائے باطلہ کے عقائد سے باطل کو علیحدہ کریں۔

امت مسلمہ نے ایک طرف تو ان باطل عقائد کے رد کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں کی اور اگر توجہ بھی کی تو سرسری انداز میں ان کی ذمہ داری عبداللہ بن سبا اور

ایسی ہی چند شخصیتوں پر ڈال دی۔واقعہ یہ ہے کہ تمام برائیوں کا سرچشمہ معاندان و دشمنان اسلام کو یا چند افراد کو قرار دینا کسی طرح درست نہیں۔دراصل مسلمانوں کی اندرونی خرابیوں اور ایمان کی کمزوری نے ایسے حالات پیدا کئے جن سے مخالفین کو استحصال کا موقع ملا۔

پھر یہ بھی غور طلب ہے کہ دو باتیں الگ الگ ہیں۔ باطل کو دلائل سے باطل ثابت کرنا اور ان باطل عقائد کے ماخذ اور مقاصد کی نشاندہی کرنا۔پہلی بات بنیادی اہمیت کی حامل ہے۔کسی شخصیت کا وجود یا اس کا عقائد باطلہ کا مصنف ہونا زیر بحث آسکتا ہے لیکن باطل کا باطل ہونا تو ایک حقیقت ہے۔ ذیلی اور فروعی مباحث سے باطل حق نہیں بن سکتا۔جن کا دارومدار ابن سبا یا کسی اور شخصیت کے وجود کے اثبات پر نہیں۔اگر بالفرض ثابت بھی ہو جائے کہ فلاں شخص کا کوئی وجود نہ تھا یا وہ عقائد باطلہ کا بانی نہ تھا تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

دوسری بات یہ ہے کہ امت مسلمہ کو اس تعلق سے اپنی ذمہ داری قبول کرنی چاہیئے۔یہ ایک حقیقت ہے کہ عہد رسالت کے بعد چند سالوں میں جس تیز رفتاری سے اسلامی مملکت کا پھیلاؤ (Extension) ہوا اسی رفتار سے استحکام (Consolidation) نہیں ہوا۔مختلف قبائل اور جداجدا نوعیت کے تہذیبی گروہ اسلامی مملکت میں شامل ہوئے۔ مختلف مذاہب کے پیرو حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔ لیکن ایمان ان سب کے دلوں کے اندر داخل نہ ہو سکا۔حالانکہ یہ امت مسلمہ کا کام تھا کہ وہ نووارد ان اسلام کو اسلام کی مکمل تعلیم و تربیت دیتی۔نظریات اصولوں اور مسلمات کے تابع ہوں تو فروعات میں ضعف واقع نہیں ہوتا اسی طرح تاریخی حقائق پر نظر رہے تو نتائج اخذ کرنے میں لغزش نہیں ہوتی۔ مشکل اس وقت پیش آتی ہے جب خود ساختہ عقائد کو اساس دین اور حقائق تاریخ پر مسلط کر دیا جائے۔

عجمیوں نے بڑی تعداد میں اسلام قبول کیا لیکن کراہت کے ساتھ۔انھوں نے اسلامی اقتدار کو برداشت کیا لیکن مخاصمت کے ساتھ۔ان میں سے اکثروں کے دلوں میں اسلام اور اس کی مرکزی قوت کے خلاف دشمنی کے جذبات شدید تھے۔ مسلمانوں کا فرض تھا کہ وہ ان کو اسلام سے قریب لاتے اور عظیم اسلامی برادری میں صرف

ظاہری طور پر نہیں بلکہ حقیقی طور پر شامل کر لیتے۔

اسی طرح ہمارے علماء کو اپنی اس کوتاہی کو تسلیم کر لینا چاہیئے کہ انھوں نے اپنے عوام سے قریبی ربط قائم نہ رکھا۔ان میں اور عوام میں خلیج بڑھ گئی۔ البتہ صوفیا مسلم عوام سے قریب ہوگئے اور قرامطہ اور باطنیہ وغیرہ نے صوفیا کو اپنا آلہ کار بنا کر ان کے ذریعہ سے مسلم عوام تک اپنی باتیں پہنچالیں۔یہ تو اظہر من الشمس ہے کہ قرامطہ کی تاریخ اسلام کے زوال کی داستاں ہے۔

ایران میں سیاسی اقتدار شاہ کو اور مذہبی اقتدار مجوسی علماء کو حاصل تھا۔جب ایران فتح ہوا تو سیاسی اقتدار تو شاہ سے امیرالمومنین کو منتقل ہو گیا۔ مسلمانوں کے ہاں پیشوایان دین کا کوئی مخصوص گروہ نہ تھا جن کو مجوسی علماء کا مذہبی اقتدار منتقل ہوتا مجوسی علماء نے جس طرح اس سے پہلے زرتشتیوں کے بڑھتے ہوئے اثرات کو دیکھ کر زرتشتی مذہب کا لبادہ اوڑھ کر اپنے پرانے نظریات اس میں داخل کر دیئے تھے اسی طرح انھوں نے اسلام کو تو قبول کر لیا لیکن اپنے تمام سابقہ عقائد، اعتبارات (شخصیت پرستی، روشنی یا نور پرستی وغیرہ) اور سابقہ رسومات کو نیا روپ دے کر سابقہ پیروؤں پر (جو اب اسلام قبول کر چکے تھے) اپنا اثر رسوخ برقرار رکھا۔اور اسلامی تعلیمات میں اپنا رنگ شامل کر دیا۔ان تمام برائیوں کو جو خود ان میں موجود تھیں ہوشیاری اور عیاری سے اسلام میں داخل کر دیا اور پھر ان افعال کو عین اسلام قرار دیا۔

عجمی عناصر نے جب یہ محسوس کر لیا کہ اب وہ اسلام کی بڑھتی اور پھیلتی ہوئی طاقت کا مقابلہ نہیں کر سکتے تو انھوں نے یہ فیصلہ کیا کہ دائرہ اسلام میں رہتے ہوئے اس کی مخالفت کریں گے اور اپنے عقائد اور اعتبارات کو اسلام میں داخل کر کے اس کی شکل ہی بدل دیں گے۔

جب بنو عباس نے اپنا اقتدار قائم کرنے کے لیے عجمیوں کا تعاون حاصل کیا تو عربوں کی قوت پاش پاش ہو گئی اور ایرانی اپنے منصوبہ میں کامیاب ہو گئے جو حضرت عمرؓ کے زمانہ سے جاری تھا۔اسی منصوبے کے تحت حضرت عمر اور حضرت عثمان شہید ہوئے، اور اسی کے تحت جمل، صفین اور نہرواں کی لڑائیاں ہوئیں۔ حضرت امیر معاویہ نے اس سیاست کو ناکام بنا دیا۔جب حضرت حسن، حضرت معاویہ

کے حق میں دستبردار ہوگئے تو وقتی طور پر یہ سازش دب گئی لیکن سبائیوں نے بنو امیہ کے دور میں اولاً اولاد علی کو اور پھر اولاد عباس کو آلہ کار بنا کر بنو امیہ کا خاتمہ کر دیا۔ عباسیوں نے عجمی عناصر کی مدد سے تحریک چلائی تھی اس لیئے جب وہ کامیاب ہوئے تو عباسیوں کے بھیس میں ایرانی خلافت پر قابض ہوگئے۔تمام کلیدی عہدے مجوسیوں کے پاس رہے۔بنو عباس اور بنو علی کے حرم میں ایرانی اور مجوسی عورتیں رہیں۔ مجوسیوں نے اسلام کا لبادہ اوڑھ کر اسلام کی صورت تبدیل کرنے کے لیے ہزارہا قسم کی داستانیں وضع کیں اور عقلیات کے نام سے یونانی اور ہندی فلسفہ کو پھیلایا اور اسلام میں وہ امور داخل کیئے جن کا اسلام سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔

مجوسی علماء نے مسلمانوں ہی کی چند شخصیتوں کو چن کر ان کو عجم کی شخصیتوں سے نسبت دے کر اپنا ہیرو بنالیا اور ان کے توسط سے اپنے سماجی اور سیاسی موقف کو مضبوط بنالیا۔اس طرح مسلمانوں کے مفتوح اسلام کے فاتح بن گئے۔ان عناصر نے سیاسی اثر ورسوخ حاصل کر لیا اور خلیفہ گر بن گئے۔پھر اپنے اثر کو اپنے عقائد کے فروغ کا ذریعہ بنالیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آج ہمارے مولوی کا سرمایہ دین، باطنی ذخیرہ، خرافات ہے جو عجمیوں، مجوسیوں، یہودیوں اور مخالف اسلام قوتوں نے بنو ہاشم کا استحصال کر کے برامکہ، آل بویہ، فاطمین وغیرہ کی سرپرستی میں خاص مقاصد سے شائع کر کے سارے عالم میں اسلام پھیلادیا۔

موجودہ زمانہ میں فرقہ ہائے باطلہ جارحانہ طریقے اختیار کر رہے ہیں۔ امت مسلمہ دفاع بھی پوری طرح نہیں کر پا رہی ہے۔اور ان عقائد سے متاثر ہو چکی ہے۔ایسے افراد کی روز بروز کثرت ہوتی جا رہی ہے جو ان فرقہ ہائے باطلہ کو اسلام ہی کے فرقے یا مکاتب فکر سمجھتے ہیں۔اسلام اور ان فرقوں کو ایک ہی سکہ کے دو رخ قرار دیتے ہیں اور پھر ان فرقہ ہائے باطلہ سے مفاہمت کے امکانات پر غور کر رہے ہیں۔عقائد باطلہ کی اصل اور ان کے مضمرات سے ناواقفیت کی وجہ سے سمجھوتہ کا سودا ان کے سر میں سمایا ہوا ہے اور یہ بھی ایک ستم ظریفی ہے کہ فرقہ ہائے باطلہ سے مفاہمت اور سمجھوتہ کو اسلام کی خدمت اور دین کی سربلندی کی کوشش سمجھا جا رہا ہے حالانکہ درمیان حق و باطل کو قطعاً قبول نہیں کیا جاسکتا۔اسلام کو اسلام باقی رکھتے

ہوئے ایسی مفاہمت نہ تو ممکن ہے اور نہ ہی مناسب۔ باہمی اختلافات کی خلیج کو پاٹنے کے نیک ارادہ سے گذشتہ ایک ہزار سال میں جب بھی مفاہمت کی کوشش کی گئیں اسلام کے آب صفا میں گندگیاں ہی آئیں اور کسی فرقہ باطلہ نے اپنے کسی عقیدہ کی اصلاح نہ کی۔

اہل باطل خود کو غیر مسلم کہیں یا مسلمان ان سے دوستانہ تعلقات قائم کئے جاسکتے ہیں لیکن اس سلسلہ میں اول تو یہ ضروری ہے کہ ہم ان کے عقائد کے مضمرات اور ان کے اصل مقاصد کو سمجھ لیں۔ دوسری بات جس پر دھیان دینا ضروری ہے یہ ہے کہ باطل عقیدوں اور غیر اسلامی اصولوں کے ساتھ کوئی سمجھوتہ نہیں کیا جاسکتا۔ جو باتیں اہل باطل اور مسلمانوں کے درمیان مشترک ہوں ان کی حد تک تعاون کیا جاسکتا ہے۔ ایسا تعاون غیر مسلموں کے ساتھ آسانی سے کیا جاسکتا ہے۔ لیکن جو باطل فرقے خود مسلمان ہونے کا دعا کرتے ہیں ان کی حد تک مشکل یہ ہے کہ سمجھوتہ کی بات سامنے آتے ہی کچھ اس قسم کی باتیں سننے میں آتی ہیں کہ اسلام کی سربلندی کی خاطر فرقہ بندیوں کو ختم کر دینا چاہیئے۔ مختلف فرقوں کے ماننے والوں کے تعلق سے کہا جاسکتا ہے کہ اہل قبلہ ہیں۔ سب کلمہ گو ہیں وغیرہ۔ یہ باتیں عوام ہی نہیں مسلم دانشور اور علما بھی کہتے ہیں۔ اقبال نے کہا ؎

منفعت ایک ہے اس قوم کا نقصان بھی ایک
حرم پاک بھی اللہ بھی قرآن بھی ایک
ایک ہی سب کا نبی دین بھی ایمان بھی ایک
کیا بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک

واقعی اگر سب مسلمان ایک ہوتے تو یہ بڑی بات ہوتی لیکن اس انداز فکر کو پرکھنے کے لیے ان فرقوں کے بنیادی عقائد سے واقفیت اور ان کا تجزیہ ضروری ہے۔ اس طرح مسلمانوں کی تاریخ کے مختلف ادوار میں وقوع پذیر ہونے والے اہم واقعات اور حادثات پر نظر ڈالنی چاہیئے کہ ماضی میں کس فرقہ نے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کس کس نوعیت کی سازشیں کیں اور دین کے خلاف کس طرح یورشیں

کیں اور کس طرح اسلام سے منسلک رہنے کا ادعا کرتے ہوئے اسلام کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا۔ اگر عقائد سے آگے بڑھ کر کسی فرقہ کا مستقل کوئی فلسفہ اور ڈھانچہ ہو جو اسلام کے بنیادی نظام اور افکار سے مختلف ہے تو مسلمان جتنا جلد اس سے واقفیت حاصل کر لیں اور اس خطرہ کا احساس کر لیں بہتر ہے۔

جب ہم حقائق پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے۔ بنیادی باتوں یعنی کلمہ، قرآن، رسالت، دین، ایمان اور احادیث کی حد تک اہل باطل کا مسلک مختلف، متضاد، مستقل اور متوازی ہے اور بعض فرقوں کی حد تک تو بنیادی باتوں کے علاوہ ہر فروعی بات میں بھی اتنا اختلاف ہے کہ ان اختلافات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ مثلاً اوقات سحر و افطار اذان تکبیر کے مقابلہ میں نعرہ حیدری۔ اذان، طریقہ و اوقات صلوۃ۔ طریق وضو غسل، طریقہ نکاح، فقہ، عقائد غرض ہر بات میں اہل باطل کے طریقے مختلف ہیں۔ اگر حقیقت سامنے رہے خواہ یہ حقیقت کڑوی ہو کہ فلاں فرقہ کے یہ عقائد ہیں تو یہ لازم آتا ہے کہ خوش فہمی کے تحت ان عقائد کی سرسری طور پر تاویل نہ کی جائے اور اس سلسلہ میں کوئی غلط فہمی باقی نہ رہے۔ تلخ حقیقت کو قبول کرنا چاہیئے، پھر دین کو سربلند کرنے کی کوشش کی جائے۔ حقیقی بنیادوں کو معلوم کر کے اہل باطل کے ساتھ تعاون کیا جائے تو ایسا تعاون پائیدار اور حقیقی ہوگا۔ ایسے تعاون کے ساتھ دین کو سربلند کرنے کی کوشش کی جائے تو ایسی کوشش شاید کامیاب ہوگی۔

عصر حاضر کے تقاضے اس بات کے لیے راہ ہموار کر رہے ہیں کہ پوری امت مسلمہ جسد واحد کی شکل میں زندہ اور فعال بن جائے۔ دشمنان اسلام جو جانتے ہیں کہ "وہ شیر پھر ہوشیار ہوگا"۔ ان عظیم امکانات سے لرزہ براندام ہیں اور سازشیں کر رہے ہیں کہ ایسا نہ ہونے پائے۔ اسلامی افکار کے چہرے سے باطل عقیدوں کا پردہ اٹھا دیا جائے تو اسلام کے احیاء میں اس سے بڑی مدد ملے گی۔

جس طرح جسمانی طور پر صاف رہنا، ستھرا لباس پہننا اور پاکیزہ غذا استعمال کرنا، صحت مند زندگی کے لیے لازمی ہے جیسے نفیس عادتوں کو اختیار کرنا یعنی سچ بولنا وعدوں کو پورا کرنا۔ وقت کی پابندی کرنا، خوش اخلاقی سے پیش آنا اخلاقی صحت

کے لیے ضروری ہے ۔ بالکل اسی طرح ذہن کو شرک اور باطل عقیدوں سے بچائے رکھنا ایمان کے تحفظ کے لیے ضروری ہے ۔

یہ ایک عبرتناک حقیقت ہے کہ اسلاف کی عظمت پر شیطان نے ایسے دلوں کو مسلط کر رکھا ہے جو خود فاسد ہو چکے ہیں اور ہر دم برائی پھیلائے رہتے ہیں ۔ ہم ایسی امت بن گئے ہیں جس کی کوئی عظمت نہیں حالانکہ یہ امت بزرگی کے ایسے مقام پر ہے جو کسی اور امت نے خواب میں بھی نہیں دیکھی ۔

امیرالمومنین حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد بلوائیوں کے دباؤ کے تحت حضرت علیؓ نے دارالخلافہ کو مدینہ سے کوفہ منتقل کیا اور اسی طرح حضرت امیر معاویہ کے انتقال کے بعد جب کوفی حضرت حسینؓ کو کوفہ کی جانب لے چلے تو یہ علی الترتیب حضرات علیؓ اور حسینؓ کا جسمانی اغوا کیا تھا لیکن ہم یہ دیکھتے ہیں کہ دشمنوں نے اسلام کی ان دو شخصیتوں کا بھی اغوا کر لیا اور ان کے فرضی کردار بنا دیئے اور ان سے فرضی دیومالائی قسم کی باتیں منسوب کر کے ان کو پوج رہے ہیں ۔ آج فرقہ ہائے باطلہ کے پاس ہم کو جو علیؓ اور حسینؓ نظر آتے ہیں وہ محض فرضی اور خود ساختہ شخصیتیں ہیں جن کو اسلام کے علیؓ اور حسینؓ سے کوئی تعلق نہیں ۔

ایک دور گذر جانے کے بعد اہل باطل نے اپنے خود ساختہ عقائد کی تائید میں جن کی حیثیت خود ساختہ اصنام سے زیادہ نہیں اتنے افسانے وضع کئے کہ مسلمان اس سیلاب میں بہہ گئے ۔ حتیٰ کہ موجودہ دور میں بعض مسلمانوں اور اہل تشیع میں کوئی فرق باقی نہ رہا اور جو کسر رہ گئی تھی اس کو اہل تصوف نے پورا کر دیا ۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ ہمارے بعض ناواقف علما بر سر منبر اہل باطل کی باتوں کا پرچار کر رہے ہیں اور نہیں جانتے کہ کیا کر رہے ہیں ۔

ہمیں اہل باطل کے عقائد سے بحث نہیں وہ جو عقائد چاہیں اپنائیں لیکن یہ واقعہ ہے کہ عام مسلمانوں کے عقائد پر فرقہ ہائے باطلہ کے اثرات کسی نہ کسی شکل میں موجود ہیں یعنی مسلمانوں کی ایک خاصی تعداد "شیعیت زدہ" ہے یہیں وجہ ہے کہ اسلام کی سچی تصویر ذہنوں سے اوجھل ہو گئی ہے ۔

دینی مزاج کی بڑائی یہ ہے کہ ہر مسلمان خود ساختہ عقائد اور دھوکہ بازیوں

سے خود کو بلند رکھے اور ان کی طرف قطعاً مائل نہ ہو ۔ لیکن دین کو اپنی اصلی حالت میں باقی رکھنے اور عقائد کو پاک و صاف رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ عقائد باطلہ سے پیدا ہونے والی خرابیوں کو پوری طرح سمجھا جائے اور ان کی درستی کی جائے ۔ مصلحت سمجھ کر اور آپسی اختلافات کو بڑھاوا دینے کے خیال سے خاموشی اختیار کرنی چاہیئے ۔

زیر نظر کتاب میں تحفظ ایمان کے اسی اعلیٰ مقصد کے تحت باطل عقیدوں کی نشاندہی کی گئی ہے ۔ تاکہ غلط نظریات کا قلع قمع ہو اور انسانیت سربلند و کامران ہو ۔

اس کتاب میں مختلف عنوانات پر (۹۱) اندراجات حروف تہجی کی ترتیب میں پیش کئے جا رہے ہیں ۔ یہ سب مضامین بلند پایہ علمائے اسلام کی مایہ ناز تصنیفات سے اخذ کئے گئے ہیں ۔

ہر عنوان کے تحت بنیادی طور پر کسی نہ کسی تصنیف سے اقتباس کیا گیا، لیکن اقتباسات میں اصل خیال اور استدلال کو باقی رکھتے ہوئے حسب ضرورت زبان و بیان میں خفیف رد و بدل اور حذف اضافہ سے کام لیا گیا ہے ۔ بعض اندراجات میں ایک سے زائد تصانیف کے اقتباسات کو شامل مضمون کیا گیا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ بعض مضامین کی حد تک ماخذ کا حوالہ نہیں دیا جا سکا ۔ البتہ مجموعی طور پر جن تصانیف سے استفادہ کیا گیا ہے ان کی فہرست بھی شامل اشاعت ہے (صفحہ ۴۵۴)

اللہ تعالیٰ سے بصد اخلاص دعا ہے کہ جس اعلیٰ مقصد کے لیے یہ اقتباسات بلند پایہ علماء اسلام کی تصنیفات سے اخذ کر کے پیش کئے جا رہے ہے اس کے حصول میں کامیابی ہو ۔

گلبرگہ ۔ مئی ۱۹۹۸ء

قاضی محمد علی

ابن جریر طبری

کتاب اظہار حقیقت از مولانا محمد اسحٰق صدیقی ندوی سے اقتباس

ابن جریر طبری کا سنہ وفات ۳۱۰ھ ہے اور ان سے پہلے تاریخ کے عنوان سے اس طرز پر کسی تالیف کا پتہ نہیں چلتا۔ اگر کسی نے کچھ لکھا بھی تھا تو وہ بھی مفقود ہو گیا۔

اس موضوع پر یہی جامع اور قدیم ترین تالیف ہے اور مابعد کی جتنی کتابیں تاریخ اسلام پر لکھی گئی ہیں ان میں تیسری ہجری تک کے واقعات اسی کتاب سے یا سیرۃ ابن اسحاق۔ واقدی۔ ابن سعد میں سے کسی کتاب سے ماخوذ ہیں۔ ابن کثیر، البدایہ والنہایہ، ابن خلدون وغیرہ جس کتاب کو بھی آپ دیکھیں گے تیسری صدی تک کے متعلق جو مواد ان میں ملے گا اس کا سرچشمہ انہیں میں سے کسی میں پائیں گے اور زیادہ تر طبری کو اس کا ماخذ پائیں گے۔ طبری کا تذکرہ کرتے ہوئے خود مودودی صاحب، ابن کثیر اور ابن خلدون کا قول نقل فرماتے ہیں۔

ابن کثیر بھی اس دور کی تاریخ میں انہی کی طرف رجوع کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ شیعی (علامہ ابن کثیر کا یہ کہنا بس دعویٰ ہی دعویٰ ہے۔ ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ ان کی کتاب میں کثیر تعداد شیعی روایات کی ہے۔) روایات سے بچتے ہوئے زیادہ تر ابن جریر طبری پر اعتماد کیا گیا ہے اور آخر میں لکھتے ہیں کہ میں نے واقعات کا ملخص دوسرے مؤرخین کو چھوڑ کر طبری کی تاریخ سے نکالا ہے کیونکہ وہ زیادہ قابل اعتماد ہے اور ان خرابیوں سے پاک ہے جو ابن قتیبہ اور دوسرے مؤرخین کی کتابوں میں پائی جاتی ہیں۔ ابن خلدون کے الفاظ ہیں:

اعتمدناہ بالموثوق بہ السلامۃ من الاھواء الموجودۃ فی کتب

ابن قتیبۃ وغیرہ من المؤرخین۔ صفحہ ۳۱۳)

مشہور مؤرخ علامہ شبلی نعمانی مرحوم طبری کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: تمام مستند و مفصل تاریخیں مثلاً تاریخ کامل ابن الاثیر، ابن خلدون ابو الفدا وغیرہ انہیں کی کتاب سے ماخوذ اور اسی کتاب کے مختصرات ہیں۔ یہ کتاب بھی ناپید تھی اور یورپ کی بدولت شائع ہوئی۔ (مقدمہ سیرۃ النبی)

محمد بن جریر طبری کون ہیں اور ان کی کتاب کا کیا درجہ ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

محمد بن جریر بن یزید الطبری مات سنۃ عشر و ثلاث ماۃ ثقۃ صادق فیہ تشیع یسیر لہ وموالاۃ لا تضر۔

محمد بن جریر بن یزید طبری جن کی وفات سنہ ۳۱۰ھ میں ہوئی۔ ثقہ اور صادق ہیں ان میں تھوڑی سی شیعیت اور موالاۃ ہے جو مضر نہیں ہے۔ (لسان المیزان جلد ۵ ص ۱۰)

شیعہ مذہب کی ابتداء ایک خفیہ تحریک کے طرز پر ہوئی اور صدیوں تک اس کی یہی کیفیت رہی۔ تقیہ اور کتمان اس کا اہم اصول رہا۔ اس لئے اس زمانہ کے علماء اس مذہب کی حقیقت اور اس کی گہرائیوں سے ناواقف تھے جیسے کہ آج بھی علماء اہل سنت میں بہت کم ایسے حضرات ہیں جو اس مذہب سے پورے طور پر واقف ہوں ان بزرگوں کو کیا خبر تھی کہ جس کو وہ "تشیع یسیراً" (تھوڑی سی شیعیت) سمجھ رہے ہیں وہ کس قدر خطرناک اور مضرت رساں ہے۔ "لاتضر" کا فقرہ طبری کی توثیق نہیں کرتا ہے بلکہ شیعہ مذہب سے مصنف کی ناواقفیت کی نشاندہی کر رہا ہے جو شخص غور کے ساتھ طبری کی تاریخ کا مطالعہ کرے گا وہ معلوم کر سکتا ہے کہ اس شیعہ مصنف نے اس کتاب میں کیسا زہر بھرا ہے اور اسے شیریں بنا کر کس طرح اہل سنت کے حلق سے اتارنے کی کوشش کی ہے۔

مولاۃ کا لفظ بھی قابل غور اور تشریح طلب ہے اس کے لغوی معنی تعلق اور

دوستی کے ہیں ۔لیکن یہ مذہب شیعہ کی ایک اصطلاح بھی ہے ۔اس اعتبار سے اس کے معنی حضرت علی مرتضےٰ وغیرہ ان چار شخصیتوں کے ساتھ خصوصی عقیدت کے ہیں جنہیں شیعہ صاحبان اہل سنت کہتے ہیں ۔ان حضرات کے ساتھ عقیدت تو اہل سنت بھی رکھتے ہیں ۔لیکن شیعی موالاۃ اتنی عقیدت کا نام نہیں ہے ۔بلکہ وہ عقیدت ہے جو اہل سنت کے نزدیک غلط سمجھی جاتی ہے ۔لفظ تشیع سے اس بات کا قرینہ ہے کہ یہاں ابن جریر کے متعلق یہ لفظ اسی شیعی اصطلاح کے طور پر استعمال ہوا ہے جو ہمارے نزدیک غلط ہے ۔ظاہر ہے کہ شیعیت اور اصطلاحی اہلبیت کے ساتھ عقیدت میں غلو کی موجودگی کے بعد بھی یہ کہنا کہ یہ مضر نہیں ہے اور ایسے شخص کی تاریخ کو معتبر سمجھنا کسی منصف مزاج کے نزدیک صحیح نہیں سمجھا جاسکتا۔

مشہور محدث حافظ احمد بن علی السلیمانی نے تو یہاں تک کہا ہے کہ یہ شیعوں کے لئے حدیثیں وضع کیا کرتے تھے ۔لیکن علامہ ذہبی نے اس کی تردید کی ہے اور سلیمانی کے علم و فضل کا اعتراف کر کے یہ کہا ہے کہ سلیمانی نے ان ابن جریر کو نہیں مراد لیا ہے بلکہ محمد بن جریر بن رستم کے متعلق یہ بات کہی ہے جو شیعہ تھا مگر اس تردید کی بنیاد اور دلیل ابن جریر بن یزید کے ساتھ حسن ظن کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔

سوال یہ ہے کہ حافظ سلیمانی (جن کے علم و تقویٰ کا اعتراف علامہ ذہبی کو بھی ہے) نے اگر یہ الزام ابن جریر بن رستم پر لگایا تھا ۔تو اس کے دادا کے نام کی تصریح کیوں نہ کر دی تاکہ تشابہ نہ باقی رہتا۔ اور اگر وہ اس سے واقف ہی نہ تھے تو انہوں نے اس کے متعلق یہ بات کہی کیسے ؟ واقفیت کے باوجود امتیاز قائم نہ کرنا تو اس بات کی واضح علامت ہے کہ ان کی مراد یہی محمد بن جریر بن یزید صاحب تاریخ و تفسیر ہی ہیں ۔اس لئے کہ ان کی شخصیت معروف و مشہور تھی ۔ابن جریر بن رستم اتنا مشہور نہیں تھا۔ اور ایسی صورت میں وہی شخصیت عموماً مراد ہوا کرتی ہے جو زیادہ

مشہور و معروف ہو ۔تعجب ہے کہ اس قوی قرینہ کے ہوتے ہوئے علامہ ذہبی نے سلیمانی کے قول کا ایک ایسا محل تلاش کیا جس کی دلیل ابن جریر کے ساتھ بے جا حسن ظن کے سوا کچھ بھی نہیں ہے ۔'لسان المیزان' میں انہیں محمد بن جریر طبری کے متعلق ابن حبان کا یہ قول بھی منقول ہے ۔

قال ابو جعفر الطبری إمامٌ من ائمة الامامیة ۔ابو جعفر طبری نے جو امامیہ (اہل تشیع) کے امام ہیں (یہ بات کہی)۔

علامہ ذہبی نے اس کی بھی تردید فرمائی ہے مگر تردید بے دلیل ہے اور اس کی بنیاد بھی طبری کے ساتھ وہی حسن ظن ہے ۔علامہ نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ابن حبان نے سلیمانی کے قول سے دھوکہ کھایا ہے ۔مگر یہ خیال صحیح نہیں ہے ۔اس لئے کہ سلیمانی ان پر وضع حدیث کا الزام لگا رہے ہیں اور ابن حبان ان کے متعلق بالکل دوسری بات کہہ رہے ہیں یعنے انہیں شیعوں کا مقتدا کہہ رہے ہیں ۔دونوں باتوں کا فرق ظاہر ہے ایسی حالت میں یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ ابن حبان سلیمانی کے قول کی بنا پر انہیں شیعہ کہہ رہے ہیں ؟ دونوں الزام ایک تو نہیں ہیں ۔بلکہ غور کیجئے تو دونوں میں ایک طرح کا تعارض ہے ۔شیعوں کے لئے وضع احادیث تو وہ شخص کرے گا جو اپنی شیعیت کو چھپائے اور سنی بن کر وضع احادیث کرے تاکہ شیعہ ان کے ذریعے سنی مسلمانوں کو الزام دے سکیں ۔بخلاف اس کے شیعوں کا امام اور مقتدا وہی شخص بن سکتا ہے جو اپنی شیعیت کا اظہار کرے ۔دونوں باتوں کے جمع ہونے کا عقلی و منطقی امکان تسلیم کرنے کے بعد بھی علامہ ذہبی کا مندرجہ بالا خیال بعید از قیاس ہی رہتا ہے اور عادتاً مذکورہ بالا دونوں باتیں جمع نہیں ہوتی ہیں ۔اس سے ظاہر ہے کہ علامہ ابن حبان کی رائے تو اپنی معلومات پر مبنی ہے ۔ان کی ذاتی رائے ہے اور علامہ سلیمانی کی تقلید نہیں ہے ۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابتداء جب یہ تقیہ کے پردے میں اپنا رفض چھپائے ہوئے ہوں گے اس وقت کا حال سلیمانی نے تحریر کیا ہے ۔پھر یہ

پردہ چاک ہوگیا اور وہ کھل کر میدان میں آگئے ۔ ابن حبان نے اسی وقت کی کیفیت بیان کی ہے ۔

مندرجہ بالا سطور سے یہ بات واضح ہو گئی کہ مورخ ابن جریر طبری میں شیعیت ہونا تو ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے ۔ یہاں تک کہ ان کے حامی علامہ ذہبی بھی ان کے تشیع کے قائل ہیں ۔ وہ انکار ان کے وضاع ہونے سے کرتے ہیں نہ کہ ان کے تشیع سے ۔

اس کے علاوہ ان کے اوپر دو الزام اور ہیں ۔ ایک تو یہ کہ وہ شیعوں کے لئے حدیثیں وضع کیا کرتے تھے ۔ گویا شیعہ ہونے کے ساتھ وضاع بھی تھے ۔ دوسرے یہ کہ خود صرف شیعہ ہی نہ تھے بلکہ شیعوں کے پیشوا بھی تھے ۔ گویا غالی قسم کے شیعہ تھے ان دونوں الزاموں کی صحت کے بارے میں ہم نے جو بحث کی ہے اس سے کم از کم اتنا ضرور ثابت ہو جاتا ہے کہ ان دونوں الزاموں کی صحت کا احتمال قوی ہے ۔ یہ چیز کم از کم ان کی پوزیشن کو ان دونوں الزاموں کے اعتبار سے بھی مشکوک و مشتبہ ضرور بنا دیتی ہے یعنے شیعیت کے ساتھ وضاع اور غالی ہونے کا احتمال ان کی کتاب اور ان کی شخصیت کو کس قدر بے وزن اور ناقابل اعتماد بنا دیتا ہے اور قاری کو ان کی روایات کے بارے میں کس درجہ احتیاط کی تلقین و تاکید کرتا ہے ۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جسے سمجھانے کی ضرورت ہو ۔ تاریخ کا بیان ہے کہ ان کی شیعیت پر سے تقیہ کا ملمع ان کی حیات ہی میں اتر گیا تھا ۔ علماء حنابلہ ان سے واقف ہو گئے تھے جب ان کا انتقال ہوا تو انہوں نے مسلمانوں کے قبرستان میں دفن نہیں ہونے دیا جس کی وجہ یہ تھی کہ وَنسبوہُ اِلی الرّفضِ انہیں رافضی کہا ۔ (البدایہ والنہایہ جلد ۱۱ ص ۱۴۶)

ایک واضح نشانی اس سلسلہ میں یہ بھی ملتی ہے کہ انہوں نے سیدنا معاویہؓ کے متعلق معاذاللہ لعنۃ اللہ علیہ لکھا ہے ۔ پھر لکھتے ہیں :

"بعض فقہی مسائل اور حدیث غدیر خم کے معاملہ میں شیعہ مسلک سے اتفاق کی بنا پر بعض لوگوں نے خواہ مخواہ انہیں شیعہ قرار دے ڈالا ۔ (ص ۳۱۴)

محترم ! آپ کو خبر نہیں کہ آپ نے خود بھی انہیں شیعیت کی سند عطا فرمادی ہے ۔ لطف یہ ہے کہ اس کے منکر بھی نہیں ۔

کوئی مذہب واعظ کیا جانے تسبیح بھی ہے زنار بھی ہے
اس طرز سخن سے کیا سمجھے اقرار بھی ہے انکار بھی ہے

حدیث غدیر خم کی شیعی تشریح ، شیعہ مذہب کا بنیادی عقیدہ ہے جو شخص یہ عقیدہ رکھتا ہو وہ قطعی طور پر زمرۂ اہل سنت سے خارج ہے اور فرقہ شیعہ میں داخل ہے ۔ اس مجمل کی شرح درج ذیل ہے ۔

ایک روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ایک سفر میں مقام غدیر خم پر پہنچ کر خطبہ دیا اور اس میں فرمایا ۔ مَن کنتُ مَولاہُ فعلیّ مَولاہُ ترجمہ : میں جس کا مولیٰ ہوں ، علی بھی اس کا مولیٰ ہے ۔

یہ روایت بعض کتب اہل سنت میں بھی موجود ہے ۔ مگر نقاد حدیث کے نزدیک ثابت نہیں ہے ۔ اگر ثابت تسلیم کی جائے تو اس کا مفہوم اہل سنت کے نزدیک یہ ہے کہ میں جس کا دوست ہوں علیؓ بھی اس کے دوست ہیں ۔ بخلاف اس کے شیعہ اسے ان کی خلافت و امامت پر نص قطعی سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مولیٰ بمعنے اولیٰ بالتصرف ہے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں صراحتاً فرمادیا ہے کہ میرے بعد علیؓ میرے خلیفہ اور امام المسلمین ہوں گے ۔ یہی وہ باطل عقیدہ ہے جو پورے شیعہ مذہب کی بنیاد ہے ۔ اس کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ ایسا عقیدہ رکھنے والا حضرات خلفاء ثلاثہ کو معاذاللہ غاصب سمجھے گا اور ان کی خلافت کو حضرت علیؓ کے حق میں ظلم اور ان کی حق تلفی خیال کرے گا ۔ یہ ہے حدیث غدیر خم کا معاملہ اور شیعہ

مسلک جس میں حسب اعتراف مودودی صاحب طبری شیعوں سے متفق تھے ۔یعنے وہ بھی حضرت علیؓ کی خلافت کو منصوص سمجھتے تھے اور انہیں آنحضورؐ کا ولی عہد اور بلحاظ استحقاق "خلیفہ بلافصل" سمجھتے تھے ۔میں متحیر ہوں کہ اس کے بعد بھی ان کی شیعیت سے انکار کی جرأت کس طرح ہوتی ہے ۔

شیعوں کی بنیادی عقیدہ رکھنے کے باوجود اگر کوئی شخص سنی ہوسکتا تو اس کا قائل ہونا پڑے گا کہ تثلیث کا قائل ہونے کے باوجود آدمی مسلمان بھی ہوسکتا ہے ۔

ان کا یہ کہنا بھی غلط ہے کہ طبری کو علماء حنابلہ نے صرف اس وجہ سے شیعہ کہہ دیا کہ وہ امام احمد بن حنبلؒ کو فقیہ نہیں تسلیم کرتے تھے ۔ان علماء کے ساتھ یہ سوء ظن آخر کس دلیل پر مبنی ہے ؟ پھر یہ کہ اس سبب مخالفت سے رفض کے الزام کو کیا مناسبت ہے ۔اگر غلط ہی الزام انہیں لگانا تھا تو خارجی کیوں نہ کہہ دیا ؟ دوسرے علماء نے اس کی تردید کیوں نہ کی ؟ ابن جریر تو ایک مشہور صاحب علم شخص تھے ۔اجتہاد بھی کرتے تھے ۔اگر وہ سنی تھے تو سنیوں کے ایک طبقہ پر ان کا اثر ضرور ہوگا ۔اور علماء اہل سنت میں کچھ نہ کچھ لوگ ان کے ضرور معتقد ہوں گے ۔کیا وجہ ہے کہ علماء و عوام نے علماء حنابلہ کی ادنیٰ مخالفت و مقاومت بھی نہیں کی اور انہیں مقابر مسلمین میں مدفون کرنے پر انہوں نے ذرا سا بھی اصرار نہیں کیا ۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حنابلہ کا الزام صحیح تھا اور طبری مذکور واقعی رافضی تھے ۔ان کا مزید قرینہ یہ ہے کہ طبریہ اس وقت شیعیت کا ایک مرکز تھا ۔

دوسرا قرینہ یہ ہے کہ امام بخاری ، امام مسلم ، امام ترمذی ، امام نسائی ، امام ابوداؤد کا زمانہ اور طبری کا زمانہ ایک ہے ۔لیکن ان حضرات نے ان سے کوئی حدیث نہیں لی ہے ۔اس کے معنے یہ ہیں کہ وہ انہیں قابل اعتماد نہیں سمجھتے تھے ۔

مودودی صاحب نے ان کی تفسیر کے متعلق علامہ ابن تیمیہؒ کی جو رائے نقل کی ہے ۔اس کا مفہوم سمجھنے میں مولانا سے غلطی ہوئی ہے ۔امام ابن تیمیہؒ ان کی تفسیر

کو معتزلہ وغیرہ کی عقلی تفاسیر پر ترجیح دیتے ہیں ۔اس لئے کہ ان کی تفسیر بالروایت ہے اور اس میں معتزلہ و باطنیہ وغیرہ کی دور از کار تاویلات سے کام نہیں لیا گیا ہے ، یہی ان کے فقرہ "لیس فیہ بدعۃ" کے معنی ہیں ۔لیکن اس کے یہ معنے ہرگز نہیں ہیں کہ اس میں جو روایتیں آئی ہیں وہ سب کی سب صحیح یا قابل قبول ہیں ۔جس شخص نے بھی تفسیر طبری کا مطالعہ کیا ہے ہرگز ایسی خوش اعتقادی کا اظہار نہیں کرسکتا چہ جائیکہ علامہ ابن تیمیہؒ کا ایسا محقق ؟

امام موصوف کی اس رائے سے نہ طبری کی کوئی توثیق ہوتی ہے نہ ان کی تاریخ کی توثیق ۔اگر ہوتی ہے تو ان کی تفسیر کی اور وہ بھی علی الاطلاق نہیں بلکہ ایک خاص حیثیت سے جس کا ذکر امام نے اس طرح کیا ہے ۔**امّا التفاسیرُ التی بایدی الناس فاصحّھا تفسیر محمد بن جریر الطبری فانہٗ یذکرُ مقالات السلف بالاسانید الثابتۃ** ۔یعنے مروجہ تفاسیر میں (سب تفسیروں میں نہیں) تفسیر طبری سب سے زیادہ صحیح ہے ۔اس لئے کہ وہ مفسرین سلف کے اقوال صحیح سندوں سے نقل کرتے ہیں ۔کشاف کے متعلق لکھتے ہیں کہ اس میں بدعت ہے ۔یعنی انکار صفات وغیرہ ہے ۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ نے بدعت کے معنی بدعت اعتزال کے لئے ہیں نہ کہ ہر قسم کی بدعت کے ۔

طبری کی شخصیت کو چھوڑ کر ذرا ان کی کتاب پر بھی ایک نظر ڈال لیجئے ۔اس سلسلہ میں پہلے مشہور مؤرخ و سیرت نگار علامہ شبلی مرحوم کی رائے ملاحظہ فرمایئے ۔جن کی حیثیت بقول مودودی صاحب وکیل صفائی کی نہیں تھی ۔فرماتے ہیں :

طبری کے بڑے بڑے شیوخ روایت مثلاً سلمۃ الابرش ، ابن سلمہ وغیرہ ضعیف الروایۃ ہیں ۔(مقدمہ سیرت النبیؐ)

علامہ نے وغیرہ لکھ کر بات مختصر کر دی ورنہ یہ فہرست خاصی طویل ہے ۔اس میں ابو مخنف ، کلبی جابر ، جعفی سیف بن عمر وغیرہ کے ایسے کذاب اور وضاع اور

شیعہ رواۃ بڑی کثرت کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ بازاری قصوں کو بھی اس کتاب میں خاصی جگہ دی گئی ہے۔ جس شخص کا جی چاہے، کتاب دیکھ کر ہمارے اس تبصرے کی تصدیق کرے۔ (یہ نکتہ قابل ذکر ہے کہ مذہب اہل سنت والجماعت کی اساس و بنیاد سنت پر قائم ہے بخلاف اس کے شیعہ مذہب کی حقیقی بنیاد تاریخ پر قائم کی گئی ہے نہ کہ کتاب و سنت پر۔ سنت کا تو ان کے یہاں تصور ہی دوسرا ہے۔ رہ گئی کتاب تو اس سے انہوں نے درحقیقت صرف اپنی بیان کردہ تاریخ کی تائید کا کام لینے کی کوشش کی ہے سنی نفسہٖ اسے دین کی اساس نہیں بنایا ہے یہی وجہ ہے کہ ان کے نزدیک قرآن مجید اپنی تفسیر و تشریح میں تاریخی روایات کا محتاج ہے۔ جنہیں انہوں نے مذہبی روایات کی حیثیت دے دی ہے۔ ابن جریر طبری کے زمانہ تک شیعہ مذہب کی تدوین نہیں ہوئی تھی۔ انہوں نے وہ مواد فراہم کیا۔ جس نے اس مذہب کی عمارت باقاعدہ تعمیر کی گئی۔ نہج البلاغۃ جو مذہب شیعہ کی معتبر ترین اور بنیادی کتاب ہے۔ ملاحظہ کیجئے۔ اس کا بہت بڑا حصہ انہیں خطبات و روایات پر مشتمل ہے جو طبری نے اپنی تاریخ میں فراہم کئے ہیں۔ اس طرح اس فاضل شخص نے شیعہ مذہب کی بہت اہم اور اساسی خدمت انجام دی ہے اور درحقیقت کتاب لکھنے سے ان کا مقصد یہی تھا۔ لیکن افسوس کہ اہل سنت نے ان کے تقیہ سے دھوکہ کھایا اور ان کی کتاب کو تاریخ کی حیثیت دی حالانکہ وہ فن تاریخ کی کتاب نہیں ہے بلکہ شیعہ مذہب کی ایک بنیادی کتاب ہے)۔

رہا یہ امر کہ اس میں صحیح روایتیں بھی موجود ہیں۔ اس سے کتاب کی حیثیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ ہم اس کے دعویدار نہیں ہیں کہ تاریخ طبری از سرتاپا کذب و دروغ ہے بلکہ ہمارا دعویٰ یہ ہے کہ وہ جھوٹ اور سچ کا مجموعہ ہے۔ اس لئے اس کی وہی روایت قابل قبول ہوگی جو اصول و معیار کے مطابق ہو۔ مجموعی طور پر کتاب قابل اعتماد اور قابل قبول نہیں ہوگی۔

مودودی صاحب خود اقرار کر چکے ہیں کہ ابن کثیر اور ابن خلدون کا مدار طبری پر ہے۔ علامہ شبلیؒ کی صراحت سے آپ کو معلوم ہوگیا کہ مابعد کی سب تاریخیں ابن الاثیر، ابو الفداء وغیرہ کا اصلی سرچشمہ یہی کتاب ہے۔ بلکہ بقول علامہ یہ سب کتابیں طبری ہی کی تلخیصات کہی جاسکتی ہیں۔ اسے ناقابل اعتماد قرار دینے کے بعد، بعد کی

کتابیں منطقی طور پر غیر معتبر ہوجاتی ہیں۔

مودودی صاحب نے طبری کی توثیق میں متعدد اقوال نقل فرمائے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ تشیع کے ثبوت کے بعد یہ سب توثیقات بے وزن ہوجاتی ہیں اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ توثیق کرنے والے حضرات شیعہ مذہب اور خود طبری سے پورے طور پر واقف نہ تھے۔ یہ ناواقفیت بالکل تعجب خیز نہیں۔ شیعہ حضرات کے تقیہ اور کتمان کی ایسی مثالیں بکثرت ہیں۔ بطور مثال مشہور شیعی مجتہد قاضی نور اللہ شوستری کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ جو لباس تقیہ پہن کر مدت دراز تک ہندوستان کے منصب قضا پر مامور رہے، بالآخر راز کھلا۔

ابو جعفر محمد بن جریر طبری مؤرخ و مفسر کا مذہب

میں نے اظہار حقیقت جلد اول میں لکھا تھا کہ شیعہ مؤرخین اور رواۃ نے اسلامی تاریخ کو مسخ کرنے اور تاریک بنانے کی مسلسل کوشش کی ہے۔ خصوصاً اسلام کی ابتدائی دو صدیوں کے بارے میں تو انہوں نے جھوٹ بولنے غلط بیانی کرنے اور خیانت و بددیانتی کر کے واقعات کو مسخ کرنے میں اپنی پوری ذہانت صرف کر دی یہ ایک افسوسناک واقعہ ہے کہ دور مذکور کی جو تاریخیں اس وقت موجود ہیں ان سب کا اصل ماخذ شیعہ مؤرخین ہی کے تصانیف اور روایات ہیں۔ اس دور کی کوئی ایسی تاریخ موجود نہیں جو کسی سنی نے لکھی ہو اور جس کا ماخذ شیعہ رواۃ مؤرخین کے بیانات نہ ہوں۔ شیعہ مؤرخین از راہ تقیہ و نفاق خود کو سنی ظاہر کرتے تھے اور اہل سنت کو فریب دے کر گمراہ کرنا ان کا مشن اور مقصد تھا۔ ان میں سب سے زیادہ اہم محمد بن جریر طبری ہے۔ جس کی تاریخ بعد کے شیعہ اور سنی مؤرخین کی کتابوں کا سب سے بڑا ماخذ ہے۔ میں نے لکھا تھا کہ یہ شخص شیعہ تھا۔ از راہ تقیہ و نفاق خود کو سنی ظاہر کرتا تھا تاکہ اہل سنت کو فریب دینا آسان ہوجائے۔ اس کا کافی و شافی

ثبوت بھی پیش کر چکا ہوں ۔ لیکن دوران تحریر جلد ثانی اس کا کچھ مزید ثبوت ہاتھ آیا۔ خیال ہوا کہ اسے بطور ضمیمہ جلد ثانی کے ساتھ ملحق کر دیا جائے اور اس سلسلہ میں عام طور پر جو غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں انہیں بھی دور کر دیا جائے ۔ میں نے عرض کیا تھا کہ لسان المیزان میں علامہ ابن حجرؒ نے اس کے متعلق تحریر فرمایا ہے فیہ تشیّع یسیرٌ ولہٗ موالاۃ لاتضرّ اس طرح اس کی شیعیت کا تو اقرار فرمایا۔ مگر یسیر اور لاتضر کے الفاظ اپنی طرف سے لکھ کر اس کے جرم کو ہلکا کرنے کی کوشش کی ہے ۔ بیان واقعہ تو فیہ تشیع کے فقرے پر ختم ہو گیا۔ اس کے بعد ان کی رائے ہے بیان واقعہ نہیں اور اس رائے کو صحیح تسلیم کرنے کی کوئی وجہ نہیں امام ذہبی نے بھی میزان الاعتدال میں ابن جریر مذکور کے تشیع کا اقرار کیا ہے ۔ مگر اسے یسیر کہہ کر اس کی شناعت کو کم کرنے کی سعی لاحاصل کی ہے ۔ امام ذہبیؒ نے اسی میزان الاعتدال میں علامہ احمد بن علی المعروف امام سلیمانی کا مندرجہ ذیل قول بھی اس کے متعلق نقل کیا ہے ۔

کانَ یصنع للرّوافض روافض کے لئے روایتیں وضع کیا کرتا تھا۔

علامہ ابن حبان نے اسی طبری کے متعلق لکھا ہے ۔ ہو امام من ائمتہ الامامیۃ یعنے وہ امامیہ (شیعوں) کا امام (مقتدیٰ) ہے ۔ اس کے ساتھ یہ بھی لکھ چکا ہوں کہ ابن حجر اور ذہبی نے ابن جریر کی شیعیت کی جو تردید کی ہے وہ کسی طرح قابل قبول نہیں ۔ اس سلسلہ میں اتنا اور عرض کرنا ہے کہ علامہ ابن حجرؒ کا زمانہ ولادت ۷۷۳ھ اور زمانہ وفات ۸۵۲ھ ہے جب کہ علامہ ابن حبان کی ولادت ۶۵۴ھ اور وفات ۷۴۵ھ میں ہوئی یہ ابن حجرؒ کے سلسلہ مشائخ میں داخل ہیں ۔ اور زمانہ کے لحاظ سے بہ نسبت ابن حجرؒ ابن جریر کے زیادہ قریب ہیں ۔ اس کے حال سے جتنی واقفیت انہیں ہو سکتی تھی وہ ابن حجرؒ کو نہیں ہو سکتی تھی ۔ اس لئے ان کا قول قابل اعتماد ہے ۔ اور علامہ ابن حجرؒ کی تردید بے وزن ۔

امام حافظ احمد بن علی سلیمانیؒ کا زمانہ تو ابن جریر کے زمانہ سے اور زیادہ قریب ہے ۔ اس کی وفات ۳۱۰ھ میں ہوئی ۔ سلیمانی کی ولادت ۳۲۱ھ اور وفات ۴۱۳ھ میں ہوئی ۔ گویا اس کی وفات اور ان کی ولادت کے درمیان صرف گیارہ سال کا فاصلہ ہے ان کے والد بزرگوار نے ابن جریر کو ضرور دیکھا ہوگا ۔ بلکہ ان کے بعض اساتذہ نے بھی اسے دیکھا ہوگا ۔ اس کے شاگردوں کو تو سلیمانی نے بھی دیکھا ہوگا ۔ ان حالات میں اس کے مذہب کے متعلق ان کی رائے اور اطلاع زیادہ وقیع اور قابل اعتماد ہے ۔ انہوں نے جو تحریر فرمایا ہے کہ وہ رافضی تھا اور روافض کے لئے روایتیں وضع کیا کرتا تھا اسی کو صحیح مانا جائے گا ۔ علامہ ذہبی کی تردید بالکل ساقط الاعتبار اور بے وزن ہے کیونکہ ان کی ولادت ۶۷۳ھ میں ہوئی ۔ یعنی جب طبری کی وفات کو تین سو تریسٹھ برس گزر چکے تھے ۔ ابن حجرؒ کا زمانہ تو اور بعد کا ہے ۔ یعنی وہ تو آٹھویں صدی میں پیدا ہوئے جب کہ ابن جریر کی وفات کو تقریباً پانچ سو برس گزر چکے تھے ۔ اس لئے امام سلیمانی یا ابن حبان کے مقابلے میں ان کا قول بے وقعت ہے ۔

علامہ ابن حجرؒ نے لسان المیزان میں اس کا ایک قول نقل کیا ہے جس سے وہ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ یہ رافضی نہ تھا ۔ مگر وہ قول ذو معنین ہے ۔ اس لئے صفائی میں نہیں پیش کیا جا سکتا ۔ روافض بکثرت اس قسم کی باتیں کر کے اہل سنت کو فریب دیتے ہیں ۔ اور جب اپنے ہم مذہبوں سے ملتے ہیں تو اپنے مقتداؤں کی طرح انما نحنَ مستھزؤن کہہ کر اس کے وہ معنی بیان کرتے ہیں جو ان کے دل میں تھے ۔ اور ان لوگوں سے نفاق کی داد حاصل کرتے ہیں ۔ یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ علامہ ابن حجرؒ طبری کی صفائی پیش کرنے کے بعد لکھتے ہیں ۔ والعلم عنداللہ ، یہ فقرہ غمازی کر رہا ہے کہ موصوف کو خود اس صفائی پر اعتماد نہیں ۔

ثبوت مزید

اب طبری مذکور کے رفض کے دو قوی ثبوت اور ملاحظہ ہوں:۔

(۱) یاقوت حموی معجم والبلدان جلد اول ص ۶۳ پر شہر آمل کے تذکرے میں لکھتے ہیں کہ ابن جریر کا مولد "آمل" تھا۔اس لئے بعد میں لکھا ہے کہ ابو بکر محمد بن العباس الخوارزمی نے جو آملی اور ابن جریر کا بھانجا اور شاگرد تھا کہا ہے :

آمل میری جائے پیدائش ہے اور بنو جریر میرے ماموں ہیں۔اور آدمی اپنے ماموں کے مشابہ ہوتا ہے تو سن لو کہ میں وراثتاً رافضی ہوں اور دوسرے لوگ دور کے تعلق سے رافضی ہیں۔

یاقوت حموی نے اسے نقل کرکے خوارزمی مذکور کے قول کو غلط قرار دیا ہے مگر بے دلیل۔ظاہر ہے کہ خوارزمی مذکور ابن جریر کا بھانجہ اور اس کا شاگرد ہے۔وہ اپنے ماموں اور استاد کے حال سے خوب واقف تھا۔یاقوت نے ۶۲۶ھ میں وفات پائی ان کے اور ابن جریر کے درمیان تین صدیوں سے زیادہ زمانہ حائل ہے۔انہوں نے تو اس کے شاگردوں کو بھی دیکھا نہ ہوگا۔اس لئے خوارزمی کا بیان صحیح مانا جائے گا کہ ابن جریر رافضی تھا۔یاقوت کا بیان یقیناً غلط ہے۔ابن جریر کے بھانجے اور شاگرد کے اس صاف اور صریح بیان کے بعد بھی اسے سنی کہنا کھلی ہوئی زیادتی ہے۔

(۲) علامہ ابو الفرج عبدالرحمن بن علی بن محمد بن علی بن الجوزی المتوفی ۵۹۷ھ اپنی مشہور کتاب المنتظم فی تاریخ الملوک والامم (مطبوعہ دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدرآباد دکن ۱۳۵۷ھ) جلد ۶ ص ۱۷۲ پر محمد بن جریر طبری مذکور کے حالات میں تحریر فرماتے ہیں۔

"(طبری مذکور) ۲۲۴ھ کے آخر میں اور ۲۲۵ھ کی ابتداء میں پیدا ہوا اور ۳۱۰ھ میں ۲۸/ شوال کو بروز اتوار بوقت مغرب فوت ہوا۔دوشنبہ کو دن چڑھے رحبہ

یعقوب میں باب خراسان کے قریب اپنے مکان کے سامنے ایک حجرے میں دفن کیا گیا اور کہا گیا ہے کہ رات کو مدفون ہوا اور اس کے دفنانے میں شرکت کے لئے کسی کو اطلاع نہیں دی گئی۔ثابت بن سنان نے اپنی تاریخ میں ذکر کیا ہے کہ اس کی تدفین کا حال اس لئے مخفی رکھا گیا کہ عوام جمع ہوگئے اور اس کے دفن سے مانع ہوئے اور اس پر پہلے رافضیت کا اور پھر الحاد کا الزام لگایا مصنف (ابن جوزی) کہتے ہیں کہ ابن جریر پاؤں پر مسح کا قائل تھا اور ان کے دھونے کو فرض نہیں سمجھتا تھا۔اسی لئے اسے رافضی کہا گیا۔اس کے بارے میں ابو بکر بن داؤد نے بات نصر حاجب تک پہنچائی اور اس پر کئی الزام لگائے جن کا اس نے انکار کر دیا۔ان میں سے ایک الزام یہ تھا کہ وہ "جہم" کا ہم خیال ہے اور بتایا کہ وہ (ابن جریر) آیت قرآنی بل یداہ مبسوطتان کی تفسیر نعمتاہ کرتا ہے۔اس نے (ابن جریر نے) اس الزام سے انکار کیا کہا کہ میں نے یہ نہیں کہا ان میں سے ایک الزام یہ تھا کہ اس نے (ابن جریر نے) یہ روایت بیان کی ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روح مبارک خارج ہوئی تو حضرت علیؑ کی ہتھیلی پر آ گئی اور وہ اسے نگل گئے (اس کے جواب میں ابن جریر نے) کہا کہ حدیث میں یہ نہیں ہے کہ وہ اسے نگل گئے۔بلکہ یہ ہے کہ انہوں نے اسے (آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی روح مبارک کو) اپنے چہرے پر مل لیا مصنف (ابن جوزی) کہتے ہیں کہ یہ بھی غیر ممکن ہے (یعنے روح مبارک حضرت علیؑ کے ہاتھ پر آنا اور ان کا اسے چہرے پر مل لینا بھی محال ہے) باوجود اس کے ابن جریر نے اس کے جواب میں نصر حاجب کو لکھا کہ اسلام میں کوئی جماعت اس ذلیل جماعت کی ایسی نہیں ہے۔مصنف رحمہ اللہ (ابن جوزی) کہتے ہیں کہ اس کی (ابن جریر کی) یہ بات بہت بری ہے۔اس کا جس سے جھگڑا تھا اسی کو کہتا۔مگر اس کی پوری جماعت کو برا کہا اور یہ جانتے ہوئے کہ وہ کس جماعت سے تعلق رکھتا ہے۔انتہائی قبیح بات ہے"۔

علامہ ابن جوزی نے اس کا پورا نام محمد بن جریر بن کثیر بن غالب

ابو جعفر الطبری لکھا ہے۔ محمد بن جریر میں تو کوئی اختلاف نہیں مگر اس کے بعد ناموں میں اختلاف ہے۔(جس کی تفصیل انشاء اللہ چند سطروں بعد آئے گی)

علامہ ابن جوزی کے اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن جریر مسح رجلین کا قائل تھا اور یہ شیعوں کا مسلک ہے۔ اہل سنت کا اجماع ہے کہ وضو میں دونوں پاؤں کا دھونا فرض ہے۔ پاؤں کے مسح کا قائل ہونا شیعیت کی نمایاں علامت ہے۔ اس سے بڑھ کر رفض کی علامت وہ فاسد عقیدہ ہے جسے طبری نے بصورت روایت بیان کیا ہے۔ یہ خیال کہ العیاذ باللہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی روح مقدس حضرت علیؓ کی ہتھیلی پر آگئی اور انہوں نے اپنے چہرے پر مل لی بالکل باطل اور سراپا گمراہی بلکہ کفر ہے۔ کیا کوئی سنی یہ باطل عقیدہ رکھ سکتا ہے؟ سوا شیعوں کے اس قسم کا عقیدہ کسی کا نہیں ہو سکتا۔ اس سے روز روشن کی طرح روشن ہے کہ طبری شیعہ اور غالی رافضی تھا۔

طبری مذکور کی رافضیت پر جو دلائل اظہار حقیقت حصہ اول میں مذکور ہوئے ان پر مندرجہ بالا دو دلیلوں کا اضافہ کیجئے۔ ان میں سے ہر دلیل اپنی جگہ اثبات مدعا کے لئے کافی ہے۔ مگر سبائی سحر کا کرشمہ ہے کہ علماء اہل سنت کی بڑی تعداد اسے رافضی تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں اور اسے امام ابو جعفر طبری کہتی ہے۔

دو ابن جریر یا ایک

جو حضرات ابن جریر مذکور کو سنی کہنے پر مصر ہیں کہ ابن جریر دو تھے۔ محمد بن جریر بن یزید۔ یہی شخص تاریخ طبری اور تفسیر طبری کا مؤلف ہے اور یہ سنی تھا۔ دوسرا محمد بن جریر بن رستم ہے۔ جو غالی شیعہ تھا۔ جن لوگوں نے زیر بحث ابن جریر کو شیعہ کہا ہے۔ انہیں دھوکا ہو گیا۔ ابن جریر ابن یزید کو انہوں نے ابن جریر بن رستم سمجھ کر رفض کو اس کی جانب منسوب کر دیا۔

اس غلط تاویل کا ایک جواب تو میں حصہ اول میں دے چکا ہوں اور بتا چکا ہوں کہ یہ بات بالکل غلط بلکہ نہایت لغو ہے۔ سلیمانی، ابن حبان کے ایسے صاحبان علم و دانش اور فن رجال کے ماہرین کا ایسا دھوکہ کھانا بعید از قیاس ہے۔ پھر یہ کہ اس کا ثبوت کیا ہے کہ ان حضرات نے دھوکہ کھایا؟ مزید یہ کہ علامہ ذہبی و علامہ ابن حجر جو اس کی طرف سے دفاع کرنا چاہتے ہیں۔ وہ بھی اس کے تشیع کے معترف ہیں صرف غالی شیعہ ہونے کی نفی کرتے ہیں۔ مگر یہ نفی بے دلیل ہے۔ اس لئے قابل التفات نہیں۔ علاوہ بریں شیعہ ہونا ہی ناقابل اعتماد ہونے کے لئے کافی ہے۔ غالی ہونا ضروری نہیں۔ المنتظم اور معجم البلدان سے جو منقول ہوا اس میں تو اس دھوکہ والی غلط بات کی سرے سے کوئی گنجائش ہی نہیں نکلتی۔ ان دونوں کے قابل مصنفین نے تو صاف صاف اسی مشہور ابن جریر کے متعلق گفتگو کی ہے۔ جو تاریخ طبری و تفسیر طبری کا مؤلف ہے۔

اس بحث کی ضرورت تو اس صورت میں ہے۔ جب دو "ابن جریر" فرض کئے جائیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ دوئی کا تصور ہی غلط ہے۔ ابن جریر بن یزید اور ابن جریر بن رستم ایک ہی شخص ہے۔ اس کے دادا کا نام رستم تھا وہ کافر تھا۔ جب مسلمان ہوا تو یزید نام رکھا گیا۔ رستم اور یزید ایک ہی شخص کے دو نام ہیں۔ ایک نام اسلام لانے سے پہلے کا ہے اور دوسرا اسلام لانے کے بعد کا۔ یہ شبہ صحیح نہیں کہ شیعہ کا نام "یزید" کیسے رکھا گیا۔ کیونکہ اس زمانہ میں شیعہ "یزید" نام رکھنے میں کوئی تکلف نہ کرتے تھے۔ دوسرے ہو سکتا ہے کہ مسلمان ہونے کے وقت وہ شیعہ نہ ہوا ہو۔ رافضیت بعد کو اختیار کی ہو۔ یا بطور تقیہ یہ نام اختیار کیا ہو۔ تاکہ اہل سنت کو فریب دینا آسان ہو جائے۔ یا وہ خود شیعہ ہی نہ ہوا ہو۔ جریر یا ابن جریر نے رافضیت اختیار کی ہو۔ مختصر یہ کہ دادا کے نام کی وجہ سے پوتے کے مذہب کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ محمد بن جریر کی رافضیت اپنی جگہ ثابت ہے۔ خواہ اس کے دادا

یزید ہو یا کچھ اور۔

محمد بن جریر بن یزید اور محمد بن جریر بن رستم دونوں کا تذکرہ اہل سنت اور شیعوں دونوں کی کتب رجال میں ملتا ہے۔ اول الذکر کو دونوں کی کتابوں میں سنی ظاہر کیا گیا ہے ثانی الذکر کو شیعہ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ دوئی کا تصور شیعوں ہی کا فریب ہے جس میں بعض [illegible] اہل سنت بتلا ہوگئے۔ قرینہ یہ ہے کہ علامہ سلیمانیؒ جن کا زمانہ ابن جریر کے زمانہ سے قریب ہے اور جو شیعی اسماء الرجال کے وجود میں آنے سے قبل گزرے ہیں۔ ابن جریر کو رافضی کہتے ہیں اور دو ابن جریر کا کوئی تصور نہیں رکھتے یہ دوئی کا تصور شیعی اسماء والرجال کے وجود میں آنے کے بعد ہی پیدا ہوا۔ اور شیعوں کا کید و فریب ہے۔ چونکہ مؤرخ و مفسر ابن جریر طبری نے تقیہ و نفاق کا لبادہ اوڑھ کر اور خود کو سنی ظاہر کرکے شیعیت کی خوب تبلیغ کی۔ تاریخ و تفسیر دونوں میں شکر لپیٹ کر رفض کا زہر ناواقف اہل سنت کے حلق سے اتارنے کی کوشش کی اور سراپا کذب و دروغ، موضوع روایتیں اور شیعہ وضاعوں کذابوں کی بیان کردہ جھوٹی حکایتیں مدون کرکے شیعہ مذہب کے لئے بنیادیں فراہم کیں اس لئے شیعی علماء نے اس کی کوشش کی کہ مرنے کے بعد اس کی لاش بھی تقیہ و نفاق کے کفن سے ڈھکی رہے۔ تاکہ اہل سنت ہمیشہ دھوکہ کھاتے رہیں۔ اس مقصد سے انہوں نے دو ابن جریر کا افسانہ تراشہ اور اہل سنت کو فریب میں بتلا کر دیا۔ ثبوت مزید کے لئے شیعوں کی کتاب نہج البلاغہ پر ایک نظر ڈال لیجئے۔ اہل سنت کے نزدیک تو یہ کتاب سرے سے ساقط الاعتبار ہے۔ مگر شیعہ اسے حضرت علیؓ کے خطبات کا مجموعہ کہتے ہیں۔ اور بمنزلہ کتاب اللہ سمجھتے ہیں۔ اس میں جو خطبات منقول ہیں ان میں بڑی تعداد تاریخ طبری سے ماخوذ ہے۔ کھلی ہوئی بات ہے کہ اگر ابن جریر طبری مؤرخ سنی ہوتا تو شیعہ اس کی کتاب پر اعتماد کیوں کرتے۔ اور یہ جعلی خطبات اس سے کیوں نقل کرتے اس سے واضح ہوتا ہے کہ وہ شیعہ تھا اور شیعہ بھی اسے شیعہ ہی سمجھتے تھے۔

مگر اہل سنت کو دھوکہ دینے کے لئے اسے سنی مشہور کر دیا۔ اور ایک ابن جریر کے دو بنا دیئے۔ پھر یہ بھی بعید از قیاس ہے کہ طبریہ کی ایسی چھوٹی سی بستی میں دو شخص ایسے ہوں جن کے نام ولدیت، وقت ولادت و وفات ایک ہی ہوں۔ دونوں مؤرخ ہوں اور شہرت حاصل کریں مگر عوام و خواص ان کے درمیان کی کوئی علامت نہ مقرر کریں اور وہ خود بھی اس امتیاز کی کوئی کوشش نہ کریں۔

نام کے بارے میں اختلاف

اس حد تک تو متفق علیہ ہے کہ اس شخص کا نام ابو جعفر محمد بن جریر تھا۔ مگر اس کے بعد اختلاف ہے۔ فہرست ابن ندیم میں اس کا نام ابو جعفر محمد بن جریر ابن یزید بن خالد لکھا ہے اور شیعہ عالم رجال نجاشی نے یزید کے باپ کا نام کثیر بن غالب لکھا ہے اور علامہ ابن جوزی سے منقول ہو چکا کہ انہوں نے بھی جریر کے باپ کا نام کثیر بن غالب بتایا ہے۔ تو کیا ان سب کو الگ الگ شخصیتیں سمجھا جائے گا؟ اگر نہیں تو ابن جریر بن رستم کو ابن جریر بن یزید کے علاوہ الگ اور مستقل شخصیت فرض کرنے کی کیا وجہ؟ یہ کیوں نہ سمجھا جائے کہ ایک ہی ابن جریر ہے جس کے دادا پردادا کے نام میں اختلاف ہے۔ اسی اختلاف کے ذیل میں بھی یہ داخل ہے کہ اس کے دادا کا نام بعض کے نزدیک "یزید یا کثیر" کے بجائے رستم ہے۔ صرف دادا کے نام میں اختلاف ہے۔

ائمہ و اکابر علماء کا طبری سے اعراض

کسی شخص کے قابل اعتماد یا ناقابل اعتماد ہونے کے بارے میں رائے قائم کرنے کے لئے اس کے ساتھ ان ثقہ فہیم اور قابل اعتماد اشخاص کا رویہ اور طرز عمل بھی فیصلہ کن حیثیت رکھتا ہے جو اس کے زمانے میں موجود اور اس کے اس قدر

قریب ہوں کہ اس کے حالات سے آگاہ ہو سکتے ہیں۔ خصوصاً جب کوئی ایسا سبب بھی موجود ہو۔ جو اس کے حالات معلوم کرنے اور اس سے تعلق قائم کرنے کا محرک ہو۔ اس زاویئے سے ابن جریر طبری مذکور کی حالت غور کیجئے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ مندرجہ ذیل ائمہ محدثین اس کے زمانہ میں موجود تھے اور ان سے اس کی ملاقات ممکن بلکہ بہت سہل تھی۔ مگر ان میں سے کوئی بھی اس سے کوئی روایت نہیں لیتا۔ نہ طبری ان سے کوئی روایت لیتا ہے۔ ان حضرات میں سے کوئی اس کی توثیق بھی نہیں کرتا نہ کوئی کلمہ خیر اس کے بارے میں کہتا ہے۔ بلکہ سب اسے نظرانداز کرتے ہیں اور اسے قابل ذکر بھی نہیں سمجھتے۔ حالانکہ یہ حضرات جمع روایات کے شائق تھے اور ان کی عظمت و شہرت کی وجہ سے مشتاقان حدیث دور دور سے ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ انہوں نے سفر بھی بکثرت کئے۔ طبری نے بھی سفر کئے اور بغداد میں مدت تک رہا۔ وہ خود بھی مشہور ہو چکا تھا۔ یہ بات بعید از قیاس۔ بلکہ محال عادی نظر آتی ہے کہ یہ حضرات طبری سے اور وہ ان سے ناواقف ہو۔ باوجود اس کے ان حضرات کا اسے نظرانداز کرنا اس بات کی بین دلیل ہے کہ یہ حضرات اسے ثقہ اور قابل اعتماد نہیں سمجھتے تھے۔ یہ ائمہ محدثین صحاح ستہ کے مؤلفین ہیں۔ جن کے اسماء گرامی مع سن وفات درج ذیل ہیں۔ اسی کے ساتھ یہ بھی بتادیا گیا ہے کہ ان میں سے ہر ایک کی وفات کے وقت طبری کا سن کیا تھا؟ ملاحظہ ہو

امام بخاری متوفی ۲۵۶ھ ابن جریر اس وقت ۳۲ سال کا تھا۔

امام مسلم متوفی ۲۶۱ھ ابن جریر اس وقت ۳۷ سال کا تھا۔

امام ابن ماجہ متوفی ۲۷۳ھ ابن جریر اس وقت ۴۹ سال کا تھا۔

امام ابو داؤد متوفی ۲۷۵ھ ابن جریر اس وقت ۵۱ سال کا تھا۔

امام ترمذی متوفی ۲۷۹ھ ابن جریر اس وقت ۵۵ سال کا تھا۔

امام نسائی متوفی ۲۷۹ھ ابن جریر اس وقت ۷۹ سال کا تھا۔

امام طحاوی متوفی ۳۲۱ھ ابن جریر ان کا ہمعصر ہے ۳۱۰ھ میں مرا۔

ان حضرات کے علاوہ اس زمانہ کے اکابر علماء میں سے کسی نے اس کی ادنیٰ سے ادنیٰ توثیق بھی نہ کی، نہ اسے قابل اعتناء سمجھا۔ اس کی وفات سے ایک صدی کے بعد خطیب بغدادی نے اس کی کتابیں دیکھ کر اس کے علم کی تعریف کی۔ مگر ان کی توثیق انہوں نے بھی نہ کی۔ انہوں نے نہ اسے دیکھا تھا۔ نہ اس کے شاگردوں کو دیکھا تھا۔ توثیق کرتے بھی تو قابل اعتبار نہ ہوتی۔ باوجود اس کے انہوں نے اس کے لئے توثیق کا کوئی لفظ نہیں استعمال کیا۔ علم کی تعریف توثیق کے مرادف ہیں۔ نہ اسے مستلزم ہے۔ صاحب علم تو رافضی بھی ہو سکتا ہے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ مشہور محدث ابن خزیمہ معاصر نے طبری کے متعلق اس کی تفسیر دیکھ کر فرمایا کہ "میں نے روئے زمین پر اس سے بڑا عالم نہیں دیکھا اور حنابلہ نے اس پر بہت ظلم کیا (یعنے اسے رافضی کہا) ابن خزیمہ کا یہ قول ابن خالویہ حسین ابن احمدان سے روایت کرتا ہے اور یہ اس کا ان پر افتراء و بہتان ہے۔ ابن خالویہ مذکور رافضی ہے۔ علامہ ابن حجرؒ لسان المیزان جلد ۲ میں اس کے متعلق تحریر فرماتے ہیں۔

(ابن خالویہ) امامی (شیعہ) تھا اور (اپنے) مذہب کا عالم تھا۔ ابوالحسین نصیبی شیعی نے اس کی وہ کتاب اس سے پڑھی ہے۔ جو اس نے مسئلہ امامت پر لکھی تھی۔

ابن خالویہ سنیوں کو دھوکہ دینے کے لئے طبری کو سنی اور قابل اعتماد ثابت کرنا چاہتا تھا۔ اس مقصد سے اس نے یہ روایت وضع کی اور مندرجہ بالا قول گھڑ کر ابن خزیمہؒ کی طرف منسوب کر دیا۔ انہوں نے یہ بات نہیں فرمائی۔ ہماری بات کی تائید اس واقعہ سے ہوتی ہے کہ ابن خزیمہ نے طبری سے کوئی روایت نہیں لی۔ حالانکہ یہ اس کے معاصر تھے۔ ان کی وفات ۲۲۳ھ میں طبری کی ولادت سے ایک سال

ء اور وفات ۳۱۱ھ میں یعنے اس کی وفات سے ایک سال بعد ہوئی۔ متاخرین علماء اہل سنت کا اس کی مدح و توثیق کرنا اسے ثقہ اور سنی سمجھنے کے لئے کافی نہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان علماء متاخرین کو اس کا علم کیسے ہوا؟ جب علم کا کوئی قابل اعتماد ذریعہ ان کے پاس نہیں تو ان کی رائے بے وزن اور غلط کہی جائے گی۔ اس سلسلہ میں ہمارے پاس اور دلائل بھی ہیں۔ مگر بخوف طوالت انہیں قلم انداز کرتے ہیں۔

("امام زہری اور امام طبری — تصویر کا دوسرا رخ" سے اقتباس)

کُنتُ کنزاً مخفیاً فاَحببتُ اَن اُعرفَ فخَلقتُ الخلقَ۔

ترجمہ: "میں ایک مخفی خزانہ تھا میں نے چاہا کہ پہچانا جاؤں تو میں نے مخلوق کو پیدا کیا"۔

یہ حدیث صحاح ستہ میں نہیں ہے۔ ملا علی قاری اور عبدالرحمن سخاوی نے اس حدیث کو موضوع قرار دیا ہے۔ امام ناصرالدین البانی نے اپنی کتاب "سلسلہ الاحادیث الضعیفہ والموضوعہ" میں اس کے موضوع ہونے پر بحث کی ہے ع

صحاح ستہ میں سرے سے جس کا کچھ پتہ نہ تھا
جسارت عجیب ہے حدیث اس کو کہہ دیا
اسی کو وحدت الوجود میں بنایا مرکزی خیال
وہ فلسفہ نہیں ہے جس کی دوسری کوئی مثال

ابن عربی ۔ ایک تعارف

اگرچیکہ اہل علم حلقوں میں ابن عربی کی ذات محتاج تعارف نہیں ہے ۔ پھر بھی اس زمانے میں جب کہ نئی نسل کی اکثریت علم سے بے بہرہ اور اپنے اسلاف سے بے خبر ہے ضرورت اس بات کی ہے کہ انھیں متقدمین کے حالات اور افکار اور ان کے بارے میں متاخرین کی آراء سے واقف کرایا جائے ۔ یہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ جب کبھی متقدمین میں سے کسی فرد کا کوئی قول یا کوئی نظریہ ان کے سامنے آئے تو وہ آسانی کے ساتھ اس کے بارے میں صحیح رائے قائم کر سکیں ۔ صوفیوں کے "شیخ اکبر" ابن عربی کے افکار و نظریات ہر زمانے میں معرکتہ الآراء رہے ہیں ۔ اکابر سے لے کر اصاغر تک شائد ہی کوئی اہل قلم ہو جس نے ان کی تائید یا تردید میں قلم نہ اٹھایا ہو ۔ زیر نظر مقالہ میں ان کا ایک مختصر تعارف پیش کیا جارہا ہے ۔ اس تعارف میں اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ کوئی طالب علم ان کی تائید یا تردید میں لکھی گئی کسی کتاب کا مطالعہ کرے تو اس تعارف کی روشنی میں اس بات کا فیصلہ کر سکے کہ ان کی تائید کرنے والے تائید میں کس حد تک حق بجانب ہیں اور مخالفت کرنے والے ان کی مخالفت میں کس حد تک حق بجانب ہیں ۔

نام و نسب

محمد نام " کنیت ابو عبداللہ " لقب محی الدین ہے ۔ "ابن عربی " اور "شیخ اکبر" کے القاب زبان زد خاص و عام ہیں ۔ قبیلہ نبو طے کے مشہور سردار " حاتم طائی " کے فرزند عبداللہ کی اولاد سے ہیں ۔ "ابن عربی " بغیر "الف لام " کے لکھا جاتا ہے ۔ اس لئے کہ ایک اور مشہور عالم قاضی اشبیلیہ علامہ ابو بکر محمد ابن عبداللہ بن العربی (م ۵۴۴ء) گزرے ہیں جو "ابن العربی " کے نام سے مشہور ہیں ۔

ولادت

رمضان ۵۶۰ء میں شہر مریسیہ " مضافات اندلس میں پیدا ہوئے ۔ ابتدائی تعلیم یہیں ہوئی ۔ آٹھ سال کی عمر میں اشبیلیہ منتقل ہوئے اور یہاں مختلف علوم و فنون میں کمال حاصل کیا ۔ معقولات اور تصوف سے فطری طور پر خاص لگاؤ تھا " عنفوان شباب ہی سے سخت ریاضتیں اور مجاہدے کئے : یہاں کے متصوفین فلاسفہ " وحدۃ الوجود " کے قائل تھے ۔ ابن عربی کے لئے یہ خیالات اور تصورات ابتداء عمر ہی سے نقش کالحجر تھے ۔

مختصر کوائف زندگی

دوران تعلیم اندلس اور شمالی افریقہ کے کئی شہروں کا سفر کیا اور وہاں کے مشاہیر سے بھرپور علمی استفادہ کیا ۔ ۵۹۰ء میں حرمین شریفین کی زیارت کی ۔ مکہ مکرمہ میں کئی ماہ تک قیام کیا بغداد بھی گئے ۔ ۶۲۰ء میں دمشق آئے اور ہمیشہ کے لئے یہیں سکونت پذیر ہوگئے ۔

ذریعہ معاش

ابتداء میں ذریعہ معاش کیا تھا معلوم نہیں ہو سکا ۔ دمشق کے قیام کے زمانے میں قاضی دمشق نے اپنی طرف سے "یومیہ " تیس درم مقرر کئے تھے ۔ حمص کے فرمانروا (اسدالدین شیر کوہ) (م ۶۳۷ء) نے اپنی طرف سے یومیہ " سو درم مقرر کئے تھے ۔ بلاد روم کے فرمانروا غالب بامراللہ نے بھی کافی مالی امداد کی جس کی بناء پر زندگی فارغ البالی گزری ۔

بیعت

حضرت عبدالقادر جیلانی (م ۵۶۱ء) کے خلیفہ شیخ ابوالسعود ابن شبل کے مرید و خلیفہ تھے ۔ ابن عربی کے دوسرے پیر طریقت شیخ ابوالفتح محمد بن قاسم فاسی تھے ۔ ابن

عربی کے مریدین و مستفیدین کا حلقہ بھی نہایت وسیع تھا۔ جس میں عورتوں کی بھی قابل لحاظ تعداد تھی۔

تصانیف

سب سے پہلی تصنیف "اصطلاحات الصوفیہ ۶۱۵ء میں مرتب کی۔ اس کے بعد قلمی کاوشوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ تالیفات بے شمار ہیں۔ بعض تالیفات آٹھ ورقیہ ہیں تو بعض کئی کئی جلدوں پر مشتمل ہیں۔ قرآن مجید کی تفسیر لکھی تھی۔ سورۂ کہف تک پہنچتے پہنچتے (۶۴) جلدیں ہوگئیں۔ لیکن اس کا بڑا حصہ چوری ہوگیا۔ "فتوحات مکیہ اور "فصوص الحکم" کو بڑی شہرت حاصل ہے۔ یہ دونوں کتابیں ۶۲۸ھ اور ۶۳۶ھ کے درمیان لکھی گئی ہیں۔ فتوحات مکیہ مصر سے چار ضخیم جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔ فصوص الحکم کے بارے میں خود ابن عربی کا کہنا ہے کہ انھوں نے محرم ۶۲۷ھ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا کہ آپ کے ہاتھ میں فصوص الحکم تھی اور آپ نے فرمایا اے محمد (ابن عربی) اس کتاب کو لو اور لوگوں میں پھیلاؤ تاکہ اس سے نفع پہنچے۔ ابن عربی کہتے ہیں کہ میں نے اس کتاب میں کچھ گھٹائے بڑھائے بغیر اس کو لوگوں کے سامنے پیش کر دیا۔ اس طرح ابن عربی نے اس کتاب کو "مُنزل من الرسول" کتاب قرار دیا۔

وفات اور مدفن

ابن عربی نے ربیع الثانی ۶۳۸ھ میں دمشق میں وفات پائی۔ اور یہیں مدفون ہوئے۔ ان کے دو فرزند سعدالدین اور عمادالدین بھی بازو مدفون ہیں۔ سلطان سلیم نے ۹۲۴ھ میں شاندار گنبد اور مسجد بنوادی۔ اب یہ مقام "حی ابن عربی" کے نام سے مشہور ہے۔ قریب ہی "قاسون" نامی پہاڑ ہے۔ مشہور ہے کہ اصحاب کہف نے اسی پہاڑ کے غار میں پناہ لی تھی اور یہ بھی مشہور ہے کہ ہابیل کا قتل بھی اسی پہاڑ پر

ہوا تھا۔

عبقری شخصیت

ابن عربی علوم معقول و منقول کے ماہر اور ایک زبردست ادیب و خطیب تھے۔ نظم و نثر پر یکساں قدرت حاصل تھی۔ ایک ایسی نادر روزگار شخصیت کے مالک تھے جس کی نظیر اسلاف و اخلاف میں نہیں ملتی۔ انھوں نے اپنے بارے میں اس قدر عجیب و غریب دعوے کئے ہیں کہ یہ فیصلہ کرنا دشوار ہے کہ ان میں کہاں تک صداقت اور واقعیت ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ انھوں نے حضرت ہود علیہ السلام سے علمی استفادہ کیا ہے۔ حضرت ابراھیم علیہ السلام سے قرآن پڑھا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دست مبارک پر توبہ کی ہے۔ انھیں سارے ہی متقدمین و متاخرین اہل ایمان کا مشاہدہ کرایا گیا ہے اور انھیں منجانب اللہ اس بات سے بھی مطمئن کر دیا گیا ہے کہ وہ آخرت کی شقاوت و بدبختی سے محفوظ ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ انھیں کئی ایک رسولوں کی ہم نشینی کا شرف حاصل ہے۔ اپنی "قطبیت" کے بارے میں کہتے ہیں کہ ۵۸۵ھ میں تمام انبیاء علیہم السلام شہر قرطبہ میں جمع ہوگئے اور مجھے حضرت ہود علیہ السلام کی وساطت سے خوش خبری دی کہ میں قطبیت کے مقام پر فائز کیا جا رہا ہوں۔ امت محمدیہ کے متقدمین صوفیہ سے انھوں نے ملاقات اور گفتگو کی ہے۔ حضرت جنید بغدادی تو ان کی قابلیت دیکھ کر شرمسار ہوگئے۔

علوم معقول و منقول میں تبحر کے باوجود ان کا زیادہ تر اعتماد اپنے "کشف" پر تھا۔ حتیٰ کہ حدیث کے معاملے میں بھی وہ اپنے کشف پر ہی اعتماد کرتے تھے۔ کوئی حدیث روایتاً اور درایتاً صحیح نہیں ہوتی تھی لیکن ان کا کشف اس کی صحت پر دلالت کرتا تو وہ اس کو صحیح تسلیم کرتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے "کُنتُ کنزاً مخفیا" والی موضوع حدیث کو یہ تسلیم کرتے ہوئے کہ یہ نقلاً ثابت نہیں ہے اپنے کشف کی

بناء پر صحیح قرار دیا۔ وہ کہتے ہیں کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ حدیث روایت و درایت کے لحاظ سے صحیح ہوتی ہے اور محدثین اس پر عمل کرتے ہیں لیکن جب مکاشف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حدیث غیر صحیح ہے اور کبھی اس کے برعکس حدیث ضعف طرق کی بناء پر ساقط الاعتبار ہوتی ہے لیکن مکاشف کے نزدیک اس کے کشف کی بناء پر صحیح ہوتی ہے۔

قرآن مجید کے بعد علوم دین میں حدیث کا علم جس اہمیت کا حامل ہے وہ اظہر من الشمس ہے۔ ابن عربی نے اس علم کو کشف کی سان پر چڑھا کر محدثین کی عمر بھر کی محنتوں پر پانی پھیر دیا۔ ابن عربی نے کشف کو معیار قرار دے کر ایسی صورت حال پیدا کر دی کہ کسی بھی حدیث کی صحت و ضعف کا تعین مشکل ہو گیا۔ صحیح احادیث مشتبہ ہو گئیں اور ضعیف و موضوع احادیث مقام پا گئیں۔ ان کے بعد ایسے محدثین نے بھی جنہوں کے اپنا ایک پاؤں تصوف کے دلدل میں پھنسا رکھا تھا حدیث کی صحت و ضعف کے لئے اپنے مکاشفات ہی کو معیار بنایا۔ چنانچہ برصغیر کے مشہور محدث شاہ ولی اللہ دہلوی (م ۱۱۷۶ھ ۱۷۵۲ء) نے اپنے مکاشفات کی بناء پر تقریباً چالیس احادیث کی روایت کی جن میں موضوع اور منگھڑت اور بعض عقل سلیم سے بھی معارض احادیث ہیں۔ یہ ابن عربی کا "فیض" ہے کہ صوفی حلقوں میں کشف الہام اور خواب کے گہرے اثرات ہیں۔

یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ غیر نبی کا کشف "الہام اور خواب بجائے خود کوئی چیز نہیں ہے۔ ان کا غالب حصہ شیطانی مداخلت اور نفسانی وسواس سے محفوظ نہیں ہے۔ اس کے برخلاف نبی کا کشف الہام اور خواب ان مداخلتوں سے محفوظ ہوتا ہے اور "وحی کی ایک نوعیت رکھتا ہے اس لئے وہ امت کے لئے حجت ہے۔ غیر نبی کا کشف " الہام اور خواب کسی کے لئے حجت نہیں ہے۔ وہ لوگ جو بظاہر اپنی نبوت کا دعوی نہیں کرتے اور اپنے کشف " الہام اور خواب کو اہمیت دیتے اور ان کی تشہیر کرتے ہیں وہ

دانستہ یا نادانستہ اپنی نبوت کے مدعی ہیں۔ جیسا کہ آگے آئے گا خود ابن عربی عقیدہ

علامہ اقبال فرماتے ہیں :

قادیانیت کی اصل حقیقت قرون وسطی کے تصوف اور دینیات کے نقاب میں پوشیدہ ہے۔ علمائے ہند نے اس کو محض ایک دینیاتی تحریک تصور کیا اور دینیاتی حربوں سے اس کا مقابلہ کرنے نکل آئے۔

اقتباس از مقالہ ختم نبوت از ڈاکٹر سر محمد اقبال مترجمہ جناب میر حسن الدین
بی۔اے۔ایل ایل بی (عثمانیہ)

ختم نبوت کے منکر اور گو مگو انداز میں اپنی نبوت کے مدعی ہیں۔ اسلام کی تاریخ میں جن اشخاص نے مہدویت " مسیحیت اور نبوت وغیرہ کے دعوے کئے ہیں ان سب کا دارومدار اپنے کشف و الہام پر رہا ہے۔

معرکۃ الآراء مسائل

یوں تو ابن عربی کے بہت سارے افکار و نظریات پر موافق و مخالف آراء موجود ہیں لیکن ان سب میں چند نظریات غیر معمولی طور پر نزاعی رہے ہیں اور ہر زمانے میں ان پر بحث و تمحیص ہوتی رہی ہے۔ صوفی مشرب علماء و مشائخ ان کی عظمت و جلالت پر بالکلیہ ایمان رکھتے ہیں۔ اور ان پر تنقید کرنے والے ہمیشہ نشانہ ملامت اور معتوب رہے ہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ ان کے پرجوش حامی اور موافق علماء و مشائخ بھی ان کے افکار و نظریات کو ٹھوس دلائل سے صحیح ثابت کرنے سے قاصر ہیں۔ لے دے کے وہ بھی ان مسائل کے لئے کشف کا ہی سہارا لیتے ہیں اور کہتے

ہیں کہ یہ مسائل عقلی ونقلی دلائل سے ثابت نہیں کئے جاسکتے اس کے لئے سلوک کی منزلیں طے کرنی پڑتی ہیں ۔ " بخدا تانہ چشی کے دانی " ان کا آخری جواب ہوتا ہے ۔ یہ حقیقت ہے کہ دین کی باتیں کشف اور سلوک کی منزلوں پر منحصر نہیں ہوتیں ۔ ایمان ویقین کا دارومدار بالکلیہ عقل ونقل پر ہوتا ہے ۔

فی الوقت ابن عربی کے چند خاص نظریات پر مختصر کلام کیا جاتا ہے جس سے ابن عربی کے مذہب اور مسلک پر روشنی پڑے گی ۔

وحدۃ الوجود

یہ مسئلہ کسی تفصیل وتشریح کا محتاج نہیں ہے ۔ شائد ہی کوئی اہل علم ہو جو اس مسئلہ سے ناواقف رہا ہو ۔ عامۃ المسلمین کی واقفیت کے لئے اتنی وضاحت کافی ہے کہ قدیم زمانہ میں لوگ " حلول " اور " اتحاد " کے قائل تھے ۔ یعنی یہ عقیدہ تھا کہ اللہ تعالی کسی بندے کی ذات میں اتر آتا ہے ۔ (حلول کرتا ہے) ۔ ارسطو سے پہلے کے فلاسفہ " حدوث عالم " (عالم فانی ہے) کے قائل تھے ۔ ارسطو نے اس سے اختلاف کیا عقل اول اور تعین اول کا نظریہ پیش کیا اور بتایا کہ یہیں سے کائنات عالم کا صدور ہوتا ہے اور چونکہ عقل اول اور تعین اول " مراتب الہیہ " میں داخل ہے اس لئے کائنات عالم بھی الوہی صفت " قدم " سے متصف ہے ۔ قدم کائنات کا عقیدہ اہل اسلام کے نزدیک بالاتفاق کفر ہے اس لئے کہ قرآن مجید میں یہ بات صراحت کے ساتھ بیان کی گئی ہے کہ کائنات عالم " اللہ تعالی کی مخلوق ہے " خالق اور مخلوق کی ذات وصفات ایک نہیں ہوسکتیں ۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے ابن عربی ایسے ماحول میں پروان چڑھے جہاں کے فلاسفہ وصوفیہ ارسطو کے نظریات کے قائل تھے ۔ اس لئے ابن عربی کے دماغ میں وحدۃ الوجود کا عقیدہ تاعمر مرتسم رہا بلکہ وہ اس عقیدے کے سرگرم مبلغ اور داعی بن گئے ۔ ابن عربی نے اس نظریہ اتحاد پر اسلامی رنگ چڑھانے کے لئے عقل

اول اور تعین اول کا نام " حقیقتہ محمدیہ " رکھا ۔ اور اس کے ثبوت کے لئے موضوع احادیث جیسے اوّل ما خلق اللہ نوری ، انا من نور اللہ وکل شیء من نوری ، اور " اول ما خلق اللہ نور نبیک " وغیرہ کی اپنے کشف کی بناء پر تصحیح وتصدیق کی ۔ ابن عربی نے عقل اول اور تعین اول کو " حقیقت محمدیہ " کا نام دے کر ارسطو کے فلسفہ کو اہل اسلام کے حلق میں اتارنے میں بڑی کامیابی حاصل کی ۔ اگر وہ اس فلسفہ پر اس نام کی " شوگر کوٹنگ " نہ کرتے تو یہ فلسفہ اہل اسلام میں ہرگز مقبول نہ ہوتا ۔ انھوں نے وحدۃ الوجود کو اپنی تصانیف میں کھلے بندوں پیش کیا ۔ متاخرین وجودی صوفیہ ان کی اس " جراءت رندانہ " کو خوب سراہتے ہیں ۔

وحدۃ الوجود کے قائلین نے کلمہ توحید " لا الٰہ الا اللہ " کے انداز پر ایک اور کلمہ وضع کیا ہے یعنی " لا موجود الا اللہ " جس کا مطلب یہ ہے کہ سارے ہی موجودات بجائے خود کچھ نہیں ہیں سب اللہ ہی اللہ ہیں ۔ جب کہ کلمہ توحید میں موجودات ہی کے " الٰہ " ہونے کی نفی کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ موجودات ذات باری تعالیٰ سے جداگانہ اور بالکلیہ اس کی مخلوق ہیں ۔ اس طرح قائلین وحدۃ الوجود کا وضعی کلمہ " لا موجود الا اللہ " کلمہ توحید " لا الٰہ الا اللہ " کا نقیض ٹھہرتا ہے ۔

ابن عربی کے نظریہ وحدۃ الوجود کی اہل حق علماء نے بھرپور تردید کی اور بتایا کہ اس سے " قدم کائنات " کا عقیدہ جاگزیں ہوتا ہے جو اسلام میں بالاتفاق " کفر " ہے ۔

اکتساب مقام نبوت

ابن عربی اس بات کے قائل ہیں کہ صرف " تشریعی " نبوت ختم ہوئی ہے ۔ " غیر تشریعی " نبوت باقی ہے ۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی ایسا نبی نہ ہوگا جو نئی شریعت لائے گا ۔ یا آپ کی شریعت میں ترمیم وتنسیخ کرے گا ۔ البتہ ایسے انبیاء آتے رہیں گے جو شریعت محمدی ہی کے تحت حکم رہیں گے ۔ ابن عربی کے

نزدیک نئی شریعت لانے والی نبوت کا دروازہ بند ہوا ہے۔ مقامِ نبوت کا دروازہ بند نہیں ہوا ہے۔ صوفی کو مجاہدات و ریاضات سے ملاءِ اعلیٰ سے اتصال پیدا ہوتا ہے۔ صفاءِ قلبی حاصل ہونے کے بعد قلب پر کلماتِ حق کا نزول ہوتا ہے یہی مقامِ نبوت

> علامہ اقبال فرماتے ہیں :
>
> ہندوستان کے شمال مغربی حصہ میں جہاں پیر پرستی زیادہ مسلط ہے قادیانیت کی تحریک شروع ہوئی۔ اس تحریک میں سامی اور آریائی تصوف کی عجیب و غریب آمیزش تھی۔
>
> اقتباس از مقالہ ختم نبوت از ڈاکٹر سر محمد اقبال مترجمہ جناب میر حسن الدین بی۔اے۔ایل ایل بی (عثمانیہ)

ہے۔ جب ان کے قلب پر راست کلماتِ حق کا نزول ہوتا ہے تو پھر ان کے لئے قرآن اور رسول کے واسطے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ صوفیہ جب "حدثنی قلبی عن ربی" کہتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ اب قرآن اور رسول سے بے نیاز ہیں ان کے نزدیک قرآن اور رسول کا وجود بھی "حجاب" ہے۔ جن صوفیوں نے اپنے مریدین سے اپنی نبوت کا اقرار کرایا ہے اور اپنا کلمہ پڑھوایا ہے وہ اپنی اسی "نبوت" کی بناء پر ہے۔ ابن عربی اس بارے میں ایک قدم اور آگے بڑھا کر کہتے ہیں کہ صوفی اور اللہ کے درمیان قلب بھی حجاب ہے۔ اس صوفی کا مقام افضل ہے جو کہے کہ مجھ سے میرے رب نے راست فرمایا۔ ابن عربی نہ صرف مقامِ نبوت کی بقاء کے قائل تھے بلکہ اس بات کے مدعی تھے کہ یہ مقام انھیں حاصل ہے۔ اپنی تصانیف کو "القاءِ ربانی" اور "ملاءِ الٰہی" قرار دیتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ انھیں اپنے ہم جنسوں (انبیائے

غیر تشریعی) میں وہی حیثیت حاصل ہے جو انبیائے تشریعی کے درمیان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تھی۔

مسئلہ ختم نبوت

اسلام کی ابتدائی تین صدیوں میں "ختم ولایت" اور "خاتم الاولیاء" کا کوئی تصور نہیں تھا۔ سب سے پہلے محمد بن علی حکیم ترمذی (م ۲۵۵ھ) نے ایک رسالہ "ختم الولایۃ" لکھا۔ جب یہ رسالہ لوگوں کے ہاتھوں میں پہنچا تو ان کی خوب لے دے ہوئی، علماء نے کفر کا فتویٰ دیا۔ انھیں شہر بدر کر دیا گیا۔ اس وقت تو یہ معاملہ کسی طرح دب گیا لیکن جب ابن عربی کا زمانہ آیا تو انھوں نے پھر اس مسئلہ کو زندہ کیا اب کی بار نہ صرف عوام بلکہ خواص نے بھی اس کو بسر و چشم قبول کیا۔

صوفیہ کے نزدیک نبوت کا تعلق مخلوق سے ہے اور ولایت کا تعلق خالق سے ہے۔ اس لحاظ سے ولایت نبوت سے افضل ہے۔ اسی طرح نبی کی بھی دو حیثیتیں ہیں ایک تعلق مع الخلق جس کو وہ نبوت کہتے ہیں۔ اور دوسرے تعلق مع الحق جس کو وہ نبی کی ولایت کہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس طرح "خاتم الانبیاء" ہیں اسی طرح "خاتم الاولیاء" بھی ہیں۔ شہود و معرفت کا القاء بالذات و بالاصالت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ہوتا ہے اور انبیاء و رسل اسی "مشکاۃ خاتم الانبیاء" سے اخذ و استفادہ کرتے ہیں لیکن اب یہ سلسلہ ختم ہو چکا ہے۔ آپ کے "مشکاۃ خاتم الاولیاء" سے اخذ و استفادہ جاری ہے۔ جمیع انبیاء غیر تشریعی۔ (اولیاء و صوفیہ) قیامت تک اخذ و استفادہ کرتے رہیں گے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی "مشکاۃ خاتم الاولیاء" ہی سب سے افضل و اتم ہے۔ آپ نے اسی مشکاۃ سے لے کر اپنی مشکاۃ خاتم الانبیاء ہی کے ذریعہ سابقہ انبیاء و رسل تشریعی کو مستفیض و مستفید فرمایا بلکہ خود آپ پر وحی بذریعہ فرشتہ آتی تھی اس کی حقیقت بھی یہی تھی کہ فرشتہ وحی کو

مشکاۃ خاتم الاولیاء سے لے کر آپ کی جانب نبوت و رسالت کو پہنچاتا تھا۔ ابن عربی نے خاتم الاولیاء کو خاتم الانبیاء سے افضل قرار دیا اور کہا کہ ہمارے ہی انبیاء و رسل بشمول حضرت خاتم الانبیاء "خاتم الاولیاء کی مشکاۃ سے اخذ و استفادہ کرتے ہیں۔ اس

علامہ اقبال فرماتے ہیں :

مرزا غلام احمد قادیانی کا دعوی ہے کہ میں پیغمبر اسلام کا بروز ہوں۔ یہ خیال غلام احمد سے پہلے محی الدین ابن عربی نے دیا تھا۔ ابن عربی کی سند پر مزید دعوی کیا جاتا ہے کہ ایک ولی کے لئے اپنے روحانی ارتقاء کے دوران اس قسم کا تجربہ حاصل کرنا ممکن ہے جو شعور نبوت سے مختص ہے۔ ابن عربی کے نقطہ نظر سے ایک ہی زمانہ اور ایک ہی ملک میں ایک سے زیادہ اولیاء موجود ہو سکتے ہیں اور شعور نبوت تک پہنچ سکتے ہیں۔

اقتباس از مقالہ ختم نبوت از ڈاکٹر سر محمد اقبال مترجمہ جناب میر حسن الدین
بی۔ اے۔ ایل ایل بی (عثمانیہ)

حیثیت خاتم الاولیائی کا کوئی "ولی" بحیثیت فنائیت" یا بحیثیت مظہریت یا بحیثیت ظل و بروز یا بحیثیت زیر قدم محمدی ہونے کے مظہر و وارث ہوتا ہے اور وہ بھی "خاتم الاولیاء" کہلاتا ہے۔ ابن عربی کے نزدیک ہر "ولی" جو حیثیت خاتم الاولیاء ی کا حقیقی مظہر و وارث اور مستقل بالذات "خاتم الاولیاء" ہے وہ "حضرت علی" ہیں اس لئے کہ تعین اول (حقیقت محمدیہ) کا فیض حیات جس شخصیت کو حاصل ہوا وہ صرف حضرت علی کی ذات تھی۔ آپ کے سوا سارے ہی انسانوں میں یہ استعداد مفقود تھی۔ اس طرح ابن عربی حضرت علی کو سارے انبیاء و رسل پر ترجیح دیتے ہیں اس سے ابن

عربی کے تشیع پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ ابن عربی کہتے ہیں کہ ہر زمانے میں ایک خاتم الاولیاء "ضرور ہوتا ہے جو منبع فیض ہوتا ہے۔ پھر انہوں نے اپنی ذات کے لئے بھی "خاتم الاولیائی" کا دعوی کیا بلکہ اپنی خاتم الاولیائی کی ایک مزید خصوصیت یہ بتائی کہ انہیں "ولایت عامہ مطلقہ عیسویہ" اور "ولایت خاصہ محمدیہ" دونوں حاصل ہیں۔ شیعہ حضرت علی کو "خاتم الاولیاء مانتے ہیں۔ نام نہاد اہل سنت والجماعت حضرت عبدالقادر جیلانی کو یہ مقام دیتے ہیں۔ کسی نے شوشہ چھوڑ دیا کہ "امام مہدی" خاتم الاولیاء ہیں تو اس کے بعد جن جن اشخاص نے "مہدویت" کا دعوی کیا انہوں نے "خاتم الاولیائی" کا بھی دعوی کیا اور ان کے ماننے والے اپنے نام نہاد مہدیوں کی ان دونوں حیثیتوں پر ایمان رکھتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ "خاتم الاولیاء" کا عقیدہ نہ قرآن سے ثابت ہے اور نہ کسی صحیح حدیث سے۔ یہ عقیدہ صرف اس لئے گھڑا گیا ہے کہ کسی طرح نبوت کی عظمت کو متاثر کیا جائے۔

مدارج ولایت

صوفیہ کے نزدیک ولایت کے مدارج ہیں۔ جیسے قطب، غوث، قطب الاقطاب، غوث الاعظم، ابدال، اوتاد، نجباء، نقباء، رجال الغیب وغیرہ ان مدارج کی بڑی تفصیلات ہیں۔ صوفیہ اس ضمن میں جس قدر احادیث پیش کرتے ہیں محدثین

علامہ اقبال فرماتے ہیں :

آج اسلام قرون وسطی کے اس تصوف کی تجدید کو روا نہ رکھے گا جس نے اپنے پیروؤں کے صحیح رجحانات کو کچل کر ایک مبہم تفکر کی طرف ان کا رخ پھیر دیا تھا۔ اس تصوف نے گزشتہ چند صدیوں میں مسلمانوں کے بہترین دماغوں کو اپنے اندر جذب کر کے امور سلطنت کو معمولی آدمیوں کے ہاتھوں میں چھوڑ دیا تھا۔ اسلام جدید تفکر اور تجربہ کی روشنی میں قدم رکھ چکا ہے۔ اور کوئی ولی یا (جعلی) پیغمبر اس کو قرون وسطی کے تصوف کی تاریکی کی طرف نہیں لے جا سکتا۔"

اقتباس از مقالہ ختم نبوت از ڈاکٹر سر محمد اقبال مترجمہ جناب میر حسن الدین
بی۔ اے۔ ایل ایل بی (عثمانیہ)

گرام نے ان سب کو موضوع منگھڑت قرار دیا ہے۔ ابن عربی نے بھی ان مدارج ولایت پر فتوحات مکیہ میں کافی روشنی ڈالی ہے۔ اسلام کی ابتدائی تین صدیوں میں ان مدارج ولایت کا کوئی تصور نہیں تھا۔ چوتھی پانچویں صدی میں اس تعلق سے ذہن بننے لگا۔ ابن عربی نے ان مدارج کی تفصیلات بیان کر کے اس میں جان ڈال دی۔ اس کے بعد سے سارے ہی صوفیوں نے موضوع احادیث اور منگھڑت واقعات کے ذریعہ قطب اور غوث وغیرہ کے عقیدے کو عوام میں رائج کر دیا۔ بالخصوص ہندوستانی مسلمانوں کے نزدیک غوث الاعظم "غوث الثقلین" غوث پاک کے القاب حضرت عبدالقادر جیلانی کے لئے ایسے قطعی اور یقینی ہیں کہ ان القاب سے آپ کے سوا اور کسی کی طرف ذہن جاتا ہی نہیں۔ مدراج ولایت کی تفصیلات پر غور کیا جائے تو یہی بات سامنے آتی ہے کہ کسی طرح عامتہ المسلمین کو شخصیتوں کی پرستش پر ڈال دیا جائے۔ چنانچہ صوفیہ کی یہ کوششیں بارآور ہوئیں۔ بے شمار مسلمان اپنی مزعومہ شخصیتوں ہی کو ماوی و ملجاء کرتا دھرتا" مانتے ہیں اور بالفاظ دیگر ان ہی کی پرستش میں لگے ہوئے ہیں۔

ابن عربی کے بارے میں اکابر کی آراء

اب تک جس قدر باتیں ابن عربی کے بارے میں لکھی گئی ہیں ان کے مطالعے سے ہر شخص اندازہ کرلے گا کہ ان کے بارے میں کیا رائے قائم کرنی چاہیئے۔ علامہ سعدالدین تفتازانی۔ ملا علی قاری، علامہ مقری شافعی نے انہیں کافر قرار دیا ہے۔ شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ تو ان کے حق میں شمشیر برہنہ تھے۔ انہوں نے ان کو کافر کے علاوہ اس امت کا شیطان" بھی کہا ہے۔ جواباً علامہ ابن حجر مکی (م ۹۷۰ء) نے ابن عربی کی مدافعت کرتے ہوئے شیخ الاسلام کے بارے میں سخت الفاظ استعمال کئے۔ لیکن ان ہی کے شاگرد ملا علی قاری (م ۱۰۱۴ء) نے اپنے استاذ سے اختلاف کر کے شیخ الاسلام کو "اکابر اہل سنت" اور "اولیاء امت" میں سے قرار دیا اور ابن عربی کی تکفیر کی۔ شیخ

علامہ اقبال فرماتے ہیں :

جمال الدین افغانی اور ان کے شاگردوں نے دنیائے اسلام پر تین مخصوص قوتوں کو حکمران پایا اور ان قوتوں کے خلاف بغاوت پیدا کرنے کے لئے اپنی پوری طاقت کو مرتکز کر دیا۔

۱۔ ملائیت ۲۔ تصوف ۳۔ ملوکیت

اقتباس از مقالہ ختم نبوت از ڈاکٹر سر محمد اقبال مترجمہ جناب میر حسن الدین بی۔ اے۔ ایل ایل بی (عثمانیہ)

الاسلام ابن تیمیہ نے ایسے زمانے میں ابن عربی کے خلاف سخت الفاظ استعمال کئے جبکہ عام طور پر ابن عربی کے معتقدین کا غلبہ تھا نتیجتہً ابن تیمیہ کو سخت مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ابن عربی کے معتقدین ابن تیمیہ کو ہر طرح سے پریشان کرنے لگے حتیٰ کہ اپنے اثر و رسوخ سے انہیں قید خانے میں بھی پہنچا دیا جہاں ان کی وفات ہوگئی لیکن علمی اعتبار سے وہ ابن تیمیہ کو ابن عربی کی عظمت کا قائل نہ کر سکے۔

تصوف اور صوفیہ کے لئے ابن عربی کی ذات ایک ایسے ستون کی حیثیت رکھتی ہے جس پر ساری عمارت کا دارمدار ہو۔ اس لئے صوفیہ ابن عربی کے موقف کو سنبھالنے اور عامتہ المسلمین میں ان کی عظمت و جلالت کو قائم رکھنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگاتے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ ابن عربی کے مخالفین ان کے کلام کو صحیح طور پر سمجھ نہیں پائے ہیں اس لئے مخالفت کر رہے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ ابن عربی کے علم و فضل اور ان کی عبقریت نے ان کو محسود بنا دیا ہے۔ بعض تو یہ کہنے پر بھی مجبور ہیں کہ ان کی کتابوں کے پڑھنے سے پرہیز کرنا چاہیئے لیکن ان سے عقیدت ضرورت

رکھنا چاہیئے ۔ مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی (م ۱۰۳۲ء) اپنے "کشف" کی بناء پر کہتے ہیں کہ "شیخ مقبولان بارگاہ کبریا میں سے نظر آتے ہیں ۔ اولیاء اللہ کی ایک جماعت کو اس "کا مشاہدہ" ہو چکا ہے ۔ مجدد صاحب نے یہ بھی فرمایا ہے کہ اُن کا (ابن عربی کا) رد کرنے والا بھی خطرے میں ہے اور ان کے اقوال کو قبول کرنے والا بھی خطرے میں ہے ۔ شیخ کو قبول کیا جائے (ان سے عقیدت رکھی جائے) اور ان کے اقوال کو قبول نہ کیا جائے ۔

حقیقت یہ ہے کہ جن صوفیوں نے ابن عربی کی عظمت و جلالت کو استوار رکھنے کی کوشش کی ہے اس کا سارا دارومدار ان کے اپنے "کشف" پر ہے جب کہ غیر نبی کا کشف کسی کے لئے حجت نہیں ہے اور جن علماء اسلام اور محدثین کرام نے ابن عربی کو کافر اور امت کا شیطان قرار دیا ان کا سارا دارومدار قرآن و حدیث پر ہے ۔ اب یہ اہل ایمان کے تقاضائے ایمانی اور اختیار تمیزی پر منحصر ہے کہ صوفیہ کے انفرادی کشف پر اعتماد کریں یا قرآن و حدیث کی روشنی میں صادر کردہ علمائے اسلام و محدثین کرام کے فیصلے کو ۔

نوٹ : اس مقالہ میں مباحث کی تفصیلات اور حوالہ جات بخوف طوالت نہیں دیئے گئے ہیں ۔ جن مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے ان کے حوالہ جات اہل علم سے مخفی نہیں ہیں ۔ انشاء اللہ آئندہ اس عنوان پر مستقل کتاب لکھنے کی صورت پیش آئے تب اس کمی کی بھرپور تلافی کردی جائے گی ۔

حافظ سید محمد علی حسینی
مولوی کامل جامعہ نظامیہ
حیدرآباد (اے ۔ پی) الہند

اخوان الصفا

خلافت عباسیہ کے دور میں دوسری زبانوں سے مختلف علوم ترجموں کے ذریعہ عربی زبان میں منتقل کئے گئے ۔ خلیفہ منصور (۷۵۳ء تا ۷۷۴ء) نے فلکیات اور طب کی جانب زیادہ توجہ کی ۔ خلیفہ ہارون الرشید (۷۸۶ء تا ۸۰۹ء) کے زمانہ میں ریاضیات کی کتابوں کے ترجموں پر زور دیا ۔

خلیفہ مامون الرشید (۸۱۳ء تا ۸۳۳ء) نے عجمی اثرات کے تحت مختلف علوم خصوصاً فلسفہ اور منطق کی کتابوں کے ترجموں کا اہتمام کیا ۔ جن کتابوں کے ترجمے کئے گئے ان کی تعداد سینکڑوں تک پہنچتی ہے جن میں سے بیشتر یونانی زبان کی تھیں ۔ سریانی ۔ فارسی اور سنسکرت کی کتابوں کے ترجمے بھی کئے گئے جن لوگوں نے علوم او فلسفہ کی کتابوں کے ترجموں میں زیادہ انہماک کا ثبوت دیا ان میں اکثر غیر مسلم علما تھے ۔ ان تما علما کو مسلمانوں نے وسیع النظری سے علمائے اسلام کا لقب دیا ۔ ان غیر مسلم علمانے علوم کے ساتھ اپنے ترجموں میں ذاتی خیالات اور اپنے عقائد باطلہ کو بھی شامل کر دیا ۔

ان ترجموں کا مثبت اثر تو یہ ہوا کہ ان کے نمایاں علمی اثرات کے تحت عصر حاضر کے علوم نے موجودہ ترقی یافتہ شکل اختیار کی ۔ منفی اثر یہ ہوا کہ اسرائیلی، مسیحی اور مجوسی علمانے ان ترجموں کو بنیاد بنا کر آزادی فکر کے نام سے ملحدانہ خیالات کو فروغ دیا ۔ بدعتوں میں اضافہ ہوا اور عقائد میں فساد پیدا ہوا ۔

خود یونانی علوم میں حق کے ساتھ باطل کا امتزاج تھا ۔ ترجمہ کرنے والوں نے اپنی طرف سے بھی باطل کو شامل کر دیا ۔ نتیجہ میں ایسے علوم پیدا ہوئے جن میں حق کے ساتھ باطل ملوث تھا ۔ اس کے نتیجہ میں ان علوم نے مسلمانوں کے عقائد کو بھی بڑی حد تک متاثر کیا ۔

اخوان الصفا عہد عباسی میں آزاد فلسفیانہ خیالات رکھنے والوں کی ایک خفیہ تنظیم تھی، جن میں علما اور دانشور شریک تھے ۔ اس تنظیم نے اپنا نام اخوان الصفا

رکھا۔انجمن کی غرض و غایت کے سلسلہ میں ان لوگوں کا کہنا تھا کہ

"دین اسلام میں جو اوہام رواج پاگئے ہیں ان سے آزادی حاصل کرنے کی کوئی اور راہ فلسفہ کے سوا نہیں"۔اس غلط خیال کو پیدا کرنے کی کوشش کی گئی کہ شریعت کو فلسفۂ یونانی سے مطابق کر دینا چاہیئے۔

چوتھی صدی ہجری اختلافات عقائد کا ایک عجیب دور تھا۔فلسفہ یونان کی آمیزش اور علمائے کرام کی فلسفہ سے بڑھتی ہوئی رغبت نے نت نئی باتیں اور موشگافیاں پیدا کردی تھیں۔علماء نے فلسفہ اور لمانیات میں تطابق پیدا کرنے کی کوشش شروع کردی تھیں۔علمائے اسلام کی یہ اجتہادی غلطی تھی کہ انھوں نے فلسفۂ یونان اور دین کے احکام میں تطابق پیدا کرنے کی کوشش کی۔حالانکہ ان کو چاہیئے تھا کہ الفرقان کی روشنی میں فلسفۂ یونان کے باطل اجزا کی نشان دہی کرتے۔

اس پس منظر میں انجمن اخوان الصفا کا وجود عمل میں آیا۔بغداد اخوان الصفا کا مرکز تھا تمام اراکین مخفی طریقہ پر جمع ہوتے تھے اور فلسفہ پر مباحث اور آزادی۔ خیال پر بات چیت کرتے تھے۔

قاعدہ یہ تھا کہ معین وقت میں ان کی نشست ہوتی تھی اور اس بات کا اہتمام کیا جاتا تھا کہ کوئی اجنبی آدمی شامل نہ ہو پائے۔انھوں نے خطوط کی شکل میں اپنے فلسفہ کو مدون کیا جو رسائل اخوان الصفا کے نام سے مشہور ہیں۔

ان رسائل کی ابتدائی اشاعت کی تشریح کی گئی چونکہ فلسفہ دوسری زبانوں سے منتقل ہوا ہے، اس لئے اس فلسفہ کے مقاصد اصلی کو عام فہم انداز میں اور کھول کو بیان کیا جائے۔

ان رسائل کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اخوان الصفا کے ارکان علوم و فنون کے مختلف انواع پر عبور اور دست رس رکھتے تھے۔اسی طرح مسائل عقلی اور دینی سے بھی واقف تھے بحث و مباحث میں تحقیق وتدوین کا دخل تھا۔دوران بحث جو باتیں ان کو درست معلوم ہوتیں انھیں مقالات کی شکل میں منظر عام پر لایا جاتا۔علمی نقطہ نظر سے تو یہ طریقہ درست اور واجبی معلوم ہوتا ہے لیکن مولفین رسائل دینی بصیرت کے حامل نہ تھے۔انھیں اسلام کی مرکزیت سے عقیدت تھی نہ لگاؤ۔یہی

وجہ ہے کہ یہ رسائل اسلام کی سیدھی سادی تعلیمات میں شکوک و شبہات پیدا کرتے اور فلسفیانہ موشگافیوں کا دروازہ کھولتے رہے۔

اس طرح باون مقالے مختلف فنون، طبیعات، ریاضی وغیرہ پر لکھے گئے۔ آخری مقالہ ایجاز و اختصار کے ساتھ اقسام مسائل پر مشتمل ہے۔لکھنے والوں نے اپنے نام مخفی رکھے اور کہیں اپنا ذکر نہیں کیا۔اس کی وجہ یہ تھی کہ مولفان رسائل کو عوامی احساسات اور علمائے اسلام کی مخالفت کا خوف دامن گیر تھا۔

بعض علمانے مولفین رسائل کے نام لئے ہیں۔مثلاً ابو حیان توحیدی (وفات ۳۸۹ھ) کے بموجب مولفین رسائل یہ ہیں۔

۱۔ابو سلمان محمد بن معشر بستی معروف بہ مقدسی
۲۔ابو الحسن علی بن ہارون زنجانی
۳۔ابو احمد مہرجانی
۴۔عوفی
۵۔زید بن رفاعہ

اسی طرح شہرزوری نے تاریخ الحکماء میں لکھا ہے کہ رسائل اخوان الصفا کے مولفین یہ ہیں۔

۱۔ابو سلمان محمد بن مسعود معروف بہ مقدسی
۲۔ابولحسن علی بن دھرون صابی
۳۔ابو احمد نہرجوری
۴۔عرفی بصری
۵۔زید بن رفاعہ

آداب اللغات العربیہ جلد دوم جرجی زیدان نے بھی ان ہی ناموں کو لکھا ہے۔ ایک مستشرق نے کتاب "الاخلاق عند الغزالی میں ابو حیان توحیدی ہی کو ان رسائل کا مولف بتلایا ہے۔مختصر یہ کہ یہ بات غیر یقینی اور اختلافی ہے۔

پروفیسر زاہد علی (کا خیال ہے کہ یہ رسالے بنی بویہ کی شیعی حکومت کے زمانہ میں اسماعیلیوں کے اس فرقہ نے لکھے جو قرامطہ کے نام سے مشہور تھا۔آخری رسالہ جو

پہلے کے ۵۶ رسالوں کا خلاصہ ہے جامعہ کہلاتا ہے۔

مولفان رسائل کے ہم مذاق لوگ جیسے معتزلہ وغیرہ ان رسائل کی نقلیں کرلیتے تھے اور ان کو مخفی طریقہ پر مختلف اسلامی صوبوں میں لے جاتے تھے۔ چنانچہ ان رسائل کا چرچا اسلامی جامعات، دینی درسگاہوں اور مفکرین میں ہونے لگا۔ خصوصاً معتزلہ نے جو عقلی و فکری حیثیت سے فراغ دل تھے۔ ان رسائل کی نشر و اشاعت میں بڑی سرگرمی دکھلائی۔

اندلس میں ابو الحکم عمر بن عبد الرحمن کرمانی پہلا شخص ہے جس نے وہاں کے علماء اور دانشوروں کو ان رسائل سے روشناس کروایا۔

حالیہ زمانہ میں رسائل اخوان الصفا کی اشاعت عمل میں آچکی ہے۔ پہلی دفعہ یہ رسائل ۱۸۸۳ء میں لبزج سے شائع ہوئے پھر ۱۸۸۸ء میں بمبئی سے اور ۱۹۲۸ء میں مصر سے شائع ہوئے۔ چند رسالے ۱۸۱۲ء میں کلکتہ سے بھی شائع ہوئے۔

عجمی اسلام

جس طرح آج عیسائیت وہ دین نہیں ہے جس کی تبلیغ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمائی تھی اسی طرح آج کا مروجہ اسلام بھی رسول اکرمؐ کا لایا ہوا دین نہیں ہے بلکہ اس سے مختلف اور ایک متوازی دین ہے۔ اسلام کو نقصان پہنچانے کے لئے مجوسیوں نے ایک خود ساختہ دین بنایا اور اس کو بھی اسلام کا نام دیا۔ یہ مجوسیوں کا بنایا ہوا عجمی اسلام ہے۔

اس عجمی اسلام میں اللہ اکبر کی جگہ یا علی یا حسین۔ یا مولیٰ قسم کے نعرے بلند کئے جاتے ہیں۔ عجمیوں نے عربی زبان پر عبور حاصل کیا۔ قرآن مجید کی تفسیریں لکھیں۔ شان نزول نظریہ امامت، تدوین قرآن، واقعہ قرطاس، مطالبہ فدک، واقعہ افک اور ایسے ہی بیسیوں مباحث کے متعلق روایات وضع کیں۔ قرآن مجید کی آیات کی اپنے نقطہ نظر سے تاویلیں کیں۔ عربی زبان کی لغات اور قواعد میں ایسی باتوں کو داخل کیا جس سے ان کے خود ساختہ عقائد کی تائید ہو۔

عجمی اسلام نظریہ امامت کی بنیاد پر تیار کیا گیا۔ رسول اکرمؐ سے ایک روایت وضع کی گئی ہے کہ علی امام الاولیاء ہیں حالانکہ یہ روایت باطل ہے اور اس کی سند کے تمام راوی مجہول ہیں۔ ولیوں کا چکر تین سو سال بعد وجود میں آیا۔ "علی اللہ کے ولی ہیں" یہ فقرہ عجمی اسلام کے کلمہ کا جزو بن گیا۔ اس فقرہ کی اہمیت کے لئے ایک اور حدیث وضع کی گئی "اَلولایتَ افضلُ من النّبوۃ" یعنی ولی کا مرتبہ نبی سے افضل ہے۔ علی کو مولا کہنا عراقی مجوسیوں کی ایک دلچسپ شرارت تھی کیوں کہ عربی میں مولا آزاد کردہ غلام کو کہتے تھے۔

عجمی اسلام میں توحید کو دخل نہ تھا۔ یہ صرف شخصیت پرستی سکھاتا تھا۔ شروع

شروع میں عجمی اسلام کی تعلیمات دین سے واقف مسلمانوں کے ڈر سے خفیہ طور پر سکھائی جاتی تھیں ۔ لیکن جب عجمیوں کو فاطمین، قرامطہ، برامکہ، بنی بویہ، صوفیوں وغیرہ کی سرپرستی میں قوت حاصل ہو گئی تو باضابطہ مشنری (مبلغ) ساری دنیا میں بھیجے جانے لگے ۔ جنھوں نے اماموں پیروں اور بزرگوں کی پرستش کو مسلمانوں میں عام کر دیا ۔ ان مبلغین کی کوششوں سے مسلم معاشرہ میں عقائد کا بگاڑ پیدا ہوا جو آج بھی موجود ہے ۔

عجمی اسلام کے تحت ملّا اور مولوی عام مسلمانوں کو گمراہ کرتے ہیں اور توحید پرستی سے دور رکھنا چاہتے ہیں ۔ اگر کوئی مسلمان رسول اکرم کا دین پیش کرے یا عجمی اسلام کی سازش کو فاش کرنا چاہے تو سب مذہبی ٹھیکہ دار مل کر اس کی مخالفت کرتے ہیں ۔

جس طرح مجوسیت کے اثر کے تحت عجمی اسلام وجود میں آیا اسی طرح ہندوستان میں برہمنیت کے اثر کے تحت اسلام کا نشو نما ہوا جس میں مذہبی پیشوائیت کو فروغ ہوا حالانکہ اسلام میں پیشوائیت کا کوئی مقام نہیں ۔ قبرپرستی کے نام پر بدترین قسم کی بت پرستی نے جنم لیا ۔ قبروں پر گنبدیں تعمیر کر کے اور ان کو درگاہوں کا نام دے کر چڑھاوے ۔ نذر و نیاز وغیرہ کو ویسے ہی رواج دیا گیا جیسا کہ ہندوستان میں منادر میں ہوتا ہے ۔

اسلام علاقہ واریت سے بلند ہے ۔ دین عربی اور عجمی ۔ یورپی اور ہندی کی تفریق کو برداشت نہیں کرتا ۔ دین میں رنگ اور نسل ۔ معاشرت اور زبان کا کوئی مقام نہیں ۔ محض دینی اقتدار سے بیگانہ ہونے کی وجہ سے امتداد زمانہ سے مسلمانوں نے علاقہ واری اثرات قبول کئے اور مختلف ادیان کے عقائد باطلہ نے ان پر یورش کی ۔ ہر ہر ملک میں اسلام کی شکل بدلی ہوئی معلوم ہونے لگی ۔ یہ بات اسلام کے لئے نہایت افسوس ناک ہے ۔

زبانوں کے اختلاف، لباس کے اختلاف، معاشرت کے اختلاف کی کوئی اہمیت نہیں ان کو مناسب حدود میں اختیار کیا جاسکتا ہے ۔ اپنی زبانوں میں قرآن مجید کے ترجمے کر لیں ۔ سیرت پر کتابیں لکھیں ۔ غرض اپنی اپنی زبانوں میں دینی لٹریچر تیار کر لیں ۔ لباس ملکی رواج اور موسمی ضروریات کے تحت خواہ کیسا ہی کیوں نہ ہو ۔ شرعی ضرورتوں کو ملحوظ رکھیں ۔ غذا ملکی پیداوار اور ملکی روایات کے تحت مختلف سہی حرام و حلال کی تمیز کافی ہے ۔ رہنے سہنے کے طریقوں اور موسمی اور غیرمذہبی تقاریب سے اسلام کو سروکار نہیں ۔ بشرطیکہ وہ ارکان اسلام کی ادائیگی میں مانع نہ ہو اور اسلامی عقائد سے متصادم نہ ہوں ۔ عجمی اسلام میں اصحاب رسول کی عظمت کو کم کرنے اور ان کے عظیم الشان کارناموں کو نظرانداز کرتے ہوئے ان کے تعلق سے طرح طرح کی بے بنیاد باتیں پھیلانے کی کوشش کی جاتی ہے ۔ بہ ظاہر حضرت علیؓ کو اصحاب ثلاثہ پر فوقیت دی جاتی ہے مگر چونکہ خود حضرت علیؓ اکابرین اسلام سے تھے اس لئے عجمی اسلام نے ان کی مبالغہ آمیز مدحت کا پہلو یہ اختیار کیا جس سے ان کی عظمت متاثر ہوتی ہے ۔ بقول ڈاکٹر اقبال ؒ

وہ مسیحوں کا خدا اور وہ علی شیعوں کا
ہائے کس طور سے اچھوں کو برا کہتے ہیں

مقام نبوت کی عجمی تعبیر

توحید کے بعد مسلمانوں کے لئے جو عقیدہ بنیادی اہمیت رکھتا ہے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اقرار ہے ۔ اسلام کی تمام اصطلاحات نہایت واضح، صاف اور غیر مبہم ہیں ان میں نہ الفاظ کا گورکھ دھندہ ہے نہ فلسفیانہ موشگافیاں ۔ قرآن مجید میں الرسالۃ کے معنی پیام کے ہیں ۔ اصطلاح میں وہ انسان جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں تک وحی کے ذریعہ پیام لاتا ہے اس کو رسول کہتے ہیں اور اس کے منصب کو رسالت کہتے ہیں اسی طرح نبی وہ ہے جو ایک گری ہوئی محکوم قوم کو مژدہ نجات وفلاح اللہ کی شرائط کے ساتھ لاکر سنائے ۔ نبی کے لغوی معنی خبر دینے والے کے ہیں ۔ قرآنی اصطلاح میں اللہ کا تعارف کرانے والا، آخرت کی باتیں بتانے والا اور قانون جزاو سزا سے واقف کرانے والا نبی ہے ۔ اسلامی عقیدہ کی رو سے اللہ تعالیٰ اپنی حکمت کے تحت انسان کو اطلاع دینے بذات خود نہیں آتا بلکہ اپنے خاص بندوں کو اپنے احکام اور قوانین سے انسانوں کو واقف کرانے کے لئے منتخب کرتا ہے ۔ سارے انبیاء برحق ہیں اور معیار حق محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں ۔

یہ ایک ستم ظریفی ہے کہ اسلام کی نہایت سادہ تعلیمات کے باوجود باطل عقائد اور یونانی، عجمی اور ہندی فلسفہ کے تحت ملت اسلامیہ کی اکثریت نبوت کے عقیدہ میں ایک سخت غلط فہمی کا شکار ہے ۔ اس غلط فہمی کے جو بنیادی اسباب ہیں ان کی نشاندہی علامہ ابوالخیر اسدی نے اپنی کتاب "مقام نبوت کی عجمی تعبیر" (دار التذکیر، رحمن مارکٹ، غزنی اسٹریٹ اردو بازار لاہور) میں کی ہے ۔ ذیل میں اس کتاب کے اہم اجزاء کو نہایت اختصار کے ساتھ پیش کیا گیا ہے ۔

واقعہ یہ ہے کہ نبوت سے بڑھ کر کوئی دوسرا ایسا شرف نہیں ہے جسے ہم

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت کا معیار بنا سکیں ۔ آپ کی افضلیت کا یہی وہ معیار ہے جو اسلاف کے بنیادی عقائد میں داخل تھا ۔ بعد میں نظریہ وحدۃ الوجود کے تحت اس افضلیت کو عامیانہ عقائد پر محمول کرتے ہوئے قبول نہ کیا گیا کیونکہ اس افضلیت کے عقیدہ سے ان حضرات کے عزائم کی تکمیل نہ ہو سکتی تھی جو مقام نبوت کی تعبیر بدلنا چاہتے تھے ۔ اس لئے نظریہ وحدۃ الوجود کے ماننے والوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت کا وہ معیار جو شرف نبوت پر موقوف تھا اسے نظریہ اصالت یعنی "حقیقت محمدیہ" میں تبدیل کر دیا ۔ اس کے نتیجہ میں نہ صرف نبوت کی عظمت متاثر و مجروح ہوئی بلکہ توحید کی بنیاد بھی متزلزل ہو گئی ۔

نظریہ اصالت

وحدۃ الوجود کے قائل حضرات نے نظریہ اصالت پیش کیا ۔ نظریہ اصالت کا مفہوم یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ساری کائنات کی اصل ہے کائنات کے اندر جو کچھ بھی موجود ہے وہ آپ ہی کی فرع ہے اصالت کے نظریہ لولاک نے اسلام کی صاف اور سادہ تعلیمات کو بے حد ضرر پہنچایا ۔ نظریہ لولاک کے تحت جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تخلیق کائنات کی علت غائتہ بتایا گیا ہے اسی طرح کائنات کی علت مادیہ بھی بتاتے ہیں ۔ اور اس علت مادیہ کی وجہ سے آپ کو مصدر کائنات کہتے ہیں ۔ حالانکہ یہ عقیدہ شرک کا باب الاکبر ہے ۔ اس نظریہ کی تائید میں جو احادیث پیش کی جاتی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے ۔ لَوْلَاکَ لَمَا خَلَقْتُ الْاَفْلَاکَ ۔

علمائے حدیث نے ان روایات کو موضوع قرار دیا ہے ۔ مولانا حبیب الرحمان کاندھلوی اپنی کتاب "مذہبی داستانیں اور ان کی حقیقت (حصہ دوم) میں مذکورہ بالا روایت کو موضوع قرار دیتے ہوئے نہایت جامع اور مدلل بحث کی ہے وہ

لکھتے ہیں۔

"ہمارے نزدیک اس روایت میں دو ایسے عیوب پائے جاتے ہیں کہ ان کی موجودگی میں یہ اللہ تعالیٰ کے الفاظ تو کیا ہوتے یہ الفاظ تو ایک جاہل عرب بھی استعمال نہیں کر سکتا نیز افلاک آسمانوں کے معنی میں استعمال نہیں ہوتا بلکہ افلاک سے مراد موہوم دائرے (مدار) ہوتے ہیں جن کے گرد سیارے چکر کاٹتے ہیں۔ حاصل کلام یہ کہ اس روایت کا آگلا پیچھا بھی درست نہیں۔ اسے حدیث کہنا بھی گناہ عظیم ہے بلکہ ان باتوں کے جاننے کے بعد اگر کوئی اسے حدیث کہے تو مجھے اس کے کفر تک کا خطرہ ہے۔ (صفحہ ۴۱۹)

جن اصولوں پر صوفی مسلک کی بنیاد استوار کی گئی ہے ان میں نظریہ اصالت بھی ہے۔ اصالت کا نظریہ حقیقتہ محمدیہ کے نظریہ سے ماخوذ ہے۔

نظریہ حقیقتہ محمدیہ

شیخ تلاجی نے شیخ محی الدین ابن عربی اندلسی (وفات ۶۳۸ ہجری م ۱۲۴۰ء) کی کتاب فصوص الحکم کی شرح لکھی ہے اس کے مقدمہ میں حقیقتہ محمدیہ کے بارے میں اعتراف کیا ہے۔

"حقیقتہ محمدیہ خالق اور مخلوق کے درمیان واسطہ ہے اور ذات الہیہ اور مظاہر کونیہ کے مابین حلقہ اتصال ہے۔ پس حقیقتہ محمدیہ فلسفہ نو افلاطونیہ NEO PLATONISM میں عقل اول کے مصداق ہے۔ اور مسیحی فلسفہ میں حضرت مسیح کے کلمتہ اللہ کے مصداق ہے اور فلسفہ غزالی میں المطاع کے مصداق ہے۔"

یہ نظریہ ابن عربی کے نظریہ وحدۃ الوجود میں نفس اول کے نام سے مشہور ہے

قدیم ماخذوں اور ماقبل اسلام نظریات کے ساتھ نظریہ حقیقتہ محمدیہ کا ربط

اقوام عالم میں جتنے مذاہب پائے جاتے ہیں ان میں یہ بحث صدیوں سے چلی آرہی ہے کہ کائنات اور خدا کے درمیان ربط کی کیا کیفیت ہے اور تخلیق کائنات کے بعد وہ کون سے واسطے ہیں جن کے ذریعہ اس کائنات کا انتظام چلایا جاتا ہے۔ ابن عربی نے اپنے نظریہ وحدۃ الوجود میں ان خیالات سے استفادہ کیا ہے جو اقوام عالم کے بعض مذاہب اور فلسفوں میں پائے جاتے تھے۔ وحدۃ الوجود کے نظریہ میں حقیقتہ محمدیہ نفس اول کہلاتا ہے اس سے لازم آتا ہے کہ وحدۃ الوجود کی جو تعبیر سابقہ نظریات سے اخذ کی گئی ہے حقیقتہ محمدیہ کی وہی تعبیر ہو گی۔ چنانچہ اکثر اہل علم نے تحقیق کر کے واضح کر دیا ہے کہ حقیقتہ محمدیہ کی وہی تعبیر ہے جو فلاں فلاں سابقہ مذاہب کے نظریات میں پائی جاتی ہے۔ بعض کے نزدیک حقیقتہ محمدیہ کا نظریہ زرتشتی مذہب سے ماخوذ ہے۔ پھر یہی نظریہ فلاسفہ یونان سے ہوتا ہوا فیلو اور مسیحی علماء میں داخل ہو گیا یہ ضروری ہے کہ حقیقتہ محمدیہ جن عجمی نظریات سے ماخوذ ہے ان کے مسموم اثرات کو اچھی طرح نمایاں کیا جائے تاکہ اسلام کے بنیادی نظریات کا تحفظ کیا جا سکے۔

ابن عربی کا فلسفہ وحدۃ الوجود

نظریہ وحدۃ الوجود یہ ہے کہ وجود صرف ایک ہے۔ اس لحاظ سے خدا ہی کائنات ہے اور کائنات ہی خدا ہے۔ نظریہ وحدۃ الوجود کے بموجب وجود صرف ایک ہے جو تعینات کی کثرت میں اپنے آپ کو ظاہر کر رہا ہے۔

نظریہ وحدۃ الوجود میں حسب ذیل جملہ کو حدیث کہہ کر پیش کیا جاتا ہے اور اس کو بنیادی اہمیت دی جاتی ہے۔

كنت كنزاً مخفياً فاحببت ان اعرف فخلقت الخلق۔

ترجمہ : میں ایک مخفی خزانہ تھا میں نے چاہا کہ میں پہچانا جاؤں تو میں نے مخلوق کو پیدا کیا۔

کسی معتبر کتب حدیث میں یہ جملہ موجود نہیں ہے پروفیسر یوسف سلیم چشتی اپنی کتاب "اسلامی تصوف میں غیر اسلامی نظریات کی آمیزش" میں لکھتے ہیں "یہ حدیث نہیں ہے۔ اکثر صوفیا اسے حدیث سمجھتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ صوفی، شاعر اور عاشق بالعموم محدث نہیں ہوتے"۔ (صفحہ ۱۱۹)

نظریہ وحدۃ الوجود کے زبردست مبلغ ابن عربی ہیں۔ ابن عربی سے پہلے ایسا عقیدہ چند افراد کو چھوڑ کر اسلاف میں موجود نہ تھا اور نہ یہ نظریہ قرآن و حدیث سے ماخوذ ہے۔ بقول علامہ اقبال "فصوص الحکم میں سوائے الحاد و زنادقہ کے اور کچھ نہیں" (مکاتیب اقبال حصہ اول صفحہ ۴۴)

مولانا عبدالباری ندوی نے وحدۃ الوجود کے بارے میں مولانا اشرف علی تھانوی کا تحقیقی فیصلہ نقل کیا ہے :

"مسئلہ خواہ وحدۃ الوجود کی صورت میں ہو یا وحدۃ الشہود کی صورت میں براہ راست اسلامی تصوف کا کوئی خاص اور ضروری جزو بالکل نہیں بلکہ کلامی اور علمی یا عقلی اور فلسفیانہ مسئلہ ہے۔ یا بعض صوفیا کے لئے کشفی جو بجائے خود اسلام میں کوئی حجت نہیں۔

بقول مولانا اشرف علی تھانوی وحدۃ الوجود ایک علمی اور کلامی مسئلہ ہے اور اسلامی تصوف کا یہ کوئی خاص جزو نہیں اور نہ اس اعتبار سے اس بحث کی کوئی اہمیت رہ جاتی ہے کہ اسلامی تصوف میں یہ باہر سے داخل ہوا یا نہیں بلکہ اس کی عامیانہ تعبیرات یقیناً بیرونی اثرات کا نتیجہ معلوم ہوتی ہیں" (تجدید تصوف و سلوک صفحات ۱۰۹ و ۱۱۱)

ساتویں صدی کے بعد علماء اور مشائخ کی اکثریت اس عقیدہ میں گرفتار نظر آتی ہے۔ یعنی ساتویں صدی کے بعد اسلام کے دو حصے ہو گئے۔ ایک اسلام دور نبوت سے شروع ہو کر ابن عربی کے دور تک ختم ہو جاتا ہے اور اسلام کا دوسرا دور ابن عربی سے شروع ہو کر ابھی تک عروج کے ساتھ رواں دواں ہے۔

فلسفہ وحدۃ الوجود میں حقیقتہ محمدیہ کا مفہوم

نظریہ وحدۃ الوجود میں حقیقتہ محمدیہ کا مفہوم یہ ہے کہ ذات مطلق نے جب چاہا کہ میں اپنے آپ کو ظاہر کروں تو سب سے پہلے اس نے اپنے حسن الوہیت کا جمال محمدی میں مشاہدہ کیا۔ اس اجمالی مشاہدہ کو حقیقتہ محمدیہ کہتے ہیں جس کا دوسرا نام تعین اول ہے۔ نظریہ وحدۃ الوجود کے قائل تمام مشائخ اور علماء اس بات پر اتفاق کرتے ہیں کہ حقیقتہ محمدیہ مراتب الہیہ میں داخل ہے۔

ذات نبویہ کی حقیقت اور بشریت اور حقیقتہ محمدیہ کا فرق

مفتی نعیمی لکھتے ہیں۔ "ذات نبویہ کی ایک ایسی جہت ہے جسے آپ کا عنصری وجود کہتے ہیں۔ یہ وجود بشری عوارض کی وجہ سے سارے اوصاف بشریت کے ساتھ موصوف ہے۔ آپ کے ماں باپ ہیں، بیویاں ہیں، بال بچے ہیں۔ آپ اسی وجود کے ساتھ سارے انبیاء کے بعد مبعوث ہوئے۔ آپ کے اس بشری وجود کے بارے میں قرآن میں کہا گیا قُلْ اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ (آپ فرما دیں کہ میں تم جیسا بشر ہوں) مفتی صاحب مزید لکھتے ہیں آپ کے بشری وجود کی جو تعریف کی ہے اس میں کسی کو بھی اختلاف نہیں۔ اختلاف کی مرکزی بنیاد آپ کی دوسری جہت ہے جسے حقیقتہ محمدیہ کہتے ہیں۔ اور جو مشائخ صوفیہ کی اصطلاح میں ذات مطلق کے پہلے تعین کا نام ہے"۔

مفتی نعیمی صاحب کے بیان سے معلوم ہوا کہ حقیقت محمدیہ کی اصطلاح نہ

قرآن و حدیث میں ہے اور نہ اسلاف کی تحریروں میں اس کا نشان پایا جاتا ہے۔ بلکہ یہ وجودیہ مشائخ کی وضع کردہ ایک کشفی اور فلسفی اصطلاح ہے۔ اس سے امت کے سارے صوفیہ مراد نہیں ہیں بلکہ صرف وہ صوفیا مراد ہیں جو ابن عربی کے نظریہ وحدۃ الوجود کے نہ صرف حامی تھے بلکہ داعی بھی تھے۔

عقیدہ حقیقتہ محمدیہ کی تشریح

مولانا محمد طاہر قاسمی (مولانا نانوتوی کے نبیرہ) لکھتے ہیں۔ "سب سے اول حق تعالیٰ نے نور عقل کو پیدا کیا۔ جس کا دوسرا نام حقیقتہ محمدیہ ہے اس کو تمام عالم کے لئے مدبر اور وجہ شرافت بنایا۔ اسی لئے تمام فرشتوں کو اس کے آگے جھک جانے کا حکم ہوا۔ خدا کے بعد عقل اول یعنی حقیقتہ محمدیہ کا درجہ ہے۔ اس لئے جس مخلوق میں یہ نور عقل (حقیقتہ محمدیہ) نہیں جھلکتا وہ مخلوق عالم کی صف اول میں جگہ نہیں پا سکتی معلوم ہوا کہ نور محمدی بلحاظ خلقت سب مخلوق سے اول ہے اور بلحاظ ظہور سب سے آخر ہے اس لئے نور محمدی کا اول و آخر نور خدا تو ہو سکتا ہے اور کسی کے نور نبوت کا یہ منصب نہیں ہو سکتا اور نہ آپ کے بعد کسی نبوت کا وجود تسلیم کیا جا سکتا ہے"۔ (عقائد الاسلام قاسمی)

مولانا سید احمد سعید کاظمی جو بریلوی فلسفہ کے امام المتکلمین ہیں نظریہ حقیقتہ محمدیہ کو یوں بیان کرتے ہیں۔

"اس حیثیت سے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اصل کائنات ہیں۔ آپؐ کی حیات مقدسہ آسمان وجود ممکنات کا چمکتا ہوا آفتاب ہے۔ مخلوقات کے تمام انواع و اقسام و افراد بمنزلہ آئینوں کے ہیں۔ ہر آئینہ اپنے مقام پر مخصوص کیفیت اور جداگانہ قسم کی استعداد کا حامل ہے۔ اس لئے ہر فرد اپنے حسب حال اس آفتاب حیات سے اکتساب حیات کر رہا ہے۔ خلق و امر، اجسام و ارواح، اعیان و معانی، ارض و سما

تحت و فوق، سب کا نور حیات اسی آفتاب حیات محمدی کی شعاعیں ہیں۔ البتہ عالم ممکنات کا اس معدن حیات سے قرب و بعد اور افراد کائنات میں استعداد کی قوت و ضعف مراتب حیات میں ضرور موجب تفاوت ہے نفس حیات سب میں پائی جاتی ہے۔ لیکن ہر ایک کی حیات اس کے حسب حال ہے۔ مومن ہو یا کافر، نیک ہو یا بد، ہر ایک کا مبدا فیض آپؐ کی ذات ہے۔ اور حضورؐ کے آفتاب حیات سے ہر ایک مومن میں حیات کی روشنی پائی جاتی ہے۔ آفتاب غروب ہو جائے تو تمام آئینے نور سے محروم ہو جائیں آئینوں میں نور کا پایا جانا آفتاب کے چمکنے کی دلیل ہے۔ اسی طرح عالم ممکنات کے کسی ایک ایک ذرہ میں نور حیات کا پایا جانا آفتاب حیات محمدی کے موجود ہونے کی دلیل ہے"۔ (حیات النبی از کاظمی صاحب صفحہ ۹۰)

ایک صحیح العقیدہ مسلمان کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ باتیں حقیقت سے کتنی دور ہیں اور اسلامی تعلیمات سے کس درجہ مغائر ہیں۔

اسوۂ حسنہ

اُسوۃ انسان کی اس حالت کو کہتے ہیں جس میں وہ دوسرے کا متبع (پیروی کرنے والا) ہوتا ہے خواہ وہ حالت اچھی ہو یا بری ۔اُسوۃ کے معنی ہیں چال، ڈھنگ، نمونہ، عمل قرآن مجید میں ہے:۔

"تمہارے لئے ابراہیم اور ان کے ساتھیوں میں ایک اچھا نمونہ ہے" (۶۰:۴)

"انھیں لوگوں کے طرز عمل میں تمہارے لئے ہر اس شخص کے لئے نمونہ ہے جو اللہ اور آخرت کا امیدوار ہو"

اللہ تعالیٰ نے رسول اکرم کو ایک کامل نمونہ بنا کر مبعوث فرمایا اور ہمیں آپ کے طرز عمل اور طریقہ پر چلنے کا حکم دیا:۔

"تمہارے لئے رسول اکرم کی ذات میں بہترین نمونہ موجود ہے اس شخص کے لئے جو اللہ اور آخرت کی امید رکھتا ہو اور اللہ کا کثرت سے ذکر کرتا ہو" ۔(۳۳:۲۱)

اسی طرح فرمایا۔

جب اللہ اور اس کا رسول کسی بات کا فیصلہ فرمادیں تو کسی مومن (مرد و عورت) کو ان کے اپنے کسی کام میں کوئی اختیار باقی نہیں رہتا اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے اس نے کھلی گمراہی اختیار کی ۔(۳۳:۳۶)

پھر یہ بھی فرمایا:۔

آپ کے رب کی قسم ایسا نہیں ہے ۔یہ اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتے جب تک کہ آپسی جھگڑوں میں بھی آپ کے فیصلہ کو قبول نہ کرلیں ۔پھر آپ کے فیصلہ کے خلاف دل میں کوئی تنگی بھی نہ پیدا ہو اور پوری طرح تابعدار بن جائیں (۴:۶۵)

رسول اکرم کی اتباع اور پیروی کا نام اتباع سنت اور اسوہ حسنہ کی پیروی ہے اور قرآن مجید نے مسلمانوں کو اس پیروی کا مکلف کیا ہے ۔آپ کے احکام اور طریقہ کار میں تبدیلی کا کسی کو بھی حق نہیں، جو ان احکام میں ترمیم یا تبدیلی کرتا ہے شریعت کی زبان میں اسے "بدعتی" کہتے ہیں ۔ایسا شخص کافر و مشرک کے بعد سب سے بڑا باغی اور سب سے بڑا دشمن اسلام ہے ۔ایک لحاظ سے کافر و مشرک سے بھی بڑھ کر ہے کیونکہ کافر نے تو قانون الٰہی کو قبول ہی نہ کیا اور یہ بدعتی اقرار کر کے ملت اسلامیہ کو دھوکا دے رہا ہے۔

رسول اکرم نے فرمایا:۔

"میرا ہر امتی جنت میں داخل ہوگا سوائے ان کے جنھوں نے انکار کیا"۔

پوچھا گیا انکار سے کیا مراد ہے ۔آپ نے فرمایا:۔

"جس نے میری اطاعت کی وہ جنت میں داخل ہوا جس نے میری نافرمانی کی اس نے انکار کیا" ۔(بخاری جلد ۔۲ مشکوۃ)

ایک اور حدیث میں ارشاد ہے۔

"تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا جب تک اس کی خواہش اس دین کے تابع نہ ہوجائے جو میں لے کر آیا ہوں" ۔(بخاری)

جو شخص سنت رسول کو ترک کر کے اپنی مرضی یا منشا سے کسی اور فعل کو اختیار کرتا ہے ۔اس کے خلاف جہاد واجب ہے خواہ یہ ہاتھ سے ہو یا زبان سے ہو، قلم سے ہو یا دل سے ۔یعنی جو شخص ایسے باغی کو برا بھی تصور نہیں کرتا وہ خود دائرہ ایمان سے خارج ہے ۔کیوں کہ دل سے برا سمجھنا ایمان کی آخری کی شکل ہے۔

رسول اکرم کے طرز عمل کی صراحت خود قرآن مجید میں موجود ہے ان رہنما اصولوں کے پیش نظر احادیث نبوی کی روشنی میں رسول اکرم کے اسوہ حسنہ کا یقینی طور پر تعین کیا جاسکتا ہے جس کی مکمل پیروی مسلمانوں پر لازم ہے۔

رسول اکرم کا طرز عمل یہ تھا کہ ان کو اللہ تعالیٰ پر مکمل اور غیر مشروط بھروسہ تھا ۔ان کے ہر عمل میں خلوص تھا اور کبھی کوئی ذاتی غرض وابستہ نہ تھی ۔وہ جو بات بھی کرتے اس میں ذاتی خواہش کا کوئی دخل نہ ہوتا ۔قرآن مجید سے بھی اس بات کی

تائید ہوتی ہے۔ "ومایںطق عن الھویٰ" (۵۳:۳) وہ (رسول اکرم) اپنی خواہش نفس سے نہیں کہتے۔ رسول اکرم مسلمانوں کے حد درجہ بہی خواہ تھے۔ لقد جاء کم رسول من انفسکم عزیز علیہ ما عنتم حریص علیکم بالمومنین رؤف رحیم (۹ : ۱۲۸) "تم لوگوں کے پاس ایک رسول آیا ہے جو تم ہی میں سے ہے۔ تمہارا نقصان میں پڑنا اس پر شاق ہے۔ تمہاری فلاح کا وہ حریص ہے۔ ایمان لانے والوں کے لئے وہ شفیق اور رحیم ہے۔"

رسول اکرمؐ کفار پر سخت اور مسلمانوں پر رحیم تھے۔ محمدٌ رسول اللہ والذین معہ اشدآء علی الکفار رحمآء بینھم (۴۸:۲۹) محمد اور جو ان کے ساتھ ہیں وہ کفار پر سخت اور آپس میں رحیم ہیں۔

ایام جاہلیت میں تیر افگنی، شہہ سواری، نیزہ بازی، قصیدہ خوانی، نسب دانی، ایسے فنون تھے جن سے واقفیت باعث امتیاز تھی رسول اکرمؐ نے ان فنون سے اپنی دلچسپی کا اظہار نہیں کیا۔ اور ان کے مقابل خلق محمدیؐ کو نمونہ بنا کر پیش کیا۔ رسول اکرمؐ جو بھی کام کرتے اس میں حکمت اور مصلحت ہوتی۔ انھوں نے بلند اخلاق اور اعلیٰ کردار کا مظاہرہ کیا۔ صبر و استقامت میں نہایت اونچا اور مثالی معیار قائم کیا آپؐ نے صفائی ر پاکیزگی کو ہمیشہ عزیز رکھا۔ آپؐ نے انصاف اور وعدہ کی پابندی پر بہت زور دیا۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرمؐ نے فرمایا:۔

تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ میں اس کو اس کے باپ اور اس کی اولاد اور تمام انسانوں سے بڑھ کر محبوب نہ بن جاؤں"۔

بخاری کی حدیث ہے۔

"جس نے محمدؐ کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے محمدؐ کی نافرمانی کی اس نے یقیناً اللہ کی نافرمانی کی محمدؐ لوگوں کے درمیان حد فاصل کی حیثیت

رکھتے ہیں"۔

اللہ کے رسول نے زندگی کے مختلف شعبوں میں ہماری رہنمائی فرمائی، دینی امور میں قرآن مجید بالعموم اصولی تعلیم دیتا ہے۔ رسول اکرمؐ کے ارشادات اور افعال سے ان کی تفصیل معلوم ہوتی ہے۔ آپؐ نے اپنے قول و عمل سے قرآنی احکام کی وضاحت فرمائی۔ اور عملی زندگی میں ان کو نافذ فرمایا۔ اصولی احکام کو تمثیلی شکل دینا در حقیقت آپ کے فرائض منصبی میں داخل تھا۔

"اے نبی ہم نے یہ ذکر (قرآن) تمہاری طرف نازل کیا ہے تاکہ تم لوگوں کے لئے اس تعلیم کو واضح کرو جو ان کی طرف نازل کی گئی ہے"۔ (النحل: ۴۴)

واقعہ افک

سورہ نور کی آیات ۱۱ تا ۲۰ میں بہتان یا افواہوں کا ذکر کیا گیا ہے لیکن اس کی صراحت نہیں کی گئی کہ یہ بہتان کس کے خلاف تھے ۔خود آیات میں صراحت موجود ہے کہ یہ فتنہ ایک دو نہیں بلکہ متعدد مومن عورتوں کے تعلق سے تھا جو پارسا تھیں

قرآن مجید کے اس عمومی انداز سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مجوسیوں اور یہودیوں نے ان آیات کے نزول کو ام المومنین حضرت عائشہؓ کے خلاف بہتان اور پھر ان کی برات سے متعلق ہونے کو مشہور کر کے روایات گڑھ دیں ۔

اس سلسلہ میں تین روایتیں وضع کی گئیں ۔ایک کو خود حضرت عائشہ صدیقہؓ سے منسوب کیا گیا ۔ان کو روایت کرنے والے ایک ابن شہاب زہری ہیں ۔زہری سے متعلق تفصیلات عنوان "امام زہری" کے تحت دیکھئے ۔دوسرے ابو اسامہ حماد بن اسامہ ۔دوسری روایت کو حضرت عائشہ کی والدہ ام رومان سے منسوب کیا گیا ۔ ان سے روایت کرنے والے مسروق بن اجرع تابعی ہیں ۔محدثین اور مفسرین بھی ان من گھڑت روایات کو درست مان کر نقل کرتے گئے ۔ایک محقق جناب محمد حبیب الرحمن نے بتوفیق الہیٰ احادیث کو جانچنے کے اصولوں کی روشنی میں ان روایات کی جانچ کی تو ان کا وضعی ہونا ظاہر ہو گیا و نیز مولانا تمنا عمادی اور حاجی عیسیٰ نے بھی اس بارہ میں تحقیق کا حق ادا کیا ۔ان روایتوں کے متن اور ان کی اسناد سے ان کا من گھڑت ہونا ثابت ہے ۔

ان تینوں روایات میں بعض باتیں مشترک ہیں ۔ بعض ایک میں ہیں تو دوسری میں نہیں ۔اور بعض باتیں تو ایک دوسرے کی بالکل ضد ہیں ۔

ایک ہی واقعہ کو مختلف افراد بیان کریں تو کمی بیشی تو ہو سکتی ہے لیکن تضاد وتناقص نہیں ہو سکتا ۔اور اگر ایسا ہو تو ایسی روایات کو رد کر دینا چاہیئے ۔

جن باتوں سے واقعہ افک سے متعلقہ روایات کا وضعی ہونا ظاہر ہوتا ہے ۔

ان میں سے چند یہ ہیں :۔

۱۔جب جنگ احزاب کے بعد دشمنان اسلام کے لئے یہ ممکن نہ رہا کہ وہ اسلام کو شکست دے سکیں تو وہ اہل ایمان کے خلاف گندی گندی افواہیں پھیلانے لگے ۔ تاکہ اہل ایمان کی زندگی داغدار نظر آئے ۔قرآن مجید میں انسانی معاشرے کے اہم گوشہ کے متعلق قوامین بیان ہوئے ہیں کہ جو شخص کسی عورت پر الزام لگائے تو چاہیئے کہ چار گواہ پیش کرے وغیرہ ۔کسی خاص واقعہ بہتان کی صراحت قرآن مجید میں نہیں ہے احکام قرآنی کے درمیان خود ساختہ واقعہ افک کا شان نزول بیان کیا گیا ہے اور ایک عام قانونی مسئلہ کو بنادیا گیا ۔ دشمنان اسلام نے گندے بہتان تراش کر ان کو حضرت عائشہ سے منسوب کر دیا ۔اور قرآن مجید میں جن افواہوں کا عمومی ذکر ہے ۔ان کو بہتان بنا کر حضرت عائشہ سے مختص کیا ۔

۲۔بہتان تراشنے والوں کا انتخاب بھی دشمنان اسلام نے نہایت چالاکی سے کیا گہری نظر ڈالنے سے وہ وجوہات سمجھ میں آسکتی ہیں جو اس انتخاب کا باعث ہوئیں :۔

(الف) ۔حضرت طلحہؓ جنگ جمل میں حضرت عائشہؓ کی طرف سے حضرت علیؓ کے اطراف جو بلوائی تھے ان سے لڑتے ہوئے شہید ہوئے جس خاتون کا نام بہتان تراشنے والوں میں شریک کیا گیا ہے ۔وہ حضرت طلحہؓ کی بیوی حمنہ بنت جحشؓ تھیں ۔

(ب) ۔حسان بن ثابتؓ انصاری صحابی ہیں ۔اچھے شاعر تھے ۔مخالفین اسلام جب رسول اکرمؐ کی ہجو کرتے تو حسان بن ثابتؓ ان کا منہ توڑ جواب دیتے ۔ حسان بن ثابتؓ حضرت علیؓ سے بیعت نہ کر کے امیر معاویہؓ کے پاس شام چلے گئے ۔ان کا نام بہتان تراشنے والوں میں شامل کیا گیا ۔

(ج) ۔مسطح بن اثاثہ بن عباد بن مطلب مہاجر اور بدری صحابی ہیں ۔یہ حضرت ابو بکر کے خالہ زاد بھائی تھے ۔جن کی حضرت ابو بکر صدیقؓ مالی مدد کیا کرتے تھے ۔مدد پانے والا محسن کی بدنامی میں اسی وقت حصہ لے سکتا ہے جب الزام میں کچھ صداقت ہو ۔یہی تاثر پیدا کرنے کے لئے ان کا نام شریک کیا گیا ۔

(د) ۔حضرت علیؓ کا نام بھی روایت میں اس طرح شامل کر دیا گیا کہ جب رسول اکرمؐ نے مختلف لوگوں سے دریافت کیا تو حضرت علیؓ نے حضرت عائشہؓ کی

تعریف کی نہ مذمت۔ اور حضرت عائشہ کی خادمہ بریدہ سے دریافت کرنے کا مشورہ دیتے ہوئے یہ مشورہ بھی دیا کہ حضرت عائشہؓ کو چھوڑ دیجئے کیونکہ اللہ نے آپ پر کوئی تنگی نہیں رکھی۔ افسانہ گھڑنے والوں کا یہ مقصد تھا کہ حضرت عائشہؓ نے حضرت عثمانؓ کو شہید کرنے والوں سے قصاص لینے کا حضرت علیؓ سے جو مطالبہ کیا وہ حق کی بناء پر نہ تھا بلکہ اس رنجش کی بناء پر تھا جو حضرت علیؓ کے خلاف حضرت عائشہ کے دل میں ان کے مشورہ کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی۔ حالانکہ دراصل حضرت علیؓ نے ایسا کوئی مشورہ نہیں دیا تھا اور حضرت عائشہؓ کا قصاص لینے کا مطالبہ قرآنی احکام کی بموجب تھا۔

(۳) ۔ مدینہ میں عورتیں رات کے وقت کسی نہ کسی کو ساتھ لے کر ہی رفع حاجت کے لئے آبادی سے باہر جایا کرتی تھیں۔ اجنبی جگہ وہ بھی غزوہ کے دوران حضرت عائشہؓ کا تنہا لشکر کے پڑاؤ سے باہر جانا ہرگز قابل قبول نہیں ہو سکتا۔

(۴) ۔ لشکر حالت سفر میں ہو یا پڑاؤ کی صورت میں رسول اکرمؐ ہمیشہ اس کے درمیان میں ہوتے تھے۔ حضرت عائشہؓ کو قلب لشکر سے نکل کر پڑاؤ سے باہر جاتے ہوئے کئی افراد نے ضرور دیکھا ہو گا۔ پھر آپ کی واپسی کا اطمینان کئے بغیر لشکر کا کوچ کر جانا قطعی ممکن نہیں۔

(۵) ۔ رسول اکرمؐ اس لشکر کے سپہ سالار تھے۔ بحیثیت سالار اور بحیثیت شوہر ساتھیوں کے متعلق باخبر رہنا آپ کے فرائض میں داخل تھا۔ اس بات کو کہ آپ اپنی بیوی کو چھوڑ کر روانہ ہو گئے تسلیم کرنے سے **نعوذباللہ** آپ کی انتظامی صلاحیت پر حرف آتا ہے۔

(۶) ۔ لشکر کے کوچ کرتے وقت لازمی طور پر آوازیں بلند ہوتی ہیں۔ دن سے زیادہ رات میں اور آبادی سے زیادہ کھلے میدان میں آوازوں کا دور دور تک سنائی دینا ایک امر واقعہ ہے۔ کوچ کا علم روشنی سے بھی کیا جاتا ہے۔ اس بات کو ہرگز تسلیم نہیں کیا جا سکتا کہ حضرت عائشہؓ کو لشکر کی روانگی کا علم ہی نہ ہوا۔ رفع حاجت کے لئے اتنا وقت لگانا بھی قرین قیاس نہیں۔

(۷) ۔ ایک روایت میں بیان ہوا ہے کہ گلے کا ہار گر جانے کا علم حضرت عائشہؓ کو ہودج پہنچنے کے بعد ہوا۔ حالانکہ اس وقت لشکر کوچ کے لئے بالکل تیار تھا۔ ایسے وقت میں حضرت عائشہؓ کو دوبارہ لشکر کے باہر کیسے جانے دیا گیا۔ ایسے وقت تو وہ لوگوں کو ہار تلاش کرنے کے لئے کہتیں۔ یا رسول اکرمؐ سے اس کا تذکرہ کرتیں۔ جیسا کہ ایک اور روایت میں ہے۔ جس کی وجہ سے تیمم کی آیتیں نازل ہوئیں۔ صحیح بخاری کتاب التیمم۔

(۸) ۔ لشکر کے ساتھ جاتے ہوئے گلے کا ہار لے کر جانا اور وہ بھی کسی سے مانگ کر ہرگز قابل قبول نہیں۔

(۹) ۔ یہ بات بھی قابل قبول نہیں کہ ہار کے تلاش کے انہماک نے لشکر کے کوچ سے حضرت عائشہؓ کو بے خبر رکھا۔ ایک روایت میں بیان کیا گیا۔ لشکر کے گذر جانے کے بعد مجھے ہار ملا۔ ان الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ لشکر کوچ کرتے ہوئے دیکھنے کے بعد بھی حضرت عائشہؓ ہار کی تلاش میں رہیں۔

(۱۰) ۔ لشکر پچھلی رات کو روانہ ہوا تھا۔ نماز فجر کے لئے لشکر لازماً رکا ہو گا۔ اس سفر میں اہل ایمان حالت خوف میں نہ تھے۔ سواریوں پر صلوٰۃ ادا کرنے کے بجائے ضرور جماعت قائم کی گئی ہو گی۔ اس وقت رسول اکرمؐ کو حضرت عائشہؓ کی عدم موجودگی کا علم ہو جانا چاہیے تھا۔

(۱۱) ۔ جب لشکر دوپہر میں پڑاؤ کیا تھا تو کم از کم اس وقت حضرت عائشہؓ کی عدم موجودگی کا علم ہو جانا چاہیے تھا۔ روایت میں ہے کہ جب حضرت عائشہؓ لشکر میں پہنچیں تب علم ہوا۔

(۱۲) ۔ ہودج کے اٹھانے اور اس کے ہلکا ہونے سے متعلق جو باتیں روایت میں بیان ہوئی ہیں وہ محل نظر ہیں۔ اس غزوہ کی روانگی اور واپسی کے دوران کئی مرتبہ ہودج اتارا اور چڑھایا گیا جس سے اٹھانے والوں کو حضرت عائشہؓ کی موجودگی یا عدم موجودگی کا اندازہ ہونا ضروری تھا۔ پھر یہ بات کہ کسی خاتون کو پہلے ہودج میں بٹھا کر پھر ہودج کو اونٹ پر کسا جاتا تھا ہرگز قابل قبول نہیں ہو سکتی۔

(۱۳) ۔ لشکر کے روانہ ہو جانے کے بعد حضرت عائشہؓ کا تنہا رہ جانے کے باوجود

آنکھ لگ جانے کی بات جو روایت میں بیان کی گئی ہے ہرگز قابل قبول نہیں۔

(۱۴) ۔روایت میں ہے کہ رسول اکرمؐ نے حضرت عائشہؓ کی خادمہ بریدہ کو بلا کر حضرت عائشہؓ کے کردار کے متعلق دریافت فرمایا۔ حالانکہ اس مہینہ "دریافت" کے وقت (رمضان ۶ھ) بریدہ اپنے مالک حضرت عباسؓ کے ساتھ مکہ میں تھیں۔ فتح مکہ کے بعد (رمضان ۸ھ) جب حضرت عباسؓ مدینہ منتقل ہوئے تب حضرت عائشہؓ نے حضرت عباسؓ سے بریدہ کو خرید کر آزاد فرمایا تھا۔

(۱۵) ۔روایت کے بموجب رسول اکرمؐ نے اپنے طور پر تحقیق کرنے کے بعد مسجد میں اس بہتان کا ذکر کر کے مشورہ طلب فرمایا۔ اس پر قبیلہ اوس کے سردار حضرت سعد بن معاذ نے بہتان لگانے والوں کو قتل کر دینے کا مشورہ دیا۔ یہی ایک بات اس روایت کے من گھڑت اور جھوٹ ہونے کی دلیل ہے۔ کیونکہ اس واقعہ سے دس ماہ قبل جنگ احزاب (۵ھ) میں حضرت سعد بن معاذ زخمی ہوئے اور بنی قریظہ کی مہم کے متصلاً ان کی وفات ہونا ثابت ہے۔ یعنی اس قضیہ کے وقت وہ دنیا میں موجود نہ تھے۔

(۱۶) ۔بہتان لگانے والوں نے حضرت مسطح اور حضرت حمنہ بنت جحش کا نام بھی روایت میں شریک کیا ہے۔ جب رسول اکرمؐ نے حاضرین مسجد سے مشورہ کیا تو روایت کے بموجب کسی نے ان کو سزا دینے کا مشورہ نہیں دیا۔

ان روایتوں میں بعض لوگوں سے حضرت عائشہ کی تائید کروائی گئی۔ لیکن تائید کے پردے میں بھی مخالفت اور عداوت صاف نظر آتی ہے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ روایت گھڑنے والوں کو حضرت عائشہؓ سے بغض تھا۔

جہاں تک ان روایات کے اسناد کا سوال ہے:۔

(۱) ۔ ابن شہاب زہری نے بیان کیا ہے کہ میں نے یہ قصہ کچھ سعید بن مسیب کچھ عروہ بن زبیر سے، کچھ علقمہ بن وقاص سے اور کچھ عبید اللہ بن مسعود سے سنا۔ ان چاروں سے سنی ہوئی باتوں کو جوڑنے سے پورا قصہ بنتا ہے۔ زہری نے کسی جگہ یہ نہیں بتایا کہ فلاں بات سعید بن مسیب سے فلاں بات عروہ سے فلاں بات علقمہ سے اور فلاں بات عبید اللہ سے معلوم ہوئی۔ یعنی راویوں کے نام تو دیئے لیکن

ان کی بیان کردہ باتیں متعین نہ کی ان چاروں راویوں میں سے کسی نے بھی یہ نہیں بتایا کہ اس نے حضرت عائشہؓ سے یہ قصہ سنا تھا۔ مختصر یہ کہ روایت ناقابل اعتماد ہے۔

(۲) ۔روایت ابو اسامہ امام بخاری نے اسے بطور حدیث نہیں بلکہ روایت زہری کی تائید میں ذکر کیا ہے۔ یہ روایت بھی مرسل ہے۔ یعنی عروہ نے اپنی خالہ حضرت عائشہؓ سے یہ داستان نہیں سنی بلکہ دوسرے اشخاص سے سنی۔

(۳) ۔روایت ام رومان ۔ام رومان کی وفات (۶ھ) میں ہوئی۔ تابعی مسروق بن اجرع نے ام رومان کا زمانہ نہیں پایا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسروق نے کسی اور سے سن کر اس قصہ کو حضرت ام رومان کی طرف منسوب کر دیا۔ امام مسلم نے صحیح مسلم میں اس روایت کو درج نہیں کیا۔

عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ شان نزول سے کسی آیت کے مفہوم کی وضاحت ہوتی ہے لیکن من گھڑت واقعہ افک کے ذریعہ جو شان نزول بیان کیا گیا ہے اس کی روشنی میں قرآنی آیت کا مفہوم ہی بدل دیا گیا۔ سورہ نور کی پانچویں آیت تک کسی خاتون پر الزام تراشی کی سزا کا ذکر ہے۔ اس کے بعد درمیان میں اس صورت کا ذکر ہے جب کہ شوہر بیوی پر جنسی خیانت کا بہتان لگائے پھر آیت ۱۱ تا ۱۳ میں اصل بات کی طرف رجوع کیا گیا۔ آیت ا یوں شروع ہوتی ہے: ۔ان الذین جاء بالافک ۔ آیت کا ترجمہ یوں کیا جاتا ہے ۔بے شک جو لوگ بہتان لائے ہیں وہ تم میں سے ایک گروہ ہے لیکن عربی قواعد کے مطابق فعل ماضی گیارہ مقامات پر مضارع کے معنی میں آتا ہے یہاں بھی فعل ماضی مضارع کے معنوں میں استعمال ہوا ہے ۔بے شک تم میں سے ایک گروہ عصبۃ منھم کسی پاک دامن پر جنسی بہتان باندھے تو (وہ بھی سزا سے نہیں بچ سکتا) ۔ان کی بہتان تراشی کو اپنے لئے برا نہ مانو بلکہ وہ تمہارے لئے بہتر ہے۔

(رسالہ "ماہنامہ الحق" بابت جنوری وفروری ۱۹۸۸۔ اور رسالہ روایت افک کا تجزیہ از حاجی محمد عیسیٰ و نیز کتاب "اعجاز القرآن و اختلاف قرات صفحہ ۵۰۳" سے اقتباس)۔

امامت

امام کے معنی ہیں آگے رہنے والا۔ سورۃ القیمہ (۷۵) کی آیت ۵ میں امامہ ان ہی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ امامت سے مراد پیشوائی یعنی ایسے موقف کے ہیں کہ دوسرے اس کی اقتداء کریں۔ اور اس کے پیچھے چلیں۔ جو شخص کسی اچھے برے کام میں کسی کا پیشوا ہو۔ اس کے لئے قرآن مجید میں لفظ امام استعمال ہوا ہے اچھے پیشواؤں کو بھی امام کہا گیا۔

ہم نے ان کو امام بنایا وہ ہمارے حکم کے ذریعہ ہدایت کرتے ہیں۔ (قرآن ۲۱: ۷۳) اسی طرح برے پیشواؤں کو بھی امام کہا گیا۔

ہم نے ان کی جہنم کی طرف دعوت دینے والے امام بنادیا۔ (قرآن ۲۸: ۴۱) اگر امام مطلق بولا جائے اور اس کے ساتھ اچھائی یا برائی منسوب نہ کی جائے تو اچھے کام کا پیشوا ہی مراد ہوتا ہے۔ ان معنوں میں امام کے معنی راہ (۱۵: ۷۹) اور ہدایت (۱۱: ۱۷) کے بھی ہیں۔ اسلام کے بنیادی تصور کے مطابق امام وہ ہے جو مسلمانوں کو منظم کرنے اور اسلام کے قانون کو نافذ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ (۲: ۱۲۴) اور جو امت کے لئے مثال اور نمونہ ہو۔ کتاب اور علم الہیٰ کو بھی امام کہا گیا ہے۔ (۳۶: ۱۲)۔

اہل سنت نے امامت کے لئے کوئی اصطلاحی معنی وضع نہیں کئے بلکہ اسے لغوی معنوں میں ہی استعمال کیا۔ اسی لئے خلیفہ کو بھی امام کہتے ہیں۔ صلوۃ میں جس کو پیشوا بناتے ہیں۔ اس کو بھی امام کہتے ہیں۔ اسی طرح فقہ، حدیث، قرات اور دوسرے دینی علوم میں جو علماء رہبری کرتے ہیں ان کو بھی دینی شعبوں کے امام کہتے ہیں اور یہ درست موقف ہے۔ اس کے برخلاف بعض فرقوں نے امامت کو اصطلاحی معنی دیئے ہیں اور وضعی روایتوں کی بنیاد پر خود ساختہ عقیدہ امامت کو ان اصطلاحی معنوں

سے متعلق کیا ہے۔

ہر زمانہ میں مسلمانوں کا امام ہونا ضروری ہے تاکہ مسلمان اس کی قیادت اور رہنمائی میں اپنی اجتماعی اور انفرادی زندگی منظم کریں۔ امام، اولی الامر اور خلیفہ تقریباً مترادف الفاظ ہیں اور ان سے اسلام کے تنظیمی نظام کا تعارف ہوتا ہے۔

امت محمدی منہاج نبوت پر فائز ہے۔ اور اس کو منصب امامت حاصل ہے۔ کہ اگر وہ اسلام کے احکام پر کماحقہ، عمل کرے تو یقیناً دوسری اقوام اس کی اتباع کریں گی۔ قرآن مجید کی رو سے امامت کا تصور یہی ہے۔

محض موروثی طور پر کسی کو امام تسلیم کرلینا جب کہ وہ اولی الامر نہ ہو اور عمومی طور پر اس کی اتباع نہ کی جاتی ہو غیر درست ہے۔ اسی طرح محض مخصوص عقیدہ کی بناء پر فرضی طور پر کسی امام کو تسلیم نہیں کیا جاسکتا اور نہ امام کے تعلق سے ایسی باتوں کو جزو دین بنایا جاسکتا ہے جن کی اصل نہ تو قرآن مجید میں ہے نہ صحیح احادیث میں۔

لیکن بدقسمتی سے اسلام کے بعض فرقوں نے امامت کے تعلق سے دشمنان اسلام کی سازش کا شکار ہو کر ایسے عقیدہ کو قبول کرلیا جو اسلامی عقیدہ امامت سے بالکل مختلف ہے۔

ابتدائی فتوحات کے بعد عجمیوں کے لئے اسلام کے مقابلہ میں متوازی تنظیم قائم کرنا ممکن نہ تھا کیوں کہ اسلام ایک بڑی طاقت بن چکا تھا۔ انھوں نے بہتر سمجھا کہ اسلام ہی کی شخصیات کو اپنا کر اور دینی عقاید میں اپنے خود ساختہ خیالات کو شامل کر کے اپنا اثر و رسوخ پیدا کریں۔ اس طرح ایران جو مسلمانوں کا مفتوح تھا۔ اسلام کا فاتح بن گیا۔ اس سازش کی وجہ سے اسلام کی مرکزیت کو بہت نقصان پہنچا۔ اس پر یہ کہ ہمارے اکثر اہل علم بھی واقف نہیں ہیں کہ باطل فرقوں کے نزدیک مسئلہ امامت کیا ہے۔ اور ان کے ہاں امامت کا کیا درجہ ہے۔

بعض فرقہ ہائے باطلہ کا عقیدہ بلکہ ایمان ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے رسالت کا سلسلہ جاری فرمایا اسی طرح رسول اکرمؐ کی وفات کے بعد سے بندوں کی ہدایت، رہنمائی اور سربراہی کے لئے امامت کا سلسلہ قائم فرمایا۔ اور قیامت تک کے لئے بعض فرقوں کے مطابق بارہ اور بعض کے مطابق سات امام نامزد کر دیئے۔ اثناء عشریہ کے مطابق بارہویں امام پر دنیا کا خاتمہ اور قیامت ہے۔ یہ بارہ امام انبیاء ہی کی طرح اللہ کی حجت اور معصوم عن الخطا ہیں ماکان ومایکون کا علم رکھتے ہیں۔ نور من نور اللہ ہیں۔ نظام کائنات کے مالک ہیں۔ ان کی اطاعت بھی فرض ہے۔ اور مرتبہ اور درجہ میں رسول اکرمؐ کے برابر اور دوسرے انبیاء سے افضل ہیں ان اماموں کو ماننا اسی طرح نجات کی شرط ہے جس طرح انبیاء کی رسالت کو ماننا۔

ان بارہ میں پہلے امام حضرت علیؓ (ولادت ۱۰ سال قبل بعثت، وفات ۴۰ ہجری) تھے۔ اسی طرح اللہ ہی کی طرف سے ان کے بڑے بیٹے حضرت حسنؓ (ولادت ۳ ہجری، وفات ۴۹ ہجری) امامت کے لئے نامزد کئے گئے۔ اور اس طرح حسب ذیل تمام امام بھی اللہ کی طرف سے امام نامزد کئے گئے۔ ۳۔ حضرت حسینؓ (ولادت ۴ ہجری وفات ۶۱ ہجری)

۴۔ حضرت زین العابدین (ولادت ۳۸ ہجری وفات ۹۵ ہجری)

۵۔ حضرت محمد باقر (ولادت ۵۶ ہجری وفات ۱۱۴ ہجری)

۶۔ حضرت جعفر صادق (ان کو امام ناطق بھی کہتے ہیں) (ولادت ۸۲ھ وفات ۱۴۸ھ)

۷۔ حضرت موسیٰ کاظم (ولادت ۱۲۸ ہجری وفات ۱۸۳ ہجری)

۸۔ حضرت علی رضا (ان کو امام ضامن بھی کہتے ہیں) (ولادت ۱۴۸ھ وفات ۲۰۳ھ)

۹۔ حضرت محمد تقی (ولادت ۱۹۵ ہجری وفات ۲۲۰ ہجری)

۱۰۔ حضرت ابوالحسن علی نقی (ولادت ۲۱۲ ہجری وفات ۲۵۴ ہجری)

۱۱۔ حضرت حسن عسکری (ولادت ۲۳۲ ہجری وفات ۲۶۰ ہجری)

حضرت حسن عسکری کے بعد آخری امام محمد بن حسن جن کو امام عصر اور امام

غائب بھی کہا جاتا ہے اثناء عشری عقیدہ کے مطابق ۲۵۵ھ (اب سے قریب ۱۱۰۶ سال پہلے) میں پیدا ہو کر چار پانچ سال کی عمر میں معجزانہ طور پر غائب ہوگئے اور اب تک "سر من رائے" کے غار میں زندہ روپوش ہیں۔

اثناعشری عقیدہ سے ہٹ کر تحقیقی بات یہ ہے کہ حسن عسکری کا کوئی بیٹا پیدا ہی نہیں ہوا۔ ان کے حقیقی بھائی جعفر بن علی کا یہی بیان ہے۔ جو انھوں نے اپنے باپ کی میراث کے سلسلہ میں سرکاری حکام کے سامنے دیا تھا۔

شیعی عقیدہ کی رو سے معتبر شیعہ کتابوں کے مطابق دنیا میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کئے ہوئے امام کا رہنا ضروری ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی ذمہ داری ہے اثناعشری عقیدہ کے مطابق بارہویں امام مہدی قیامت تک زندہ رہیں گے اور قیامت سے پہلے کسی وقت غار سے برآمد اور ظاہر ہونگے اور اپنے ساتھ وہ اصلی قرآن کو جسے حضرت علی نے مرتب کیا تھا اور مصحف فاطمہ و نیز بندوں کی ہدایت کا وہ سب ذخیرہ جو ان سے پہلے تمام اماموں سے وراثتاً ان کو ملا تھا۔ جیسے الجفر اور الجامعہ وغیرہ۔ وہ غار سے لے کر برآمد ہوں گے۔

اثناء عشریہ کے نزدیک ان بارہ اماموں کا درجہ یہ ہے کہ دنیا ان ہی کے دم سے قائم ہے اگر ایک لمحہ کے لئے بھی دنیا امام سے خالی ہوجائے تو ساری کائنات فنا ہوجائے گی۔ سب ائمہ صاحب معجزہ تھے۔ ان کے پاس ملائکہ اسی طرح آتے تھے جس طرح انبیاء کے پاس آتے رہے۔ ان پر کتابیں بھی نازل ہوئیں۔ ان کو معراج بھی ہوتی تھی۔ ان کے پاس تمام کتابیں توریت، زبور اور انجیل اپنی اصلی شکل میں موجود تھیں اور وہ ان کتابوں کو ان کی اصل زبانوں میں پڑھتے تھے۔ ان کے ہاں وہ علوم بھی تھے جو قرآن یا رسول اکرمؐ کے ذریعہ نہیں بلکہ راست اللہ تعالیٰ سے یا دوسرے سے خاص ذرائع سے حاصل ہوئے تھے۔ ان کو اختیار تھا کہ جس چیز کو چاہیں حلال یا حرام قرار دیں۔ ان میں سے ہر ایک کو اپنی موت کا وقت بھی معلوم تھا۔ اور

ان کی موت خود ان کے اختیار میں تھی۔

امامت سے متعلق فرقہ باطلہ کی کتب کی روایات اور ائمہ کے ارشادات بے شمار ہیں۔ باطنی مفوضہ اسماعیلی، اثناء عشری، ان سب کے مذہبی اصول جن مسائل میں ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں۔ ان میں مسئلہ امامت کی بنیاد بھی شامل ہے مفوضہ کے نزدیک اللہ تعالیٰ نے کاروبار حضرت علی اور ان کی اولاد کے سپرد کر رکھا ہے۔ یہی لوگ پیدا کرتے ہیں۔ رزق دیتے ہیں۔ مارتے ہیں زندہ کرتے ہیں قیامت کے دن اٹھائیں گے۔ اور جزاو سزادیں گے۔

اصول کافی میں امامت سے متعلق ایک علحدہ باب ہے۔ ان روایات اور ارشادات کی تفصیل بہت ہے۔ چند باتیں درج ذیل ہیں۔ جو اہل باطل کا بنیادی عقیدہ ہیں:۔

۱۔ مخلوق پر اللہ کی حجت امام کے بغیر قائم نہیں ہوتی۔

۲۔ امام کے بغیر دنیا قائم نہیں رہ سکتی۔

۳۔ اماموں کو پہچاننا اور ماننا شرط ایمان ہے۔

۴۔ امامت اور اماموں پر ایمان لانے کا اور اس کی تبلیغ کا حکم سب رسولوں اور سب آسمانی کتابوں کے ذریعہ آیا۔

۵۔ اللہ اور اس کے رسولوں کے ساتھ جس "مَنزَل مِنَ اللّٰہ" پر ایمان لانے کا حکم قرآن مجید میں کیا گیا ہے اس سے مراد ائمہ ہیں۔

قرآن (۶۴:۸) میں ہے

"ایمان لاؤ اللہ پر اس کے رسولوں پر اس نور پر جو ہم نے نازل کیا ہے

نور سے مراد صاف قرآن مجید ہے۔ یعنی اللہ اور رسول کے ساتھ قرآن مجید پر بھی ایمان لانے کا حکم ہے لیکن اہل باطل کی روایات میں امام باقر، امام جعفر صادق، امام موسیٰ کاظم، سب سے یہی نقل کیا گیا ہے کہ ان آیتوں میں نورٌ منَ اللہ سے اثناء عشریہ کے بارہ امام مراد ہیں۔ اور ان ہی پر ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے۔

۶۔ اماموں کی اطاعت رسولوں کی اطاعت کی طرح فرض ہے۔

۷۔ ائمہ کو اختیار ہے جس چیز کو چاہیں حلال یا حرام قرار دیں۔

۸۔ ائمہ انبیاء علیہم السلام کی طرح معصوم عن الخطا ہیں۔

۹۔ عام انسانی فطرت کے خلاف امام کے مفروضہ خصوصیات یہ ہیں۔

(۱) بالکل پاک صاف پیدا ہوتا ہے۔

(۲) ختنہ شدہ پیدا ہوتا ہے۔

(۳) جب جسم مادر سے زمین پر آتا ہے تو اس طرح آتا ہے کہ دونوں ہتھیلیاں زمین پر رکھے ہوتا ہے بلند آواز سے کلمہ شہادت پڑھتا ہے۔

(۴) کبھی غسل کی حاجت نہیں ہوتی۔

(۵) سوتے میں صرف آنکھ سوتی ہے۔ دل میں بیدار رہتا ہے۔

(۶) اس کو کبھی جماہی نہیں آتی۔

(۷) وہ کبھی انگڑائی نہیں لیتا۔

(۸) وہ جس طرح آگے کی جانب دیکھتا ہے۔ اسی طرح پیچھے کی جانب دیکھتا ہے۔

(۹) اس کے پاخانہ میں مشک کی خوشبو ہوتی ہے۔

(۱۰) جب وہ رسول اکرمؐ کی زرہ پہنتا ہے تو اس کو بالکل فٹ آتی ہے۔ کوئی دوسرا پہنتا خواہ طویل ہو یا پست قد زرہ ایک بالشت بڑی رہتی ہے۔

(۱۰) اماموں کا حمل ماؤں کے رحم میں نہیں بلکہ پہلو میں قائم ہوتا ہے۔ اور وہ ان کی ران سے پیدا ہوتے ہیں۔

۱۱۔ امامت کا درجہ نبوت سے بالاتر ہے۔

۱۲۔ ائمہ معصومین کو امام ماننے والے (شیعہ) اگر ظالم، فاسق، فاجر بھی ہیں تو جنتی ہیں۔ اور نہ ماننے والے اگر متقی پرہیزگار بھی ہیں تو دوزخی ہیں۔

۱۳۔ ائمہ کے پاس فرشتوں کی آمد و رفت رہتی ہے۔

۱۴۔ ائمہ کے پاس بندوں کے دن رات کے اعمال پیش ہوتے ہیں۔

۱۵۔ ہر شب جمعہ ائمہ کو معراج ہوتی ہے۔ وہ عرش تک لے جائے جاتے ہیں جہاں ان کو بے شمار نئے علوم عطا ہوتے ہیں۔

۱۶۔ ائمہ دنیا اور آخرت کے مالک ہیں۔ کہ جس کو چاہیں دے دیں۔ اور بخش دیں

اور جس کو چاہیں محروم رکھیں۔

۱۷۔اس سے آگے بڑھ کر یہ عقیدہ بھی ہے کہ ائمہ صفات الوہیت کے بھی حامل ہیں کوئی چیز ان سے مخفی اور ان کے لئے غیب نہیں۔

۱۸۔ائمہ کے بارے میں غفلت، سہو، اور نسیان کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔کائنات کے ذرہ ذرہ پر ان کی حکومت ہے۔اور ان کو "کن فیکون" اقتدار حاصل ہے

۱۹۔(معاذاللہ) حضرت علی کی ولایت اور امامت نہ ماننے کی وجہ سے خلفاء ثلثہ اور عام صحابہ کرام قطعی کافر اور مرتد تھے۔

اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ امامت سے متعلق یہ سب عقائد تیسری صدی ہجری کے آخر میں تصنیف کئے گئے۔

اس بات کی وضاحت کے سلسلہ میں کہ ائمہ کی نامزدگی اللہ کی طرف سے ہوتی ہے۔ایسی روایتیں بیان کی گئی ہیں کہ ہر امام کے لئے اللہ کی طرف سے ایک سربمہر لفافہ رسول اکرمؐ پر نازل ہوا تھا جس میں امام کے لئے خاص ہدایات تھیں۔وہ ہر امام کو سربمہر ہی ملتا رہا۔ایک روایت میں آسمان سے نازل ہونے والی سبز رنگ کی تختی کا عجیب و غریب قصہ بیان کیا گیا ہے جس پر نورانی حروف میں نمبروار بارہ اماموں کے نام ان کی تفصیلی تعارف کے ساتھ درج تھے۔

یہ بھی روایت بیان کی گئی ہے کہ حضرت علیؓ نے صدیق اکبرؓ کے خلافت کے زمانہ میں ایک دن ان کا ہاتھ پکڑ کر رسول اکرمؐ سے ملاقات کرادی۔رسول اکرمؐ نے حضرت صدیقؓ کو علیؓ اور ان کی اولاد میں سے گیارہ اماموں پر ایمان لانے کی اور خلافت کے بارے میں جو کچھ کیا اس سے توبہ کرنے کی ہدایت فرمائی۔

اہل باطل نے اپنے بارہ مہینوں کے نام بارہ دیوی دیوتاؤں کے نام پر رکھے جن کی انسانی اور حیوانی شکلیں تھیں اور وہ سب سورج کے گرد گھومتی دکھائی جاتی ہیں۔

نظام شمسی کے بارے میں اہل باطل کی معلومات زیادہ تھیں۔مخالف اسلام قوتوں نے اپنی ضروریات کے تحت بارہ دیوی دیوتاؤں کی جگہ خود ساختہ بارہ امام فٹ کر دیئے۔ان میں اسد یعنی شیر تو یقیناً ہمارے حیدر کرار کی نمائندگی کرتا ہے۔اسی

طرح سنبلہ اور زہرہ دونوں تقریباً ہم معنی الفاظ ہیں۔(ارمغان عجم)

بارہ اماموں کا سلسلہ نسلی تھا۔اور امامت حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ کے سلسلہ میں قائم کی گئی۔مجوسیوں نے حضرت محمدؐ کی نسل ان کی بیٹی سے جاری کردی جب کہ قرآن مجید نے واضح کردیا تھا کہ محمدؐ کو اولاد نرینہ نہیں دی گئی (تاکہ ان کی نسل کو پوجنا نہ شروع کردو)۔

ملا باقر مجلسی نے شہربانو کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ جناب امیر نے حضرت عمرؓ سے کہا کہ شہربانو کو اختیار دے دو کہ مسلمانوں میں سے جسے چاہے پسند کرے اور یہ کہا جسے پسند کرے اس کے حصہ غنیمت میں شہربانو کو محسوب کردیا جائے یعنی جب شہربانو نے حضرت حسینؓ کو پسند کیا تو وہ ان کی باندی سمجھی جائے گی اور حسینؓ کو بقیہ مال غنیمت میں کچھ نہ ملے گا اس طرح شیعوں کے چوتھے امام باندی کی اولاد سے ہیں۔اسی طرح چھٹے امام جعفر صادق کی ماں بھی حضرت ابو بکرؓ صدیق کی پوتی اور غیر سید تھیں۔ان کے بعد تمام ائمہ کی مائیں ایرانی باندیاں تھیں۔

فرقہ امامیہ کا عقیدہ ہے کہ مخصوص اماموں کے علاوہ جو کوئی مدعی یا منکر امامت ہے وہ کافر ہے۔نواب محسن الملک نے "آیات بینات" حصہ سوم کے آخر میں اس پر تفصیلی بحث کی ہے۔تاریخ سے یہ بات بخوبی ثابت ہے کہ حضرت حسینؓ کے قتل کے بعد بنی فاطمہ میں سے کوئی امام ایسا نہیں ہوا جس کے زمانہ میں اس کے بھائیوں اور رشتہ داروں میں سے کسی نہ کسی نے امامت کا دعویٰ نہ کیا ہو۔یا امامت کو کسی پر منحصر سمجھا ہو۔امام اور مدعیان امامت کے درمیان کچھ نہ کچھ جھگڑا ہوا۔حضرت حسین کی شہادت کے بعد حضرت زین العابدین امام مانے جاتے ہیں۔مگر محمد بن حنیفہ نے جو حضرت علی کے فرزند اور زین العابدین کے چچا تھے خود کو امامت کا مستحق قرار دیا۔دروزیہ یاذکری محمد بن حنیفہ کو امام غائب مانتے ہیں۔ان کا عقیدہ ہے کہ امام غائب بادلوں میں چھپے ہوئے ہیں۔ایک دن ظاہر ہوں گے اور حکومت کریں گے اس سے یہ بات بخوبی ثابت ہوگئی کہ چونکہ محمد بن حنیفہ نے امامت کا دعویٰ کیا تھا اس لئے ان کا یہ دعویٰ ان کی تکفیر کے لئے کافی ہے۔

اسی طرح زین العابدین کے بیٹے زید نے امامت کا دعویٰ کیا اور خلیفہ

ہشام بن عبد الملک (۷۲۳ تا ۷۴۳ء) کے خلاف بغاوت کی حالانکہ ان کے بھائی محمد باقر کی امامت کو ایک طبقہ نے تسلیم کر لیا تھا۔ ایسے میں زید کا خروج کرنا ان کو فاسق قرار دینے کے لئے کافی تھا اور شیعہ پیشواؤں کے نزدیک گناہ تھا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اثنا عشری کس منہ سے زین العابدین کے اس فرزند کو جس نے بنی امیہ پر خروج کیا اور اپنی جان دی فاسق اور بوجہ دعویٰ امامت کافر سمجھتے ہیں۔

بعض اثنا عشری علماء زید کو ان کے دعویٰ امامت کے باوجود فسق و کفر سے بچانے کی کوشش کرتے ہیں اور ان کو ان کے بھائی محمد باقر کے بعد افضل سمجھتے ہیں ان کے دعویٰ امامت کی نسبت کہتے ہیں کہ انھوں نے خروج اپنے لئے نہیں کیا بلکہ وہ اپنے بھائی باقر ہی کو امام مانتے تھے لیکن یہ بات کسی طرح ثابت نہیں ہو سکتی۔ تاریخی واقعات پایہ ثبوت پر پہنچے ہوئے ہیں کہ زید نے اپنے بھائی باقر کی امامت سے انکار کرکے خود امامت کا دعوی کیا تھا۔

زید کے بعد ان کے بیٹے یحییٰ نے اور شیعوں کے ساتویں امام موسیٰ کاظم کے بعد ان کے فرزند ابراہیم یوسف اور جعفر نے اور ذکریا بن محمد باقر اور محمد بن قاسم بن حسن اور یحییٰ بن عمر وغیرہ نے جو ائمہ کی اولاد سے تھے امامت کا دعویٰ کیا اور اکثر نے اسلام کی مرکزی حکومت پر خروج کیا اور اپنی جانیں دیں۔ اس کی وجہ سے بہت سے فرقے ہو گئے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اہل باطل کے ائمہ کی اولاد نے کبھی امامت کے متعلق یہ نہیں سمجھا کہ وہ اصول دین سے ہے اور نہ ہی منکر امامت کو نبوت کے منکر کے مماثل سمجھا۔

بعض فرقے حضرت حسن کی اولاد میں امامت مستقل سمجھتے ہیں اور ان کے بیٹے عبداللہ اور ان کے بعد محمد پھر ان کے بھائی ابراہیم کو امام سمجھتے ہیں۔ محمد اور ابراہیم وہ ہیں جنھوں نے خلیفہ منصور کے زمانہ میں خروج کیا اور اپنی جان دی۔ بعض کہتے ہیں کہ امامت کبھی کبھی حضرات حسن اور حسین کی اولاد میں منتقل نہیں ہوئی۔ جس نے دعوی کیا وہ کافر ہے اور پھر شیعوں کے چھٹے امام جعفر صادق کے بعد بھی امامت میں اختلاف ہے۔ کیونکہ ان کے پانچ بیٹے تھے۔ ان میں سے ہر ایک کی امامت کا علحدہ علحدہ فرقہ معتقد ہے۔

۲۹۶ھ میں میمون القداح مجوسی غلام کی اولاد میں عبیداللہ نے رسول اکرمؐ کی صاحبزادی حضرت فاطمہ کی اولاد سے ہونے کا دعویٰ کرکے شمالی افریقہ کے شہر قیروان میں اپنی حکومت قائم کی۔ اس طرح خلافت بنو فاطمہ کی حکومت کا قیام عمل میں آیا۔ عبیداللہ مہدی اور اس کے پیرو فرقہ اثنا عشری ہی کی ایک شاخ ہیں۔ یہ لوگ جعفر صادق تک تو چھ اماموں کو مانتے ہیں لیکن ان کے بعد وہ جعفر صادق کے بڑے فرزند اسماعیل کو امام مانتے ہیں جب کہ اثنا عشری جعفر صادق کے فرزند موسیٰ کاظم کو امام مانتے ہیں۔ فاطمی حکمراں اسماعیل کی اولاد میں ہونے کا دعویٰ کرتے تھے اس لئے وہ اسماعیلی کہلائے۔

اس طرح مسئلہ امامت میں صرف اس وجہ سے اختلاف ہے کہ کسی امام کی اولاد نے کسی مخصوص امام کی امامت پر اتفاق نہیں کیا اور نہ امامت کے دعویٰ سے احتراز کیا۔ صرف اثنا عشری حضرت علی سے حضرت مہدی تک بارہ اماموں کے معتقد ہیں۔ ان کے عقیدے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ باقی اور امام زادے جنھوں نے امامت کا دعویٰ کیا یا امام برحق کو امام نہیں مانا وہ سب کے سب کافر ہیں۔

اسماعیلیہ فرقہ امام کی الوہیت کا قائل ہو گیا۔ یعنی امام اللہ ہوتا ہے۔ اور اللہ امام کے روپ میں دنیا میں آتا ہے۔ ایک فرقہ مرنے والے اماموں کے بارے میں تناسخ کے ذریعہ دنیا میں پھر واپس ہونے کا قائل ہے۔ بعض کہتے ہیں امام مرتے نہیں نظروں سے پوشیدہ ہو جاتے ہیں یا پردہ کر لیتے ہیں۔ اور وہ مناسب وقت پر ظاہر ہوتے ہیں۔ یہ فرقہ ان کی آمد کی لو لگائے بیٹھا ہے۔ ایک فرقہ اس انتظار میں ہے کہ خلافت اہل بیت میں لوٹ آئے گی۔ پھر صوفیوں میں کشف اور ماورالحس کا مسئلہ پیدا ہوا اور بہت صوفی مطلق حلول و وحدت کے قائل ہو کر امامیہ اور رافضیوں کے ہم خیال بن گئے کیونکہ ان میں بھی اکثر الوہیت ائمہ کے قائل ہیں کہ اللہ ان میں حلول کئے ہوئے ہے۔

(تصوف اور شیعیت سے اقتباس)

امام زہری

محمد بن مسلم بن عبید اللہ بن شہاب زہری (۵۲-۱۲۴ ہجری) کا شمار اسلامیات کی تاریخ کی عظیم شخصیات میں کیا جاتا رہا۔ حقیقت یہ ہے کہ احادیث و روایات کے سب سے پہلے جامع مدوّن یہی ہیں۔ حدیثوں کا سب سے بڑا ذخیرہ محدثین کو ان ہی سے ملا۔ انھوں نے روایات کو تحریری شکل دی۔ احادیث کے چھوٹے چھوٹے مجموعے جنھیں اس وقت صحیفے کہا جاتا تھا تیار کروائے اور تلامذہ کو اجازت کے ساتھ دیئے۔

حال ہی میں (جولائی ۱۹۹۴ء) ایک معرکتہ الآرا تحقیقی کتاب امام زہری و طبری تصویر کا دوسرا رخ شائع ہوئی ہے جو مولانا تمنا عمادی اور دیگر علماء کی کاوش کا نتیجہ ہے۔ اس کتاب میں مولانا تمنا عمادی، مولانا حکیم نیاز احمد، مفتی عبداللطیف رحمانی، مولانا احمد شاہ بخاری، مولانا قمرالدین سیالوی نے تحقیق کا حق ادا کیا اور گہرے مطالعہ اور عرق ریزی کے بعد زہری کی مختلف فیہ شخصیت کا تعارف کرواتے ہوئے ایسی باتوں کا انکشاف کیا ہے جو علم حدیث کے طالب علموں ہی کی نہیں علماء کی بھی آنکھیں کھول دینے والی ہیں۔ ۴۶۴ صفحات پر مشتمل اس کتاب کے اہم نتائج کو جو امام زہری سے متعلق ہیں ذیل میں پیش کیا جارہا ہے۔

زہری نے اپنے بعض عقائد باطلہ کو چھپاتے ہوئے نہایت ہوشیاری کے ساتھ روایت حدیث میں اپنا رعب قائم کیا۔ علمائے اہل سنت نے تصویر کے ایک رخ کو سامنے رکھتے ہوئے جمع و تدوین احادیث کے سلسلہ میں ان کو امام کا درجہ دیا ان کے عہد کے بعد علم حدیث نے ترقی کی۔ علم رجال اور روایتوں کی جانچ کے طریقوں کی ابتدا ہوئی اور جرح و تعدیل کے قواعد و ضوابط منضبط ہوئے۔ چنانچہ بعد کے محدثین نے زہری کی کمزوریوں کی نشاندہی کی لیکن اس وقت کے محدثین کے سامنے مشکل یہ

تھی کہ اگر زہری کو سرے سے ناقابل اعتبار کہہ دیتے تو پھر حدیثوں کے ان ذخیروں سے جو ان کے ذریعہ سے ملے تھے ہاتھ دھولینا پڑتا علاوہ ازیں اس وقت تک زہری کا رعب موجود تھا جو خلفائے بنو مروان سے ۴۵ سالہ وابستگی کی وجہ سے قائم تھا۔ اس طرح ہمارے علماء کو زہری کی اصلیت کو بے نقاب کرنے میں تامل رہا اور وہ بڑی حد تک محتاط رہے۔

حقیقت یہ ہے کہ زہری ایک ذوالوجہتین شخصیت ہیں۔ ان کے والد مسلم بن عبید اللہ، مصعب بن زبیر کے متوسلین میں سے تھے۔ مصعب بن زبیر سکینہ بنت حسین کے شوہر یعنی حضرت حسین بن علی کے داماد اور ان کے موئد (SUPPORTER) تھے۔ معرکہ کربلا کے بعد علویوں اور شیعان علی کا کوئی محاذ باقی نہ رہا تھا۔ اس لئے مصعب کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا کہ بنو مروان کے خلاف اپنے بھائی عبداللہ بن زبیرؓ کے ساتھ ہوجائیں۔ مصعب نے اپنی کوشش سے عراق پر اپنے بھائی عبداللہ بن زبیر کا اقتدار قائم کیا تھا لیکن عبداللہ بن زبیر نے مصعب پر اعتماد نہیں کیا اور ان کی کوئی مدد نہ کی۔ مصعب بن زبیر آخر وقت تک بنو مروان سے برسرپیکار رہے اور اپنے بھائی عبداللہ بن زبیر کی خلافت (۶۸۵-۶۹۵ء) کے زمانہ میں عراق کے مختلف علاقوں میں گورنر رہے۔

مصعب بچپن سے عبدالملک بن مروان کے دوست تھے۔ سیاست نے دونوں کو ایک دوسرے کے خلاف لا کھڑا کیا۔ ۷۰ھ میں جب کہ مصعب کوفہ کے گورنر تھے عبدالملک بن مردان سے مقابلہ میں مارے گئے۔

زہری کے والد مسلم بن عبید اللہ آخر تک مصعب کے ساتھ رہے اور بنو مروان کی مخالفت کی۔ کبھی ہاتھ سے تلوار نہیں چھوڑی۔ بنو مروان کی حکومت کا خاتمہ کرنے میں مسلم بن عبید اللہ نے کوئی کسر نہیں چھوڑی۔

زہری مروانیوں کے اس مخالف ماحول میں پیدا ہوئے اور پرورش پائی۔

زہری حصول علم کے لئے مدینہ منورہ پہنچے ۔زہری کے مدنی اساتذہ کسی نہ کسی درجہ میں بنومروان کی مخالفت کا شکار ہوئے جو ان دنوں اپنی حکومت کے استحکام میں مصروف تھے اور کسی قسم کی مخالفت کو برداشت نہ کرتے تھے ۔زہری کے استاد سعید بن المسیب مدینہ کے تابعی علماء میں ممتاز مقام رکھتے تھے ۔جب خلیفہ عبدالملک نے اپنے فرزند ولید سے ان کی بیٹی کا رشتہ چاہا تو انہوں نے انکار کرتے ہوئے ایک غریب آدمی ابو زراعہ سے فوراً اپنی بیٹی کا نکاح کر دیا ۔اس طرح وہ بنو مروان کے معتوب رہے ۔یہاں تک کہ انہیں درے بھی مارے گئے ۔

زہری علی بن حسین (زین العابدین) کے بھی شاگرد رہے جو اگرچہ خانہ نشین اور غیر سیاسی آدمی تھے اور زندگی بھر خلفائے وقت کی مخالفت نہ کی لیکن شیعان علی جو ہمیشہ علی بن حسین اور حکومت وقت کے درمیان مخالفت پیدا کرنے کے لئے سازشیں کیا کرتے تھے ان شیعان علی سے زہری متاثر تھے ۔

اس کے علاوہ اس وقت حجاج بن یوسف کی سخت گیری اور شیعان علی کے خلاف ان کے سخت رویہ کا مبالغہ آمیز پروپگنڈا کیا جاتا تھا ۔

اس ماحول میں زہری کے خیالات کا سانچہ تیار ہوا ۔انہوں نے اپنے ذہن کو اس طرح تیار کیا کہ حکمران طبقہ سے قریب رہتے ہوئے اور اپنی خدمات اور اپنے احساسات کو ظاہر نہ کرتے ہوئے ان کی مخالفت کی جائے ۔بہت جلد ان کو اس کا موقع مل گیا ۔

زہری تحصیل علم سے فارغ ہوئے تو طلب معاش میں شام گئے ۔ایک روز اتفاق سے ایک اہم مسئلہ خلیفہ عبدالملک کے سامنے پیش ہوا ۔زہری نے تسلی بخش جواب دیا ۔اس طرح دربار خلافت تک پہنچ گئے اس وقت ان کی عمر کم و بیش ۳۰ سال تھی جب خلیفہ عبدالملک کو معلوم ہوا کہ زہری مسلم بن عبیداللہ کے بیٹے ہیں تو ناراض ہوئے کہ مسلم نے ہمیشہ بنومروان کی مخالفت کی لیکن زہری نے کمال

فراست سے خلیفہ کے غصہ کو فرد کیا اور خلیفہ عبدالملک کے فرزندان کے اتالیق مقرر ہوگئے ۔جن عجمی عناصر نے خلیفہ سلیمان بن عبدالملک کے ذہن کو متاثر کیا ان کے سرخیل زہری تھے اسی طرح خلیفہ عمر بن عبدالعزیز نے علویوں کے تالیف قلب کی جو کوشش کی اس کے پس پردہ ان کے استاد زہری کا ہاتھ تھا ۔زہری نے ساری عمر مروانیوں کے دربار میں گزار دی ۔

زہری حزب نفاق کے فرد ہیں ۔ان کی تربیت نے بنومروان کو اس انجام تک پہنچا دیا جو زہری چاہتے تھے ۔ان کی وفات کے صرف ۸ سال بعد بنومروان کی خلافت ختم ہوگئی بنومروان کے لئے زہری کا وہی کردار ہے اور کامل و کامیاب کردار ہے جو ابن علقمی کا کردار بنو عباس کے لئے ہے لیکن ابن علقمی کا کردار ناقص ہے ۔

زہری نے ۱۰۱ھ یا اس کے بھی کچھ بعد جمع و تدوین احادیث کا کام شروع کیا بعض متاخرین نے لکھ دیا ہے کہ خلیفہ عمر بن عبدالعزیز نے خود زہری کو جمع و تدوین روایات کا حکم دیا تھا ۔یہ بات غلط ہے ۔اصل بات یہ ہے کہ خود خلیفہ عمر بن عبدالعزیز نے جمع احادیث کا عام حکم اپنے استاد زہری کے مشورہ پر دیا تھا ۔اور زہری نے اس کا سیاسی فائدہ اٹھایا اور اپنا رعب قائم کر کے اپنا مقصد حاصل کیا ۔جو لوگ ۱۰۱ھ سے پہلے وفات پا چکے تھے ان سے احادیث لینے کا زہری کو تقریباً موقع نہیں ملا ۔ان کی حدیثیں نصف سے زیادہ ایسے بزرگوں سے ہیں جو ۱۰۱ھ سے پہلے ہی وفات پا چکے تھے ۔ایسی حدیثوں میں سے یقیناً فی ہزار ۹۹۹ حدیثیں مرسل ہیں یعنی ان حدیثوں کو زہری نے کسی واسطے سے سنا اور وہ واسطہ حذف کر کے ان حدیثوں کو ان بزرگوں کی طرف "حدثنا فلاں" کہہ کر منسوب کر دیا ۔

منافقین عجم میں اکثریت شیعوں ہی کی تھی۔ انہوں نے اپنے مقصد کی تکمیل کے لئے محبت خاندان رسول اور ان کی ظاہری حمایت ہی کو اپنا حیلہ بنایا تھا ۔اسی جماعت کے افراد اس وقت تابعی کا لباس پہن کر ہر جگہ احادیث کی روایت کرتے

پھرتے تھے اور ہر دس سچی باتوں میں دو چار موضوع حدیثیں بھی ضرور رکھ دیتے تھے۔
یہی وجہ تھی کہ زہری کو ہر طرح کے راویوں کی حدیثیں ملتی رہیں اور ہر فرقہ میں ان کا رسوخ رہا۔ زیادہ تر روایتیں ان ہی لوگوں سے ملیں جو خاندان نبوی سے محبت کے مدعی تھے۔

زہری ارسال کے بہت خوگر تھے۔ درمیان سے اپنے اصل شیخ کا نام چھوڑ کر شیخ کے شیخ سے بلاواسطہ اس طرح روایت کرتے ہیں کہ سننے والا یہ سمجھے کہ انہوں نے خود فلاں شخص سے سنا ہے۔

مشہور صحابی عبادہ بن صامت کی وفات ۳۴ھ میں یعنی زہری کی ولادت سے تقریباً ۱۷ سال پہلے ہوئی مگر زہری بغیر کسی درمیانی راوی کا نام لئے بلاواسطہ ان سے بھی روایت کرتے ہیں۔ اس طرح زہری عروہ بن زبیر سے بھی روایت کرتے ہیں جبکہ عروہ بن زبیر سے ان کی ملاقات ثابت نہیں۔ ابن حجر عسقلانی نے اپنی تصنیف تہذیب التہذیب میں (جس میں زہری کا بھی تعارف کروایا گیا ہے) لکھا ہے کہ یحییٰ بن سعید جو مشہور محدث و امام فن رجال تھے کہا کرتے تھے کہ زہری کی مرسل روایتیں بمنزلہ ریح ہیں۔

اس طرح بعض غیر معروف لوگوں کی روایت لینے میں زہری کوئی باک محسوس نہیں کرتے۔

زہری کی عادت ادراج کی بھی تھی۔ رسول اکرم کے الفاظ کے ساتھ اپنے الفاظ ملا دینے کو ادراج کہتے ہیں۔

متعدد اکابر علماء مثلاً دار قطنی، طحاوی، ابن عبد البر، بیہقی، امام نووی، ابن کثیر، ابن حجر عسقلانی، جلال الدین سیوطی، ملا علی قاری وغیرہم نے زہری کے ادراجات کا صریحاً ذکر کیا ہے۔

امام شافعی نے بھی زہری پر تدلیس کا الزام عائد کیا ہے۔ اگر راوی سلسلہ

روایت کے کسی نام میں ایسی کوئی صورت قصداً اختیار کرے جس سے اس کی اصلی شخصیت جو متعارف تھی اس پر پردہ پڑ جائے اور سننے والے کا گمان کسی اور طرف چلا جائے تو اس کو تدلیس کہتے ہیں۔ یہ تدلیس تو اسناد میں ہوئی۔ متن حدیث میں بھی تدلیس ہوتی ہے۔ یعنی یہ کہ مفہوم ایسے طرز بیان میں ادا کیا جائے جس سے حدیث کے صحیح مفہوم کے بجائے غیر مقصود معنی کی طرف سننے والے کا ذہن چلا جائے۔

مختصر یہ کہ علمائے حدیث کے بموجب زہری مرسل بھی ہیں۔ مدرج بھی ہیں اور مدلس بھی ہیں۔ سند کے تینوں عیوب ان میں پائے جاتے ہیں۔

زہری کے شاگردوں میں امام مالک، خلیفہ عمر بن عبدالعزیز، عمرو بن دینار صالح بن کیسان وغیرہ شامل ہیں۔ ان محدثین نے زہری کی کمزوریوں سے واقفیت کے باوجود ان سے حدیثیں لیں کیونکہ ان احادیث کو چھوڑ دینا مناسب نہ سمجھا۔ مگر جس نے قبول کیا یہ سمجھتے ہوئے قبول کیا کہ یہ حدیثیں غالباً صحیح ہوں گی۔

زہری متضاد روایات کے مرجع ہیں جس کی توجیہ اور تطبیق مشکل ہے' وہ امت میں انتشار اور افتراق کے بانیوں میں سے ہیں۔ زہری الجھی ہوئی ڈور ہیں جس کا سراپانا مشکل ہے۔ (صفحہ ۱۹۴ و ۱۹۵)

روایات زہری کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض صحابہ کرام اور صحابیات کے متعلق زہری کے خیالات درست نہ تھے۔ اپنی روایات میں وہ اپنے خیالات، عقائد اور احساسات کا اظہار اس طرح کرتے ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا دل اللہ کے خوف سے خالی تھا۔

خلافت صدیقی و عثمانی میں جمع قرآن سے متعلق زہری کی وہ روایت جسے بخاری و مسلم نے اپنے ہاں درج کیا ہے اس کے راوی تنہا زہری ہیں۔ ایسی روایات پر مفتی عبداللطیف رحمانی نے اپنی کتاب تاریخ القرآن میں سیر حاصل بحث کی ہے۔ اور یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ یہ تمام روایات بمقابلہ اس تواتر کے جس سے قرآن ہمیں ملا

ہے لائق اعتبار نہیں۔

وہ تمام روایات جو سنی شیعہ مباحث سے متعلق ہیں ان میں ابن شہاب زہری کی کارستانی نظر آتی ہے۔ واقعہ قرطاس ہو حضرت علی کا چھ ماہ تک صدیق اکبر کی خلافت کی بیعت نہ کرنے کا معاملہ ہو۔ مطالبہ فدک میں حضرت فاطمہ کے غضبناک ہونے اور حضرت ابو بکر صدیق سے بات چیت بند کرنے کا معاملہ ہو جنازہ فاطمہ کے سلسلہ میں حضرت ابو بکر صدیق کو اطلاع نہ دینے اور ان کی عدم شرکت کا معاملہ ہو' ایسی تمام باتیں صرف زہری ہی کی روایات میں منقول ہیں۔ یہ بات کہ حضرت علی نے حضرت ابو بکر صدیق کی بیعت خلافت چھ ماہ تک نہیں کی جن روایات میں پائی جاتی ہے ان کی سند میں سب مواضع میں ابن شہاب زہری موجود ہیں۔ یہ تمام روایات غلط نہیں ہیں بلکہ اصل روایت میں کچھ ملا دیا گیا ہے اور راوی کی جانب سے ادراج ہے۔

یہی حال فدک کی روایتوں کا ہے۔ جن روایات میں حضرت ابو بکر صدیق کا جواب سن لینے کے بعد حضرت فاطمہ کا غضبناک اور ناراض ہو جانا مذکور ہے وہ ۱۶ ہیں ان تمام روایتوں میں ابن شہاب زہری ہی اس روایت کے راوی ہیں۔

روایت افک ہی کو لیجئے زہری السابقون الاولون کو ایک دوسرے کی زبان سے منافق کہلواتے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں ان کی یہ گفتگو نقل کرتے ہیں اور ساری گفتگو ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی زبان سے ادا کرواتے ہیں ان حقائق کے سامنے آجانے کے بعد بھی بعض طبائع ان واضح نتائج کو قبول کرنے میں تامل کرتے ہیں اور جن شخصیات کو ان کی اصلیت جانے بغیر اونچے درجے دے دیئے گئے ہیں ان کی مخالف اسلام کارستانیوں کو تو کیا ان کی کسی کمزوری یا کوتاہی کو بھی ماننے تیار نہیں۔ حالانکہ حقائق سامنے آجانے کے بعد ہمارے سامنے دو ہی راستے ہیں۔ زہری کی روایت پر اعتماد کر کے نبی کریم کی تعلیم و تربیت کو نعوذ باللہ بے اثر تصور کریں۔ السابقون الاولون کو جاہلیت میں گرفتار،

بے کردار، نبی کی شان میں گستاخ خیال کریں اور ازواج النبی کو آپس میں حاسد، دنیادار بیویاں تسلیم کریں یا زہری کو حزب نفاق کا فرد تسلیم اور روایت افک وغیرہ کو زہری کے خود ساختہ افسانے سمجھ کر اپنے ایمان کی حفاظت کریں۔ ہم ایمان بالرسول کے مکلف ہیں ایمان بالزہری کے مکلف نہیں۔

ان روایتوں اور اس قسم کی دوسری روایتوں سے جن سے شیعہ عقیدہ کی تائید ہوتی ہے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ابن شہاب زہری شیعہ عقیدہ کے حامل ہی نہیں ان عقائد کے بانیوں میں سے ہیں۔ زہری کے شیعہ ہونے کے چار گواہ یہ ہیں۔

(۱) شیخ عباس قمی
(۲) محمد بن یعقوب کلینی
(۳) مصنف کتاب روضات الجنات
(۴) مصنف عین الغزال فی اسماء الرجال

جب ہم احادیث کی تدوین پر غور کرتے ہیں تو یہ افسوسناک حقیقت سامنے آتی ہے کہ جس طرح ملت اسلامیہ کی تاریخ صحیح انداز پر مرتب نہیں ہوئی اسی طرح احادیث کے معاملہ میں بھی ایسی شخصیتوں پر عدم واقفیت کی بنا پر اعتماد کر لیا گیا جو تقیہ کی آڑ میں اپنے عقائد باطلہ کی تائید میں ارسال، ادراج اور تدلیس سے کام لیتے ہوئے ایسی روایات کو شامل کیا جو شامل کرنے کے لائق نہ تھیں اور جن سے بحیثیت مجموعی احادیث کی ثقاہت متاثر ہوئی اور ان پر اعتماد متزلزل ہوا۔

جس طرح ملت اسلامیہ کی تاریخ کی تطہیر ضروری ہے اس سے کہیں زیادہ ذخیرہ احادیث کی تطہیر ضروری ہے۔ علمائے اہل سنت والجماعت کو چاہیئے کہ وہ ان شخصیتوں کو پہچان لیں جو اپنی اصلیت کو مصلحتاً چھپا کر اپنے عقائد کا پرچار کرتے رہے۔ زہری نے نہ صرف روایات کو اپنے عقائد کے پرچار کا ذریعہ بنایا بلکہ علمائے اہل سنت جماعت میں اپنا مقام پیدا کر لیا۔ اہل سنت' جماعت میں عقائدی بگاڑ کا سرا جن شخصیتوں سے ملتا ہے ان میں زہری کو اہم درجہ حاصل ہے۔

ام کلثوم اور حضرت عمرؓ کا نکاح

یہ بات شیعہ اور اہل سنت کی کتابوں سے ثابت ہے کہ حضرت عمرؓ کا نکاح حضرت فاطمہؓ کی دختر حضرت ام کلثومؓ سے ہوا۔اس سے حسب ذیل باتیں ظاہر ہوتی ہیں:۔

۱۔اس نکاح سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت علیؓ اور حضرت عمرؓ میں باہم کچھ عداوت نہ تھی بلکہ دوستی تھی۔

۲۔اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ نعوذباللہ کافر، منافق یا مرتد نہ تھے (جیسا کہ اہل تشیع کا عقیدہ ہے) ورنہ حضرت علیؓ اپنی دختر کا نکاح ان کے ساتھ نہ کرتے۔

۳۔اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے کبھی کسی قسم کا رنج یا صدمہ حضرت علیؓ یا حضرت فاطمہؓ کو نہ دیا تھا (جیسا کہ موضوع روایات سے ظاہر ہوتا ہے) ورنہ وہ اس نکاح سے کیونکر اتفاق کرتے۔

اہل باطل کسی معاملہ میں ایسے زچ نہیں ہوئے جیسے کہ اس معاملہ میں۔ حقیقت میں یہ بحث نہایت دلچسپ ہے کہ اہل باطل نے عبداللہ بن سبا کے زمانہ سے لے کر حالیہ قبلہ و کعبہ کے زمانے تک اس معاملہ میں کیسی مہمل توجیہات کی ہیں۔

۱۔کسی نے اس نکاح کے ہونے ہی سے انکار کیا۔

۲۔کسی نے ام کلثومؓ کے حضرت علیؓ کی بیٹی ہونے سے انکار کیا۔

۳۔کسی نے نکاح پر غصب کا اطلاق کیا۔

۴۔کوئی نکاح کے بعد حضرت عمرؓ کے ساتھ ہم بستر ہونے کا منکر ہوا۔

۵۔کسی نے کہا کہ ایک جنیہ (مونث جن) بشکل حضرت ام کلثومؓ حضرت عمرؓ کے پاس آئی تھی اور ہم بستر ہوئی تھی

۶۔کسی نے واقعہ نکاح کو حضرت علیؓ کے اعلیٰ درجہ کے صبر کا نتیجہ کہا۔

۷۔کسی نے اس کو تقیہ قرار دیا۔

قاضی نوراللہ شوستری نے مجالس المومنین میں اس نکاح کا اقرار کیا ہے۔اور بھی کئی شیعہ عالموں نے اس نکاح کا اقرار کیا ہے۔نکاح کا اقرار کرنے کے بعد حضرات شیعہ نے ائمہ کرام کی طرف سے بعض باتیں روایت کی ہیں۔

سید مرتضیٰ علم الہدیٰ کتاب "تنزیہ الانبیا" میں فرماتے ہیں کہ حضرت علیؓ نے اپنی بیٹی کا نکاح عمرؓ کے ساتھ منظور نہیں کیا مگر عمرؓ نے ان کو دق کیا اور ڈرایا اور جھگڑا مچایا۔ حضرت عباسؓ نے دیکھا کہ فتنہ و فساد ہوا چاہتا ہے تب حضرت علیؓ سے اس کام کو اپنے اختیار میں لے لیا اور ام کلثوم کا نکاح عمرؓ کے ساتھ کر دیا۔

قاضی نوراللہ شوستری "مصائب النواصب" میں لکھتے ہیں ایک مخالف نے پوچھا کیا سبب ہے کہ حضرت علیؓ نے اپنی بیٹی کا نکاح عمرؓ سے کر دیا۔ہم کہتے ہیں کہ ہم کو خبر دی ہے ایک جماعت نے جن میں فلاں فلاں ثقہ اصحاب شریک ہیں کہ امام جعفر سے سوال کیا گیا تو انھوں نے جواب دیا "ہو اول فرج غصبت منا" یہ پہلی فرج ہے جو ہم سے غصب کی گئی اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علیؓ نے اپنی خوشی سے نکاح نہیں کیا بلکہ حضرت عباسؓ نے زبردستی نکاح کر دیا۔چند دلیلوں کی بناء پر یہ قول باطل ہے۔

۱۔اگر یہ تسلیم کیا جائے تو حضرت علیؓ نے خود نکاح نہیں کیا بلکہ حضرت عباسؓ کو اختیار دے دیا اور انھوں نے نکاح کر دیا تو اس سے اصل نکاح کے ہونے میں کچھ شبہ نہ رہا۔ حضرت عباسؓ بھی رشتہ میں حضرت ام کلثومؓ کے دادا ہوتے تھے۔باپ نے نہ سہی ان کی اجازت سے دادا نے نکاح کر دیا۔اصل بات جو ہم کہتے ہیں وہ ثابت ہو گئی۔

۲۔ حضرت عمرؓ لایق زوجیت ام کلثوم کے تھے یا نہ تھے۔اگر لایق زوجیت کے نہ تھے تو حضرت عباس پر سخت الزام عائد ہوتا ہے کہ انھوں نے رسول اکرمؐ کی نواسی کا نکاح ایسے شخص سے کر دیا جو صلاحیت زوجیت نہیں رکھتا تھا اور ایمان، زہد، تقویٰ سے بھی بری تھا۔پس جو الزام حضرت علیؓ کی ذات پر اصول شیعہ کے مطابق ہوتا ہے وہی حضرت عباس پر ہوگا۔

۳۔گو یہ نکاح حضرت عباسؓ نے کیا مگر جب حضرت علیؓ کے وکیل اور مختار ہوئے تو یہ نکاح حضرت علیؓ کی اجازت سے سمجھنا چاہیے۔اگر حضرت علیؓ نے حضرت عباسؓ کو

اجازت نہیں دی تھی اور وکیل نہیں بنایا تھا تو بلااجازت ان کے حضرت عباس کا وکیل اور مختار ہو جانا جائز نہ ٹھہرا اور پھر نکاح کا ولی کی اجازت بغیر ہونا ظاہر ہوتا ہے

۴۔ اگر ہم تسلیم کریں کہ حضرت علیؑ دل سے راضی نہ تھے لیکن حضرت عباسؓ کے سمجھانے سے مجبوری سے راضی ہوئے تو اس سے بھی حضرت علیؑ پر الزام عائد ہوتا ہے جس کے بچانے کے لئے یہ بناوٹ کی گئی ہے یعنی جان کے خوف سے حضرت عباس کے کہنے پر مجبوراً قبول کر لیا اور جان بچانے کے لئے **نعوذباللہ** عزت دینا گوارا کر لیا۔ ایسے معاملہ میں جس سے مبدئیہ طور پر خاندان نبوت کو بٹہ لگے حضرت عباس کا کہا نہ ماننا ضروری تھا۔ آخر حضرت علیؑ کی شجاعت کس دن کے لئے تھی۔

۵۔ حضرت عباس حضرت علیؑ کی وکالت کی صلاحیت نہ رکھتے تھے کیوں کہ وہ حضرت علیؑ کے نزدیک ذلیل و خوار تھے۔ (شیعہ محدثین اور مجتہدین حضرت عباس کا حضرت علیؑ کے نزدیک ذلیل و خوار ہونا بیان کرتے ہیں)۔

۶۔ اگرچہ بعض شیعہ حضرات نے اس نکاح کے جواز کے لئے حضرت عمرؓ کے ظاہری اسلام کا اقرار کیا۔ لیکن حضرت عمرؓ کے ایمان میں اکابرین شیعہ نے جو رخنہ ڈالا۔ وہ چند شیعہ حضرات کے بند کرنے سے بند نہیں ہوگا۔ اس سلسلہ میں ہم ایک استفتاء کرتے ہیں۔ شیعہ علماء اس کا فتویٰ لکھ دیں:۔

۱۔ کیا فرماتے ہیں شیعہ علماء کہ ایک منافق جس نے اللہ کی کتاب میں تحریف کی۔ جس نے رسولؐ کی سنت کو بدلا۔ جس نے حضرت فاطمہؓ کا حق غصب کیا۔ جس نے ان کو ایسا جسمانی صدمہ پہنچایا کہ معصوم بچہ شہید ہوا۔ جس نے حضرت علیؑ کا حق غصب کیا اور جس نے ان پر جبر و ظلم کیا۔ کیا ایسے شخص کا مومنہ، عارفہ کے ساتھ نکاح جائز ہے؟

۲۔ ایک مومن نے جس کو اللہ نے ذاتی شجاعت شرافت میں یکتا پیدا کیا جس کے بازو کو قوت و طاقت قلعہ شکنی کی دی اور جس کو جرات دس ہزار سوار کے ساتھ لڑنے کی دی۔ یہ اپنی بیٹی مومنہ عارفہ کا نکاح ایک منافق، مرتد، غاصب اور خائن، کے ساتھ صرف اس کی تہدید زبانی پر کر دیا۔ ایسے شخص کی نسبت کیا حکم شرعی ہے۔ وہ گناہ گار ہوا یا نہیں؟

یا شیعہ علماء صرف اتنا ہی بتا دیں کہ نکاح مومنہ کا سنی ناصبی کے ساتھ جائز ہے یا نہیں۔ شیعہ حضرات نے صرف حضرت عمرؓ کی فضلیت سے انکار کے واسطے جو توجیہات کی ہیں اور جو الزام حضرات اہل بیت پر عائد کئے ہیں وہ نہایت گمراہ کن ہیں۔

جب حضرات فرقہ اثنا عشری نے خیال کیا کہ حضرت علیؑ کے صبر کے تاویل درست نہیں اور ایسے نازک معاملہ میں تحمل کا عذر بے موقع ہے تو اس کی تائید دوسری طرف سے کی۔ یعنی یہ بتایا کہ رسول اکرمؐ اپنے وصی اور امام اول کو وصیت فرما گئے تھے کہ وہ سوائے صبر کے کچھ نہ کریں اور جو ظلم و ستم ان پر کیا جائے سب برداشت کریں۔ جو واقعے پیش آنے والے تھے حضرت علیؑ سے کہہ چکے تھے۔ ہر واقعہ پر صبر و تحمل کی وصیت کر گئے تھے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت علیؑ کے دور خلافت میں جنگ جمل و جنگ صفین میں زائد پچاسی ہزار فرزندان توحید کا خون بہایا گیا۔ اس وقت حضرت علیؑ نے وصیت کو کیوں پیش نظر نہ رکھا۔ اگر وصیت کا سبب یہ تھا کہ آئندہ خون خرابہ نہ ہو تو ان جنگوں کے وقت اس وصیت پر عمل کرنے کی زیادہ ضرورت تھی۔

حضرت عمرؓ نے اپنے دور خلافت میں اس پرنالے کو جو اکھاڑ دینے کا حکم دیا جو حضرت عباس کے مکان کی چھت پر رسول اکرمؐ کی زندگی سے قائم تھا۔ حضرت عباس حضرت علیؑ کے پاس فریاد کو آئے۔ حضرت علیؑ نے فرمایا تم اپنے گھر میں آرام سے بیٹھو دیکھو میں کیا کرتا ہوں۔ حضرت علیؑ نے قنبر کو آواز دی کہ ذوالفقار لانا۔ اور جا کر قنبر سے کہا کہ پرنالے کو جہاں تھا وہاں لگا دے۔ اور فرمایا قسم ہے مجھ کو صاحب قبر و منبر کی کہ اگر کسی نے اس پرنالے کو اکھیڑا تو اس کی گردن ماروں گا۔ حضرت عمرؓ نے پرنالے کو اپنی جگہ دیکھا اور کہا کوئی علیؑ کو غضب میں نہ لا دے غرض ایک خفیف بات یعنی پرنالے کے لگانے پر حضرت علیؑ اس قدر طیش میں آجاویں تو کیوں کر اس بات کو قبول کیا جا سکتا ہے کہ رسول اکرمؐ نے صبر کی وصیت کی ہوگی۔ اگر واقعی صبر کی وصیت کی گئی تھی۔ تو حضرت علیؑ کیوں اس معمولی بات کے لئے اس وصیت کو بھول گئے اور ایک مرتد نے جب ان کی بیٹی کو بہ جبر حاصل کرنا چاہا تو اس وقت صبر کی وصیت کو یاد رکھا۔ (آیات بینات سے اقتباس)

اویس قرنی

اویس قرنی کے بارے میں اکثر روایات من گھڑت اور فرضی ہیں ۔ بلکہ بعض کو تو اس بارے میں شک ہے کہ اویس قرنی کا کوئی وجود بھی تھا یا نہیں ۔ چنانچہ امام مالک (وفات ۱۷۹ھ) امام شعبہ (وفات ۱۶۰ھ) اور امام عمرو بن مرہ تابعی (وفات ۱۱۸ھ) سرے سے ان کے وجود ہی کے منکر ہیں ۔ عمرو بن مرہ اتفاق سے قبیلہ مراز ہی سے تعلق رکھتے ہیں ۔ اور قرن قبیلہ مراز کی ایک شاخ ہے ۔ جس سے اویس کا تعلق بیان کیا جاتا ہے ۔ عمرو بن مرہ کا بیان ہے کہ ہمارے قبیلہ میں اویس نامی کوئی فرد نہیں گذرا اور اسی باعث امام شعبہ اور امام مالک اویس کے وجود کے منکر ہیں ۔

اویس قرنی سے متعلق ایسی روایات بنالی گئی ہیں کہ رسول اکرمؐ کے دانت شہید ہونے کی اطلاع ملی اور یہ تفصیل معلوم نہ ہوئی کہ کونسے دانت شہید ہوئے تو انہوں نے رسول اکرمؐ سے محبت اور عقیدت میں اپنے سارے دانت توڑ لئے ۔

یمن کا علاقہ ۱۰ ہجری میں فتح ہوا ۔ اس وقت اہل یمن کافر تھے ۔ اگر اویس کا کوئی وجود تھا تو وہ ۱۰ھ کے بعد اسلام لائے ہوں گے جبکہ رسول اکرم کے دندان مبارک جنگ احد میں یعنی ۳ ہجری میں شہید ہوئے ۔ پھر یمن کا علاقہ حضرت خالد بن ولید اور حضرت علی کے ہاتھوں فتح ہوا اور فتح کے بعد یمن کے پہلے امیر حضرت علی مقرر ہوئے اور ذی الحجہ ۱۰ھ میں حضرت علی کی جگہ حضرت معاذ بن جبل اور ابو موسیٰ اشعری کو متعین کیا گیا ۔ اب اگر اویس ان حضرات میں سے کسی کے ہاتھوں پر ایمان لائے تھے تو یقیناً ان حضرات سے یہ بھی معلوم ہو سکتا تھا کہ رسول اکرم کے کونسے دانت شہید ہوئے ۔ اس سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اویس نے ان صحابہ سے نہ تو ملاقات کی نہ ان سے دین کی معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی بلکہ اپنی جہالت کو علم تصور کرتے ہوئے اپنے تمام دانت توڑ لئے ۔

اگر کوئی شخص کسی سے عقیدت اور محبت میں اپنے دانت توڑ والے تو یہ واقعہ مشہور ہو جائے گا اور یہ خبر چند ہی روز میں پورے ملک میں پھیل جائے گی لیکن

اس کے باوجود کسی محدث اور کسی مورخ نے اس واقعہ کا تذکرہ نہیں کیا جو اس بات کا بین ثبوت ہے کہ دانت توڑ لینے کی بات بے بنیاد ہے ۔ اگر ایسا کوئی واقعہ پیش بھی آیا تھا تو اویس کا یہ عمل کوئی نیک کام نہیں بلکہ ایک گناہ تصور ہوگا ۔ احادیث سے تو ثابت ہے کہ پوری رات عبادت کرنا یا ہمیشہ روزے رکھنے کی بھی اجازت نہیں دی ۔ اگر حب رسول میں جان یا جسم کے کسی حصہ کا بلاوجہ ضائع کرنا جائز ہوتا اور یہ فعل حب رسول کی دلیل ہوتی تو صحابہ اکرام میں سے کوئی بھی اس سے احتراز نہیں کرتے ۔ لیکن کسی بھی صحابہ نے اسے اختیار نہ کیا جو اس امر کا ثبوت ہے کہ یہ کوئی مستحسن فعل نہیں بلکہ ایک نامناسب فعل ہے ۔ اگر ہم یہ تسلیم کریں کہ یہ مستحسن فعل ہے تو اس سے دو امور لازم آئیں گے ۔ اول اگر کوئی حب رسول میں خود کشی کرے تو وہ جائز ہوگی ۔ دوسرے یہ کہ رسول اکرم کی حیات سے لے کر اویس قرنی تک ان کے علاوہ کوئی محب رسول نہیں گذرا ۔

اگر اویس قرنی نے یہ حرکت لاعلمی کے باعث کی تو یہ ان کی جہالت ہے جو ہمارے لئے حجت نہیں ہو سکتی ۔ اگر انہوں نے علم کے باوجود ایسا کیا تو گناہ کے مرتکب ہوئے اور فرمان رسول کی مخالفت کی ۔ اس صورت میں یہ محبت محبت رسول نہیں ہوگی ۔

اویس قرنی کے متعلق ان گنت بے سروپا روایتیں ہیں ۔ داتا گنج بخش کی کتاب "کشف المحجوب" کے چند فقرے یہ ہیں :

۱۔ اویس قرنی تابعینؒ میں سے تھے ۔

۲۔ رسول اکرم کے زمانہ میں موجود تھے مگر آپ کے دیدار کا شرف حاصل نہ ہو سکا ۔ اس کے دو اسباب تھے ایک تو ان پر جذب کا غلبہ غالب رہتا تھا دوم یہ کہ وہ اپنی والدہ کا حق ادا کرنے میں مصروف تھے ۔

۳۔ جنگ صفین میں حضرت علی کی طرف سے لڑے اور راہ حق میں شہید ہوئے ۔

۴۔ جب حیات تھے تو رسول اکرم نے کمال شفقت سے فرمایا کہ قبیلہ قرن میں ایک مرد ہے جس کا نام اویس ہے اس کا قد درمیانہ ، بال لمبے اور اس کے

پردرہم کے برابر داغ ہیں وہ میری امت کی شفاعت کرے گا۔ جب تم اس کو دیکھو تو میرا سلام کہو اور کہنا کہ میری امت کے لئے دعا کریں۔

۵۔ لوگ اویس قرنی کے رتبہ کو پہچانتے نہ تھے اس لئے کہ وہ ایک دیوانہ ہے آبادی سے دور پہاڑوں میں رہتا ہے۔ پتہ پوچھ کر حضرت عمر اور حضرت علی صحرا میں گئے۔ اور جسم کے داغوں کو دیکھ کر رسول اکرام کا سلام پہنچایا، اور امت کے لئے دعا کی خواہش کی۔

۶۔ حضرت اویس قرنی نے دعا کی اور کہا واپس جائیں قیامت آنے والی ہے میں قیامت کا سامان بہم پہنچا رہا ہوں۔ ہماری ملاقات قیامت کے دن ہوگی۔ ان فقروں میں چھپے ہوئے مفسدانہ جھوٹ دیکھئے

۱۔ تابعی وہ ہے جو وفات رسول کے بعد پیدا ہو۔ تابعی کو رضی اللہ عنہ نہیں کہتے

۲۔ یہ کیسا جذب تھا جس نے اویس کو رسول سے دور اور ماں سے قریب کر دیا۔ جنگ صفین کے وقت جب دیکھا کہ عبداللہ بن سبا اور مالک اشتر حضرت علی کے ساتھ ہیں تو اپنا جذب بھول گئے۔

لوگ اویس کو پاگل سمجھتے تھے مگر رسول نے بلا دیکھے ہی ان کی عظمت پہچان لی اور ان کو سلام کرنے لگے حالانکہ قیصر و کسریٰ کو سلام نہ کیا تھا۔ اپنی امت کی شفاعت بھی ان کے حوالہ کر گئے۔

اویس قیامت کی تیاری کر رہے تھے یہ وہی قایم القیامہ ہیں جسے شیعہ امام غایب کہتے ہیں۔ اس نے حضرت عمر کو دھمکی دی کہ میں تم سے سمجھ لوں گا۔ لیکن اویس قرنی کی تیاریاں رائگاں گئیں یعنی قیامت نہ آئی۔

ان ہی بزرگ و مجذوب کی فاتحہ شب برات میں ہوتی ہے۔

اویس کے معنی بھیڑیا اور قرن کے معنی پہاڑی کے ہیں۔ اویس قرنی وہی پہاڑی بھیڑیا ہیں جسے قدیم زمانہ سے آریا نسل کے لوگ خدا سمجھ کر پوجتے رہے۔ یونان میں اسے "زی اس" جیوپٹر نامی خدا نے پہاڑ سے نیچے پھینک دیا تھا۔ داتا گنج بخش نے اسے پھر زندہ کر کے دنیائے اسلام میں پہنچا دیا

("شب برات ------ ایک تحقیقی جائزہ" سے اقتباس)

ام ہانی

ام ہانی حضرت علیؓ کی حقیقی بہن تھیں۔ نام ہند تھا۔ بڑے بیٹے ہانی کے نام پر ام ہانی کنیت تھی۔ بعض وضعی روایتوں میں ان کا نام فاختہ بیان کیا گیا ہے۔ ام ہانی کو ان کے ایام دوشیزگی میں رسول اکرمؐ نے نکاح کا پیام دیا تھا لیکن ابو طالب نے صاف انکار کر دیا اور اپنی بیٹی مخزوم کے خاندان میں ہبیرہ بن ابو وہب مخزومی سے بیاہ دی ابو طالب نے رسول اکرمؐ کو یہ جواب دیا کہ۔

اے بھتیجے ان لوگوں کے تو ہم سے رشتے ہوتے آئے ہیں۔ "اشراف کا میل اشراف ہی سے ہوتا ہے۔" (طبری، الاصابہ، طبقات ابن سعد، بحوالہ عترت رسول)

۔ رسول اکرمؐ نے گلہ کیا۔ "چچا۔ تو نے ہبیرہ سے بیٹی بیاہ دی مگر مجھے یوں ہی چھوڑ دیا"۔

ہبیرہ قریش کے شہہ سواروں اور شاعروں میں تھا اور آنحضرت صلعم کی ہجو کیا کرتا تھا۔ ام ہانی نے اپنے خاوند سے وفاداری میں کوتاہی نہ کی لیکن انھوں نے اس کی کوشش کی کہ وہ رسول اکرم صلعم کے درپئے آزار نہ ہو۔ اس کا ثبوت خود ہبیرہ کے کلام ہی سے ملتا ہے۔ لیکن ہبیرہ نے ان کا کہا نہ مانا اور اپنی حرکتوں سے باز نہ آیا۔ فتح مکہ کے بعد ام ہانی کی دائمی جدائی میں بچوں کو مکہ میں چھوڑ کر عیسائی علاقہ میں بھاگ گیا۔ بعد میں وہیں بہ حالت کفر ہلاک ہوا۔ جب ام ہانی کی دائمی جدائی مشرک و کافر شوہر سے ہو گئی تو انھیں اسلام قبول کرنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ جب ام ہانی نے اسلام قبول کیا تو ان کے مشرک دیور۔ جیٹھ ان کے گھر پناہ لینے آگئے اور ام ہانی کی حسن تدبیر سے حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔ حضرت علیؓ نے رسول اکرمؐ کو مشورہ دیا کہ ام ہانی سے نکاح فرما لیں آپؐ نے اظہار رضامندی فرمایا۔ ام ہانی نے یہ عذر پیش کیا۔

"بخدا آپ مجھے جان سے زیادہ عزیز ہیں لیکن میں بے باپ کے بچوں والی ہوں حق شوہر ادا کروں تو ان بچوں کی جان جانے کا اندیشہ ہے اور اگر بچوں کی دیکھ بھال کروں تو رسول اکرمؐ کی خدمت میں کوتاہی ہوگی"۔ رسول اکرمؐ نے ام ہانی کا عذر

قبول فرمایا۔(طبقات ابن سعد جلد ۲ بحوالہ)

معراج کے سلسلہ میں ایک روایت ام ہانی سے بیان کی جاتی ہے ۔ معراج کا واقعہ ہجرت سے کچھ پہلے کا ہے ۔اس زمانہ میں ام ہانی ہبیرہ کی زوجیت میں تھیں اور خود بھی اسلام قبول نہ کیا تھا۔اس روایت کو سب سے پہلے سیرت ابن ہشام کے ایرانی نژاد مولف محمد بن اسحق بن یسار نے بلا سلسلہ اسناد کے اپنی کتاب میں درج کیا ہے۔ محمد ابن اسحق کی ولادت ام ہانی کی وفات سے کوئی ۴۰، ۴۲ برس بعد ۸۵ھ میں ہوئی۔ اور سیرت ابن ہشام کی بھی جس میں یہ روایت درج ہے ام ہانی کی وفات کے تقریباً ایک صدی بعد تالیف کی گئی۔

یہ وضعی کہانی درج ذیل ہے۔

" وہ (ام ہانی) یہ بیان کرتی ہیں کہ رسول اکرمؐ رات کے سفر پر کسی اور جگہ سے نہیں بلکہ میرے ہی گھر سے گئے تھے ۔رات میں وہ میرے ہی گھر میں سوئے تھے۔ عشاء کی نماز کے بعد وہ بھی سوگئے اور ہم بھی سوگئے ۔فجر سے ذرا پہلے رسول اکرمؐ نے ہمیں جگایا جب وہ صلوۃ فجر ادا کر چکے اور ہم نے بھی ان کے ساتھ صلوۃ ادا کی تو فرمایا اے ام ہانی میں نے عشاء کی صلوۃ تم لوگوں کے ساتھ اسی وادی میں یعنی (مکہ) میں پڑھی تھی جیسا کہ تم نے دیکھا پھر میں بیت المقدس چلا گیا وہیں صلوۃ ادا کی پھر اب صبح کی صلوۃ تم لوگوں کے ساتھ ادا کی ۔جیسا کہ تم دیکھ رہے ہو ۔یہ فرما کر رسول اکرمؐ باہر جانے کے لئے کھڑے ہوئے ہی تھے کہ میں نے چادر کا کونا پکڑ لیا۔جس سے ان کا شکم کھل گیا۔جو سکڑے ہوئے اور شکن پڑے قبطیہ کپڑے کی مانند تھا۔میں نے (ام ہانی) نے عرض کیا، اے اللہ کے نبی لوگوں سے یہ واقعہ بیان نہ کیجئے ۔لوگ آپ کو جھٹلائیں گے اور تکلیف پہنچائیں گے ۔آپ نے فرمایا، واللہ میں ضرور بیان کرونگا۔میں نے اپنی حبشیہ کنیز سے کہا ذرا تو رسول اکرمؐ کے پیچھے پیچھے جاؤ، سن کے آ، وہ لوگوں سے کیا کہتے ہیں ۔رسول اکرم نے لوگوں سے جا کر یہ واقعہ بیان کیا وہ حیران ہوگئے اور پوچھنے لگے اس کا کیا ثبوت ہے ۔آپ نے فرمایا میرا گذر فلاں وادی میں ایسے ایسے قبیلہ کے اونٹوں کے گلہ پر سے ہوا تو میری سواری کی آواز سے اونٹوں میں بھگدڑ مچ گئی ایک اونٹ گم ہوگیا میں نے اس کا پتہ ان لوگوں کو بتادیا میں (اس وقت) شام کے

راستہ پر تھا پھر میں آگے چلا یہاں تک کے ضجنان پہنچا تو فلاں قبیلہ کے قافلہ پر گذر ہوا۔ میں نے قبیلہ کے لوگوں کو سوتا پایا ان کے پاس پانی کا برتن تھا جو ڈھکا ہوا تھا۔ میں نے وہ پانی پی لیا اور برتن کو اسی طرح ڈھک دیا۔اس کی علامت یہ ہے کہ قافلہ بیضہ اور ثنیہ پر سے اتر رہا ہے اور قافلہ کے آگے آگے اونٹ ہے جس پر دو مشکیزے لدے ہوئے ہیں ان میں ایک سادہ رنگ کا ہے اور دوسرا دھاری دار ہے یہ سن کر لوگ ثنیہ کی طرف دوڑے ۔سب سے پہلے اونٹ نمودار ہوا جیسا کہ رسول اکرمؐ نے بتایا تھا۔ پھر قافلہ والوں سے برتن کا ماجرا پوچھا۔ہم نے برتن میں پانی بھر رکھا تھا اور اس کو ڈھانک دیا تھا۔ بیدار ہوئے تو برتن ڈھکا ہوا تھا اس میں پانی ندارد تھا۔

یہ روایت محض باطل ہے ۔اس کی تفصیلات خود بتا رہی ہیں کہ یہ نچلے سطح کے ذہن کی پیداوار ہیں ۔اس سلسلہ میں عوام میں اس قسم کے اشعار مشہور کئے گئے ہیں جن سے غلط عقائد کو تقویت ملتی ہے۔

خواب راحت میں تھے ام ہانی کے گھر
آکے جبرئیل نے یہ سنادی خبر
چلئے چلئے شہنشاہ والا گہر
حق کو شوق لقا آج کی رات ہے

اسریٰ کا عظیم واقعہ ہجرت سے کچھ ہی عرصہ قبل پیش آیا تھا بقول علامہ سلیمان ندوی " معراج اور ہجرت کے بیچ میں کوئی زمانہ حایل نہ تھا بلکہ معراج در حقیقت ہجرت ہی کا اعلان تھا" (سیرۃ النبی جلد ۳)

کتاب الانساب الاشراف میں بلاذری نے لکھا ہے ۔یثرب کے وہ ستر (۷۰) اشخاص جنھوں نے مقام عقبہ پر بیعت کی تھی جب واپس ہوئے تو یہ واقعہ قریش پر گراں گذرا کہ رسول اکرمؐ کو مقام ہجرت مل گیا ۔اور انھوں نے مسلمانوں کی عافیت تنگ کر دی ۔مسلمان رسول اکرمؐ سے ہجرت کی اجازت مانگتے آپ فرماتے اس بارے میں مجھے اذن الہیٰ ابھی نہیں ملا۔ پھر چند دن بعد رسول اکرمؐ نے مسلمانوں سے فرمایا تمہاری ہجرت کا مقام یثرب ہے ۔پس جو ہجرت کرنا چاہے وہاں ہجرت

کرجائے پس لوگ خفیہ خفیہ یکے بعد دیگرے مدینہ جانے لگے۔ اول ہجرت سے آخر ہجرت تک ان کو کوئی ایک سال لگ گیا۔

بعض کتابوں میں تو ام ہانی کو رسول اکرمؐ کی زوجہ مطہرہ قرار دینے اور شب معراج میں پوری رات ان ہی کے ساتھ بستر پر رہنے کی مکروہ لغو بیانی کی گئی ہے معراج کہاں سے شروع ہوئی اس بارے میں مختلف روایات ہیں۔

۱۔ کہ آپ خانہ کعبہ کے پاس تھے۔

۲۔ آپ حطیم یا حجر میں تھے۔

۳۔ بیت منور میں تھے۔ صحیحین کی ان حدیثوں میں نہ ام ہانی سے منسوب روایت کا ذکر ہے نہ ان کے گھر آپ کے استراحت فرمانے کا۔

ام ہانی کا گھر شعب ابی طالب میں تھا۔ یہ روایت مشہور دروغ گو کلبی کی ہے ناسخ التواریخ کے شیعہ مورخ نے بھی شب معراج رسول اکرمؐ کے ام ہانی کے گھر استراحت فرمانے کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"رسول اکرمؐ نے فرمایا میں ام ہانی خواہر علی کے گھر تھا اور اپنے مصلے پر سو رہا تھا کہ یکایک مکان کی چھت کھل گئی اور جبرئیل داخل ہوئے۔ ان کے ساتھ پچاس ہزار فرشتے تھے اور تسبیح کے لئے ایک شخص بھی ان کے ساتھ تھا۔ اور میکائیل فرشتہ بھی تھا۔ اس نے کہا اٹھو اے محمد خدائے جبار تمہیں طلب کرتا ہے"

غرض آپ ام ہانی کے گھر سے تشریف لے گئے۔ جس جس آسمان سے آپ کا گذر ہوتا فرشتے علی بن ابو طالب کی خیریت پوچھتے رہے۔

ام ہانی کا گھر ان کے شوہر ہبیرہ مخزومی ہی کا گھر تھا۔ مخزومی گھرانے کی سکونت مکہ میں خانہ کعبہ سے بجانب جنوب شہر کے اس حصہ مین تھی جو اسفل مکہ کہلاتا ہے۔ ام ہانی کے والدین کا مسکن شعب بنی ہاشم میں تھا۔ جو کعبہ سے بجانب شمال اور مشرق اعلائے مکہ میں تھا۔ ام ہانی کے میکہ اور سسرالی مکانوں کے درمیان ایک میل سے زیادہ فاصلہ تھا۔ امیرالمومنین المہدی باللہ عباسی نے ۱۶۷ھ میں مسجد حرام کی توسیع کر دی تو ام ہانی کے مکان کو بھی اس میں شامل کر لیا گیا البتہ جنوبی سمت کا دروازہ جہاں ان کا مکان مسجد حرام میں شامل کیا گیا باب ام ہانی کہلایا۔ وضعی

روایتوں میں بیان کیا گیا کہ ام ہانی کا مکان شعب بنی ہاشم میں تھا یا شعب ابو طالب میں (حالانکہ شعب ابو طالب نام کا کوئی علاقہ ہی نہ تھا)۔

("وقائع زندگانی ام ہانی" سے اقتباس)

امی

عربی میں ام کے معنی ہیں ماں۔ کسی شئے کی اصل بنیاد یا منبع کو بھی ام کہتے ہیں جو شخص اس حالت میں رہے جیسا کہ پیدائش کے وقت تھا اس کو امی کہتے ہیں قرآن میں کسی جگہ بھی امی کا لفظ بہ معنی ان پڑھ نہیں آیا بعض روایات بھی ایسی ہیں جس سے رسول اکرمؐ کا نوشت و خواند سے واقف ہونا ثابت ہوتا ہے بعض دوسری روایتیں ایسی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ رسول اکرمؐ ان پڑھ تھے اور عمر بھر رہے۔ علامہ نیاز فتحپوری نے مجموعہ "استفسار و جواب" جلد سوم صفحات ۳۶۴ تا ۳۶۹ پر ایسی تمام روایات کو موضوع بتایا اور لکھا ہے کہ "قبل نزول تو آپ کا نوشت و خواند سے ناواقف ہونا مسلم ہے۔ لیکن نبوت کے بعد اس باب میں لوگوں نے اختلاف کیا ہے میری رائے یہ ہے کہ بعثت کے بعد آپؐ نے معمولی نوشت و خواند سے واقفیت حاصل کر لی تھی" عربوں کے لکھے پڑھے ہونے کا یہی ثبوت کیا کم ہے کہ انھوں نے "سبعہ معلقہ لکھ کر چیلنج کے طور پر خانہ کعبہ میں آویزاں کر دیا تھا اور واقعہ نے ثابت کیا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی دوسرا ان کے اس چیلنج کا جواب نہ دے سکا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے بھی عربوں کو چیلنج کیا کہ اگر تم کو قرآن مجید کی صداقت میں شک ہے تو اس جیسا قرآن یا کچھ سورے ہی بنالاؤ۔ اگر اہل مکہ لکھے پڑھے نہ ہوتے تو قرآن ان کو اس طرح چیلنج ہرگز نہ دیتا۔

بعض علماء امی کو ام القریٰ (Metropolis) مکہ کی طرف منسوب کرتے ہیں چونکہ اہل مکہ کے تعلق سے یہ خیال عام تھا کہ وہ من حیث القوم بے پڑھے لکھے تھے اس وجہ سے بے پڑھے لکھے شخص کو امی کہا جانے لگا۔

واقعہ یہ ہے کہ کفار عرب جو "الکتاب" سے بے بہرہ اور عموماً احوال عالم سے بے خبر تھے اور ایک حد تک نوشت و خواند سے بھی ناواقف تھے، یہودیوں نے ان کا نام "امیون" رکھ دیا تھا۔ اس زمانہ میں لکھنے پڑھنے کا محور "الکتاب" ہی ہوتی تھی۔ یہودیوں کے اس خطاب میں احساس برتری بھی شامل تھا، جس کی وضاحت قرآن مجید کی اس آیت سے ہوتی ہے ذلک بانھم قالوا لیس علینا فی الامیین سبیل (آل عمران ۳ : ۷۵) یہودی کہتے ہیں کہ ہم ان امی لوگوں کے ساتھ کچھ ہی برتاؤ کریں ہم پر مواخذہ نہ ہوگا۔

یہی لفظ قرآن مجید میں "الکتاب" سے نابلد ان اشخاص کے لئے بھی استعمال ہوا ہے، جو اہل کتاب تھے۔

و منھم امیون لا یعلمون الکتب الا امانی (بقرہ ۲ : ۷۸)

اور بعض (ان یہودیوں میں) ایسے بھی ہیں جن کو الکتاب کا کچھ علم نہیں۔ یہاں الاامانی کے معنیٰ الا ان یتلیٰ علیھم (سوائے اس کے کہ انھیں پڑھ کر سنایا جائے) کے ہیں۔ امی کو عامی کی طرح سمجھنا چاہیئے کیونکہ عامی وہ ہے جو عامتہ الناس کی صفت پر ہو چنانچہ زجاج نے تصریح کی ہے کہ امی وہ ہے جو امت عرب کی صفت پر بے پڑھا لکھا ہو۔ اس صراحت سے عام طور پر فرض کر لیا گیا ہے کہ بے پڑھا لکھا ہونا امت عرب کی صفت تھی، حالانکہ یہ واقعہ ہے کہ اسلام سے قبل "عہد جاہلیت میں بھی عرب نوشت و خواند سے قطعاً نابلد نہ تھے۔

یہاں عہد جاہلیت کی صراحت ضروری ہے عام طور پر بعثت نبوت سے قبل کے دور کو عہد جاہلیت کا نام دیا جاتا ہے۔ جاہلیت سے مراد نوشت و خواند سے ناواقفیت نہیں ہے بلکہ وحی کے ذریعہ جو کتابیں نازل ہوئیں ان سے ناواقفیت ہے نیز اللہ کے رسولوں نے زندگی گذارنے کا جو طریقہ بتایا اس سے ناواقفیت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جہل علم کی نہیں بلکہ حلم کی ضد ہے۔ جن علماء نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ رسول اکرمؐ نوشت و خواند سے ناواقف تھے انھوں نے اس بات کو قرآن مجید کا اعجاز ظاہر کیا ہے۔ انھوں نے اس آیت کو وما کنت تتلو من قبلہ من کتب الا تخطہ بیمینک اذا لارتاب المبطلون۔ (قرآن ۲۹ : ۴۸) ترجمہ: ۔ "آپ نے

اس (قرآن) سے پہلے نہ تو کسی کتاب کی تلاوت کی تھی اور نہ اپنے دست راست سے کوئی خط کھینچا تھا۔ تب تو یہ جھٹلانے والے شک بھی کر سکتے۔"

قرآن مجید کے قطعاً منجانب اللہ ہونے کے ثبوت کے طور پر پیش کیا ہے۔ حالانکہ اس آیت میں یہ بتلایا گیا ہے کہ (اے محمد) آپ نزول قرآن سے قبل توریت یا انجیل کو نہیں پڑھ سکتے تھے کیونکہ ان کی زبان سے واقف نہ تھے اور نہ ان کتابوں کے مضامین کو لکھ سکتے تھے۔ نوشت و خواند سے بے بہرہ ہونے کو رسالت کے لئے شرط نہیں سمجھا گیا۔ مزید برآں یہ امر لایق غور ہے کہ اس آیت میں ناواقفیت (توریت اور انجیل سے یا نوشت و خواند سے) قرآن کے نزول سے پہلے کی ہے اس آیت کے مطابق نزول قرآن کے بعد یہ ناواقفیت باقی نہ رہی۔

آیات محولہ بالا سے قرآن مجید کا اعجاز تو ظاہر کیا جا رہا ہے کہ اس کے نزول سے قبل آپ توریت یا انجیل سے واقف نہ تھے اور اس کے مضامین کو نقل نہ کر سکتے تھے لیکن یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ بعثت کے بعد بھی آپؐ نوشت و خواند سے بے بہرہ رہے شاید درست نہیں۔ ڈاکٹر سید عبداللطیف انگریزی مترجم قرآن مجید نے اپنے رسالہ Was the Prophet Of Islam Unlettered میں اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ رسول اکرمؐ نوشت و خواند سے واقف تھے۔ ایک روایت کے بموجب ایک دن جبکہ رسول اکرمؐ غار حرا میں معتکف تھے اللہ تعالیٰ کی جانب سے ایک فرشتہ آیا اور پہلی بات یہ کہی۔ اقراء آپ نے فرمایا: ما انا بقاری "دوبارہ کہا "اقراء" آپ نے وہی جواب دیا۔ فرشتہ نے پھر بھینچا اور کہا "اقراء"۔ آپؐ نے پوچھا "ماذا اقراء" اس پر فرشتہ نے سورہ اقراء کی ابتدائی پانچ آیتیں پڑھیں۔ اگر اقراء کے معنیٰ "پڑھ" لئے جائیں جیسا کہ عام طور پر یہ معنیٰ لئے جاتے ہیں تو گویا فرشتہ کی بھیجنے سے آپؐ کو پڑھنا آگیا اور آپؐ امی نہ رہے۔

اکثر علماء نے امیون سے مراد غیر اہل کتاب لی ہے جن میں بیضاوی بھی شامل ہیں قرآن کی آیات۔

وقل للذین اوتوا الکتاب والامین اسلمتم (۳ : ۲۰)

پھر اہل کتاب اور امیین (غیر اہل کتاب) دونوں سے پوچھو کیا تم نے اطاعت

قبول کی؟

هوالذی بعث فی الامین رسولاً منهم (۲:۶۲)

وہی تو ہے جس نے "امیین ہی سے (محمدؐ کو) رسول بناکر مبعوث کیا۔اس آیت میں امیین سے مراد غیراہل کتاب ہی ہے۔اسی طرح آیت۔

فاٰمنوابالله ورَسوله النبی الاُمی الذی یؤمن بالله وکلمٰته (۷: ۱۵۸) پس لمان لاؤ اللہ پر اور اس کے بھیجے ہوئے بنی امی پر جو اللہ کے ارشادات (قانون) کو مانتا ہے۔اس آیت میں امی سے مراد قوم کے آدمی (عرب) مراد ہیں۔اور آیت۔

لِتنذر امَّ القریٰ ومَن حولها (۷:۴۲)

تاکہ آپ مکہ کے رہنے والوں کو اور جو لوگ اس کے اردگرد رہتے ہیں بدعملی کے انجام سے خبردار کریں۔

اس آیت میں ام القریٰ اور اس کے نواح میں رہنے والوں سے مراد غیراہل کتاب ہیں۔اور ابوذکریا یحییٰ بن زیاد الفرا نے کہا ہے کہ امیون سے مراد وہ ہیں جو اہل کتاب نہ تھے۔اس آیت سے بھی اسی کی صراحت ہوتی ہے۔

الذین یتّبعون الرسول النبی الامی ، الذی یجدونه مکتوبا عندھم فی التوراة والانجیل (۷:۱۵۷)

اور جو (محمد) رسول (اللہ) نبی امی کی پیروی کرتے ہیں جن (کے اوصاف) کو، وہ اپنے یہاں توریت و انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔

مختصر یہ کہ امی سے مراد غیراہل کتاب ہے نہ کہ وہ جو نوشت و خواند سے ناواقف ہے۔لفظ امی کی غلط معنیٰ آفرینی کا مسلمانوں پر کیا اثر ہوا اس کا کچھ اندازہ ایک مضمون سے ہوگا جو مدینہ بجنور مورخہ ۱۳/ مئی ۱۹۵۲ء میں شائع ہوا ہے۔

"صوبہ بہار کے مسلم اکثریت والے ضلع پورنیا کے بارے میں مضمون نگار لکھتے ہیں یہاں جس جگہ بھی آپ تشریف لے جائیں درجنوں کی تعداد میں تقدس مآبان ملت مقدس لباسوں میں ملبوس ساحرانہ ہیئت کذائی میں نظر آئیں گے۔ان بزرگوں کی عزت سادہ لوح مسلمانوں کے دلوں میں اور ان کی جیبوں پر ان کا قبضہ غاصبانہ چونکہ

سنگین قسم کی جہالت و گمراہی کی وجہ سے ہے اس لئے یہ سالکان راہ طریقت و ماہران فن تصوف اپنے علم و تجربہ کا سارا زور اس پر صرف کر رہے ہیں کہ یہاں کے مسلمانوں میں کسی طرح تعلیم نہ پھیلنے پائے۔وہ جس قسم کے ارشادات عالیہ کے ذریعہ علم کو فتنہ سے بچاکر پیری مریدی کے کاروبار پر فریفتہ کر رہے ہیں ان میں چند یہ ہیں:۔

رسول اکرمؐ خود امی تھے یعنی پڑھے لکھے نہ تھے اس لئے سالکان راہ طریقت و جانثار رسول کے لئے، افضل ترین عبادت ان پڑھ رہنا ہے۔" (سیرت النبی جلد سوم (طبع دوم)

عبرت کا مقام تو یہ ہے کہ ہمارے علماء تک اس مغالطہ میں گرفتار ہیں۔ علامہ سید سلیمان ندوی نے سیرت النبی جلد صفحہ ۴۷۸ پر اپنے مقالہ کا عنوان قائم کیا ہے "امیت یعنی آنحضرت صلعم کا ظاہری تعلیم اور نوشت و خواند کے داغ سے پاک ہونا۔"

لفظ داغ پر کسی تبصرہ کی ضرورت نہیں۔

مآل بصیرت صفحات ۴۱ تا ۱۵۹ اعجاز القرآن و اختلافات قراءت۔ صفحات ۱۹۱ ! ر ۳۹۸ سے اقتباس)

اہل بیت

مجوسیوں اور یہودیوں نے اہل بیت اور آل رسولؐ کے تعلق سے پنج تن کا ایک عجیب و غریب اعتقاد مسلمانوں میں پیدا کر دیا ہے، جس کی بنیاد محض شخصیت پرستی پر ہے۔حالانکہ شخصیت پرستی کا کوئی مقام دین اسلام میں نہیں۔اس عقیدہ کی تائید نہ قرآن مجید سے ہوتی ہے اور نہ معتبر احادیث سے۔

اہل بیت کا لفظ قرآن مجید میں تین مقامات پر آیا ہے۔

جب فرشتے حضرت ابراہیمؑ کو بیٹے (حضرت اسحاقؑ) کی بشارت دیتے ہیں تو ان

کی اہلیہ (حضرت سارہ) تعجب کا اظہار کرتی ہیں کہ بھلا اس عمر میں ہمیں بچہ کیسے ہوگا۔ اس پر فرشتہ نے کہا: ۔**اَتَعجَبینَ مِنْ امُر اللہ رحمتَ اللہِ وَ برکاتہٗ علیکُم أھلَ البیتِ** (قرآن ۱۱: ۷۳) ترجمہ: ۔ کیا تم اللہ کے امر پر تعجب کرتی ہو، اے گھر والو تم پر تو اللہ کی رحمت اور برکتیں ہیں۔

اسی طرح جب حضرت موسیٰؑ ایک شیر خوار بچے کی حیثیت سے فرعون کے گھر پہنچتے ہیں تو فرعون کی بیوی کو ایسی انا کی تلاش ہوتی، جس کا دودھ بچہ پی لے۔ اس موقع پر حضرت موسیٰؑ کی بہن جا کر کہتی ہیں: ۔

ھل ادلکم علیٰ اھل بیت یکفلَونہ لکم (قرآن ۲۸: ۱۲) ترجمہ: کیا تمہیں ایسے گھر والوں کا پتہ بتادوں جو تمہارے لئے اس بچہ کی پرورش کا ذمہ لیں۔

رسول اکرم صلعم کی زندگی میں جب مسلمان آسودہ حال ہونے لگے تو ازواج مطہرات نے اپنی فقر و فاقہ کی حالت کو ختم کرنے کی خاطر اپنے خرچ میں اضافہ کا مطالبہ کیا۔ اللہ تعالیٰ کو اور رسول اکرم صلعم کو ان خواتین کا دنیا کی طرف التفات پسند نہ آیا چنانچہ سورہ احزاب کا پورا ایک رکوع (رکوع نمبر ۴) نازل ہوا۔ جس میں ازواج مطہرات کے اعلیٰ مرتبت ہونے کی وضاحت کی گئی اور ان کے لئے ضابطہ حیات مقرر ہوا۔

سورہ احزاب (۳۳) کی آیت (۳۳) میں رسول اکرم صلعم کے گھر والوں کو خطاب کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ تمہارا معاملہ عام انسانوں جیسا نہیں ہے۔ تمہارے گھر وہ ہیں جہاں اللہ کی آیتوں کی اور حکمت کی تعلیم دی جاتی ہے اس لئے تمہیں اپنی زندگی کو اس کے مطابق بنانا چاہیئے۔ اس سلسلہ میں ارشاد ہوا: ۔

"اے نبی کی بیویو! تم اپنے گھر میں قرار سے رہو اور پچھلی جاہلیت کی طرح (سج دھج) دکھاتی نہ پھرو، صلوۃ قائم کرو اور زکوۃ ادا کرو، اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اللہ چاہتا ہے کہ تم اہل بیت سے آلودگی کو دور کرے اور تم کو پوری طرح پاک کردے"۔

ازواج مطہرات دنیا کی آرائش و زینت کی طالب نہیں تھیں بلکہ اللہ اور اس کے رسول کی رضا کو طلب کرنے والی تھیں۔ اور آخرت کے درجات عالیہ کا ارادہ

رکھتی تھیں۔ ورنہ رسول اکرم صلعم اچھے طریقے سے انھیں چھوڑ دیتے اور الگ کر دیتے جیسا کہ آپ کو اللہ تعالیٰ کا حکم تھا۔ ان کو رسول اکرم صلعم نے الگ نہیں فرمایا تو معلوم ہوا کہ سب ازواج مطہرات نیک تھیں اور اللہ تعالیٰ کے مقرر کئے ہوئے معیار پر پوری اتریں جبھی تو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے اجر عظیم تیار فرمایا ہے۔ تقویٰ اور طہارت کی صفات ہی کی بناء پر ان کو ازواج مطہرات کے مبارک لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔

اس تمام رکوع میں تخاطب صرف ازواج نبی سے ہے۔ اہل فرقہ باطلہ نے اس رکوع کی صرف ایک آیت (آیت تطہیر) کے تقریباً نصف حصہ سے عجیب و غریب استدلال پیش کئے ہیں اور اس حصہ آیت کا مصداق وضعی روایات کی بناء پر جن شخصیتوں کو بنایا ہے وہ مخصوص طور پر اس کے مصداق نہیں ہیں۔

امہات المومنین کو نساء النبی کہہ کر مخاطب کیا گیا ہے۔ اور دوران آیت امہات المومنین ہی کو اہل بیت کہہ کر مخاطب کیا گیا ہے۔ اول الذکر دو آیتوں کی طرح اس آیت میں بھی اہل بیت سے مراد گھر والیاں یعنی رسول اکرم صلعم کی ازواج مطہرات ہی مراد ہیں۔ اور یہ بات اتنی واضح ہے کہ اس میں کسی اور مفہوم کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

بعض علمائے سنت نے اہل بیت سے مراد "داعی حق کے گھر والے" لیا ہے مولانا وحید الدین خاں لکھتے ہیں: ۔

"اس آیت میں اہل بیت سے مراد عام طور پر اہل بیت رسول لیا جاتا ہے اور پھر یہ غیر ضروری بحث چھیڑ دی جاتی ہے کہ اس سے مراد پیغمبر کی بیویاں ہیں یا فاطمہؓ کی اولاد۔ یہ بحثیں اس لئے پیدا ہوتی ہیں کہ آیت کو صرف خاندانی معاملوں میں لیا گیا ہے حالانکہ اس سے مراد محدود نسلی معنیٰ میں صرف خاندان نبوت نہیں بلکہ وسیع تر معنیٰ میں "خاندان دعوت" ہے "پیغمبر کے گھر والے" کا مطلب دوسرے لفظوں میں "داعی حق کے گھر والے" ہے۔ اس میں شک نہیں کہ آیت کے ابتدائی اور ظاہری مفہوم کے اعتبار سے یہاں اہل بیت کا مطلب اہل بیت رسول ہی ہے مگر یہاں یہ بتایا جارہا ہے جو شخص لوگوں کے درمیان حق کا داعی بن کر کھڑا ہو اس کے گھر کا طرز زندگی

(Life Style) دوسروں سے ممتاز اور نمونہ ہونا چاہیئے ورنہ لوگ اس کے دعوتی امتیاز کو بھی نہ سمجھ سکیں گے اور وہ لوگوں کے درمیان داعی کا مقام حاصل کرنے میں ناکام رہے گا"۔

اہل بیت میں صرف اور صرف حضرت علیؓ، حضرت فاطمہؓ اور ان کے دو بیٹوں کو شریک کرنے کا مطلق کوئی جواز نہیں ۔ جس وقت یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اکرم صلعم کی سب سے بڑی صاحبزادی حضرت زینبؓ اپنے والد محترم کے گھر میں موجود تھیں ۔ اگر بیٹیوں کو بھی اہلبیت کی تعریف میں شامل کرنا ہو تو حضرت زینبؓ کو بھی شریک کیا جانا چاہیئے ۔ حضرت رقیہؓ کے صاحب زادے عبداللہ الاکبر بن حضرت عثمانؓ بھی زندہ تھے، ان کو بھی ضرور اہل بیت میں شامل کرنا چاہیئے ۔ اگر داماد کو اہل بیت میں شامل کیا جاسکتا ہے تو حضرت عثمانؓ کو شریک کرنے کا جواز ہوگا، جو " ذی النورین " تھے ۔ یعنی رسول اکرم صلعم کی دو صاحبزادیاں یکے بعد دیگرے آپ کے نکاح میں رہیں ۔

اسی طرح حضرت فاطمہؓ کی بیٹیوں کو بھی شریک کرنا چاہیئے ۔ حضرت فاطمہؓ کی صاحبزادی ام کلثومؓ کو اس لئے شامل نہیں کیا گیا کہ وہ امیرالمومنین حضرت عمرؓ کی شریک حیات تھیں ۔ بلکہ مخالفین اسلام تو حضرت فاطمہؓ کے علاوہ حضرت زینبؓ ، حضرت رقیہؓ اور حضرت ام کلثومؓ کو تو رسول اکرمؐ کی بیٹیاں بھی تسلیم نہیں کرتے ۔ اور یہ باور کراتے ہیں کہ یہ تینوں صاحبزادیاں نعوذباللہ حضرت خدیجہؓ کے سابقہ شوہر سے تھیں ۔ حالانکہ رسول اکرمؐ کی تین یا تین سے زاید صاحبزادیاں ہونا قرآن مجید سے ثابت ہے ۔

اے نبی تم اپنی ازواج سے اور اپنی بیٹیوں سے اور اہل ایمان کی عورتوں سے کہہ دو کہ وہ اپنی چادروں سے گھونگھٹ نکال لیا کریں ۔ (قرآن ۳۳:۵۹)

بیویوں اور بیٹیوں کے لئے جمع الجمع کے صیغے استعمال ہوئے ہیں ۔ عربی میں جمع الجمع کا صیغہ تین سے کم کے لئے استعمال نہیں ہوتا ۔

اصل بات یہ ہے کہ مخالفین اسلام کو قدیم غیراسلامی تصور کے تحت صرف پانچ افراد کی ضرورت تھی جن کو مقدس بنا کر مسلمانوں کے ذہنوں پر مسلط کر دیا

جائے ۔

پنج تن کا تصور غیراسلامی ہے ۔ ہندوستان میں رام چندر جی اور ان کے اہل بیت سیتا، لچھمن لو اور کش پنج تن کہلاتے ہیں ۔ پانچ میں سے ایک خاتون تھیں ۔

حضرت نوحؑ کی قوم بھی اپنے پانچ بزرگوں کو پوجتی تھی ۔ جب ان کو توحید کی دعوت دی گئی تو وہ ناراض ہوگئے اور آپس میں کہنے لگے : ۔

لاتذرن الھتکم ولاتذرن ودا ولا سواعاہ ولا یغوث ویعوق و نسرا ہ (قرآن ۷۱ : ۲۳) ترجمہ : ۔ اپنے بزرگوں (یعنی دیوتاؤں) کو نہ چھوڑ، سواع، یغوث، یعوق اور نسر (ہمارے پنج تن ہیں) ان کو پوجنا ترک نہ کرنا ۔

ان پانچ میں بھی ایک (سواع) دیوی ہے ۔ اور بقیہ چار دیوتا ۔ یغوث، شیر کی شکل کا بت تھا ۔ اسی بناء پر مخالفین نے حضرت علیؓ کو شیر کی شخصیت دے دی ۔

اہل بیت سے مراد گھر والے ہی ہیں ۔ ظاہر ہے کہ گھر والوں میں سب سے پہلے بیوی یا بیویوں کا شمار ہوگا ۔ پھر دوسرے گھر والوں کا ۔ یعنی رسول اکرم صلعم کی صاحبزادیاں ان کی اولاد رسول اکرمؐ کے خسر صاحبان (حضرت ابوبکر ، حضرت عمر ، حضرت ابوسفیان) تمام بنی ہاشم اور تمام صحابہ کرام ۔ یہی علمائے اہل سنت کا موقف ہے ۔

اہل بیت کا جو تصور فرقہ اہل باطل پیش کرتے ہیں اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ رسول اکرمؐ آفاقی پیام لے کر نہیں آئے تھے بلکہ اہل بیت لے کر آئے تھے ۔ آیت تطہیر کا یہ مفہوم لیا جاتا ہے کہ گویا اس کے ذریعہ خاندان کے ایک حصہ کا درجہ بلند کرنا یا فضیلت پیش نظر ہے ۔

حالانکہ اس آیت کا مقصد ضابطہ کردار (Code Of Conduct) تجویز کرنا تھا ۔ اور گھر والوں کے لئے قیود، بندشیں اور ذمہ داریاں عائد کرنا تھا تاکہ ان کی ذراسی لغزش سے نوخیز تحریک (اسلام) کو جو دشمنوں سے گھری ہوئی تھی نقصان نہ پہنچنے پائے اور مخالفین کو انگشت نمائی کا موقع نہ ملے ۔ ذمہ داریوں میں ازواج مطہرات کے ساتھ نسبی تعلق کی وجہ سے ان پانچ افراد کو بھی شامل کیا گیا ہے ۔ اس کا ہرگز یہ مقصد نہ تھا کہ چند افراد خاندان کو خصوصیت دی جاکر ان کا درجہ

بڑھایا جائے یا ان کو ازلی معصوم اور پاک بتلایا جائے ۔ اس آیت کی وضاحت کے سلسلہ میں عقائد باطلہ کے زیر اثر ایسی باتیں بیان کی جاتی ہیں جو اسلام کے بنیادی کردار کے خلاف ہیں:

جب آیت تطہیر نازل ہوئی تو رسول اکرم صلعم نے فاطمہ، حسن، حسین کو بلایا اور ان کو اپنی چادر میں ڈھانک لیا ۔ حضرت علیؓ آپ کے پیچھے کھڑے تھے ۔ پھر آپؐ نے فرمایا: ۔

اللھم ھولاء اھل بیتی فاذھب عنھم الرجس وطھرھم تطھیرا ۔

ترجمہ: ۔ اے اللہ! یہ لوگ بھی تو میرے اہل بیت ہیں، ان سے بھی نجاست دور فرمادیجئے ۔ اور ان کو بھی پاک و صاف فرمادیجئے ۔

حضرت ام سلمیٰؓ بولیں: ۔ "اے اللہ کے نبیؐ میں بھی ان کے ساتھ شامل ہوں؟"

تو آپؐ نے فرمایا: ۔ "تم اپنی جگہ پر ہی رہو، تم تو بھلائی پر ہو ہی" (یعنی تم کو تو یہ دولت بغیر مانگے مل چکی ہے اور اس آیت کا اصل مصداق تو تم ازواج ہی ہو) یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب آیت تطہیر میں تخاطب صرف ازواج مطہرات سے ہے تو پھر کیا وجہ تھی کہ رسول اکرمؐ نے حضرت فاطمہؓ اور حضرت علیؓ اور حسنینؓ کو بھی اہل بیت میں شامل کیا ۔ ایسا اس خیال سے کیا گیا کہ جو ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے امہات المومنین پر عائد کی اس میں ان چار شخصیتوں کو بھی رکھا جائے ۔

آیت تطہیر کا مصداق صرف ازواج مطہرات ہیں ۔ کیونکہ قرآن مجید میں اس آیت سے پہلے ازواج مطہرات کا ہی ذکر ہے ۔ چونکہ نزول آیت کے موقع پر رسول اکرم صلعم نے فاطمہ حضرات حسنین و علیؓ کو اپنی چادر میں جمع فرماکر ان کو بھی اہل بیت فرمایا اور ان کے لئے بھی تطہیر کی دعا فرمائی جو اللہ کی طرف سے ازواج مطہرات کو بغیر مانگے مل چکی تھی ۔ اس لئے حضرت فاطمہؓ حضرات حسنینؓ اور حضرت علیؓ کو بھی اہل بیت میں شمار کیا جاسکتا ہے لیکن فرق صرف اتنا ہے کہ ان پر اہل بیت کا اطلاق بربنا حدیث ہوگا، جب کہ ازواج مطہرات پر اہل بیت ہونے کا اطلاق نص قرآن کی بنیاد پر ۔

لفظ اہل بیت ازروئے قواعد و لغت عرب و محاورہ قرآنی زوجہ کے لئے

مخصوص ہے فرقہ اثنا۔ عشری نے ازواج کو تو اہل بیت سے خارج کر دیا اور جن لوگوں کو رسول اکرم صلعم نے مجازی طور پر اہل بیت میں شامل کیا تھا ان کے لئے (ان میں سے بھی چند کے لئے) اس لفظ کو خاص کر دیا ۔

اہل بیت کے تعلق سے علمائے اہل سنت کے واضح نقطہ نظر کے باوجود اہل سنت عوام نے ہر دو امور کو تسلیم کر لیا ۔ یعنی وہ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اہل بیت سے ازواج مطہرات مراد ہیں، لیکن ساتھ ہی فرقہ اثنا۔ عشری کے تراشیدہ مصنوعی اور مختص اہل بیت بھی اہل سنت عوام کے دماغوں پر اس بری طرح مسلط ہوگئے ہیں کہ اصل اہل بیت پس پردہ چلے گئے ۔

اہل فرقہ اثنا۔ عشری ایک طرف صرف پانچ افراد کو اہل بیت سے مختص کرتے ہیں اور دوسری طرف سورہ احزاب کی آیت (۳۳) کے حوالہ سے یہ خیال پیش کرتے ہیں کہ اہل بیت کو اللہ تعالیٰ نے پاک کر دیا ہے اس میں اتنا غلو کیا جاتا ہے کہ ان سب نفوس کو پاک اور معصوم تصور کیا جاتا ہے ۔ جن سے کوئی گناہ تو ایک طرف خطا اور لغزش بھی نہیں ہوسکتی ۔ جو خصوصیت انبیاء علیہم السلام کو حاصل ہے اس کا اطلاق خاندان نبوت کے مخصوص افراد پر کرتے ہیں ۔ حالانکہ اس آیت کا مفہوم واضح ہے کہ اللہ چاہتا ہے کہ ان کو پاک کر دے ۔ اس لئے ان کے لئے چند قیود اور ضوابط مقرر کئے اور ان لوگوں نے (یعنی ازواج مطہرات) صحابہ وغیرہ نے اپنا پاک اور مثالی کردار پیش کیا جس سے اسلام کا بول بالا ہوا ۔ ان تمام نفوس نے بحیثیت انسان اپنے اعلیٰ کردار کا مظاہرہ کیا ۔ یہ نہ تو مافوق الفطرت ہستیاں تھیں، نہ ان کی پیدائش نور سے ہوئی تھی اور نہ ہی ان کو معصوم عن الخطا پیدا کیا گیا تھا ۔

اہل سنت جماعت کو مخصوص افراد ہی کو اہل بیت شمار کرنے پر اعتراض ہے اصلی اہل بیت یعنی ازواج مطہرات اور دوسرے اہل خاندان کے ساتھ ذمہ داری عائد کرنے کے تصور کے ساتھ ان چار افراد کو شامل کرنے پر کوئی اعتراض نہیں ورنہ جہاں تک فضیلت کا تعلق ہے امت کی ماؤں کی برابری کون کر سکتا ہے؟

یہاں یہ صراحت ضروری ہے کہ آل اور اہل دونوں لفظ ایک ہی ہیں ۔ لفظ آل کی تصغیر اہل آتی ہے ۔ قرآن مجید کی آیت (۳۳:۳۳) میں اگرچہ اہل بیت سے مراد

بالخصوص ازواج مطہرات ہیں لیکن احادیث میں لفظ اہل یا آل زیادہ وسیع معنوں میں آیا ہے۔

۱۔ ازواج النبی بروئے قرآن مجید مخاطب بہ اہل بیت ہیں۔ حدیث میں لفظ آل ازواج کے لئے بھی آیا ہے۔

۲۔ یہ لفظ جملہ بنو ہاشم کے لئے آیا ہے، جن پر صدقہ لینا حرام ہے۔

۳۔ آل عباس بھی بروئے ارشادات نبوی داخل اہل بیت ہیں۔

۴۔ یہ لفظ رسول اکرمؐ کی ذریت کے لئے بھی آیا ہے۔

آل رسول، آل محمدؐ اور آل عباس تینوں اصطلاحات اپنی ترکیب اور رائج مفہوم کے اعتبار سے غیر قرآنی ہیں۔ قرآن مجید میں لفظ آل ۲۵ مرتبہ استعمال ہوا ہے۔ اور ہر مرتبہ کسی معروف شخصیت کے ساتھ بطور مضاف کے استعمال ہوا ہے۔

۱۔ چودہ مرتبہ فرعون کے ساتھ

۲۔ تین مرتبہ حضرت لوط علیہ السلام کے ساتھ

۳۔ دو مرتبہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ

۴۔ دو مرتبہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے ساتھ

۵۔ ایک ایک مرتبہ حضرت موسیٰؑ، حضرت ہارونؑ اور حضرت داؤد علیہ السلام کے ساتھ

۶۔ ایک مرتبہ بی بی مریم کے والد عمران کے ساتھ

ان تمام ۲۵ مقامات پر آل کا لفظ گروہ، جماعت، پیروکار، قوم، اور طرفدار کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ بعض مقامات پر اولاد کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ لیکن وہاں بھی پیروکاری کا وصف نمایاں ہے۔ کسی ایک جگہ بھی مجرد اولاد یا قرابت دار کے لئے لفظ آل کا اطلاق نہیں کیا گیا

دوسری اہم بات یہ ہے کہ لفظ آل کو قرآن مجید میں کسی ایک مقام پر بھی اور کسی معنی میں بھی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ استعمال نہیں کیا گیا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آل محمدؐ کا مروجہ مفہوم بعد کی پیداوار اور خود ساختہ ہے۔

احادیث میں آل محمدؐ کے الفاظ موجود نہیں لیکن رسول اکرمؐ نے جن دعاؤں

اور ارشادات میں "آل محمدؐ" کے الفاظ استعمال فرمائے ہیں۔ ان میں مومنین مخلصین ملت سب شامل ہیں۔

رحمت العالمین کے فیض عام کو مخص افراد کے لئے مخصوص کرنا شان رسالت اور اسلامی تعلیمات کے سراسر منافی ہے۔

رسول اکرمؐ کی حدیث میں تَبِعَ سُنّتی فَھُوَ آلی (جس نے میری اتباع کی وہ میری آل ہو گیا) سے لفظ آل کے مفہوم کی پوری وضاحت ہوتی ہے

(اہل بیت رسول اور "عترت رسول" سے اقتباس)

اہل سنت والجماعت

اسلام میں فرقہ پرستی کا کوئی مقام نہیں۔ قرآن مجید کا حکم ہے:۔ واعتصموا بحبل اللہ جمیعاً ولا تفرقوا (۳: ۱۰۳)

سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑ لو اور باہم تفرقہ نہ پیدا کرو

ان الذین فرّقوا دینکم وکانوا شیعاً لست منھم فی شئی (۶: ۱۵۹) جن لوگوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور گروہ گروہ بن گئے یقیناً ان سے تمہارا واسطہ نہیں۔

من الذین فرقوا دینھم وکانوا شیعا (۳۰: ۳۶)

(ان مشرکین میں سے نہ ہو جاؤ) جنھوں نے اپنے دین میں تفرقہ ڈالا اور گروہ گروہ بن گئے۔

عام طور پر دین کو ایک ایسے کل کی حیثیت سے ادارک کیا جاتا ہے جو متعدد فرقوں، متضاد عقائد کا مجموعہ ہے، حالانکہ ایسا سمجھنا بالکل غلط ہے۔

فرقہ پرستی کی ابتداء اہل باطل نے کی، ۷۳ فرقوں والی روایت فرقہ اہل باطل کی خود ساختہ ہے حضرت علیؓ کی خلافت کے آخری دنوں میں مسلمانوں میں تین گروہ پیدا ہو چکے تھے۔ ایک گروہ حضرت علیؓ کا طرفدار تھا اور ان کو برحق مان کر پوری طرح

ان کا حامی و مددگار تھا۔ اور شیعان علیؓ کہلاتا تھا۔ دوسرا گروہ اہل شام کا تھا اور حضرت معاویہؓ بن ابوسفیان کی تائید کرتا تھا۔ اور تیسرا گروہ خارجیوں کا تھا۔ یہ شیعان علیؓ ہی کی ایک جماعت تھی جنگ صفین کے موقعہ پر حضرت عمرؓ بن العاص کے مشورہ پر حضرت معاویہؓ نے صلح کی پیش کش کی تو حضرت علیؓ نے پیام صلح کو فوراً منظور کر لیا اور تحکیم پر راضی ہوگئے۔ حضرت علیؓ کے حکم کی تعمیل میں تمام محاذوں پر جنگ بند ہوگئی۔ سبائیوں کا ایک گروہ مالک بن اشتر کی سرکردگی میں جنگ بندی کا مخالف تھا اس نے حضرت علیؓ کی بات نہ مانی اور جنگ جاری رکھی۔ یہ کہنا کہ خارجی جنگ بندی چاہتے تھے تاریخ کا مغالطہ ہے جب مالک اشتر نے جنگ کو جاری رکھا تو شیعان علی کے ایک گروہ میں یہ شبہ پیدا ہوگیا کہ حضرت علیؓ نے ظاہر میں تو جنگ بندی سے اتفاق کر لیا ہے لیکن اندرونی طور پر جنگ جاری رکھنے کی ہدایت دی ہے۔ ان شیعان علی نے حضرت علیؓ کو قتل کی دھمکی دی۔ شیعان علی کا دوسرا گروہ امت میں اختلاف کو ہوا دینا چاہتا تھا۔ تشدد پر اس کو یقین تھا۔ ریاکارانہ عبادت کی بنا پر سبائیوں میں قراء کا امتیازی لقب رکھتا تھا اس گروہ کے فتنہ پرور دماغ نے اپنی پارٹی کا مفاد اس میں دیکھا کہ جنگ جاری رہے۔ اس گروہ نے صفین کے موقع پر حضرت علیؓ سے غداری یا بے ادبی نہیں کی۔ اس نے بعد کو بغاوت کی اور ان کو خوارج کا نام دیا گیا۔ سبائیوں نے غلط طور پر یہ مشہور کر دیا کہ صفین کے موقع پر اسی گروہ نے حضرت علیؓ کے ساتھ بے ادبی کی تھی۔ خارجی حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ ہر دو کے سخت مخالف تھے۔ یہ تینوں گروہ ایک دوسرے کے دشمن اور ایک دوسرے سے برسرپیکار تھے۔ اختلاف کی بنیاد زیادہ تر سیاسی تھی۔ شیعان علیؓ اور حامیان معاویہ دونوں میں صحابہ اور صالحین شریک تھے۔ سیاسی اختلاف کی وجہ سے الگ الگ گروہ میں منقسم تھے۔ عجمیوں نے ملت کا شیرازہ بکھیرنے کی سازش کے تحت سیاسی اختلافات کو مذہبی عقائد کا رنگ دے دیا۔ اور فرقہ باطلہ کے نظریہ کے تحت مختلف فرقے وجود میں آئے۔ جیسے شیعان علیؓ، زیدیہ، امامیہ، اسماعیلیہ وغیرہ۔ ان تمام فرقوں کے ذریعہ اسلام میں شخصیت پرستی کی ابتداء ہوئی۔ اور مجوسی عقائد کسی نہ کسی شکل میں مسلمانوں میں منتقل ہوئے۔ (اظہار حقیقت سے اقتباس)

ابتدائی زمانہ میں باہمی مخالفتیں سیاسی تھیں۔ اس لئے جو لوگ حضرت علیؓ کے طرفدار تھے وہ خلفائے ثلاثہ کی فضیلت کے پوری طرح معترف تھے۔ بعد میں جب مجوسیوں نے حضرت علیؓ سے ایسے فضائل متعلق کرنے کی کوشش کی جو ان میں نہ تھے تو خلفائے ثلاثہ کو بے حیثیت اور کمتر ظاہر کرنا ضروری ہوا جس کے بغیر حضرت علیؓ کی مبینہ بڑائیاں نمایاں نہیں ہوسکتی تھیں اس طرح یہ فرقہ ع

گر فرق مراتب نہ کنی زندیقی

کا مرتکب ہوا۔

ایک اور گروہ معتزلہ کا تھا۔ معتزلہ کے عقائد کی بنیاد سیاسی اختلافات نہ تھی بلکہ فکری تھی۔ معتزلہ ابتداً بصرہ میں متشکل ہوئے بعد میں بغداد کو ان کے مرکز کی حیثیت حاصل ہوئی کچھ عرصہ بعد معتزلہ شیعیت سے متاثر ہوئے اور کٹر قسم کے شیعہ بن گئے۔ مثلاً ابو جعفر اسکافی اور اس کا بیٹا ابن الاسکافی۔

امت مسلمہ پہلی مرتبہ ایک عجیب صورت حال سے دوچار ہوئی۔ مسلمانوں نے محض ردعمل کے طور پر عقائد باطلہ کی مخالفت کی۔ اس سلسلہ میں "عثمانیہ" کی اصطلاح رائج ہوئی۔ جاحظ (وفات ۲۵۵ ہجری) نے "العثمانیہ" کے عنوان سے ایک کتاب لکھ کر دینی عقائد اور افکار کا دفاع کیا۔ یہ کوئی علیحدہ فرقہ نہ تھا۔ ان دینی اقدار کی تائید کی گئی، جن کی اموی دور تک پابندی کی جاتی تھی۔ محض "عثمانیہ" کے نام سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ شیعان علیؓ کے مقابلہ میں حضرت عثمانؓ کی پارٹی بنائی گئی تھی ایسا ہرگز نہ تھا۔ جاحظ کی "العثمانیہ" میں صرف دو جگہ حضرت عثمانؓ کا نام لیا گیا ہے۔ تشیع کے رد میں یہ بنیادی عقیدہ پیش کیا گیا کہ خلفا کو ان کی ترتیب کے اعتبار سے ایک دوسرے پر ترجیح دی جائے۔ جاحظ کے زمانہ تک "العثمانیہ" کے اصطلاح امت مسلمہ کے سواد اعظم کے لئے عمومی طور پر رائج تھی۔ جس کے عقائد کا جاحظ نے العثمانیہ میں دفاع کیا ہے۔

اکابر صحابہ کے فیصلہ کے بعد جو بمقام اذرح صادر کیا گیا تھا جب حضرت معاویہؓ کی خلافت قائم ہوئی تو اس سال کو عام السنت کہنے لگے اور جب حضرت حسنؓ حضرت معاویہؓ کے حق میں دستبردار ہوگئے تو پھر ساری امت ایک

عرصہ بعد پھر ایک امیر کے تحت آ گئی تو اس سال کو عام الجماعت کہنے لگے۔ اس طرح امت کے لئے اہل سنت والجماعت کی اصطلاح استعمال ہوئی لیکن ۲۰۰ ہجری تک اہل سنت کی اصطلاح مستعمل نہ تھی۔ ۲۰۰ ہجری کے بعد اہل حدیث اور اہل سنت والجماعت کی اصطلاحات رائج ہوئیں۔

مذہب اہل سنت، عثمانیہ کے مفہوم سے عدول کر کے حتمی طور پر تیسری صدی ہجری کے اوائل میں تشکیل پایا۔ اس دور میں بعض علما ان خیالات کے حامل تھے جو بعد میں اہل سنت کے عقائد قرار پائے۔

فرقہ ہائے باطلہ کے مقابل اہل سنت کی اصطلاح استعمال کر کے ایک علیحدہ فرقہ تشکیل دینا وقت کا تقاضہ تو تھا لیکن بعض وجوہات کی بناء پر شائد درست نہ تھا۔ وہ وجوہات یہ ہیں:۔

۱۔ جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے اسلام میں فرقہ پرستی کی گنجائش نہیں، اور فرقہ بندی اسلام میں ایک اجنبی پودہ ہے۔

۲۔ علیحدہ علیحدہ فرقے بن جانے سے دین کی عظمت متاثر ہوئی۔

۳۔ جب خود اہل سنت کا ایک علیحدہ فرقہ بن گیا تو پیروؤں کے عقائد کا منبع دین کی بجائے فرقہ بن گیا۔

۴۔ فرقہ اہل سنت مسلمانوں کے سواد اعظم کے عقائد کا ترجمان تھا لیکن اس فرقہ کے قائد وقتاً فوقتاً دوسرے فرقوں کے عقائد سے متاثر ہوتے رہے۔

اگر غور سے دیکھا جائے تو وہی جماعت برحق ہے جس کا ایمان قرآن مجید پر ہے اور جو رسول اکرمؐ کے طریقہ پر ہے۔ یہی اسلام ہے اور یہی تمام فرقوں اور گروہوں سے الگ ہے۔ اہل باطل کے مقابلہ میں اہل سنت کی اصطلاح ایک ضرورت کے تحت استعمال کی گئی یعنی تاریخی عوامل کی بناء پر اس سواد اعظم کو اہل سنت کہا گیا۔ اس حد تک یہ تخصیص درست ہے لیکن اس وسیع جماعت میں مختلف العقائد عناصر شامل تھے اس لئے خود اہل سنت کے عقائد و اعمال کے تعین میں گڑبڑ واقع ہوئی۔

اب یہ صورت حال پیدا ہو گئی ہے کہ بدقسمتی سے خود اہل سنت کے مختلف مسلکوں کو علیحدہ فرقے تصور کیا جا رہا ہے۔ جو مسلک دین سے قریب ہیں ان کو

علیحدہ فرقے وہابی وغیرہ کہا جا رہا ہے اور جس مسلک پر باطل فرقوں کے اثرات زیادہ ہیں اس کو اہل سنت والجماعت کہا جا رہا ہے۔ حالانکہ ابتداً فرقہ اہل سنت والجماعت کی اصطلاح باطل فرقوں کے مقابل استعمال کی گئی تھی۔ اس صورت حال سے باطل فرقوں کو تقویت حاصل ہو گئی ہے۔

اس لئے اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ اکابرین سلف کے پاکیزہ طرز اور ان کے رہنمایانہ ہدایات کو سامنے رکھ کر باطل فرقوں کے مقابلہ میں اہل سنت والجماعت کا واضح تصور مسلمانوں کے سامنے رکھا جائے۔

بہ الفاظ دیگر اہل سنت والجماعت کو اصل دین کے ترجمان کی حیثیت سے باطل فرقوں کے مقابلہ میں پیش کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ ایک افسوس ناک حقیقت ہے کہ امت مسلمہ بے شمار فرقہ ہائے باطلہ میں بٹی ہوئی ہے اور خود مسلمانوں کے عقائد پر ان باطل فرقوں کا گہرا اثر ہے۔ آج صورت حال کچھ اس نوعیت کی ہے۔

شمعیں تو جل رہی ہیں سو بزم میں روشنی نہیں

("اہل سنت والجماعت کی حقیقت" سے اقتباس)

بداء

علاوہ تقیہ کے ایک تقیہ کی دم بھی شیعوں کے اگلے بزرگوں نے قائم کی تھی، جسے اب حضرات شیعہ نے ضرورت نہ ہونے کے سبب کاٹ ڈالا ہے۔ اور تقیہ کو دم بریدہ کر دیا۔ وہ دم کیا تھی؟۔ بداء۔

اس کا حال یہ ہے کہ جب اس مذہب کے پیشوا ائمہ کرام کی خدمت میں جاتے تو باہر آ کر اپنے پیروؤں سے کہتے کہ آج امام نے فرمایا ہے کہ:۔

اب بہت جلد سلطنت شیعوں کو ملتی ہے۔ اس کے لئے معیاد بھی مقرر کر دیتے جب وہ معیاد ہو جاتی اور کچھ ظہور اس وعدہ کا نہ ہوتا اور لوگ پوچھتے تو وہ حضرات کہتے

کہ امام نے فرمایا:۔
اللہ کو بداء ہوا ہے۔یعنی اب اس نے پہلی تجویز کو بدل دیا ہے۔اور اس نے وقت بدل دیا ہے۔

جب کوئی امام کے سامنے ان پیشواؤں کے حالات بیان کرتا تو امام ان پیشواؤں سے بیزاری ظاہر کرتے اور لعنت کرتے۔

پھر کوئی شخص ان پیشواؤں سے اس بات کو بیان کرتا تو کہتے:۔
امام نے تمہارے ساتھ "خیرات نورہ" کا عمل کیا ہے۔سننے والا حیران رہ جاتا اور پوچھتا "خیرات نورہ" کیا ہے تب کہتے کہ تقیہ۔

جب وہ پیشوا امام کی طرف سے کسی سے کچھ وعدہ پورا نہ ہوتا تو کہہ دیتے کہ اللہ کو بداء ہوا۔یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنی رائے بدل دی اور جب کوئی شک کرتا تو کہتے کہ تم نہیں جانتے ہو، اس میں مصلحت تھی۔اور اللہ کی مصلحت جو سوائے اللہ کے یا امام کے کوئی نہیں جانتا۔اور کیا تعجب کرتے ہو۔بداء ایک قسم کی نسخ ہے۔

دیکھو شریعتوں میں احکام اللہ نے بدل دیئے اور ایک کو دوسرے حکم سے منسوخ کر دیا۔پس چپ رہو۔اللہ کی باتوں میں چوں وچرانہ کرو۔"بداء پر یقین کرنا، ہزاروں درجات اور ثواب کا باعث ٹھہرا۔اور اس پر یقین نہ کرنا، نقص ایمان کی دلیل ٹھہرا۔بلکہ کہا گیا بداء کو اللہ نے اسی واسطے تجویز کیا ہے کہ اس پر یقین یا شبہ کرنے سے ایمان کا امتحان ہو۔

بداء کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو بہت سی چیزوں کا علم اس کے وقوع کے بعد ہوتا ہے۔اللہ تعالیٰ ایک ارادہ کرتا ہے اور اس کے وقوع کی خبر بھی دیتا ہے مگر کسی عارضہ کی وجہ سے اسے منسوخ قرار دیتا ہے اور وعدہ کر چکنے کے باوجود ایفائے عہد نہیں کرتا۔بروایت یعقوب کلینی۔

"ابو حمزہ ثمالی کہتے ہیں کہ میں نے جعفر صادق کو کہتے ہوئے سنا کہ اے صادق اللہ نے ستر سال کے اندر اندر امام مہدی کے ظہور کا وقت مقرر کیا تھا مگر جب حسینؓ قتل ہو گئے تو اہل زمین پر اللہ کا غضب سخت ہو گیا اور اس نے امام کے ظہور کو ۱۴۰ھ تک موخر کر دیا۔ہم نے تم سے یہ بیان کیا تو تم نے اس بات کو مشہور کر کے

راز فاش کر دیا۔اس کے بعد امام مہدی کے ظہور کا وقت اللہ نے ہمیں بھی نہیں بتایا اللہ جس بات کو چاہتا ہے مٹاتا ہے جسے چاہتا ہے باقی رکھتا ہے۔(اصول کافی)
اب شیعوں نے گھبرا کر بداء کا ارادہ ترک کر دیا۔" جاننا چاہئے کہ کوئی شخص اس کا قائل ہو کیونکہ اس سے لازم آتا ہے کہ باری تعالیٰ جاہل ہو (کتاب اساس الاصول) از قبلہ المجتہدین وآیتہ اللہ فی العالمین۔مطبوعہ لکھنو)
اس سے یہ ثابت ہو گیا کہ بداء کے معنی اللہ تعالیٰ کو جاہل جاننا ہے (آیات بینات اور عترت رسول صفحات ۲۸و۳۱ سے اقتباس)۔

بدعت

لغت میں ہر نئے کام کو بدعت کہتے ہیں۔اسی سے بدیع مشتق ہے جو اللہ تعالیٰ کا صفاتی نام ہے۔لیکن اصطلاح شریعت میں بدعت ہر اس کام کو کہا جاتا ہے جسے دین سمجھ کر یا حصول ثواب کی نیت سے اختیار کیا جائے اور جو کتاب و سنت اور اسوہ صحابہ سے ثابت نہ ہو۔سنت و بدعت باہم متقابل اصطلاحات ہیں۔جب کہا جائے کہ فلاں چیز سنت ہے تو اس کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ یہ بدعت نہیں اور جب کہا جائے کہ یہ بدعت ہے تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ وہ خلاف سنت ہے۔دنیوی ایجادات کو نہ شریعت میں بدعت کہتے ہیں اور نہ شریعت انہیں منع کرتی ہے۔رسول اکرمؐ کا ارشاد ہے۔

جس نے ہمارے اس دین میں کوئی ایسی نئی بات ایجاد کی جو اس دین میں نہ ہو تو وہ رد ہے۔(بخاری۔مسلم۔ابوداؤد۔ابن ماجہ)

یہ نکتہ بھی ذہن نشین رہے کہ جس طرح رسول اکرمؐ کا قول و فعل سنت ہے اسی طرح جس فعل کو رسول اکرمؐ نے اختیار نہ فرمایا ہو اس کا ترک کرنا بھی سنت ہے اور اسے اختیار کرنا بدعت ہے۔کیوں کہ اگر اس فعل میں کوئی خوبی ہوتی اور اس فعل سے کچھ ثواب حاصل ہوتا یا اس کا کرنے والا اللہ تعالیٰ کی جانب سے کسی اجر کا

مستحق ہوتا تو رسول اکرمؐ ایسے عمل کو ضرور انجام دیتے اور ہرگز ترک نہ فرماتے۔

اسلام کو بطور دین اللہ تعالیٰ نے مکمل کر دیا۔ اب اس میں تاقیامت کسی ترمیم و تنسیخ یا حذف و اضافہ کی کوئی ضرورت باقی نہیں۔ اب جو شخص دین میں کسی ایسے امر کا اضافہ کرتا ہے جس کی تعلیم اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ نے نہ دی ہو تو گویا وہ اس بات کا مدعی ہے کہ اسلام ایک نامکمل دین ہے۔

بدعت اختیار کرنے سے رسول اکرمؐ پر اتہام لازم آتا ہے کہ انھوں نے دین میں (نعوذباللہ) اخفا سے کام لے کر فرض رسالت میں خیانت کی۔ چنانچہ امام مالک (وفات ۱۷۹ھ) فرماتے ہیں۔

جس نے اسلام میں کوئی بدعت جاری کی اور وہ اسے اچھے کام تصور کرتا ہو تو گویا وہ دعویٰ کر رہا ہے کہ رسول اکرمؐ نے رسالت کی ادائیگی میں خیانت کی۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

"آج ہم نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا"۔ (سورۃ المائدہ: ۳)

اس کے بعد دین میں کمی ہو سکتی ہے نہ کسی اضافہ کی گنجائش ہے۔ اور جو شئے اس روز دین نہ تھی وہ آج بھی دین نہیں ہو سکتی۔

علامہ حسام الدین علی المتقی الحنفی (وفات ۹۷۹ھ) لکھتے ہیں۔

بلکہ اس میں (بدعت میں) اسلاف پر ایک قسم کا طعن اور ان کی ملامت و مذمت ہے کہ انھوں نے احکامات دین و بیان نہیں کئے بلکہ نبی کریمؐ پر بھی اعتراض ہے کہ آپ نے دین کو ناقص چھوڑ دیا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ پر بھی اعتراض ہے کہ اس نے شریعت کی تکمیل نہیں کی۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے آج ہم نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا"

ایسی احادیث نبوی موجود ہیں جن میں رسول اکرمؐ نے بدعت کی مذمت فرمائی ہے۔ جابر بن عبداللہ سے روایت ہے کہ رسول اکرمؐ نے ارشاد فرمایا:۔

اس کے بعد سب سے بہترین بات کتاب اللہ ہے اور سب سے بہترین ہدایت محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ہدایت ہے۔ اور سب سے بدترین کام نئی باتیں ہیں۔ اور نئی بات گمراہی ہے۔ (مسلم۔ نسائی۔ ابن ماجہ)

رسول اکرمؐ نے فرمایا۔

سحقا سحقا لمن غیر بعدی پھٹکار پھٹکار ان لوگوں کے لئے جنھوں نے میرے بعد میرا طریقہ بدل ڈالا (متفق علیہ مشکوۃ)

ایک دفعہ تین صحابہ ازواج مطہرات کی خدمت میں حاضر ہوئے اور رسول اکرمؐ کی عبادت کی کیفیت دریافت کی۔ ازواج مطہرات نے رسول اکرمؐ کی عبادت کا یہ حال بیان کیا تو ان حضرات نے اسے قلیل تصور کرتے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار یوں کیا کہ اللہ تعالیٰ نے تو آپ کے اگلے پچھلے گناہ معاف فرما دیئے ہیں ایک نے کہا میں ہمیشہ تمام رات صلوۃ ادا کروں گا۔ دوسرے نے کہا میں دائم الصوم رہوں گا۔ اور افطار نہ کروں گا۔ تیسرے نے کہا میں عورتوں سے جدا رہوں گا۔ کبھی نکاح نہ کروں گا۔ اتنے میں رسول اکرمؐ تشریف لائے اور ان اصحاب کے بظاہر نیک تصورات سن کر فرمایا" اللہ کی قسم میں تم سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا اور تم سے زیادہ متقی ہوں لیکن صلوۃ بھی ادا کرتا ہوں اور سوتا بھی ہوں۔ روزہ بھی رکھتا ہو اور افطار بھی کرتا ہوں۔ اور نکاح بھی کرتا ہوں تو جس نے میری سنت سے اعراض کیا وہ میری امت میں سے نہیں۔

ان صحابہ نے دین میں کسی نئی عبادت کا خیال نہیں کیا تھا بلکہ ان اعمال میں جو شریعت سے ثابت تھے ان میں انفرادی طور پر اضافہ کا تصور کیا تھا لیکن رسول اکرمؐ نے اسے اپنی سنت کے منافی تصور کیا اور اس کی مخالفت فرمائی۔ اور ایسے افراد کو اپنی امت سے خارج قرار دیا۔

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرمؐ نے ایک کام کیا اور لوگوں کو اس کی اجازت دی لیکن کچھ لوگوں نے اسے خلاف دین داری تصور کرتے ہوئے اس سے گریز فرمایا۔ جب رسول اکرمؐ کو اس کی اطلاع ملی تو آپ نے فرمایا۔" لوگوں کو کیا ہو گیا کہ وہ ایک ایسی بات سے احتراز کرتے ہیں جسے میں اختیار کرتا ہوں۔ اللہ کی قسم میں ان سے زیادہ اللہ کو جاننے والا اور ان سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا ہوں۔" یہاں کسی اضافہ کا تصور نہیں بلکہ ایک قسم کی کمی کا تصور ہے۔ ان احادیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ سنت رسولؐ میں کسی قسم کی کمی اور بیشی دونوں منع ہیں۔ اس کی منطقی

وجہ یہ ہے کہ اگر کسی سنت میں انفرادی طور پر ہی کسی کو اضافہ کی اجازت دی جائے تو کچھ ہی عرصہ میں وہ عام ہوجائے گی اور اسی کو عام طور پر دین تصور کیا جائے گا اور اس کے برخلاف عمل گناہ تصور کیا جائے گا۔یہی صورت کسی بات سے گریز کی ہوگی کہ کچھ عرصہ اسے حرام تصور کیا جائے گا۔اس طرح سنت ختم ہوجائے گی۔

بدعت کے مذموم ہونے کی ایک وجہ یہ ہے کہ بدعت سے دین میں تحریف و تغیر لازم آتا ہے۔بدعت کے علاوہ آدمی جو بھی گناہ کرتا ہے اسے یہ احساس ہوتا ہے کہ میں ایک غلط کام کر رہا ہوں مگر بدعت ایسا منحوس گناہ ہے کہ کرنے والا اس کو غلطی سمجھ کر نہیں بلکہ اچھا ہی سمجھ کر کرتا ہے اور شیطان اس گناہ کو اس کی نظر میں خوبصورت بنا کر پیش کرتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ گناہ گاروں کو توبہ کی توفیق ہوجاتی ہے مگر بدعت کے مریض کو شفا نہیں ہوتی سوائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ کی خاص رحمت سے بدعت کی برائی اس کے سامنے کھل جائے۔

موجودہ دور میں تمام بدعات کی یہی صورت ہے کہ ان کے ترک کو گناہ تصور کیا جانے لگا ہے۔اور جو ان بدعات سے منع کرتا ہے۔اسے دین سے خارج قرار دیا جاتا ہے۔حالانکہ جن باتوں کو اہل بدعت دین تصور کر رہے ہیں وہ سرے سے دین ہی نہیں۔

یہ امر ذہن نشین رہے کہ ہمیشہ بدعات کو اچھا سمجھ کر ہی اختیار کیا جاتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ انسانی طبیعت اسے ترک کرنے پر آمادہ نہیں ہوتی۔

تاریخ شاہد ہے کہ دور صحابہ کے بعد عجمی اثرات کے تحت جس شدومد سے احادیث وضع کی گئیں ان کی تعداد اصل احادیث کی تعداد سے بھی کہیں زیادہ ہے۔مختلف طبقوں نے اس کام کو انجام دیا۔فرقہ اہل باطل اور صوفیاء نے لاکھوں احادیث وضع کیں۔اس طرح امت مسلمہ کے عقائد اور اعمال کی ہیئت اور صورت ہی بدل کر رہ گئی۔اور روز بروز اس بگاڑ میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

رسول اکرمؐ نے فرمایا:۔

"میں تمہیں اللہ سے ڈرنے اور اطاعت کرنے کی وصیت کرتا ہوں خواہ حبشی غلام ہی حکم کیوں نہ دے۔تم میں سے جو میرے بعد زندہ

رہے گا وہ زبردست اختلاف دیکھے گا تم میری سنت اور ان خلفاء کی سنت کو لازم پکڑ لو اور نئی باتوں سے بچو۔کیونکہ ہر نئی بات بدعت اور ہر بدعت گمراہی ہے اور ہر ایک گمراہ آگ میں جائے گا"۔

صحابہ کا یہ عمل رہا کہ وہ ہمیشہ سنت کے نفاذ کے لئے کوشاں رہے۔دین میں کوئی نئی بات دیکھتے تو اعتراض کرتے۔حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے ایک بار مسجد میں ذاکرین کی ایک جماعت کو دیکھا جو حلقہ بنائے بیٹھی تھی۔انھیں ایک شخص تلقین کرتا جاتا کہ سو مرتبہ اللہ اکبر پڑھو۔وہ کنکریوں پر سو مرتبہ اللہ اکبر پڑھتے۔پھر وہ کہتا سو بار یہ پڑھو وہ پڑھتے وغیرہ۔حضرت عبداللہ بن مسعود نے دریافت کیا تم ان کنکریوں پر کیا پڑھتے ہو۔وہ کہنے لگے ہم تکبیر تہلیل اور تسبیح پڑھتے ہیں۔حضرت عبداللہ نے فرمایا تم اپنی برائیوں کو شمار کرو۔میں اس کا ضامن ہوں کہ تمہاری نیکیوں میں سے کوئی شئے ضائع نہ ہوگی اے امت محمدیہ تم پر افسوس تم اتنی جلد ہلاک ہوگئے۔ابھی تو تم میں بکثرت صحابہ موجود ہیں یہ حضور کے کپڑے موجود ہیں جو ابھی بوسیدہ نہیں ہوئے نہ آپ کے برتن موجود ہیں جو ابھی ٹوٹے نہیں۔کیا تم گمراہی کا دروازہ کھولنا چاہتے ہو۔

ایک موذن نے اذاں کے بعد الصلوۃ الصلوۃ کہہ کر لوگوں کو متوجہ کیا۔حضرت عمرؓ نے فرمایا کیا تو پاگل ہے؟میری اذاں میں جو دعوت تھی کیا وہ لوگوں کو بلانے کے لئے کافی نہ تھی؟

حضرت علیؓ نے عید کے روز صلوۃ سے قبل ایک شخص کو دیکھا کہ وہ نفل پڑھنے کا ارادہ کر رہا ہے۔حضرت علیؓ نے اس کو منع فرمایا۔اس نے کہا میں صلوۃ ادا کر رہا ہوں اور وہ عبادت ہے۔اللہ تعالیٰ کسی عبادت پر عذاب نہیں دیتا۔حضرت علیؓ نے کہا میں خوب جانتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کسی ایسے فعل پر ثواب نہیں دیتا جب تک کہ اس کو رسول اکرمؐ انجام نہ دے لیں یا اس کی ترغیب نہ فرمالیں۔ایسی صورت میں تیری یہ صلوۃ بیکار ہے اور بیکار شئے پر عمل کرنا حرام ہے۔شاید اللہ تعالیٰ تجھے رسول اکرمؐ کی مخالفت کی وجہ سے عذاب دے۔

یہ جاننے کے لئے کہ وہ کون کون سے امور ہیں جو بدعت ہیں سنت کو جاننا

انتہائی ضروری ہے۔ تمام بدعات دو اقسام پر مشتمل ہیں، بدعت اعتقادی اور بدعت عملی۔ گذشتہ اور موجودہ گمراہ طبقے بدعت اعتقادی کا نتیجہ ہیں۔ جن میں رافضی قابل ذکر ہیں۔ صوفیا کے بعض سلسلے بھی جو درپردہ عجمیت کے پجاری ہیں انھوں نے بھی بدعات کی اشاعت میں نمایاں خدمات انجام دیں۔

بدعات عملی کی چند مثالیں یہ ہیں:۔

۱۔ جمعہ کے دن خطبہ کی اذاں امام کے سامنے کھڑے ہو کر دینا۔

۲۔ خطبہ میں آیت (۳۳:۵۶) پڑھنے پر اس کے جواب میں درود ((اللھم صلِ علی سیدنا محمد) پڑھنا۔

۳۔ رجب کے روزے رکھنا اور شب برات منانا۔

اس قسم کی بدعات پر صدیاں گذر چکی ہیں اور اب یہ بدعات بھیڑچال علما میں دین کا درجہ اختیار کر چکی ہیں۔ ان کے خلاف آواز اٹھانا پوری قوم کو مقابلہ کی دعوت دینا ہے۔

علماء کرام نے چند اصول بیان کئے ہیں جن سے سنت و بدعت کے امتیاز میں مدد ملتی ہے:۔

۱۔ شریعت نے ایک چیز ایک موقع پر تجویز کی ہے۔ اگر کوئی اپنے رائے اور خواہش سے اسی فعل کو دوسرے موقع پر تجویز کرے تو وہ بدعت ہے۔ مثلاً اذاں دینا ایک دینی کام ہے لیکن بعض لوگوں نے یہ بدعت اختیار کی ہے کہ دفن کے بعد قبر پر بھی اذاں کہی جائے۔ اسی طرح صلوۃ کے بعد مصافحہ کا رواج ہے۔ ہر باہر سے آنے والے کے ساتھ مصافحہ مسنون ہے، نہ جانے کیوں عیدین جمعہ اور دوسری صلوتوں کے بعد مصافحہ کا رواج چل نکلا۔ اگر ان باتوں کو سنت کی پیروی سمجھ کر اختیار کیا جائے تو یہ بدعت ہیں۔

۲۔ شریعت نے جو چیز مطلق رکھی ہے۔ اس میں اپنی طرف سے قیود لگانا بدعت ہے مثلاً شریعت نے زیارت قبور کے لئے کوئی تاریخ مقرر نہیں کی اب کسی بزرگ کی قبر پر جانے کے لئے تاریخ مقرر کر لینا اور اسی کو ضروری سمجھنا بدعت ہوگا۔ اسی طرح بزرگوں کے عرس پر جو خرافات ہوتی ہیں ان کو کسی طرح جائز قرار نہیں دیا جاسکتا۔

۳۔ شریعت نے جو عبادت جس خاص کیفیت میں لازم قرار دی اس کی کیفت میں تبدیلی کرنا حرام اور بدعت ہے۔ مثلاً دن کی صلوتوں (ظہر و عصر) میں شریعت نے قراءت آہستہ تجویز کی ہے۔ اگر کوئی ظہر و عصر میں بھی اونچی قراءت کرنے لگے تو یہ فعل ناجائز اور بدعت ہوگا۔

۴۔ جس عبادت کو شریعت نے انفرادی طور پر لازم کیا ہے اس کو اجتماعی طور پر کرنا بدعت ہے۔ مثلاً نفل صلوۃ کو انفرادی طور پر ادا کرنے کا حکم ہے۔ اگر نفل صلوۃ کو جماعت سے ادا کیا جائے تو فقہائے نے اس کو مکروہ اور بدعت لکھا ہے۔ بدعت کے تعلق سے یہاں تک احتیاط ضروری ہے کہ جب کسی فعل کے سنت یا بدعت ہونے میں اشتباہ ہو جائے تو علماء نے فرمایا کہ ترک سنت فعل بدعت سے بہتر ہے۔

"ردالمحتار" میں ہے۔

جب کسی حکم میں تردد ہو کہ یہ سنت ہے یا بدعت تو سنت کے ترک کر دینے کو بدعت اختیار کرنے پر ترجیح حاصل ہے۔

اس فقہی قاعدہ کے تحت ان تمام امور کا حکم معلوم ہو جاتا ہے جن کے سنت یا بدعت ہو جانے میں اختلاف ہو۔ بعض اسے سنت بتاتے ہیں اور بعض بدعت۔ ایسے تمام کاموں کو چھوڑ دینا ہی احتیاط کا تقاضہ ہے۔

مولانا عبد العلی فاروقی کے الفاظ میں:۔

فقہہ اسلامی کی اصطلاح میں اسوہ رسول ہی کا دوسرا نام سنت ہے۔ اور زمانی اور رواجی باتوں کو دین بنا کر پیش کرنے کا نام بدعت ہے۔ فرمان نبوی ہے:۔

"کُلُّ مُحدَثَۃٍ بِدعَۃ" یعنی ہر خود ساختہ چیز بدعت ہے۔

غیر اسلامی باتوں میں اسلام کا نام لے کر الجھنے کا نام بدعت ہے۔ جس سے ہدایت کے بجائے گمراہی ہاتھ لگے۔ بدعت کی تباہ کاریوں کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ اس سے دو قسم کے شدید نقصانات ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ اسے بھولے بھالے اور ناواقف مسلمان اللہ اور رسول کی خوشنودی حاصل کرنے کی غرض سے دین سمجھ کر اختیار کر لیتے ہیں اور ہدایت اسلامی اور اللہ اور رسول کی رضامندی کے بجائے ضلالت و گمراہی اور اللہ و رسول کی ناراضگی مول لیتے ہیں اور دوسرے یہ کہ اسلام

کے دشمنوں کو اس کا موقع مل جاتا ہے کہ اس فعل کی برائیوں کو بیان کر کے اسلام کی سچی تعلیمات کو بدنام و رسوا کریں۔ جب کہ ان کو سچی اسلامی تعلیمات میں کبھی نقطہ رکھنے کا بھی موقع ہاتھ نہیں آپاتا۔ بدعت کی ترویج میں رسم و رواج نے جو اہم رول ادا کیا ہے اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ عام طور پر لوگ رواجاً کسی فعل کو باعث ثواب سمجھ کر کرتے ہیں اور پھر اللہ کا کوئی بندہ اگر ان کے سامنے اس فعل کی برائیوں کو بیان کر کے اس کے ترک کرنے کا مطالبہ کرتا ہے تو ایسے لوگوں کا جواب یہ ہوتا ہے کہ یہ فعل ہمارے باپ دادا کے وقتوں سے ہوتا چلا آیا ہے اور ہم خود بھی اس کو شروع سے انجام دیتے رہے ہیں۔ نہ ہمارے باپ دادا کو ٹوکا گیا اور نہ ہی ہم کو۔ پھر کیا اب تک دین کی سمجھ رکھنے والے اور دین کی سچی تعلیمات سے واقف لوگ نہ تھے جو آج آپ ٹوک رہے ہیں؟"۔

بعض گوشوں سے ایک اصطلاح "بدعت حسنہ" وضع کی گئی ہے اور بعض امور کو بدعت حسنہ قرار دیا گیا ہے یعنی بدعت کی دو اقسام قرار دی گئیں ہیں۔ اچھی بدعات اور خراب بدعات۔ جب واضح طور پر کہہ دیا گیا کہ بدعت ضلالت اور گمراہی ہے تو پھر یہ تقسیم بے معنی ہو جاتی ہے۔ کسی بدعت کو بدعت حسنہ قرار نہیں دیا جاسکتا۔

(رسالہ "مروجہ بدعات" سے اقتباس)

شب برات

ایک تحقیقی جائزہ

سورۃ دخان (۴۴) کی تیسری اور چوتھی آیات ہیں۔ "ہم نے یہ (قرآن) مبارک رات میں نازل کیا۔ یقیناً ہم ڈرانے والے ہیں۔ اس رات میں ہر حکمت والے کام کا فیصلہ کیا جاتا ہے"۔

ان آیات میں یہ وضاحت کی گئی ہے کہ قرآن مجید مبارک شب میں نازل کیا

گیا اور اس شب میں فیصلے کئے جاتے ہیں۔

لیلۃ المبارکہ (مبارک شب) سے کیا مراد ہے۔ عام مولویوں کا یہ خیال ہے کہ اس سے مراد شب برات ہے۔ جب کہ تمام متقدین، محدثین، مفسرین اور فقہا کا کہنا ہے کہ لیلۃ المبارکہ سے لیلۃ القدر مراد ہے۔ ان سب کا کہنا ہے کہ قرآن مجید لیلۃ القدر میں نازل کیا گیا اور اس آیت میں بھی نزول قرآن کا بیان ہے۔ لیلۃ القدر کی تعریف میں بھی وضاحت کی گئی کہ اس شب میں تمام امور کے فیصلے کئے جاتے ہیں اور ہر قسم کی سلامتی نازل ہوتی ہے (قرآن ۹۷:۵) اس سے صاف ظاہر ہے کہ لیلۃ المبارکہ اور لیلۃ القدر دو جداگانہ راتیں نہیں ہیں۔

سورۃ بقرہ میں اس امر کی وضاحت یوں ہوئی ہے کہ "ہم نے یہ قرآن ماہ رمضان میں نازل کیا"۔ (قرآن ۲:۱۸۵) شب برات رمضان میں واقع نہیں ہوتی۔ اگر ایسا نہ ہو تو قرآن مجید کا نزول دو راتوں میں لازم آئے گا۔ اور یہ ماننا پڑے گا کہ فیصلے بھی سال میں دو مرتبہ کئے جاتے ہیں۔ حالانکہ صحابہ کرامؓ، تابعین اور متقدمین میں سے کوئی بھی اس کا قائل نہیں رہا۔ وہ لیلۃ البرات کو نہ تو علحدہ حیثیت دیتے تھے اور نہ اس رات کو دوسری راتوں پر کوئی فوقیت دیتے تھے۔ یعنی دور صحابہ اور کبار تابعین کے زمانہ میں شب برات کا کوئی وجود نہ تھا۔

متقدمین میں صرف عکرمہؓ کا خیال ہے کہ لیلۃ البرات نصف شعبان کی شب ہے۔ خود صوفیہ بھی اس کے قائل رہے کہ نزول قرآن مجید شب برات میں ہوا۔ جیسا کہ غزالیؒ (وفات ۵۰۵ھ) کی احیاء العلوم اور شیخ عبدالقادر جیلانیؒ (وفات ۵۶۱ھ) کی "غنیۃ الطالبین" سے واضح ہوتا ہے۔

دراصل یہ دعویٰ کہ قرآن مجید دو بار نازل ہوا۔ پہلی مرتبہ شاہ ولی اللہؒ (وفات ۱۷۶۳ء) نے حجۃ اللہ البالغہ میں کہی۔ انھوں نے یہ بات اس لئے کہی کہ قرآن کا رد بھی نہ ہو اور بزرگوں کا اندھا اعتقاد بھی قائم رہے۔ پھر مولانا شبیر احمد عثمانی (وفات ۱۹۵۱ء) اور مولانا احتشام الحق تھانوی نے بھی اسی طریقہ کو اپنایا۔ لیکن لطف کی بات یہ ہے کہ شب قدر کے وقت ان آیات کو شب قدر کی فضیلت میں پیش کر دیا جاتا ہے اور شب برات کے وقت شب برات کی صداقت کے لئے پیش کر دیا جاتا ہے۔ یعنی ان

آیات کو جس کے ساتھ چاہا منسلک کر دیا۔

تفسیر اور فقہہ کا یہ مسلمہ اصول ہے کہ اگر کوئی آیت محتمل المعنی نظر نہ آئے تو اس کی تفسیر قرآن مجید ہی کی دوسری آیات سے کی جائے گی اور صرف وہی معنی مراد لئے جائیں گے، جس کی تائید قرآن مجید کی آیات سے ہو۔ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانا کہ "ہم نے ماہ رمضان میں قرآن نازل کیا" اور پھر یہ کہنا کہ "ہم نے قرآن لیلۃ القدر میں نازل کیا۔" یہ دونوں باتیں واضح ہیں۔ ایسے واضح بیان کی موجودگی میں ایک مشتبہ رویہ اختیار کرنا اور بطور خود یہ تصور قائم کر لینا کہ قرآن مجید دو مرتبہ نازل ہوا ایک علمی خیانت ہے۔

جب تمام مفسرین اس کے قائل ہیں کہ لیلۃ المبارکہ سے لیلۃ القدر مراد ہے تو پھر کوئی وجہ نہ تھی کہ ان تمام علماء اور ائمہ کا قول ترک کر کے صرف عکرمہ ہی کا قول اختیار کیا جائے۔ ہند و پاک کے اکثر علماء اور مقالہ نویسوں نے عکرمہ اور شاہ ولی اللہ کی تقلید کے علاوہ کوئی تحقیق نہیں کی، نہ انھوں نہ یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ دیگر مفسرین کی رائے کیا ہے۔ ان کی تحریرات کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ سب ان کے اپنے خیالات ہیں جن کا قرآن مجید سے دور کا بھی واسطہ نہیں بلکہ انھوں نے ضعیف روایات سے مرعوب ہو کر قرآن مجید کو ان کے مطابق ڈھال لینے کی سعی لاحاصل کی ہے۔

عکرمہ ابن عباس کے غلام تھے۔ اور ان سے روایتیں بیان کی ہیں۔ ان کے متعلق امام ذہبی کا کہنا ہے۔ "اس کے خیالات کے باعث اس کی ذات میں کلام کیا گیا نہ کہ حافظہ کے باعث" گو بخاری نے اس پر اعتماد کیا لیکن مسلم نے اجتناب کیا اور اس سے بہت کم روایات لیں اور وہ بھی اس وقت جب دوسرا راوی موجود ہو۔ امام مالک نے ایک یا دو احادیث کے علاوہ اس سے اعراض کیا۔

عبداللہ بن حارث کا قول ہے کہ میں علی بن عبداللہ بن عباس کی خدمت میں حاضر ہوا تو وہاں عکرمہ زنجیروں میں بندھا پڑا تھا۔ میں نے کہا: ۔آپ اللہ سے نہیں ڈرتے؟ انھوں نے جواب دیا، یہ خبیث میرے باپ (عبداللہ بن عباس) پر جھوٹ بولتا ہے۔ بہرحال محدثین نے عکرمہ کو غیر ثقہ قرار دیا۔

یعقوب الحضرمی نے اپنے دادا سے نقل کیا ہے کہ ایک بار عکرمہ مسجد کے دروازے پر کھڑے ہو کر کہنے لگا۔ "اس مسجد میں جتنے لوگ ہیں سب کافر ہیں" وہ خارجیوں کے ایک فرقے اباحیہ کا ہم خیال تھا۔ ان علماء کو جو عکرمہ کی روایات کو مانتے ہیں یہ چاہتے ہیں کہ وہ اولاً عکرمہ کی صداقت ثابت کریں پھر اس پر بحث کریں کہ اس کا قول عقلی اور نقلی نقطہ نگاہ سے درست ہے یا نہیں۔

حیرت تو اس پر ہے کہ عکرمہ تو امت مسلمہ کو واجب القتل تصور کرتا ہے اور ہم اس کی روایت پر اپنے عقائد کی بنیاد رکھتے ہیں۔

جہاں تک روایت کا تعلق ہے حضرت عائشہؓ سے ایک روایت بیان کی جاتی ہے جو حضرت عائشہؓ پر صریح بہتان ہے۔ ترمذی کی روایت یوں ہے:۔

"میں نے ایک رات رسول اکرم کو نہیں پایا۔ میں (تلاش میں) نکلی تو آپ بقیع میں تھے آپ نے پوچھا تو اس سے ڈرتی ہے کہ اللہ اور اس کا رسول تیرے ساتھ زیادتی کرے گا۔ میں نے عرض کیا اے رسول میں گمان کیا تھا کہ آپ اپنی دیگر ازواج کے پاس گئے ہیں۔ آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نصف شب شعبان میں آسمان دنیا کی جانب نزول فرماتا ہے اور بنو کلب کی بھیڑوں کے بالوں کی تعداد سے زیادہ لوگوں کی مغفرت فرماتا ہے"۔

اسی روایت پر تمام قصہ کی بنیاد رکھی گئی ہے اور مسلمان اس رات قبرستان کے چکر کاٹتے یا مسجدوں میں شب بیداری کرتے نظر آتے ہیں اور اسے ایک ضروری عمل تصور کرتے ہیں جس کا ترک انھیں کسی حال گوارا نہیں۔ حالانکہ محدثین کی نگاہ میں اس روایت کی کوئی حیثیت نہیں خود امام ترمذی (وفات ۲۷۶ھ) نے اسے روایت کر کے اس پر شدید جرح کی ہے۔ تعجب ہے کہ ہمارے علماء ترمذی کے اس روایت کو بیان کرتے ہیں لیکن امام ترمذی نے اس پر جو بحث کی ہے اس پر نظر نہیں کرتے۔

یہ امر بھی غور طلب ہے کہ جب اس رات کو اتنی فضلیت حاصل تھی تو رسول اکرمؐ نے صرف قبرستان جانے پر کیوں اکتفاء فرمایا اور کوئی دوسرا عمل انجام نہ دیا۔ اس روایت میں شب بیداری کا بھی کوئی ذکر نہیں، اگر اس رات کو اتنی فضلیت حاصل تھی تو ضروری تھا کہ آپ پہلے صحابہ کرام کو اور ازواج مطہرات کو

بیان فرماتے ۔ تاکہ سب اس فضیلت کو حاصل کر سکتے اور کم از کم حضرت عائشہؓ کو تو (نعوذ باللہ) آپ کا پیچھا کرنے کی ضرورت پیش نہ آتی ۔ روایت سے یہ تاثر ملتا ہے کہ رسول اکرمؐ نے اخفاء سے کام لیا تھا۔

یہ امر بھی سوچنے کے قابل ہے کہ سورہ دخان مکی صورت ہے ۔ اور ہجرت سے تقریباً (۴) سال قبل نازل ہوئی ۔ جب کہ یہ واقعہ اگر حضرت عائشہؓ سے شادی کے فوراً بعد بھی پیش آیا تو ہجرت کے (۱۶) ماہ بعد کا واقعہ ہوگا ۔ یہ ناممکن سی بات ہے " کہ سورۃ دخان کے نزول کے (۵) سال بعد شب برات کی فضیلت مدینہ میں ظاہر کی گئی ہو اور اس تمام عرصہ میں لوگوں کو اس فضیلت سے لاعلم رکھا گیا ہو۔

روایت میں ایک لفظ کی موجودگی سے تو یہ ظاہر ہو رہا ہے کہ واقعہ ہجرت کے کئی سال بعد پیش آیا کیونکہ حضرت عائشہؓ فرما رہی ہیں کہ میرا گمان تھا کہ آپ اپنی ازواج کے پاس گئے ہوں گے یعنی یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب کہ آپ کے نکاح میں متعدد ازواج تھیں۔

اس روایت سے ایک اور بھی مسئلہ پیدا ہوگا ۔ یہ واقعہ ۸ ھ کے واقعہ جعرانہ سے قبل کا ہے یا بعد کا ۔ اگر کہا جائے کہ اس سے قبل کا ہے تو اس وقت تک قبروں کی زیارت ممنوع تھی ۔ واقعہ جعرانہ کے وقت آپ نے اجازت دی ۔ اگر کہا جائے کہ شب برات کا یہ قصہ واقعہ جعرانہ کے بعد پیش آیا تو ظاہر ہوتا ہے کہ سورہ دخان کے نزول کے بارہ سال بعد اس کی فضیلت کا علم ہوا ۔ ترمذی میں یہ روایت مختصر ہے ۔ پھر جیسے جیسے زمانہ گذرتا گیا اس پر حاشیے چڑھتے گئے حتیٰ کہ ایک طویل داستان بن گئی ۔ اور اس میں اتنا داخلی تضاد پیدا ہوا کہ الامان ۔ جب مکمل داستان سامنے آئے گی تو عقل بھی انگشت بہ دندان رہ جائے گی۔

دوسری روایت بھی حضرت عائشہؓ ہی کی جانب منسوب ہے اور اس کے راوی بھی عروہ ہیں ۔ روایت یہ ہے کہ: ۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ: ۔

جب نصف شعبان کی شب ہوئی تو رسول اکرمؐ میرے بستر سے خاموشی سے نکل گئے پھر فرمانے لگیں: ۔ خدا کی قسم، میرا بستر ریشم کا تھا نہ قزکا نہ کتان کا اور نہ صوف کا ۔ میں نے پوچھا، سبحان اللہ پھر وہ کس شئے کا بنا ہوا تھا ۔ حضرت عائشہؓ نے فرمایا، اس کا

اس طرح ہر دو روایات میں باہم تضاد ہے ۔ سوال صرف اتنا ہے کہ کیا یہ دو واقعات ہیں یا ایک واقعہ ۔ اگر دو واقعات ہیں تو کیا حضرت عائشہؓ اتنی کم فہم تھیں کہ بار بار اس قسم کے واقعات پیش آنے کے باوجود ہمیشہ بھول جاتیں اور بار بار تکرار کے باوجود اس رات کی کوئی فضیلت بیان نہیں کرتیں۔

۲ ۔ اس روایت میں جس دعا کا ذکر ہے وہ ایک دعا نہیں بلکہ متعدد دعائیں ہیں، جنھیں راوی نے مختلف مقامات سے یکجا کر کے شب برات سے جوڑ دیا۔

۳ ۔ یہ جملہ " یا رسول اللہ آپ کے تو اگلے پچھلے گناہ معاف ہو چکے " ۔ حضرت عائشہؓ کا قول نہیں بلکہ دیگر صحابہ کا قول ہے جو دوسری حدیث سے چوری کر کے یہاں جوڑ دیا گیا۔ یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ رسول اکرمؐ تمام رات عبادت نہ فرماتے تھے جس کا ذکر قرآن (۷۳: ۲ تا ۴) اور اس تائید میں لاتعداد احادیث موجود ہیں ۔ حضرت عائشہؓ کی ایک دوسری روایت میں ہے ۔ رسول اکرم صلعم ماہ رمضان ہو یا غیر رمضان گیارہ رکعت سے زیادہ ادا نہ فرماتے تھے ۔ چار رکعت پڑھتے تو ان کی خوب صورتی اور طوالت نہ پوچھ ۔ پھر چار رکعت پڑھتے تو ان کی خوب صورتی اور طوالت نہ پوچھ ۔ پھر تین رکعت پڑھتے۔

۴ ۔ دوسری روایت میں قدموں پر ورم آنے کے جو الفاظ استعمال کئے گئے ہیں ۔ ان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس روایت کو وضع کرنے والا عرب نہیں کوئی عجمی ہے۔

۵ ۔ شب برات کے سلسلہ میں جتنی روایات ہیں ان میں سے کسی میں بھی تاریخ کا ذکر نہیں ۔ "نصف شعبان" والی منطق بھی عجیب و غریب ہے۔

لفظ برات کی تحقیق بھی ضروری ہے ۔ لفظ تبریٰ برات ہی سے مشتق ہے ۔ برات کے معنی ہیں بیزاری یا اظہار نفرت ۔ سورہ توبہ کا دوسرا نام سورہ برات ہے کیونکہ اس سورہ میں کفار اور مشرکین سے برات کا اعلان کیا گیا ۔ ان معنوں کے پیش نظر یہ بات غور طلب ہے کہ شب برات میں کس بات سے بیزاری کا اظہار کیا جاتا ہے اور اس نام کی ابتداء کب سے ہوئی ۔ کسی ایک حدیث میں بھی لفظ برات استعمال نہیں ہوا۔

فرقہ اہل باطل کا عقیدہ ہے کہ اس رات تمام فرقہ اہل باطل امام مہدی سے

ان کے خروج کی یعنی باہر نکلنے کی درخواست کرتے ہیں تاکہ مومنین رافضیوں کی اعانت کریں اور منکرین یعنی اہل سنت کا صفایا کریں ۔ اس طرح تمام اہل سنت اور صحابہ سے بیزاری کا اظہار کرتے ہیں اسی لئے اس شب کا نام برات ہے اور یہ شب تبریٰ ہے ۔ لطف یہ ہے کہ "مومنین" یہ خدمت اپنی چالاکی سے اہل سنت سے لے رہے ہیں ۔

یہ بات افسوس ناک ہے کہ اسلام کو جتنا نقصان صوفیا نے اپنی لاعلمی سے پہنچایا شاید زندیقوں اور رافضیوں نے بھی نہیں پہنچایا ۔ انھوں نے جو روایتیں بیان کی ہیں ان میں سے ایک بھی صحت کے ساتھ ثابت نہیں کی جاسکتی کہ یہ حدیث رسولؐ ہے ۔

شب برات کی روایات کا تعلق احادیث کے تیسرے اور چوتھے طبقہ سے ہے اور یہ تمام روایات احادیث کی تیسرے یا چوتھے طبقہ کی کتابوں میں پائی جاتی ہیں یا کتب تصوف اور بعض تفاسیر میں ملتی ہیں ۔ شب برات سے متعلق جتنی روایات غنیۃ الطالبین میں پائی جاتی ہیں ابو نصر اور ہبتہ اللہ سے مروی ہیں ۔ ان روایات میں باہمی تضاد ہے ۔ جس سے یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ غنیۃ الطالبین سرے سے شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی تصنیف ہی نہ ہو ۔

شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی دوسری کتاب فتوح الغیب میں بھی احادیث کا یہی حال ہے ۔ پہلے اور دوسرے طبقہ میں ان کا کہیں وجود نہیں ۔ تیسرے طبقہ میں بھی صرف ان کتابوں میں یہ روایات پائی جاتی ہیں جن کے مصنفین نے احتیاط سے کام نہیں لیا ۔ اور اپنی کتابوں میں ہمہ اقسام کی روایات نقل کر دیں ۔ لیکن اس طبقہ کی وہ کتابیں جو موضوعات سے پاک ہیں ان میں ان روایات کا کوئی وجود نہیں ۔

حضرت عائشہؓ سے ایک روایت مروی ہے : ۔

"ایک رات رسول اکرم صلعم اٹھے ، کپڑے پہنے اور گھر سے باہر تشریف لے گئے ۔ میں (حضرت عائشہؓ) نے اپنی باندی بریدہ کو پیچھا کرنے کا حکم دیا ۔ اس نے آپ کا پیچھا کیا ۔ حتیٰ کہ آپ بقیع تشریف لے گئے ۔ اس کے ایک کنارے پر جب تک اللہ نے چاہا آپ کھڑے رہے اس کے بعد واپس ہوئے ۔ بریدہ پہلے واپس آگئی ۔ اس نے مجھ سے

تمام واقعہ بیان کیا ۔ میں نے صبح تک تو حضور سے کسی بات کا ذکر نہیں کیا ۔ صبح آپ سے واقعہ بیان کیا ۔ آپ نے فرمایا ۔ مجھے اس لئے بھیجا گیا تھا کہ میں اہل بقیع کی صلوۃ جنازہ پڑھوں یا ان کے لئے دعائے مغفرت کروں " ۔

حالانکہ سورہ توبہ میں ہے : ۔ " نبی کو اور ان کے لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں زیبا نہیں ہے کہ مشرکوں کے لئے مغفرت کی دعا کریں چاہے وہ ان کے رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں (آیت ۱۸۳) " ۔

ابو موہبہ سے روایت ہے ۔ مجھے حکم دیا گیا تھا کہ میں اہل بقیع کے لئے دعا مغفرت کروں اس لئے میں ان کے لئے دعائے مغفرت کرنا چاہتا ہوں ۔ پھر آپ بقیع تشریف لے گئے اور اہل بقیع کے لئے دعائے مغفرت کرنے کے بعد فرمایا ۔ اے ابو موہبہ ! اللہ نے مجھے اختیار دیا ہے یا تو میں دنیا کے خزانے اور اس کی دوامی زندگی پسند کر لوں یا پروردگار اور اس کی ملاقات پسند کروں ۔ میں نے اپنے پروردگار کی ملاقات کو پسند کر لیا ۔ اسی رات کے بعد صبح سے آپ کو وہ تکلیف شروع ہوئی جس میں آپ کی وفات ہوئی ۔ گویا یہ وفات سے پانچ روز پیشتر کا واقعہ ہے یعنی اگر رسول اکرمؐ کی وفات ۹ ربیع الاول کو ہوئی ۔ (۱۲ / ربیع الاول کو وفات ہونا ، واقدی ، کذاب رافضی کا قول ہے ۔) تو آپ بقیع کو ۴ / ربیع الاول تشریف لے گئے ۔ اگر وفات ۲ ربیع الاول کو ہوئی جیسا کہ بعض مورخین اور امام سلیمان تیمی کا قول ہے تو آپ ۲۷ / ۲۸ / صفر کو بقیع تشریف لے گئے تھے ۔ اس سے پہلے رسول اکرمؐ کبھی رات کو بقیع تشریف نہیں لے گئے تھے ۔ اس سے یہ بات واضح ہو گئی کہ شب برات اور بقیع کی کہانی سراسر جھوٹ اور فریب ہے ۔

عورتوں کے لئے قبرستان جانے کی ممانعت ہے ۔ ایسی صورت میں یہ دعویٰ کہ ام المومنین بقیع تشریف لے گئی تھیں ایک کھلا تبریٰ ہے ۔

شیخ عبدالقادر جیلانیؒ (وفات ۵۶۱ھ) نے حضرت عائشہؓ کی ایک روایت اس سند سے نقل کی ہے ۔ " ہمیں ابو نصر بن محمد نے خبر دی ۔ وہ اپنے باپ ابو علی الحسین سے روایت کرتا ہے ۔ وہ اپنی سند سے ہشام بن عروہ سے وہ حضرت عائشہؓ سے " ۔ اس طرح ہمیں ابو نصر کے باپ نے ہشام تک کوئی سند بیان نہیں کی ۔ حالانکہ ان دونوں کے

در میان ساڑھے تین سو سال کا فرق ہے۔ یہ روایت یوں ہے:۔

رسول اکرمؐ روزے رکھتے حتیٰ کہ ہم کہتے کہ اب آپ افطار نہ فرمائیں گے اور جب آپ افطار کرتے تو ہم کہتے کہ اب آپ روزے نہ رکھیں گے۔ اور آپ کو شعبان میں روزے بہت محبوب تھے۔ میں (عائشہؓ) نے عرض کیا یا رسول اللہؐ کیا بات ہے کہ میں آپ کو شعبان میں بہت روزے رکھتے دیکھتی ہوں۔ آپؐ نے فرمایا، اے عائشہ یہ ایسا مہینہ ہے جس میں اس سال مرنے والوں کے نام لکھ کر ملک الموت کو دیئے جاتے ہیں اور میں یہ محبوب رکھتا ہوں کہ جب میرا نام لکھ کر دیا جائے تو میں حالت روزہ میں رہوں۔

ابو نصر کے والد کا کہنا ہے کہ ہشام نے یہ روایت حضرت عائشہؓ سے نقل کی ہے حالانکہ ہشام حضرت عائشہؓ کی وفات کے تین یا چار سال بعد پیدا ہوئے۔

اس کے برخلاف رسول اکرمؐ نے آخر شعبان کے روزوں کی ممانعت یوں فرمائی۔

"رمضان سے ایک یا دو دن پہلے روزے نہ رکھو"۔ (ترمذی، مسلم، ابو داؤد، نسائی)

اسی طرح ترمذی وغیرہ نے حضرت ابوہریرہ سے روایت کی ہے کہ رسول اکرم صلعم نے ارشاد فرمایا۔ "جب نصف شعبان ہو جائے تو روزے نہ رکھو"۔

یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ سب سے افضل رات لیلۃ القدر کی حقیقت میں نہ تو کوئی اس قسم کی حدیث ہے اور نہ اس کی کوئی تاریخ معین کی گئی تاکہ لوگ اس پر بھروسہ کر کے زندگی بھر کا عمل ترک نہ کر دیں۔ اور لیلۃ البرات قطعی تعین کر دیا گیا اور اس شب کا علم ہر ایک کو ہو گیا۔ اگر اس شب کی کوئی فضیلت ہوتی تو اسے بھی مخفی رکھا جاتا۔ جس طرح لیلۃ القدر کو مخفی رکھا گیا اور جمعہ کے دن مقبول ساعت کو بھی رکھا گیا۔ شب برات کی کہانیاں انسانوں کی وضع کردہ ہیں اس لئے اس کے اخفا کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے "غنیتہ الطالبین" میں حضرت علیؓ کا ایک عمل اور ایک دعا بھی نقل کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:۔

حضرت علیؓ سال بھر میں چار راتوں میں اپنے آپ کو عبادت کے لئے فارغ کر لیا کرتے تھے۔ ماہ رجب کی پہلی شب، شب عید الفطر، شب عید الضحیٰ اور نصف شعبان کی شب اور اس رات میں حضرت علیؓ یہ دعا مانگتے، "اے اللہ، محمدؐ اور ان کی آل پر رحمتیں نازل فرما۔ جو حکمت کے چراغ۔ نعمت کے مالک اور عصمت کی کانیں ہیں اور مجھے ان کے واسطے سے ہر برائی سے محفوظ رکھ۔ مجھے دھوکا اور فریب میں نہ پکڑ میرے کام کے انجام کو حسرت اور ندامت نہ بنا اور مجھ سے راضی ہو جا۔ کیونکہ آپ کی مغفرت ظالموں کے لئے ہے اور میں ظالموں میں سے ہوں۔ اے اللہ! میری ان گناہوں کی مغفرت فرما جو آپ کو ضرر نہیں پہنچا سکتے اور مجھے مال عطا فرما جو آپ کو نفع نہیں دے سکتا۔ آپ کی رحمت وسیع اور آپ کی حکمت نئی ہے۔ مجھے وسعت، امن، صحت، شکر، عفو، تقویٰ، صبر، اور صداقت عطا فرما۔ اپنے اور اپنے اولیاء پر لازم کر دے (اس کا کوئی مفہوم ظاہر نہیں ہوتا لیکن اس جملہ کا ترجمہ ہی ہے) یہ بات کہ مجھے تنگی کے ساتھ آسانی عطا فرما اور اسے میرے گھر والوں میرے لڑکے اور میرے ان بھائیوں پر بھی عام کر جو آپ کی وجہ سے میرے بھائی ہیں اور ان لوگوں پر بھی عام فرما جو مسلمان مردوں اور عورتوں، مومن مردوں اور عورتوں کے یہاں پیدا ہوئے"۔

حضرت علیؓ کے اس عمل کے بارے میں شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے کوئی سند بیان نہیں فرمائی اور پانچ سو سال بعد روایت بیان کر دی۔ ایسی کہانی حضرت علیؓ کی جانب منسوب کرنا ایک افترا ہے۔ اس روایت میں جو باتیں بیان کی گئی ہیں وہ خالص شیعہ مذہب کی ترجمانی کرتی ہیں۔

چوتھی صدی ہجری تک نیک اور پرہیزگار شخص کے لئے زاہد، عابد، متقی اور صالح وغیرہ کے الفاظ استعمال کئے جاتے تھے۔ اولیاء کی اصطلاح عجمی ہے۔

اس دعاء میں حضرت علیؓ نے آسانی کے ساتھ تنگی کی بھی دعا فرمائی ہے۔ اسی طرح حضرت علیؓ نے صبر کی دعا مانگی ہے اور صبر نزول مصیبت کے بعد ہوتا ہے۔ تاوقتیکہ مصیبت نازل نہ ہو صبر کی دعا مانگنا حرام ہے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ چار راتوں میں لیلۃ القدر کا کوئی ذکر نہیں۔

حضرت عائشہؓ کی ایک روایت میں بھی چار راتوں کا تذکرہ ہے لیکن ان میں

رجب کی پہلی رات داخل نہ تھی بلکہ اس کی بجائے شب عرفہ تھی۔

شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے بعض گمنام علما کا ایک فتویٰ بھی نقل کیا ہے۔

بعض علماء نے ان راتوں کو جمع کیا ہے جن میں شب بیداری مستحب ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایسی راتیں سال میں چودہ ہیں:۔

۱۔محرم کی پہلی رات ۲۔شب عاشورہ ۳۔رجب کی پہلی رات
۴۔رجب کی پندرھویں شب ۵۔شب عرفہ ۶۔شب عیدالفطر
۷۔شب عیدالضحیٰ ۸۔رمضان کی پانچ راتیں اور دو آخر عشرہ کی راتیں۔اسی طرح سترہ دن ایسے ہیں جو اوراد و ظائف اور عبادت کے لئے مخصوص ہیں:۔

۱۔یوم عرفہ ۲۔یوم عاشورہ ۳۔پندرہ شعبان ۴۔یوم جمعہ ۵۔یوم عیدین ۶۔ایام معلومہ، یعنی ذی الحجہ کے دس ایام معدودات یعنی تشریق اور ان میں موکد جمعہ کا دن اور رمضان ہے۔

ایام معدودات سے ایام تشریق مراد لینا بالکل غلط ہے۔قرآن مجید میں ایام معدودات سے رمی کے دن مراد ہیں اور وہ تین دن ہیں، دس، گیارہ اور بارہ ایام تشریق ۹ سے شروع ہوکر ۱۳ پر ختم ہوتے ہیں۔اگر ایام تشریق کو شامل کیا جائے تو افضل دنوں کی تعداد ۱۹ ہوگی، ورنہ ۱۸، ۱۷ کسی صورت میں نہ ہوگی۔یہ بھی غور طلب ہے کہ تمام دن سال بھر میں ایک دفعہ آئیں گے جب کہ جمعہ کے دن کم از کم ۴۸ بار آئیں گے۔یہ کہنا کہ تمام دنوں میں موکد جمعہ اور رمضان ہے۔رمضان کسی دن کا نہیں مہینہ کا نام ہے۔اگر جمعہ کے علاوہ رمضان کے کم سے کم انیس (۱۹) دن بھی شامل کئے جائیں تو سال بھر میں عبادت کے دنوں کی تعداد سو سے زیادہ ہوگی۔

حضرت عائشہؓ سے دریافت کیا گیا کہ رسول اکرمؐ کسی ماہ کے خاص طور پر روزے رکھتے تو انھوں نے کہا۔"اللہ کی قسم رسول اکرمؐ نے رمضان کے علاوہ کسی متعینہ مہینے کے روزے کبھی نہیں رکھے اور نہ کوئی ایسا مہینہ گذرا جس میں مکمل افطار کیا۔" یعنی آپ کی یہ عادت نہ تھی کہ پندرہ شعبان یا رجب کی پہلی جمعرات یا ستائیسویں (۲۷) تاریخ ہی کو روزہ رکھا جائے بلکہ جب بھی موقع ملتا نفلی روزے رکھ لیتے اور جب رکھتے تو صرف ایک یا دو روزہ رکھ کر نہ چھوڑتے۔متعینہ مہینہ تو صرف

رمضان کا ہے۔

مختصر یہ کہ شب برات کے متعلق جتنی روایات ہیں وہ سب محدثین کے نزدیک موضوع اور منکر ہیں۔ان میں سے ایک روایت بھی ایسی نہیں جس پر اعتماد کیا جاسکے۔ابتداء میں تو اس قسم کی روایات صرف ایک کہانی کی حیثیت رکھتی تھیں۔لیکن بعد کے آنے والے صوفیا نے اس پر مزید حاشیہ چڑھا کر اسے دین کا اہم جز بنا دیا۔اور بعد کے آنے والے اندھے مقلدین نے ان صوفیا کی کتابوں کو دیکھ کر یہ تصور کرلیا کہ شب برات بھی دین کا کوئی اہم رکن ہے۔جس کا ترک گناہ کبیرہ ہے حالانکہ یہ سب روایات فرقہ باطلہ کی وضع کردہ تھیں۔

یوسف کوکن عمری "سیرۃ ابن تیمیہ" میں لکھتے ہیں:۔

ان راتوں میں ہر گھر میں حلوے پکائے جاتے اور مسجدوں میں روشنی کا انتظام ہوتا۔صحن مسجد اور اطراف میں بازار لگتا۔ہر قسم کے بدمعاش جمع ہوتے۔خوانچے والے مسجدوں میں صدا لگاتے اور سقے پانی لئے گھومتے۔عورتیں بھی زرق برق لباس پہن کر اور عطر لگا کر ان نمازوں میں شریک ہوتیں۔پندرھویں شعبان کو خاص طور سے عورتیں زیادہ آتیں اور مزاروں پر حاضری دیتیں۔

گویا صوفیا اور سنی حضرات نے فرقہ باطلہ کی عید غدیر کی نقل میں ایک نئی عید غدیر جاری کرلی۔

ہر دور میں علماء نے ان بدعات کو بند کرنے کی کوشش کی مگر عوام کی عقیدت کچھ ایسی تھی کہ وہ بند ہوہو کر پھر جاری ہوتی رہیں۔

جیسا کہ بیان کیا جاچکا ہے شب برات کے موجد شیعہ تھے اور یہ لفظ تو صرف دھوکا دہی کے لئے استعمال کیا گیا ورنہ دراصل یہ شب تبریٰ تھی۔شیعوں نے سنیوں کو دھوکا دینے کے لئے اس کے فضائل میں روایات وضع کرکے پھیلائیں اور صوفیہ نے اپنی عادت کے مطابق ان کی ترویج کا کام انجام دیا بعض صوفیہ تو قرآن و سنت سے جاہل محض تھے اور بعض باطنی طور پر شیعہ تھے لیکن تقیہ کرکے سنی بنے ہوئے تھے۔عملی طور پر یہ دونوں طبقے دین کی بیخ کنی میں بتلا تھے یہی وجہ ہے کہ موجودہ دور کے سنیوں پر تشیع کا غلبہ ہے۔

پندرھویں شعبان کی تخصیص اس لئے ہے کہ رافضیوں کے بارھویں امام کی ولادت مبینہ طور پر اس رات کو ہوئی تھی ۔شب برات میں آتش بازی کی جو مذموم رسم رائج ہے وہ مجوسی اثر کا کھلا ثبوت ہے ۔ایران کے ایک ایک شہر میں آتش کدے بنے ہوئے تھے جو حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے زمانے میں ٹھنڈے کئے گئے ۔ سمرقند و بخارا کے آتش کدے ، بنو امیہ کے دور میں سرد ہوئے ۔ مجوسیوں کے ہاں ہر خوشی کے موقع پر آگ کا مظاہرہ ہوتا ہے ۔ایران میں نوروز منایا جاتا ہے تو چراغاں کا مظاہرہ کیا جاتا ہے ہندوستان میں اہل تشیع محرم میں الاوے جلاتے ہیں ، ہندوؤں میں جو دیوالی منائی جاتی ہے وہ آتش پرستی ہی کی بنا پر ہے ۔

شب برات میں چراغاں کی ایجاد کا سہرا بقول امام ابن وحیہ ، یحییٰ بن خالد برمکی کے سر ہے ۔ امام ابن وحیہ کی کوششوں سے مصر سے اور امام ابن تیمیہ کی کوشش سے ملک شام سے آتش پرستی کی بدعت کا قلع قمع ہو گیا ۔ لیکن ہند و پاک میں جہاں ایرانیوں کا اثر رہا، اس بدعت میں برابر اضافہ ہوتا رہا تاآں کہ اب ہر خوشی کے موقع پر آتش پرستی کا مظاہرہ کیا جاتا ہے اور شب تبریٰ میں تو آگ کا وہ کھیل کھیلا جاتا ہے جس کی بدولت کئی خاندان اسی آگ کی نذر ہو چکے ہیں اور چند لمحات کے لئے بھی یہ سوچنے کے لئے تیار نہیں کہ آتش بازی کے پس پردہ کیا چیز کار فرما ہے ۔جہاں تک چراغاں کا تعلق ہے اس کی حیثیت صرف کھیل کی نہیں بلکہ عوام الناس اسے رضائے الٰہی کے حصول کا ایک ذریعہ تصور کرتے ہیں جو ایک خالص مجوسی عقیدہ اور عین بدعت ہے

بعض لوگ اعتقاد رکھتے ہیں کہ شب برات میں مردوں کی روحیں گھروں میں آتی ہیں اور دیکھتی ہیں کہ کسی نے کچھ ہمارے لئے پکایا یا نہیں ۔

بعض لوگ کہتے ہیں شب برات سے پہلے کوئی مرجائے تو جب تک اس کے لئے فاتحہ شب برات نہ کیا جائے وہ مردوں میں شامل نہیں ہوتا ۔یعنی اس کی روح بھٹکتی پھرتی ہے جو خالص ہندوانہ عقیدہ ہے ۔یہ سب باتیں جاہل ملاؤں کی خود ساختہ ہیں جن کا حقیقت میں وجود نہیں ۔اس قسم کی تمام روایات بے دینی پھیلانے کے لئے وضع کی گئی ہیں ۔

شب برات کی اہمیت سے متعلق جو خرافات وضع کی گئیں ان سے محسوس ہوتا ہے کہ ان کا مقصد شب قدر کی عظمت گھٹانا اور مسلمانوں سے ماہ رمضان کی عبادتیں ترک کرانا ہے ۔

مولانا اشرف علی تھانوی اپنی کتاب "اصلاح الرسوم" میں لکھتے ہیں :۔

مجملہ ان رسوم کے شب برات کا حلوہ اور عید کی سویاں اور عاشورہ محرم کا کھچڑا اور شربت وغیرہ ہے ۔شب برات میں حدیث سے اس قدر ثابت ہے کہ رسول اکرمؐ بحکم حق تعالیٰ جنت البقیع میں تشریف لے گئے اور اموات کے لئے استغفار فرمایا ۔اس سے آگے سب بدعت ہے جس سے مفاسد کثیرہ پیدا ہوگئے "۔

رسول اکرم بقیع کو وفات سے چند روز پیشتر تشریف لے گئے تھے اور ۱۵/ شعبان کو جانے کا ذکر غلط ہے ۔

(کتاب "شب برات ۔ایک تحقیقی جائزہ" سے اقتباس)

برامکہ

ایرانیوں اور مجوسیوں کی ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ عربوں کے ایک طبقہ سے تعلق پیدا کر کے اسلام کے خلاف سازش کی جائے ۔ اسلام دشمنی کے سلسلہ میں حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کی شہادتیں اور جنگ جمل ، جنگ صفین اور جنگ نہروان اسی سازش کا نتیجہ تھیں ۔امیر معاویہ نے اس سیاست کو ناکام بنادیا تو وقتی طور پر یہ سازش دب گئی ۔لیکن بنو امیہ کے دور میں اولاً اولاد علی کے نام سے اور آخر میں اولاد عباس کو آلہ ٔکار بناکر بنو امیہ کا خاتمہ کر دیا گیا ۔بنو عباس نے عجمیوں کی ہی حمایت سے بنو امیہ سے اقتدار چھینا تو یہ دراصل بنو عباس کی کامیابی نہ تھی بلکہ عجمیوں کی سازش کی کامیابی تھی ۔اس طرح عباسیوں کے بھیس میں ایرانی خلافت پر قابض ہوگئے ۔یہی وجہ ہے کہ عباسی دور میں تمام کلیدی عہدے ایرانیوں اور مجوسیوں کے پاس رہے ۔ بنو عباس اور بنو علی کے حرم میں ہمیشہ ایرانی اور مجوسی عورتیں رہیں ۔ان مجوسیوں نے اسلام کا لبادہ اوڑھ کر جہاں عربوں کی قوت ختم کی

وہاں اسلام کی صورت تبدیل کرنے کے لئے ہزارہا داستانیں وضع کیں اور وہ امور داخل کئے جن کا اسلام سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔

ان مجوسی عہدہ داروں میں سب سے مشہور خاندان برامکہ کا ہے۔ برامکہ برمک کی جمع ہے جو ان کے جد اعلیٰ کا لقب تھا۔ اکثر علماء نے ان کو مجوسی تصور کیا ہے لیکن یہ دراصل بدھ مت کے پیرو تھے۔ اس بات کی وضاحت کے لئے حسب ذیل تفصیل پیش ہے۔

مشرق وسطیٰ میں بدھ مت مذہب کا فروغ دو ادوار میں ملتا ہے۔ ایسے شواہد ملتے ہیں کہ بدھ مذہب کے ماننے والے مصر، شام، فلسطین وغیرہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پہلے موجود تھے۔ گرنار کے کتبہ سے ثابت ہو چکا ہے کہ اشوک نے بدھ مذہب کی تبلیغ کے لئے پانچ مبلغین مشرق وسطیٰ کو بھیجے تھے۔ یہ مشرقی ممالک میں بدھ مذہب کے پھیلاؤ کا پہلا دور تھا۔ اس دور کے بارے میں GEIGER لکھتا ہے:۔

"سکندر کے بعد کے زمانہ میں بدھ مت مشرقی ایران میں زور پکڑ چکا تھا۔ اور اس مذہب کے پیرو طبرستان تک پھیلے ہوئے تھے۔ باختر میں بدھ راہب موجود تھے۔ یہ صورت حال جو تقریباً پہلی صدی قبل مسیح سے شروع ہوئی تھی ساتویں صدی عیسوی تک قائم رہی۔ جب ظہور اسلام نے کابل اور باختر میں بدھ مذہب کے فروغ کو روک دیا۔
"

GEIGER نے بدھ مت کے دونوں ادوار کو ملا دیا ہے۔ مشرق وسطیٰ میں بدھ مذہب کے پھیلاؤ کا دوسرا دور ہندوستان میں بدھ مذہب کے زوال کے بعد شروع ہوتا ہے ہندوستان میں بدھ مذہب کا زوال مسلمانوں کی آمد کے بعد مکمل نہیں ہوا جیسا کہ عام طور پر غلط فہمی پھیلائی گئی ہے بلکہ بدھ مذہب کے مکمل زوال اور اس کے پیروؤں کی بڑی بھاری اکثریت کو دیس سے نکال دینے کے بعد ہندوستان میں مسلمانوں کا داخلہ ہوا بلکہ اگر یہ کہا جائے تو درست ہوگا کہ بدھ مذہب کو ہندوستان کے نچلے پسماندہ طبقے اپنا سہارا تصور کرتے تھے۔ بدھ مذہب کے زوال

کے بعد نچلے طبقات میں مایوسی اور ہراسانی کی کیفیت پیدا ہوئی۔ بدھ مذہب کے اس خلاء کو پر کرنے کے لئے ہندوستان میں مسلمانوں کا داخلہ ممکن ہو سکا۔ جن کو پست اور مظلوم طبقات نجات دہندہ اور بدھ مذہب کے پیروؤں کے جانشین تصور کرتے تھے۔

شنکر اچاریہ کی زبردست تحریک کے زیر اثر مذہبی پیشواؤں اور راجاؤں کی سازش کے نتیجہ میں جب بدھ مذہب کے پیروؤں کو دیس سے نکال دیا گیا تو وہ ہندوستان کے اطراف کے تمام ممالک میں بس گئے جیسے سری لنکا، برما، ویٹ نام، تبت، چین، جاپان۔ اسی طرح مشرق وسطیٰ کے ممالک میں بھی جا بسے۔ دیرینہ تعلقات اور ہم مذہب افراد کی موجودگی کی وجہ سے ان کی نظر مشرق وسطیٰ کے ملکوں پر پڑی۔ مشرق وسطیٰ کے ممالک میں قدم جمانے کا موقع اس لئے بھی ملا کہ وہاں بدھ مذہب کے پہلے دور کے اثرات ابھی باقی تھے۔ جزیرۃ العرب میں جو ہندوستانی ہجرت کر گئے اور بس گئے تھے ان میں قابل ذکر قبیلے مید، سیابجہ، حمراء اور بیاسرہ ہیں۔

قاضی اطہر مبارکپوری نے لکھا ہے کہ:۔

"مید بدھ مذہب کے پیرو تھے۔ اسی طرح حمراء کے متعلق کہا جاتا ہے کہ بدھ مذہب سے تعلق رکھتے تھے اور گیروا لباس پہننے کی وجہ سے حمراء یعنی سرخ کہلاتے تھے"۔

اگر ساتویں صدی عیسوی میں عربستان اور مشرق وسطیٰ میں اسلام کو فروغ نہ ہوتا تو قرائن بتاتے ہیں کہ آج تمام مشرق وسطیٰ کا مذہب بدھ مت ہوتا اور اس مذہب کو ان ممالک میں اسی طرح فروغ حاصل ہوتا جیسا کہ ہندوستان کے دوسرے ہمسایہ ممالک میں ہوا۔

جب اسلام پھیلا تو خود بلاد عرب اور مشرق وسطیٰ کے دوسرے ممالک میں اسلام کو قبول کرنے والوں میں یہودیوں، عیسائیوں اور مجوسیوں کے ساتھ ساتھ بڑی تعداد میں بدھ مت کے پیرو بھی تھے۔

بہارات کا لفظ بہار کی جمع ہے۔ جو "وہار" کی بدلی ہوئی شکل ہے۔ ہندوستان کی مشرقی ریاست کا نام بہار بھی اسی مناسبت سے ہو گیا کہ گوتم بدھ کی پیدائش اسی

ریاست کے ایک مقام گیا میں ہوئی تھی اور وہاں بدھ مت مذہب کے دینی مراکز یعنی وہاروں کی کثرت تھی ۔ وسطِ ایشیاء کے شہر بخارا، کا نام دراصل وہار ہی کی بدلی ہوئی اور بگڑی شکل ہے بلخ کا نو بہار مجوسیوں کا آتش کدہ نہیں بلکہ بدھ مذہب کا نو وہار تھا ۔ اور بلخ میں مسلمانوں کی آمد تک موجود تھا ۔

مسلمانوں کی کلامی کتابوں میں ثمنیہ کا لفظ مستعمل ہے جس سے مراد ہندوستانی مفکرین کے ایک خاص گروہ کی لی جاتی ہے ۔

ابوریحان البیرونی (وفات ۱۰۴۸ء) نے لکھا ہے کہ :-

خراسان میں بوذاسف (مولانا مناظر احسن گیلانی کے بموجب بوذاسف بدھا کے لفظ کا عربی تلفظ ہے ۔ عربی کتابوں میں بدھا کا ذکر بوذاسف ہی کی شکل میں کیا جاتا ہے ۔) کے پیروں کو شمنان کہتے تھے ۔ (بدھا کی وفات کے چند صدیوں بعد ہی ان کی تعلیم مختلف تشریحات اور تاویلات اور برہمنیت کی سازش کا شکار ہو گئی اور بدھ مت میں مورتی پوجا کا رواج ہو گیا حالانکہ ہندوستان میں اس سے قبل مورتی کا رواج نہ تھا خود بدھا کی مورتیاں بنا کر ان کی پوجا کی جانے لگی ۔ **بقول مولانا مناظر حسن گیلانی** فارسی لفظ بت کی اصل بدھ مت ہی تھی ۔ دال، ت سے بدل گئی ان مورتیوں اور فرخادات (پیکروں) کے بہارات خراسان کے ان حصوں میں جو برصغیر سے قریب ہیں عام طور پر پائے جاتے ہیں ۔ لفظ ثمنیہ اسی شمنان کی نسبت سے بنایا گیا ۔ یعنی شمنان کا معرب ہے ۔

عباسی دربار کے برمکی وزراء کا نسلی تعلق بلخ کے نوبہار کے پرمکھوں سے تھا ۔ پرمکھ کا لفظ عربی میں برمک بن گیا ۔

ایران میں بدھ مذہب کے پیروؤں پر مجوسیوں کے اثرات بھی پڑے اور انھوں نے آتش پرستی کو بھی اختیار کیا ۔ یہی وجہ ہے کہ چراغاں کی بدعت سب سے پہلے برامکہ نے جاری کی ۔ جب وہ اسلام لائے تو انھوں نے اسلام میں وہ چیز داخل کر دی جس کو وہ اختیار کئے ہوئے تھے ۔ چراغاں سے ان کا مقصد آگ کی پوجا تھی حالانکہ شریعت اسلامی میں کسی موقع پر بھی ضرورت سے زیادہ روشنی کی اجازت نہیں

امام ابن دحیہ کے بموجب شب برات میں چراغاں کی ابتداء کا سہرا بھی یحییٰ بن خالد بن برمک کے سر ہے ۔ امام ابن دحیہ کی کوششوں سے مصر سے آتش پرستی (چراغاں) کی بدعت کا خاتمہ ہوا ۔ اس طرح ابن تیمیہ کی کوششوں سے ملک شام سے اس بدعت کا خاتمہ ہوا ۔ اب یہ بدعت زیادہ تر ہندو پاکستان میں ہے جہاں خود اہل ہنود کا ایک طبقہ آتش پرست ہے اور جہاں ایرانیوں کا ہمیشہ اثر رہا ۔

(کتاب "شب برات ۔ ایک تحقیقی جائزہ" سے اقتباس)

آل بویہ

عباسی خلافت کے عروج کا زمانہ ۱۳۲ھ سے ۲۴۷ھ تک ہے ۔ اس کے بعد زوال شروع ہوا اور خلافت عباسیہ کمزور ہوتی گئی ۔ حکمران اور امراء کی عیش پرستی نااہلی اور سب سے زیادہ اخلاقی زوال اور دینی اقتدار سے بیزارگی کے نتیجہ میں خلافت کا اقتدار کم ہوتا گیا ۔ ۳۲۲ھ میں راضی باللہ خلیفہ ہوئے تو ان کا اقتدار شہر بغداد اور اس کے مضافات تک ہی تھا ۔ کسی صوبہ سے خراج نہ آتا تھا ۔ راضی باللہ آخری خلیفہ تھے جنھوں نے مسجد میں جمعہ کا خطبہ دیا ۔ اس کے بعد خلیفہ کو اس کا موقع نہ ملا ۔ راضی باللہ کے جانشین متقی باللہ نیک تھے ۔ لیکن ان کے دور میں نظام حکومت درہم برہم ہو چکا تھا ۔

بحیرہ ، خزر (CASPIAN SEA) کے جنوبی ساحل پر بسنے والے ماہی گیر دیلمی کہلاتے تھے ۔ ان کا مورث اعلیٰ ابو شجاع بویہ تھا ۔ چونکہ اس خاندان کا تعلق ماژندران کے علاقہ دیلم سے تھا اس لئے بنی بویہ کو دیالمہ بھی کہتے ہیں ۔ سامانیوں کی [illegible] خاندان بھی ایرانی تھا ۔ بویہ کے تین بیٹے اسلامی فوج میں بھرتی ہو گئے ۔ ان کا مقصد تھا کہ عربوں کے فن حرب سے واقفیت حاصل کریں ۔ تربیت کے بعد گھر لوٹے تو باغی ہو گئے ۔ بڑے بھائی احمد بویہ نے اپنے قبیلہ کے نوجوانوں کو جمع کر کے ایک فوج تیار کی اور آس پاس کے علاقوں پر حملے کئے ۔ مغربی اور جنوبی ایران میں

اپنے اثرات بڑھائے۔ پھر جنوبی ایران پر حملہ کر کے شیراز پر قبضہ کر لیا۔ عباسیوں نے کوئی کارروائی نہ کی تو ان کی ہمت بڑھ گئی۔ انھوں نے ایران اور عراق میں علیحدہ علیحدہ حکومتیں قائم کیں۔ عراق کا پورا ملک اور خراساں کو چھوڑ کر باقی ایران بنی بویہ کے قبضہ میں تھا بغداد اور اصفہان اور شیراز بویہی حکومت کے بڑے شہر تھے۔ سامانیوں کے زوال کے بعد "رے" پر بھی ان کا قبضہ ہوگیا۔ عمادالدولہ ان کا مرکزی سربراہ تھا۔ اس کے بعد رکن الدولہ کو مرکزی حیثیت حاصل ہوئی۔ پھر عضدالدولہ ۳۶۶ تا ۳۷۲ھ اور اس کی اولاد کو۔

۳۳۴ھ میں احمد بویہ نے بغداد پر قبضہ کر لیا۔ خلیفہ مستکفی (وفات ۳۳۴ھ) نے فوراً اطاعت قبول کر لی اور اس کو معزالدولہ کا خطاب دے کر بغداد کا گورنر مقرر کر دیا اس کے بھائیوں حسن کو رکن الدولہ اور علی کو عمادالدولہ کے خطابات دے کر اپنے وزراء میں شامل کر لیا۔ اس طرح مرکزی حکومت پر بالکلیہ آل بویہ کا تسلط ہو گیا اور آل بویہ نے عباسی خلیفہ کو بے دست و پا پاکر مختلف طریقوں سے ذلیل کیا۔ کچھ عرصہ بعد قصر خلافت میں گھس کر خلیفہ کو گھسیٹتے ہوئے دربار عام میں لائے پھر بازار میں لے گئے اور ڈنڈے مارتے ہوئے سارے شہر میں گھما کر اندھا کر دیا اور قید میں ڈال دیا جہاں وہ سات سال ایڑیاں رگڑ کر مر گئے۔ پھر بنی بویہ نے کسی مجہول النسب شہزادہ کو مطیع اللہ کا اسم باسمیٰ خطاب دے کر اس شرط پر خلیفہ بنایا کہ وہ امور سلطنت میں مداخلت نہ کریں۔

آل بویہ کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ یہ لوگ زین العابدین بن حضرت حسین کے بیٹے زید کے پیروؤں کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے تھے۔ زید نے مرکزی حکومت کے خلاف خروج ضرور کیا تھا لیکن ان کے عقائد فرقہ باطلہ کے عقائد سے مختلف تھے۔ انھوں نے حضرات ابوبکر، عمر، اور عثمان کی مخالفت نہ کی لیکن آل بویہ زیدی شیعہ نہ تھے۔ انھوں نے سیاسی اغراض اور اسلام دشمنی کے تحت غالی شیعوں کے عقائد کو قبول کیا اور ان عقائد کو اپنے اقتدار کے ذریعہ رائج کیا۔

اس دور کے علمی اور ثقافتی ترقیوں کا ذکر کیا جاتا ہے جو اس سلسلہ کا ایک حصہ تھا۔ جس کی ابتداء رسول اکرم کے لائے ہوئے کامیاب انقلاب کے نتیجہ میں

مسلمانوں کی ہمہ جہتی ترقی کی شکل میں ہوئی تھی ورنہ بنی بویہ کا دور حکومت مسلمانوں میں عقائد کی کمزوری اور اخلاقی خرابیوں کا باعث ہوا۔ اس خاندان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے امت مسلمہ میں شیعی اثرات اپنے اقتدار کے ذریعہ وسیع پیمانہ پر داخل کر دیئے علمی سرپرستی کے نام پر شیعی عقائد کو بڑھاوا دیا۔ مثلاً عربی کے شاعر متنبی کی سرپرستی کی گئی۔ جس نے ماقبل اسلام کی عشقیہ اور رندی شاعری کی اتباع کی۔ اس نے عضدالدولہ اور صاحب ("رے" کے حکمران فخرالدولہ کو ایک قابل وزیر صاحب بن عباد مل گیا تھا۔ اس نے بارہ ۱۲ سال (۳۷۳ھ تا ۳۸۵ھ) حکومت کی اور ایسی شہرت حاصل کی جیسے برامکہ نے حاصل کی تھی) کی تعریف میں قصیدے لکھے۔ اسی خاندان نے اپنے خوشامدیوں سے ایسی کتابیں لکھوائیں جو سلف صالحین پر طعن سے بھری ہوئی تھیں۔ مسعودی بھی اسی دربار کا وظیفہ خوار تھا۔

بویہی حکومت سے پہلے اہل بغداد سب اہل سنت والجماعت تھے۔ تمام صحابہ کی عزت کرتے تھے۔ اس لئے آل بویہ نے کھل کر اپنے عقائد کو رائج کرنے کی ہمت نہ کی مسلمان خلافت کو اسلامی نظام کا لازمی حصہ سمجھتے تھے۔ اس لئے آل بویہ نے مجبوراً خلافت کو باقی رکھا۔ انھوں نے جب صحابہ پر لعنت اور سب و شتم کا سلسلہ شروع کرنا چاہا تو مسلمان برافروختہ ہوگئے۔ اس پر آل بویہ نے یہ مسئلہ اٹھادیا کہ خلافت نبوت کو چاروں اصحاب پر ختم سمجھ لیا جائے۔ امیوں کی خلافت ختم ہو چکی تھی۔ اس لئے ان کو جباروں میں شامل کرنا دشوار نہ تھا۔ روایتوں کی ٹکسال آل بویہ کے ہاتھ میں تھی جس قسم کی جو بات رائج کرنا چاہتے اس کی حمایت میں جیسی ضرورت ہوتی روایت تیار کر لیتے۔

معزالدولہ نے ۳۵۱ھ میں جامع مسجد بغداد کے دروازے پر یہ عبارت لکھوادی "اللہ کی لعنت ہو معاویہ ابن ابوسفیان پر اور اس پر جس نے فاطمہ کا فدک غصب کیا۔ (الزام ہے حضرت ابوبکر صدیقؓ پر) اور جس نے حسن کو روضہ مبارک میں دفن سے روکا۔ (الزام ہے حضرت عائشہؓ پر) اور جس نے ابوذرؓ کو سزا دی۔ (الزام ہے حضرت عثمانؓ پر) اور جس نے عباسؓ کو شوریٰ سے نکالا۔ (الزام ہے حضرت عمرؓ پر بنی عباس کی سیاست کو اپنا ہمنوا بنانے کے لئے حضرت عباسؓ کو درمیان میں لاکر

حضرت عمرؓ پر لعنت بھیجنے کا جو طریقہ اختیار کیا گیا اس سے بنی بویہ کی چالاکی ظاہر ہوتی ہے۔ بغداد میں کسی اہل سنت والجماعت کو ہمت ہوئی نہ حمیت کہ کم از کم اسے مٹا دیتا

اسی سال معزالدولہ نے فرضی عید غدیر منانے کا حکم دیا۔ اس کے لئے حضرت عثمانؓ کی شہادت کی تاریخ یعنی ۱۸/ ذی الحجہ منتخب کی گئی۔ خوب خوب خوشیاں منائی گئیں۔ بظاہر اور درون خانہ جو ہوا سو وہ تو ہوتا ہی ہے جو مجوسیوں کا شیوہ ہے۔ دوسرے سال یعنی ۳۵۲ھ میں معزالدولہ نے شہادت حسینؓ کا غم منانے کا حکم دیا۔ اس کے لئے یوم عاشورہ یعنی دس محرم کا انتخاب کیا گیا۔ سب دکانیں حکماً بند کروائی گئیں۔ لوگ ماتمی (سیاہ) لباس میں سڑکوں پر نکل آئے۔ عورتیں بھی اپنے بال کھول کر اور چھاتیاں کوٹتی نکلیں اور مرثیے پڑھنے لگیں۔ فرقہ باطلہ نے آل بویہ کے اقتدار کی آڑ میں خوب خوب دھوم مچائی اور آل بویہ نے اہل سنت والجماعت کی سیاسی اور اخلاقی کمزوری کا خوب فائدہ اٹھایا۔

اہل سنت دم بخود اور سارے تماشے کے خاموش تماشائی بنے رہے جس کے اثرات امت مسلمہ آج تک بھگت رہی ہے۔

۳۵۴ھ میں اہل سنت کو بھی ماتمی جلوس میں شامل ہونے کا حکم دیا گیا تو بغداد میں شیعہ سنی فساد برپا ہو گیا۔

معزالدولہ نے کربلا کے میدان میں تین سو برس بعد حضرت حسین کا مقبرہ تعمیر کروایا (کربلا کے حادثہ کے آٹھ دن بعد مقتولین کو دفن کرنے کے لئے کوفہ سے فوجی دستہ آیا تو اس کو صرف ڈھانچے ملے تھے) اور نجف کے ٹیلہ پر حضرت علیؓ کا فرضی مزار بنوایا۔ (حضرت علی کی لاش غنڈے لوٹ لے گئے تھے۔ پھر پتہ نہ چل سکا کہ کیا ہوئی) یہ دونوں زیارت گاہیں قدیم شہر "بابل" اور "ار" کے کھنڈروں پر قائم ہیں۔ اور شیعہ دنیا کے لئے مکہ و مدینہ کا نعم البدل یا ان کے مماثل قرار پائیں اور یہی آل بویہ کا مقصد تھا۔

اسی خاندان کے ایک فرد نے جو شریف الرضی اور سیدزادہ مشہور ہے۔ حضرت علیؓ کی وفات کے چار سو سال بعد "نہج البلاغہ" تصنیف کی اور اس کو حضرت علیؓ

سے منسوب کیا۔

آل بویہ نے اپنے نقطہ نظر سے خطبات (یہ خطبات آج تک ہندوستان اور پاکستان میں مروج ہیں) جمعہ لکھوائے اور مساجد میں بھیج دیئے ان کا پڑھنا لازمی قرار دیا۔ انھوں نے یہ بات طے کرادی کہ خطبوں میں صرف چار خلفاء کا نام لیا جائے۔ عشرہ مبشرہ کا ذکر اجمالاً ہو۔ ناموں کی تصریح نہ کی جائے۔ خلیفہ وقت کے لئے البتہ دعا کی اجازت تھی مگر اس کے ساتھ ساتھ خود آل بویہ کا مردود نام بھی لیا جائے رسول اکرمؐ کی بیٹیوں میں سے صرف حضرت فاطمہؓ کا تذکرہ جنت کی ملکہ اور ان کے بیٹوں کا ذکر جنت کے شہزادوں کی صراحت سے کیا گیا۔ حضرت عباسؓ کا ذکر خلفائے عباسیہ کے مورث ہونے کی بناء پر روکا نہ جاسکتا تھا۔ اسی لئے دوسرے چچا حضرت حمزہ کا نام شامل کر دیا گیا لیکن ان کے خطابات " اسد الله " اور سید الشہدا " ان سے چھین لئے گئے۔ حضرت عقیل حضرت علی ہی کی زندگی میں حضرت معاویہ سے جا ملے تھے اس لئے ان کا نام شریک نہیں کیا گیا اور غالباً اسی پاداش میں حضرت جعفر طیار کا نام بھی شریک نہ کیا گیا۔

آل بویہ نے ان خطبات کی تیاری اس عیاری سے کی تھی کہ آل بویہ اور عام مسلمانوں کے درمیان ایک قسم کا غیر مکتوب سمجھوتہ ہو گیا۔ مسلمانوں نے بھی حالات کو دیکھتے ہوئے اور پہلے خلفاء کی حرمت کو برقرار رکھنے کے لئے اس بدعت کو برداشت کر لیا کہ بہرحال خلفاء ثلثہ کا نام لینے کی سبیل تو نکلی۔ ورنہ بغداد کا حال تو یہ تھا کہ علانیہ مساجد کے دروازوں پر خلفائے اسلام کا نام لے لے کر لعنت لکھی جاتی تھی جسے رات کو مسلمان مٹا دیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ اہل سنت علماء اور خطیبوں میں اتنی ہمت اور اخلاقی جرات نہ تھی کہ ان خطبوں کی مخالفت کرتے۔ چند خطیبوں نے مخالفت کی تو شیعہ نوجوانوں کو یہ خطبے یاد کروا کر ان کو مذہبی وضع قطع دے کر مساجد پر سرکاری طور پر متعین کر دیا گیا۔ اور ان کو تنخواہیں مقرر کر دی گئیں۔ یہ تو شہر بغداد کی مساجد کا حال تھا۔ دیہات میں اماموں اور خطیبوں کو مقرر تو کر دیا گیا لیکن انھیں اجازت دی گئی کہ وہ عوام سے چندے لے کر اپنی گذر بسر کریں۔

ان ماہی گیر مجوسیوں کا اقتدار تقریباً ایک سو سال تک رہا اور وہ عباسی خلفاء پر حاوی رہے اور من مانی کرتے رہے۔ حتیٰ کہ ۵۳۲ھ میں خلیفہ راشد باللہ کو شیعوں نے قتل کر دیا۔ اس کے بعد بنو بویہ کے اثرات ختم ہوئے اور سلجوقیوں نے ان کی جگہ لی۔

ابو بکر ابن العربی کے مطابق جب اللہ تعالیٰ نے عالم اسلام کو آل بویہ کے تسلط سے نجات دی تو مسلمانوں نے بغداد کی مسجدوں کے دروازوں پر یہ عبارت لکھ دی کہ رسول اکرمؐ کے بعد بہترین ہستی ابو بکر صدیقؓ کی اور پھر حضرت عمرؓ کی پھر حضرت عثمانؓ کی پھر حضرت علیؓ اور پھر اہل ایمان کے ماموں حضرت معاویہؓ کی ہے" یہ آل بویہ کی حرکات کا رد عمل تھا ورنہ مسجدوں پر یہ کلمات لکھنے کی ضرورت نہ تھی۔

(ملت اسلامیہ کی تاریخ اور "ارمغان عجم" سے اقتباس)

بیعت

بیعت سہ حرفی مادہ بیع سے مشتق ہے جس کے معنی بیچنے، فروخت کرنے کے ہیں، یعنی نقد لے کر جنس دینا۔ اس کے مقابل شراء کا لفظ ہے جو شری سے مشتق ہے اس کے معنی خریدنے کے ہیں۔ یعنی نقد لے کر جنس دینا۔

بیع و شرا دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ جب خرید و فروخت، جنس کے عوض جنس ہو تو ہر ایک کو بائع اور مشتری کہہ سکتے ہیں۔ چنانچہ قرآن مجید میں شروہ بیچنے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ "وشروہ بثمن بخس (قرآن ۱۲ : ۲۰) اور اس کو تھوڑی سی قیمت پر بیچ ڈالا"۔

خرید و فروخت کا قرار داد ہو جانے پر ہاتھ پر ہاتھ مار کر اقرار یا معاہدہ کرنے کو بائع کہتے ہیں۔ اسی سے بائع السلطان (سلطان کی بیعت کرنا) اس امن و امان اور عطایا کے عوض جو سلطان عطا کرتا ہے اس کی اطاعت کے اقرار کو بیعت کہتے ہیں۔

رسول اکرمؐ نے مدینہ سے جو لوگ آئے تھے ان سے بیعت لی تھی جو تاریخ میں بیعت عقبہ سے یاد کی جاتی ہے۔ اسی طرح صلح حدیبیہ کے موقع پر حضرت عثمانؓ کی شہادت کی اطلاع ملنے پر قصاص لینے کے لئے رسول اکرمؐ نے تمام مسلمانوں سے جو اس وقت موجود تھے بیعت لی تھی جو بیعت رضوان کہلاتی ہے۔ اس کا ذکر قرآن مجید میں بھی ہے

رسول اکرمؐ کے بعد جس امامت پر امت کا اجتماع ہوا وہ حضرت صدیقؓ کی خلافت ہے۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ حضرت علیؓ نے خلفائے ثلاثہ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ ان کے مخلص مشیر اور خیر خواہ رہے۔ انھیں برحق خلیفہ اور واجب الطاعۃ تسلیم کیا۔ ابتدائے اسلام میں بیعت، بیعت خلافت بھی تھی اور بیعت ارادت بھی (یعنی مریدی کی بیعت)

ابتدائے اسلام میں صرف خلیفہ (امیرالمومنین) کی بیعت ہوتی تھی جس کا واحد مقصد خلیفہ کے توسط سے مملکت اسلامیہ سے غیر مشروط وفاداری کا اظہار تھا۔ اس بیعت کا مقصد حدود شریعہ کے نفاذ کے سلسلہ میں خلیفہ کے اختیارات کو تسلیم کرنا اور اسلامی مملکت کے تحفظ کے سلسلہ میں اپنے آپ کو جہاد کے لئے پیش کرنا تھا۔

خلفا کی بیعت میں تزکیہ نفس، سلوک الی اللہ۔ نسبت، توجہ اور فیضان وغیرہ کا تصور مضمر تھا۔ خلیفہ سے بیعت اور ارادت گویا اسلامی تعلیماتِ سے مکمل وابستگی کا اظہار تھا۔

خلفا جو بیعت لیتے تھے وہ علانیہ ہوتی تھی۔ اسلام میں پہلے فرد جنھوں نے مملکت اسلامیہ میں انتشار پھیلانے پوشیدہ طور پر بیعت لی وہ مسلم بن عقیل تھے۔ اس کے بعد سے دعویدار ان خلافت کے وقتاً فوقتاً خروج کا سلسلہ شروع ہوا اور پوشیدہ طور پر بیعتیں لی جانے لگیں۔ بیعت کرنے والے نہ صرف بیعت کرتے بلکہ اپنے امام کی مالی مدد بھی کرتے۔ رفتہ رفتہ بیعت صرف بیعت ارادت ہو گئی۔ چنانچہ صوفیا اپنے ارادت مندوں یا مریدوں سے بیعت لیتے ہیں۔ بیعت اسلام اور اس کی مرکزیت سے وابستگی کی بجائے مرشد کے مخصوص عقائد اور مرشد کے دیئے ہوئے "علم سینہ" سے وابستگی کا نشان اور انتشار کا باعث بنی۔

بیعت کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ بیعت سے خلافت قائم ہوتی ہے۔ رائے عامہ کی حمایت ہی سے استحقاق خلافت ثابت ہوتا ہے۔ اگرچہ کچھ لوگ بیعت سے منحرف ہوں یعنی انکار کریں تو ان سے کچھ تعرض نہیں کیا جائے گا جب تک یہ ثابت نہ ہو کہ وہ جتھا بنا کر باقاعدہ حکومت کے خلاف صف آرا ہونا چاہتے ہیں۔ اگر مسلمان متفقہ طور پر بیعت نہ کریں تو خلافت قائم نہ ہوگی یا قیام کی کوشش کی گئی تو باطل قرار پائے گی۔ قیام خلافت کے بعد خلیفہ جو عمل انجام دے مسلمانوں پر لازم ہے کہ خلیفہ کا ساتھ دیں۔ ہر خلیفہ پر کتاب و سنت رسول اور جمیع خلفائے راشدہ کے طریقہ پر عمل کرنا ضروری ہے تاکہ تسلسل باقی رہے۔

نص صریح ہے کہ محمدؐ تم میں سے کسی (مرد) کے باپ نہیں، لیکن آپ اللہ کے رسول اور خاتم النبیین ہیں (قرآن ۳۳: ۴۰) یہاں "لکن" کے بعد یہ نہیں ہے کہ فلاں کے خسر ہیں، یا فلاں کے داماد۔ بلکہ بتایا گیا ہے کہ آپ اللہ کے رسول اور خاتم النبیین ہیں یعنی نظام اسلامی کے بارے میں محمدؐ بن عبداللہ ہاشمی سے انتساب نہیں ہوتا۔ جو شخص دین کی جتنی زیادہ خدمت کرے گا وہ آپ سے قریب ہوگا۔ اگرچہ نسباً بعید ہو اور جس شخص سے امت کو نقصان پہنچے گا وہ آپ سے بعید ہوگا۔ اگرچہ نسباً قریب ہو۔ اس بات پر شروع سے آج تک امت کا اجماع ہے، جو اسی نص صریح پر مبنی ہے۔

امیرالمومنین کے ہاتھ پر بیعت خود اس سے نہیں ہوتی۔ بلکہ یہ عہد آئین حکومت سے وفاداری کا ہوتا ہے۔ اشخاص کی حیثیت ثانوی ہوتی ہے۔

بیعت رضوان

خانہ کعبہ جسے حضرت ابراہیمؑ نے تعمیر کیا، تمام عربوں کی مرکزی عبادت گاہ تھا اور تمام عرب اس کو اپنا مشترک ورثہ سمجھتے تھے۔ عام طور پر سب عرب اس بات کو مانتے تھے کہ کعبہ پر تمام قبائل کا حق ہے۔

ذی قعدہ ۶ ہجری میں رسول اکرمؐ عمرہ کی نیت سے مکہ معظمہ کے لئے روانہ

ہوئے۔ عمرہ کا احرام باندھا، قربانی کے اونٹ ساتھ لئے اور یہ حکم دیا کہ کوئی مسلمان (بجز ایک تلوار) ہتھیار باندھ کر نہ آئے۔ چنانچہ چودہ سو صحابہ جن میں مہاجرین و انصار شامل تھے روانہ ہوئے ذوالحلیفہ پہنچ کر قربانی کی ابتدائی رسمیں ادا کیں۔

جب قریش کو مسلمانوں کے آنے کی اطلاع ملی تو کعبہ کی روایات کے برخلاف تمام قبائل کے نمائندوں کو یکجا کر کے کہہ دیا کہ محمدؐ اور ان کے ساتھی ہرگز مکہ کو نہیں آسکتے۔ باضابطہ مقابلہ کی تیاری کی۔ خالد بن ولید اور عکرمہ بن ابو جہل دو سو سواروں کے ساتھ آگے بڑھے۔ رسول اکرمؐ نے حدیبیہ پہنچ کر قیام کیا جو مکہ سے ایک منزل (۱۲ کیلومیٹر کے فاصلہ) پر واقع ہے رسول اکرمؐ نے قبیلہ خزاعہ کے سردار بدیل کے ذریعہ قریش کو پیام بھیجا کہ ہم "عمرہ کی غرض سے آئے ہیں۔ لڑنا مقصود نہیں۔ جنگوں نے قریش کی حالت زار کر دی ہے ان کے لئے یہی بہتر ہے کہ ایک معین مدت کے لئے صلح کا معاہدہ کر لیں اور مجھے عرب کے ہاتھ میں چھوڑ دیں۔ اس پر بھی وہ راضی نہ ہوئے تو قسم اللہ کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے میں آخری دم تک لڑوں گا اور فیصلہ اللہ پر چھوڑ دوں گا"۔

قریش کی جانب سے عروہ بن مسعود ثقفی رسول اکرمؐ کی خدمت میں آئے لیکن معاملہ ناتمام رہا۔ رسول اکرمؐ نے خراش بن عمیہ کو بھیجا۔ قریش نے ان کی سواری کے اونٹ کو مار ڈالا لیکن وہ کسی طرح جان بچا کر آگئے۔ پھر رسول اکرمؐ نے صلح کی گفتگو کے لئے حضرت عمرؓ کا انتخاب کیا، انھوں نے معذرت کی کہ قریش میرے سخت دشمن ہیں اور سارے مکہ میں میرے قبیلہ کا ایک شخص بھی نہیں جو مجھے بچا سکے۔ رسول اکرمؐ نے ان کے عذر کو قبول فرمایا اور حضرت عثمانؓ کو سفیر مطلق بنا کر بھیجا حضرت عثمانؓ اپنے عزیز ریاض بن سعد کی حمایت میں مکہ گئے۔

جب حضرت عثمانؓ کی واپسی میں تاخیر ہوئی تو مسلمانوں میں یہ افواہ پھیل گئی کہ حضرت عثمانؓ کو شہید کر دیا گیا۔ رسول اکرمؐ نے فرمایا:۔ کہ حضرت عثمانؓ کے خون کا قصاص لینا فرض ہے یہ کہہ کر آپؐ نے ایک ببول کے درخت کے نیچے بیٹھ کر جملہ صحابہ سے جو اس وقت ساتھ تھے بیعت لی۔ سب نے آپؐ کے دست مبارک پر

جاں نثاری کا عہد کیا۔ اس بیعت کو بارگاہ ایزدی میں قبولیت حاصل ہوئی۔ اس لئے اس بیعت کا نام بیعت رضوان ہے۔ یہ اسلام کا نہایت اہم اور مہتم بالشان واقعہ ہے بعد میں حضرت عثمانؓ کی شہادت کی افواہ غلط ثابت ہوئی۔ واقعہ یہ تھا کہ حضرت عثمانؓ کو مہمان داری کے لئے روک لیا گیا تھا۔

بیعت رضوان سے کئی اہم نتائج اخذ کئے جاسکتے ہیں:۔

۱۔ حضرت عثمانؓ تاریخ عالم میں پہلے شخص ہیں جن کو کسی رسول کا سفیر مطلق بنا کر بھیجا گیا۔

۲۔ ان کے خون کے قصاص کو رسول اکرمؐ نے اتنی اہمیت دی کہ اس کے لئے خصوصی بیعت لی۔

۳۔ حدیبیہ میں جو صورت حال پیش آئی اس پر رسول اکرمؐ نے دو طرح کا رد عمل ظاہر کیا، جو ایک دوسرے سے مختلف تھا۔ حدیبیہ میں اشتعال انگیز حالات پیش آئے تو رسول اکرمؐ نے مسلمانوں کے نسبتاً کمزور موقف کا اندازہ کر کے حالات سے نبٹنے میں انتہائی صبرو تحمل سے کام۔ لیکن جب حضرت عثمانؓ کی شہادت کی اطلاع ملی تو جملہ صحابہ سے فرداً فرداً عہد لیا کہ قریش سے بدلہ لیں گے خواہ نتیجہ کچھ ہی ہو۔

۴۔ بیعت رضوان سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ رسول اکرمؐ کو غیب کا علم نہ تھا۔ اگر غیب کا علم ہوتا تو آپ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے قصاص کا عہد نہ لیتے جو اس وقت مکہ میں زندہ و سلامت موجود تھے۔

۵۔ سب سے اہم نکتہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں بیعت رضوان کا ذکر اس طرح فرمایا:۔

"(اے نبیؐ) جو لوگ تم سے بیعت کر رہے تھے وہ در اصل اللہ سے بیعت کر رہے تھے۔ ان کے ہاتھ پر اللہ کا ہاتھ تھا۔ اب جو اس عہد کو توڑے گا اس کی عہد شکنی کا وبال اس کی اپنی ہی ذات پر ہوگا۔ اور جو اس عہد کو وفا کرے گا۔ جو اس نے اللہ سے کیا ہے۔ اللہ عنقریب اس کو بڑا اجر عطا فرمائے گا۔" (الفتح آیت ۱۰)

"اللہ مومنوں سے راضی ہوگیا جب وہ درخت کے نیچے آپ سے

بیعت کر رہے تھے"۔ (الفتح آیت ۱۸)

یہ بات کہ جس وقت بیعت لی جارہی تھی۔ حضرت عثمانؓ مکہ معظمہ میں صحیح و سلامت موجود تھے۔ رسول اکرمؐ کو معلوم نہ تھی لیکن اللہ تعالیٰ کو تو معلوم تھی پھر بھی اس بیعت کو اللہ سے عہد قرار دیا گیا تو اس سے صاف ظاہر ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بیعت رضوان اصلاً حضرت عثمانؓ کی شہادت کا قصاص لینے کا عہد تھا۔ جب بھی وہ واقع ہو۔ رسول اکرمؐ اور مسلمانوں نے یہ سمجھا تھا کہ شہادت وقوع پذیر ہو چکی۔ اللہ تعالیٰ کو معلوم تھا کہ شہادت عثمان ۳۵ ہجری میں واقع ہوگی اور اسی امر واقعہ کے قصاص کے عہد کو اللہ تعالیٰ نے اہمیت دی، اور فرمایا:۔

کہ جو اس عہد کو توڑے گا اس کی عہد شکنی کا وبال اس کی اپنی ہی ذات پر ہوگا

جب ۳۵ ہجری میں سبائی بلوائی اور دشمنان اسلام ایسے وقت جب کہ مدینہ کی آبادی کا ایک بڑا حصہ حج کے لئے یا جہاد پر گیا ہوا تھا، منظم سازش کے تحت مدینہ میں گھس آئے خلیفہ وقت حضرت عثمانؓ کے مکان کا محاصرہ کر کے پانی کی سربراہی تک روک دی۔ پھر مکان کی چھت توڑ کر اندر اتر گئے اور امیرالمومنین حضرت عثمانؓ کو اس وقت جب کہ وہ قرآن مجید کی تلاوت کر رہے تھے شہید کر دیا۔

جب حضرت عثمانؓ کی شہادت واقع ہو گئی تو بیعت رضوان میں شریک جو صحابہ بقید حیات تھے، ان پر حضرت عثمانؓ کے خون کا قصاص لینا خصوصی طور پر فرض ہو گیا، لیکن ایسے افسوس ناک حالات پیدا ہو گئے کہ امت مسلمہ دو گروہوں میں بٹ گئی۔ ایک گروہ طالبان قصاص کا تھا اور دوسرا مانع قصاص تھا۔ اس عبرتناک خانہ جنگی کے نتیجہ میں مسلمانوں کی تلوار مسلمانوں کے خلاف اٹھی۔

جنگ جمل (۳۶ھ) جنگ صفین (۳۷ھ) اور جنگ نہروان (۳۸ھ) میں کم و بیش ۸۵ ہزار مسلمانوں کا خون ہوا۔ معاندین اسلام کی سازش کامیاب رہی۔ اسلام کی مرکزیت کو ایسا نقصان پہنچا جس کی تلافی آج تک نہ ہو سکی۔ اسلام کی اشاعت اور مسلمانوں کی فتوحات رک گئیں۔ مسلمانوں کے دینی اور اخلاقی اقدار کو سخت دھکا پہنچا۔ اخوت اسلامی جس کی سابقہ امتوں میں مثال نہ تھی، بری طرح متاثر ہوئی، جب

۴۰ھ میں سیدنا امیر معاویہ کی خلافت پر پوری امت مسلمہ کا اجماع ہوا تو عالم اسلام میں پھر ایک بار امن و امان قائم ہوا۔ اور اس سال کو عام الجماعت (جماعت کا سال) کہا گیا۔

(ملت اسلامیہ کی تاریخ حصۂ اول صفحہ ۵۳ سے اقتباس)

تحکیم

جنگ صفین کے موقع پر حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے درمیان تحکیم (ثالثی) پر اتفاق ہوا۔ اس سلسلہ میں عام طور پر جو باتیں بیان کی جاتی ہیں ان کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ اصل واقعات یوں ہیں:۔

حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کی فوجیں صفین کے مقام پر ایک دوسرے کے سامنے آئیں۔ ۳۶ھ بغیر کسی جنگ کے گذر گیا۔ ۳۷ھ کے اوائل میں بھی کوئی جنگ نہیں ہوئی کیونکہ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ دونوں خون ریزی سے بچنا چاہتے تھے چنانچہ دونوں نے صلح کی کوشش کی اور دو دن بغیر کسی جنگ کے گذر گئے۔ لیکن سبائی اشرار جو حضرت علیؓ کے ساتھ تھے چاہتے تھے کہ کسی نہ کسی طرح دونوں فوجوں میں تصادم ہو۔ چنانچہ تیسرے دن جنگ شروع ہوئی اور ایک ہفتہ تک جاری رہی۔ حضرت معاویہؓ نے حضرت عمرو بن العاصؓ کے مشورہ سے آخری بار صلح کی کوشش کی اور یہ اعلان کروایا کہ فریقین کے درمیان قرآن ہی فیصلہ کریگا۔ یہ بات غلط اور سبائیوں کی اختراع ہے کہ حضرت عمرو بن العاصؓ نے شکست کے آثار دیکھ کر اور حضرت علیؓ کے لشکر میں اختلاف پیدا کرنے کے لئے صلح کا مشورہ دیا تھا۔ غیر محتاط مورخوں نے یہ بات بھی مشہور کر دی کہ شامیوں نے نیزوں پر قرآن مجید بلند کیا۔ اس وقت قرآن مجید کے مطبوعہ نسخے تو تھے نہیں کہ نیزوں پر بلند کئے جاتے۔ حضرت معاویہؓ نے قرآن مجید کا ایک نسخہ ایک شخص کے ہاتھ حضرت علیؓ کے پاس بھیجا۔

جنگ بندی:۔

حضرت علیؓ نے فوراً پیام صلح کو منظور کر کے جنگ بند کرنے کا حکم دے دیا اور تحکیم پر راضی ہو گئے۔ حضرت علیؓ کے حکم کی تعمیل میں تمام محاذوں پر جنگ بند ہو گئی لیکن ایک گروہ نے مالک اشتر نخعی کی سرکردگی میں جنگ جاری رکھی۔ یہ کہنا کہ حضرت علیؓ جنگ جاری رکھنا چاہتے تھے اور خارجی جنگ بندی چاہتے تھے تاریخ کا مغالطہ ہے۔

جب مالک اشتر نے حضرت علیؓ کے حکم کے باوجود جنگ کو جاری رکھا تو چند شیعان علی کو یہ شبہ پیدا ہوا کہ حضرت علیؓ نے ظاہر میں تو جنگ بندی سے اتفاق کر لیا ہے لیکن اندرونی طور پر جنگ جاری رکھنے کی ہدایت دی ہے چنانچہ ان شیعان علی نے حضرت علیؓ کو قتل کی دھمکی دی۔ (اظہار حقیقت جلد دوم صفحہ ۳۳۸ تا ۳۵۰)

تحکیم:۔

فریقین کے درمیان بات چیت اور خطوط کے طویل سلسلہ کے بعد تحکیم پر اتفاق ہو گیا اور یہ طے ہوا کہ دونوں قائد اپنی اپنی جانب سے ایک ایک شخص کو نامزد کریں۔ حضرت علیؓ نے حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کو اور حضرت معاویہؓ نے حضرت عمرو بن العاصؓ کو نامزد کیا۔

تحکیم کے تعلق سے عام طور پر ابو مخنف لوط بن یحییٰ کی روایت کو بنیاد بنایا گیا ہے جو مسلمہ طور پر ناقابل اعتبار ہے۔ اس کی روایت کو ابن جریر طبری نے نقل کیا ہے اور سب تاریخوں میں اسی روایت کے بموجب تحکیم کا واقعہ بیان کیا گیا ہے تحکیم کے تعلق سے یہ روایت عبداللہ بن امام احمد بن حنبل سے نقل کیا ہے۔ اس روایت کی انتہا زہری پر ہوتی ہے اور یہ روایت منقطع ہے (زہری اور طبری پر علحدہ مضامین شامل اشاعت ہیں)۔ ان غیر معتبر روایات کے مقابلہ میں تحکیم کے متعلق قابل ترجیح روایت محدث کبیر دار قطنی کی ہے جس کو قاضی ابو بکر بن العربی نے العواصم من القواصم میں نقل کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ کسی محدث کے مقابلہ میں ابو مخنف، زہری یا طبری کی روایت کو قبول نہیں کیا جا سکتا۔ حکمین کے سپرد یہ کام تھا کہ وہ قرآن اور سنت کی روشنی میں ایسا فارمولہ تیار کریں جس سے فریقین کے درمیان نزاع کا خاتمہ ہو جائے۔ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے درمیان اختلافی امور دو تھے:۔

(۱) حضرت معاویہؓ، حضرت عثمانؓ کے قاتلوں سے قصاص لینے اور سبائی پارٹی کی قوت کو توڑنے کا مطالبہ کر رہے تھے۔ سبائیوں کے زیر اثر حضرت علیؓ اس مطالبہ کو پورا نہیں کر رہے تھے۔

(۲) حضرت علیؓ، حضرت معاویہؓ سے بیعت کا مطالبہ کر رہے تھے۔ حضرت معاویہؓ کا ادعا تھا کہ حضرت علیؓ کا انتخاب آزاد فضا میں نہیں ہوا بلکہ مفسدوں کا ایک گروہ دباؤ اور جبر سے کام لے رہا تھا اور خلافت کی پالیسی اور سیاست پر چھایا ہوا تھا اس لئے حضرت معاویہؓ دوبارہ انتخاب اور استصواب (رائے دہی) کا مطالبہ کر رہے تھے۔ حضرت معاویہؓ نے خلافت کا ادعا نہیں کیا تھا۔

حکمین نے دومۃ الجندل کے مقام پر حضرت معاویہؓ کے متعلق یہ فیصلہ دیا کہ وہ قصاص، خلیفہ کے انتخاب جدید اور استصواب کا مطالبہ ترک کر دیں اور حضرت علیؓ کے متعلق یہ فیصلہ دیا کہ حضرت معاویہؓ سے بیعت کے مطالبہ سے دستبردار ہو جائیں حکمین اس بات پر متفق ہو گئے کہ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے درمیان اختلافی امور صحابہ کی غیر جانب دار جماعت کے سپرد کر دیئے جائیں۔ حکمین کے سامنے یہ مسئلہ نہ تھا کہ دونوں حضرات میں سے کس کو خلیفہ رکھا جائے۔

عام طور پر تاریخ کی کتابوں میں جھوٹی روایات کی روشنی میں یہ بات بیان کی جاتی ہے کہ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ نے یہ اعلان کیا کہ وہ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ دونوں کو معزول کرتے ہیں۔ آئندہ مسلمان جسے پسند کریں خلیفہ منتخب کر لیں اس کے بعد حضرت عمرو بن العاصؓ نے اپنا فیصلہ یوں سنایا:۔

ابو موسیٰ اشعریؓ کا فیصلہ آپ لوگوں نے سن لیا۔ انھوں نے اپنے آدمی کو معزول کر دیا، میں بھی اس کو معزول کرتا ہوں لیکن اپنے آدمی معاویہؓ کو برقرار رکھتا ہوں۔" اس وقت تک چونکہ حضرت معاویہؓ نے خلافت کا دعویٰ نہیں کیا تھا اس لئے دونوں کو معزول کرنے یا حضرت معاویہؓ کو خلیفہ برقرار رکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا پھر یہ بھی غور طلب ہے کہ حضرت عمرو بن العاصؓ کو یہ اختیار نہ تھا کہ حضرت معاویہؓ کو خلیفہ بنا دیتے۔ یہ اختیار تو عامۃ المسلمین کو حاصل تھا۔

حکمین کو فریقین کے درمیان نہیں بلکہ امت کے درمیان اتحاد کے سلسلہ

میں سفارشات پیش کرنے کا ذمہ دار قرار دیا گیا تھا۔ حکمین کو فیصلہ نافذ کرنے کا اختیار نہ تھا۔

اکابر صحابہ کا فیصلہ:۔

حسب قرارداد بمقام اذرح صحابہ کرام کا اجتماع ہوا۔ انھوں نے حکمین کے فارمولہ پر غور کر کے اپنا فیصلہ دیا۔ اس فیصلہ کی تفصیلات سے ہماری تاریخ ساکت ہے لیکن بعد کے واقعات سے اس فیصلہ کی نشاندہی ہوتی ہے۔ اذرح کے اجتماع کے بعد مملکت اسلامیہ عملاً دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ ایک حصہ پر حضرت علیؓ حکمران رہے اور دوسرے پر حضرت امیر معاویہؓ اس کے بعد فریقین میں کوئی جنگ نہیں ہوئی اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اذرح میں غیر جانبدار صحابہ نے فیصلہ دیا تھا کہ جب تک نئے سرے سے خلیفہ کا انتخاب عمل میں نہ آئے مملکت اسلامیہ کو دو حصوں میں منقسم سمجھا جائے۔ اس تصفیہ کا مزید ثبوت اس خط و کتابت سے بھی ملتا ہے جو حضرت علی اور حضرت معاویہؓ کے درمیان ۴۰ھ میں ہوئی۔

(اظہار حقیقت اور ملت اسلامیہ کی تاریخ سے اقتباس)

تصوف

تصوف یونانی لفظ صوفیا سے مشتق ہے۔ اس کے معنی ایسی حکمت کے ہیں جو خالق کائنات کی پہچان کا ذریعہ ہو اور جس سے اس کی ذات و صفات اور افعال کا علم حاصل ہوتا ہو۔ اسی کو معرفت کہتے ہیں۔ صوفی وہ ہے جو حکمت الہیٰ کا طالب ہو۔

ابن خلدون کا خیال ہے کہ یہ کلمہ "صوف" سے مشتق ہے کیونکہ اہل تصوف صوف کا لباس پہنتے تھے جو اونٹ کے بالوں سے بنایا جاتا تھا۔ مستشرقین بہت بحث کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ لفظ صوفی صوف سے مشتق ہے جو ایک قسم کا ریشمی کپڑا ہوتا تھا چونکہ مسلمان زاہدوں نے عیسائی راہبوں کی تقلید میں جو شام میں موجود تھے اس کپڑے کو ترک دنیا کی علامت کے طور پر پہننا شروع کیا تھا، اس لئے یہ لوگ صوفی

کہلائے۔

لیکن سب سے اہم توجیہ ابوریحان البیرونی نے کی۔انھوں نے "کتاب الہند" میں لکھا کہ تصوف اصل میں "س" سے تھا اور اس کا مادہ "سوف" تھا۔جس کے معنی یونانی زبان میں حکمت کے ہیں۔دوسری صدی ہجری میں جب یونانی کتابوں کا عربی میں ترجمہ ہوا تو رفتہ رفتہ صوفی بن گیا۔

پروفیسر نکلسن نے اس خیال کو بڑے وثوق کے ساتھ پیش کیا ہے کہ اسلامی تصوف یونانی فلسفہ کے زیر اثر پیدا ہوا۔انھوں نے صوفیہ اور حکمائے یونان کے خیالات میں تطبیق دینے کی کوشش کی۔حقیقت یہ ہے کہ کم و پیش ایک سو سال قبل مسیح میں یونان میں ایک جماعت تھی۔جو SOPHISTS کہلاتی تھی۔اس کے افراد Travelling Teachers Of Wisdom یعنی حکمت و عرفان کے چلتے پھرتے "اساتذہ" کہلاتے تھے۔یہ لوگ مذہبی عقائد اور مناہیات یعنی Taboo کی پروا نہ کرتے ہوئے اپنی باتیں بلا جھجک بیان کرتے تھے۔مسلمان صوفیوں نے اسلامی ذرائع سے بنیادیں تلاش کر کے اس نقطہ نظر کو ایک علحدہ مستقل فکر و خیال کی حیثیت دینے کی کوشش کی اور تصوف کے نظریات کو قرآن و حدیث سے ثابت کرنے کی کوشش کی۔

تصوف سے خالق کائنات کی پہچان ہوتی ہے تو لازماً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا تصوف اسلام سے علحدہ کسی تعلیم کا نام ہے یا اسلام ہی کا ایک جزو ہے۔اگر اسلام ہی کا ایک جزو ہے تو علحدہ نام دے کر علحدہ تعلیمات اور عقائد کے ذریعہ اس کو پھیلانے کی کیا ضرورت تھی؟

تصوف اور اسلام کے باہمی تعلق پر غور کریں اور یہ معلوم کرنا چاہیں کہ مسلمانوں میں یہ تحریک کیونکر پیدا ہوئی اور اس کا ارتقاء کس طرح ہوا تو معلوم ہوتا ہے کہ ہر زمانہ اور ہر ملک میں محققین اسلام کے ایک گروہ نے جن کو "علماء ظاہر" کا حقارت آمیز خطاب دیا گیا۔تصوف سے اختلاف کیا اور اس کو غیر اسلامی قرار دیا۔ واقعہ یہ ہے کہ تصوف اسلام کی سرزمین میں ایک اجنبی پودا ہے۔

تصوف کا ایک اہم ماخذ شریمد بھگوت گیتا بھی ہے۔گیتا اور اسلامی تصوف کی

تعلیمات میں بہت کچھ اثرات مشترک ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ گیتا کے خیالات اور اثر راست یا بالواسطہ طور پر تصوف پر پڑا۔گیتا اور تصوف کی تعلیم میں ہم آہنگی واضح ہے۔گیتا کی تعلیمات وہی ہیں جن کو اہل تصوف فلسفہ وحدت الوجود (ابن عربی پر علحدہ مضمون شریک اشاعت) کہتے ہیں۔

دارا شکوہ (وفات ۱۶۶۰ء) نے اپنی مشہور کتاب "مجمع البحرین" میں "ویدانت" اور تصوف کی اصطلاحات کا مقابلہ کیا۔بھگوت گیتا کے مختلف ابواب کے عنوانات سے بھی یہ مماثلت واضح ہوتی ہے۔گیتا کے پانچویں ادھیائے کا عنوان ہے۔"اعمال کے نتیجہ سے دست بردار ہونے کا فلسفہ" چھٹے ادھیائے کا عنوان ہے۔"خود پر قابو پانے کا فلسفہ" ساتویں ادھیائے کا عنوان ہے۔"علم عرفان کا فلسفہ"۔گیارھیوں ادھیائے کا عنوان ہے "ہمہ از وست کا فلسفہ" اٹھارویں ادھیائے کا عنوان ہے۔"ترک علائق کا فلسفہ"۔بھگوت گیتا میں جس کو "وشوا روپم یا" "وراٹ روپم" کہا گیا ہے اسی کو صوفی لٹریچر میں "شکل محیط" کہا جاتا ہے۔

یہ قول کہ ویدانت نہ کوئی مذہب ہے اور نہ فلسفہ، شریمد بھگوت گیتا کی طرح تصوف پر بھی صادق آتا ہے جس میں ویدانت کے نظریے کی بازگشت وحدت الوجود کی صورت میں صاف سنائی دیتی ہے۔

ظاہر ہے کہ اسلام نے دیگر مذاہب سے کوئی خیال یا تعلیم مستعار نہ لی بلکہ یہ اثرات بن بلائے مہمان کی طرح دوسرے مذاہب سے آئے۔اگر دوسرے مذاہب اپنی اصلی حالت پر باقی رہتے تو ان میں اور اسلام میں کسی اختلاف کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا کیونکہ اسلام کوئی نیا دین نہیں ہے۔جس طرح دوسرے ادیان میں بگاڑ پیدا ہوا اسی انداز سے اسلام میں بھی بگاڑ پیدا کرنے کی کوششیں ہوئیں اور اسلام کو عقائد باطلہ کی یورش کا سامنا کرنا پڑا۔

قرآن مجید نے عقائد باطلہ ہی کی بنیادوں پر ضرب لگائی۔مثلاً بعض مذاہب کا عقیدہ ہے کہ "ساری کائنات خالق کی لیلا ہے"۔اس خیال کو قرآن مجید نے یہ کہہ کر رد کیا:۔

ہم نے اس کائنات کو لہو و لعب کے لئے پیدا نہیں کیا بعض قدیم عقاید پر فلسفہ

قنوطیت کا اثر تھا۔ قرآن مجید نے لَا تَقْنَطُوا مِن رَّحْمَةِ اللّٰه (قرآن ۳۹: ۵۳) کہہ کر اس تمام فلسفہ کو باطل قرار دیا۔

عیسائیوں میں تثلیث کا عقیدہ باطل رائج ہوگیا تھا۔ جس کی تعلیم حضرت عیسیٰؑ نے نہیں دی تھی۔ قرآن مجید نے لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ (قرآن ۱۱۲: ۳) کہہ کر تثلیث کی بنیاد ہی کو غلط قرار دیا۔

ڈوزی، فان کریمر، وغیرہ کی رائے ہے کہ تصوف فلسفہ ویدانت سے ماخوذ اور ہندی الاصل ہے۔ کچھ لوگ بدھ مت کو اس کا منبع قرار دیتے ہیں۔

تصوف کی ابتداء بظاہر رسم پرستی، ظاہر بینی اور استبداد و استحصال کے رد عمل میں ان کے خلاف باغیانہ تحریک کے طور پر ہوئی۔ اور یہ بتایا گیا کہ اس میں مذہب کی اصل روح کو سامنے رکھا جانا چاہیئے چنانچہ تصوف میں اداروں والے اور رسموں والے مذہب یعنی (Institutiona lized) مذہب کو نظرانداز کیا جاتا ہے۔ لیکن غور سے دیکھا جائے تو یہ تحریک اسلام کے خلاف ایک سازش تھی۔ کسی قوم کا دنیوی عروج اس پر منحصر ہے کہ وہ اپنی آنکھیں کھلی رکھے اور گردوپیش کے حالات کو سمجھ کر اپنے اعمال و افعال کے رخ کو متعین کرے۔

اگر کسی قوم کے سامنے

جہاں وکار جہاں جملہ ہیچ در ہیچ است
ہزار بار من ایں نکتہ کردہ ام تحقیق

حافظ

یعنی دنیا اور دنیا کے کام سب ہیچ اور بالکل ہیچ ہیں۔ میں نے اس بات کی ہزار بار تحقیق کی ہے۔ کا سوچا سمجھا فلسفہ پیش کیا جائے اور اس فلسفہ سے قوم متاثر بھی ہوجائے تو پھر دنیوی اعتبار سے اور ذہنی اعتبار سے اس کی تباہی یقینی ہے۔ تصوف کی آڑ میں یہی کیا گیا۔

تصوف کا لٹریچر نہایت وسیع ہے۔ اور اس کے دائرے میں مختلف الخیال مصنفین ہیں جن میں کچھ مخلص اور سادہ لوح اور غیر اسلامی باتوں کو جزو دین سمجھے ہوئے ہیں اور کچھ اپنے الحاد اور زندقہ کو تصوف کی آڑ میں چھپائے ہوئے ہیں۔

عام طور پر صوفیوں کے دو گروہ ہیں۔ ایک وہ جو شریعت پر قائم ہے۔ اس گروہ نے قرآن کا وہی مطلب سمجھا جو صحابہ کرامؓ نے سمجھا تھا۔ دوسرے گروہ نے شریعت اسلامی کو محض علم ظاہری تصور کیا۔ ایک مخصوص طریق تحقیق کو جسے اس نے اپنی اصطلاح میں عرفان کہا، اس کو علم پر ترجیح دی اس عرفان کی وساطت سے مسلمانوں میں فلسفہ وحدت الوجود کی بنیاد ڈالی، جس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ اس گروہ میں بھی مختلف الخیال لوگ ہیں مگر ایک عام مماثلت پائی جاتی ہے۔

ابتدائی صوفیا میں ایک گروہ پیدا ہوا یا یوں کہہ سکتے ہیں، اس نئے گروہ نے خود کو صوفیا میں داخل کرلیا۔ اس گروہ نے اسلامی عبادات کی فلسفیانہ حقیقت معلوم کرنے کا ایک اور اصول قائم کیا۔ یہی گروہ سلطنت روما کے سیاسی اجزا کی پریشانی کا باعث ہوا تھا۔

اسلامی تصوف کی ابتداء کے اسباب معلوم کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ آٹھویں اور نویں صدی عیسوی کی اسلامی دنیا پر ایک نظر ڈالی جائے۔ یہ کہہ دینا کافی نہیں کہ اسلامی تصوف ہندی فلسفہ یا "افلاطونیت جدیدہ Neo Platonism کے مسائل کی تزویج سے پیدا ہوا۔ عین ممکن ہے کہ جن اسباب سے رومن دنیا میں افلاطونیت جدیدہ کے مسائل پیدا ہوئے اسی قسم کے اسباب سے اسلامی دنیا میں تصوف بھی پیدا ہوا ہو۔

تصوف کی تاسیس، ترویج اور تکمیل میں ایرانی قوم کا زیادہ حصہ ہے۔ اس لئے اسلام سے پہلے کے ایران کی ذہنی حالت کا مطالعہ ضروری ہے اور یہ معلوم کرنا بھی ضروری ہے کہ اس قوم کے خیالات اور تاثرات کا میلان کس طرف تھا۔

ایران اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں مختلف مذاہب اور عقیدوں کا تماس Interaction رہا۔ زرتشت (۱۲۰۰ تا ۱۰۰۰ ق۔م) نے ایرانی قوم کو مظاہر فطرت کی پوجا سے نکال کر توحید کی تعلیم دی۔ ان کی تعلیم میں تصویر کشی اور مجسمہ سازی منع تھی۔ جزا و سزا اور جنت و دوزخ کا تصور بھی تھا۔ مجوسی بنیادی طور پر زرتشت کی نبوت کے قائل ہیں اور اپنی شریعت کو ان ہی سے منسوب کرتے ہیں۔ لیکن زرتشت کی تعلیمات کے برعکس روشنی، آگ، پانی وغیرہ کی پرستش کرتے ہیں۔

اس کے بعد دوسری صدی عیسوی میں "مذہب متھرا" کو فروغ ہوا۔ مجوسیوں کی طرح اس مذہب کے پیرو بھی سورج کی پرستش کرتے ہیں۔ وہ انسانی روح کو خدا کا ایک جزو تصور کرتے ہیں اور عبادت کے مخصوص طریقوں اور سخت ریاضت سے خدا اور روح کے (حلول) اتحاد کو قابل عمل سمجھتے ہیں۔ اس کے بعد مانی ۲۱۶ء میں بابل کے مقام پر پیدا ہوئے۔ ۲۵ سال کی عمر میں انھوں نے اپنے مذہب کی تبلیغ شروع کی۔ بہرام (حکومت ۲۲۷ تا ۲۷۴ء) نے انھیں ایک مناظرہ کے بعد قتل کر دیا۔ مانی دو خداؤں یعنی یزداں و اہرمن کو ماننے والے تھے ان کے مذہب میں بہنوں اور بیٹیوں سے بھی نکاح جائز تھا۔ دنیا سے بے رغبتی اور آخرت کے لئے نیک کام کرنے کی تلقین کرتے۔ ترک حیوانات کے قائل تھے۔ سبزی پر گذارہ کرتے تھے۔ سال میں پچاس روزے رکھتے۔ مانی عقائد پر کئی مذاہب کے اثرات موجود ہیں۔

ان مذاہب کے علاوہ ایران میں بدھ مذہب کی ترویج بھی ہوئی۔ اشوک نے مشرق وسطیٰ میں جو مبلغ بھیجے تھے۔ ان کی کوشش سے ایران بھی بدھ مذہب سے روشناس ہوا۔ مانی کے عقائد میں دوسرے مذاہب کے اثرات کے علاوہ گوتم بدھ کی تعلیمات کی جھلک بھی ملتی ہے۔ یہ بدھ مت کا پہلا دور ہوا۔ پھر جب ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد سے قبل شنکر اچاریہ کی کوششوں سے بدھ مذہب کا دیس نکالا ہوا تو جس طرح بدھ مذہب کے پیروؤں کو جو استبداد سے بچ گئے تھے، نیپال، تبت، لنکا، برما تھائی لینڈ، چینی، ترکستان وغیرہ کو ہجرت کر کے اپنی جانوں اور تہذیبی ورثہ کو بچانا پڑا اسی طرح انھوں نے ایران اور عربستان کو بھی ہجرت کی۔ یہ اہل ایران سے بدھ مذاہب کا دوسرا تماس تھا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد اسلام نے نہ صرف ذہنی سطح پر اثرات ڈالے بلکہ ایران پر مسلمانوں کا سیاسی تسلط بھی قائم ہو گیا۔

چونکہ ایران میں مختلف مذاہب کی آویزش اور باہمی کشمکش رہی۔ اور اکثر و بیشتر ایک مذہب کے پیرو دوسرے مذہب کے پیروؤں سے برا سلوک کرتے رہے۔ اس لئے ایران میں عام طور پر چند اثرات پیدا ہوئے۔ پیشوایان مذاہب کی اہمیت اور شخصیت پرستی، عقائد کو چھپانا، ترک دنیا، مختلف مذاہب کی تعلیمات سے کچھ کچھ خیالات لے کر ان کو اس شکل میں پیش کرنا کہ سب کے لئے قابل قبول ہوں وغیرہ۔

جس طرح ہندوستان میں بھی مختلف مذاہب کے تماس سے ویدانت کے فلسفہ اور اوتار کے عقیدہ وغیرہ کو فروغ ہوا، اسی طرح مذہبی میدان میں تقریباً مماثل حالات موجود ہونے سے ایران میں وحدت الوجود اور عقیدہ حلول وغیرہ کو فروغ ہوا۔

جب اسلام ایران کے راستے ہندوستان میں داخل ہوا تو اس میں تصوف کے اجزا شامل تھے۔ یہ تقریباً وہی اثرات تھے جو شریمد بھگوت گیتا کی تعلیمات میں ملتے ہیں۔

تصوف کو یہ سراہنا دی جاتی ہے کہ اس کے ذریعہ ہندوستان میں اسلام کی ترویج ہوئی لیکن حقیقت اس کے خلاف ہے اجمیر اور دہلی اور آس پاس کے علاقوں جو مشائخ چشت کا مرکز رہے مسلمانوں کو کبھی بھی اکثریت حاصل نہ ہو سکی۔ اس کے برخلاف اسلامی حکومتوں کے اکثر سرداروں نے اپنے اپنے علاقوں میں اسلام کی کامیاب اشاعت کی۔

صوفیوں کے ذریعہ اگر اسلام کی کچھ ترویج ہوئی بھی تو اس حقیقت پر غور نہیں کیا جاتا کہ خود اسلام کو اس تبلیغ کی بھاری قیمت دینی پڑی اور اہل ہند کو اس اسلام سے متعارف کیا گیا جس میں عجمی اور غیر اسلامی اثرات داخل ہو چکے تھے۔ ہندوستان میں اسلام اپنی اصلی شکل میں پہنچتا تو شاید تعداد کے اعتبار سے نہ سہی، معیار کے اعتبار سے اس کی اہمیت ہوتی اور یہ بھی ممکن ہے تعداد کے اعتبار سے بھی اسلام اثرانداز ہوتا۔ یہ تو قرائن ہیں۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ اسلام عجمی راستہ سے داخل ہوا اور آمیزش والا، مسخ شدہ، اسلام ہندوستان میں داخل ہوا جہاں کی سرزمین اسلام کی اس مخصوص شکل کو قبول کرنے کے نسبتاً زیادہ سازگار تھی۔

جب اسلام اور ایران کے (مذاہب) کا تماس ہوا تو یہ وہ زمانہ تھا جب فتوحات کا دائرہ وسیع ہونے پر مسلمانوں نے مفتوح اقوام کے علوم و فنون کی طرف توجہ کی۔ خاص طور پر یونانی فلسفہ میں مسلمانوں کی دلچسپی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ مگر لائق توجہ بات یہ ہے کہ یونانی فلسفہ مسلمانوں میں خراساں اور شام کے عیسائی مترجمین کے عربی ترجموں کی وساطت سے متعارف ہوا اور ان مترجمین کے خیالات کا پرتو ترجموں پر پڑنا لازمی تھا۔ پھر مترجمین نے غلطی سے جدید افلاطونیت کو ارسطو اور افلاطون کا فلسفہ تصور کیا۔ اسلامی فلسفہ، تاریخ میں صرف ایک عالم ابن رشد اندلسی تھے جو اس

فلسفیانہ دلدل سے صحیح و سالم نکل کر اپنے پیشتروؤں کے مقابلے میں ارسطو کے خیالات سے قریب تر ہونے میں کامیاب ہوئے۔

یونانی فلسفہ کے اثرات سے مسلمانوں میں فرقہ معتزلہ پیدا ہوا جس نے مذہبی حقائق کو عقلی ترازو میں تولنے کی کوشش کی۔ بعض تو پرانی ایرانی ثنویت کی طرف گئے۔ اور بعض توحید پر قائم رہے لیکن ان کی توحید یا تو وحدت الوجود کا پیش خیمہ تھی یا اسلامی توحید سے بہت دور جا پڑی تھی۔ بعض طبیعتیں تشکیک کی طرف مائل ہوئیں جن کا خیال تھا کہ حقائق کا ثبوت ناممکن ہے۔ عقل انسان کی رہنمائی کر ہی نہیں سکتی اس واسطے ایک حاضر اور معصوم امام کا تسلیم کر لینا ضروری ہے۔ غرض مختلف قدیم باطل خیالات نے مختلف فرقوں کو جنم دیا۔

صوفیا کے پہلے طبقہ میں فضیل ابن عباس (وفات ۱۸۷ء)

ابراہیم ادھم (وفات ۱۶۲ھ)

معروف کرخی (وفات ۲۰۰ھ) آبائی دین آتش پرستی تھا۔

شفیق بلخی (وفات ۱۹۴ھ) شامل ہیں۔

ان بزرگوں کے حالات جو ہم کو معلوم ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ایک حد تک مخلص اور خدا پرست تھے۔ ان میں سے بعض نے زہد و عبادت میں غلو بھی کیا۔ یہ لوگ ذات باری اور نظام باری اور نظام عالم کے حقائق کے متعلق کوئی موشگافی نہیں کرتے تھے۔ اور نہ ان کا تصوف فلسفیانہ پہلو رکھتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ علمائے اسلام نے ان بزرگوں کی مخالفت نہیں کی۔ علماء کی مخالفت کا سلسلہ ذوالنون مصری (وفات ۲۴۵ھ) سے شروع ہوتا ہے۔ انھوں نے بقول جامی سب سے پہلے عالم باطن کے اشارات کو عبارات میں منتقل کیا۔ انھوں نے کہا:۔

اللہ کی ذات میں سوچنا جہالت ہے۔ اس طرف اشارہ کرنا شرک ہے اور معرفت کی حقیقت حیرت ہے۔

ذوالنون پہلے وحدت الوجودی تھے۔ وہ ایک بڑے عالم اور کیمیاء کے ماہر تھے پانی کے متعلق پہلے پہل انھوں نے ثابت کیا کہ یہ مفردات سے مرکب ہے۔ انھوں نے معروف کرخی کے اس خیال کو کہ تصوف حقائق کا علم ہے آگے بڑھایا اور کہا کہ

تصوف توحید کے اسرار کا علم ہے اور اس علم کی انتہا یہ ہے کہ عارف و معروف ایک ہی شئے ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اہل مصر انھیں زندیق کہتے رہے۔

صوفیا نے ایسی باتیں کیں جو اسلام میں نہ تھیں۔ انھوں نے نئی اصطلاحات وضع کیں جن کو مسلمانوں نے گوارا کر لیا۔ وجہ صرف یہ تھی کہ اس ابتدائی زمانہ میں تصوف کا مقصد سوائے زہد و عبادت کے اور کچھ نہ تھا۔

بایزید بسطامی (وفات ۲۶۱ھ) کے دادا آتش پرست تھے (جامی نے وفات ۲۳۴ھ بتلائی ہے) سے بہت سی باتیں منسوب کی گئیں ہیں۔ مثلاً میرے خرقہ میں سوائے اللہ کے اور کوئی نہیں۔ اور میرا علم محمد کے علم سے بلند تر ہے اسی طرح سبحانی ما اعظم شانی یعنی تعریف میری ہی ہے کیا بڑی شان ہے میری۔ وہ جنید کے برعکس سکر (نشہ) کے مسلک کے حامی تھے۔

اسی قبیل کے ایک صوفی حسین بن منصور حلاج تھے (منصور حلاج پر مضمون شریک اشاعت ہے)

امام قشیری نے تصوف کی عجیب و غریب اصطلاحات وضع کیں۔

مسلمانوں کی مذہبی رواداری کی وجہ سے اسلامی دنیا کے بڑے بڑے شہروں میں ہر قسم کی غیر اسلامی مذہبی تحریکیں نشو و نما پاتی تھیں۔ اسلامی فرقوں کے علاوہ عیسائیت، رہبانیت، مانویت اور سمنانیت (بدھ مذہب) کے مباحث کا بازار بھی بغداد و بصرہ میں گرم تھا۔ بعض لوگ جو بظاہر مسلمان تھے اپنے آپ کو ثنویت کا قائل بتاتے تھے۔ اسلامی تصوف نے بھی اسی ماحول میں پرورش پائی مثلاً

تصوف کا مسئلہ مقامات، تسبیح کا استعمال درویشانہ زندگی وغیرہ سمنانیت سے ماخوذ ہیں۔ ابتدائی صوفیہ اور عیسائی راہبوں کے لباس میں مماثلت تھی۔ ریاضت کے ہندوانہ طریقے گیارہویں صدی عیسوی میں مسلمانوں میں رائج ہوئے۔ جب کہ البیرونی نے پتنجلی کے یوگ شاستر کا سنسکرت سے عربی میں ترجمہ کیا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ریاضت کے بہت سے غیر اسلامی طریقے تصوف میں جذب ہو گئے۔ جن کو علمائے اسلام نے کبھی وقعت کی نظر سے نہیں دیکھا۔

اسلامی تصوف کی پیدائش کے اسباب تلاش کرنے کے لئے کسی خاص خارجی

تحریک کی طرف جانے کی ضرورت نہیں ۔ اسلامی دنیا کے اندر وہ تمام اسباب موجود تھے جن کے مجموعی اثر سے ایک خاص نصب العین کا پیدا ہونا اور بڑھنا یقینی امر تھا ۔ اس ارتقاء میں غیر اسلامی خیالات بھی یقیناً اثر انداز ہوئے ۔

تصوف کی تحریک نے جو امرا کی عیش پرستی اور تکلف اور خانہ جنگیوں کے خلاف ایک صدائے احتجاج تھی دسویں صدی عیسوی کے اختتام تک اسلام کے بالمقابل ایک ایسے نظام کی شکل اختیار کرلی جس سے ابتدائی دور کے مسلمان محض ناآشنا تھے ۔

اس بات سے انکار کیا ہی نہیں جاسکتا کہ تصوف کی راہ سے بے شمار مضر اثرات اسلام میں داخل ہوئے (علامہ راغب الطباخ ۔ تاریخ افکار و علوم اسلامی (حصہ دوم) اردو ترجمہ ۱۹۸۳ء) مثلاً بعض صوفیا نے کچھ قرآنی الفاظ کے اصل معنوں کو اختیار نہ کرکے کچھ ایسے باطنی معنی نکالے جن کا کوئی فائدہ عقل و فہم میں نہ آسکا اور جو بہر حال قرآن مجید کی حکمت کے مطابق نہ تھے ۔ یہ گویا قرآنی الفاظ کے ساتھ کھیلنا تھا ۔

قرون اولیٰ کے مسلمان قرآنی اصطلاحات کے بارے میں غیرت و حمیت رکھتے تھے اور ان کی حفاظت کا اہتمام کرتے تھے ۔ مسلمانوں کی اکثریت کی ذہنی پستی کے نتیجہ میں اصطلاحات قرآنی کے مفہوم میں تبدیلیاں پیدا ہوگئیں اور ان کی عظمت متاثر ہوئی ۔ و نیز مسلم عوام کی اکثریت تصوف کے زیر اثر حکایات اور کہانیوں پر ایمان رکھتی ہے ۔

شیعیت اور تصوف کا باہمی تعلق بھی بہت واضح ہے ۔ شیعوں کے عقیدہ کے بموجب امامت کا ایک پہلو ولایت بھی ہے ۔ مشہور شیعی عالم شہید مرتضیٰ مطہری نے اپنے مقالہ "امامت کے معانی و مراتب" (رسالہ توحید جلد ۶ شمارہ ۱، جنوری، فروری ۱۹۸۹ء) میں لکھا ہے کہ: ۔

امامت کی یہی حیثیت (ولایت) تشیع اور تصوف کے درمیان مشترک پہلو رکھتی ہے" ۔

علامہ طباطبائی کے بموجب: ۔

"صوفیوں نے اسے (مسئلہ ولایت کو) شیعوں سے لیا ہے ۔ اس لئے یہ

مسئلہ شیعوں کے یہاں اس وقت سے موجود ہے جب نہ تصوف کو یہ شکل حاصل ہوئی تھی اور نہ یہ مسائل ان کے یہاں پیدا ہوئے تھے ۔ بعد میں صوفیہ کے یہاں بھی یہ تصور پیدا ہوگیا ۔

چنانچہ اگر یہ سوال اٹھے کہ ایک نے دوسرے سے اپنایا تو یہی کہا جائے گا کہ یہ تصور شیعوں سے صوفیوں کے یہاں پہنچا" ۔

حارث بن اسد محاسبی (وفات ۲۴۳ھ) پہلے شخص ہیں جنھوں نے تصوف پر کتابیں لکھیں ۔ جب کہ ان کی کتابوں کے بارے میں ایک بڑے محدث ابو زرعہ رازی (وفات ۲۶۴ھ) سے دریافت کیا گیا تو انھوں نے کہا: ۔

ان کتابوں سے بچو ۔ یہ بدعت و گمراہی کی کتابیں ہیں ۔ حدیث کو پکڑے رہو اس میں ہر شئے ملے گی جو تمہیں اور چیزوں سے بے نیاز کردے گی ۔ اس کے بعد تو تصوف کی کتابوں میں اور بھی بے اعتدالیاں پیدا ہوئیں اور اب تو صورت حال یہ ہے کہ اکثر کتب تصوف جھوٹ سے معمور ہیں ۔

بعض کتابیں تو اس درجہ کی ہیں کہ ان میں کوئی روایت ایسی نہیں جس کے بارے میں صداقت کا کوئی شائبہ بھی ہو (تصوف کے اہم ملفوظات سے بعض اقتباسات شریک اشاعت ہیں) ۔ یہ لوگ جہاں حدیث سے نا واقف محض ہیں، وہاں تاریخ سے بھی کورے ہیں ۔

اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں کو ان کتابوں کے شر سے محفوظ رکھے ۔

قرآن اور سنت سے ہٹی ہوئی باتیں جن چور دروازوں سے تاریخ، فقہ، تفسیر وغیرہ میں داخل ہوئیں ان ہی سے تصوف میں بھی داخل ہوئیں ۔ معاملہ صرف تصوف کی کتابوں میں الحاق ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ خود بعض صوفیاء نے بھی ایسے باطنی عقائد اپنالئے جن کو اسلام سے کوئی واسطہ نہیں لیکن اب وہی باطنی عقائد اور اصول تصوف کے مسلمات اور اسلامی عقائد اور اصول سمجھے جانے لگے ہیں ۔

شیعوں کے چھٹے امام، جعفر صادق نے ۱۴۸ ہجری میں وفات پائی ۔ ان کی وفات کے بعد ان کو ماننے والوں میں اختلاف ہوا ۔ ایک گروہ نے ان کے چھوٹے فرزند موسیٰ کاظم کو ساتواں امام تسلیم کیا ۔ دوسرے گروہ نے بڑے فرزند اسماعیل کو جعفر

صادق کا جانشین تسلیم کیا۔ شیعیت کی ابتداء ہی تخریبی اور مرکز گریز تحریک کے طور پر ہوئی تھی لیکن اس دوسرے گروہ نے اسلام کی مرکزیت کے خلاف اہم تخریبی تحریکوں مثلاً ملاحدہ، باطنیہ اور قرامطہ کی بنیاد ڈالی۔ یہی گروہ تصوف میں غیر اسلامی عناصر کو شامل کرنے کا بانی بھی ہے۔

جو عقائد تمام غالی شیعوں میں مشترک ہیں یہ ہیں:۔

۱۔ اللہ کا انسانی شکل میں ظہور (تشبیہ)

۲۔ مشیت ایزدی میں تبدیلی (بداء)

۳۔ امام کی واپسی (رجعت)

۴۔ امام کی روح کا جانشین میں حلول کرنا (تناسخ)

ظاہر ہے کہ یہ عقائد قرآن کے سراسر خلاف ہیں۔ لیکن اسماعیلی شیعوں نے ان خیالات کو اپنے داعیوں کے ذریعہ جاہل مسلمانوں میں پھیلایا۔ اور چوتھی صدی ہجری کے بعد تصوف میں یہ سب اور اس قسم کے غیر اسلامی عقائد مثلاً رہبانیت، اباحت مطلقہ وغیرہ راہ پاگئے۔ یہی وجہ ہے کہ امام تیمیہ اور امام ابن القیم سے لے کر آج تک تمام علماء نے اس غیر اسلامی تصوف کے خلاف آواز اٹھائی۔

جس زمانہ میں قرامطہ نے اپنی تبلیغی سرگرمیاں شروع کیں۔ تصوف کا آغاز ہو چکا تھا۔ اور مختلف سلسلے قائم ہو چکے تھے۔ عبداللہ ابن میمون القداح نے جب اسماعیلی فرقہ کو منظم کیا تو اس جماعت کے پوشیدہ تبلیغ کرنے والوں کو ہدایت دی کہ خود کو صوفی ظاہر کریں۔ ان جدید اسماعیلیوں نے تصوف کو عوام میں مقبول بنادیا۔ اس کے بعد قرامطہ نے بھی صوفیوں کو گمراہ کرنا شروع کیا۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ تصوف کے پردہ میں مسلمانوں کے دلوں میں غیر اسلامی عقائد جاگزیں کر دیں۔ اس طرح ایران میں غیر اسلامی تصوف کی بنیاد رکھ دی گئی۔ جو رفتہ رفتہ مسلمانوں میں رائج ہو گیا اور اسلامی تعلیمات سے مخلوط ہو گیا۔ دوسرا کام قرامطہ نے یہ کیا کہ مسلمان صوفیوں کی تصانیف میں اپنے عقائد داخل کر دیئے۔ چنانچہ باطنیہ، ملاحدہ اور زنادقہ نے سب سے پہلے امام احمد حنبل پھر امام غزالی وغیرہ کی تصانیف میں اپنی طرف سے تدسیس کی۔ باطنیت نے تصوف پر اپنا گہرا اثر ڈالا۔ اور تصوف کے ذریعہ

عوام تک پہنچے اور اہم شخصیتوں تک بھی۔ چنانچہ نظام الملک طوسی کے قاتل نے جو اسماعیلی تھا صوفی بن کر طوسی کا قرب حاصل کیا۔

منگولوں کے حملہ کی وجہ سے ایران میں اسماعیلی طاقت کا خاتمہ ہو گیا تو اسماعیلی عقائد صوفیوں کے سلسلوں میں داخل ہو گئے۔ اس طرح اس زمانہ میں تصوف اور اسماعیلیت میں اتحاد کی شکل پیدا ہوئی جس کے تحقیقی مطالعہ کی ضرورت ہے۔

اسماعیلی داعیوں اور مبلغین نے جو پندرھویں صدی عیسوی کے آغاز میں ہندوستان آئے صوفیوں کا طریقہ اختیار کیا۔ قرامطہ نے ہمیشہ اس اصول پر عمل کیا کہ

"جیسا دیس ویسا بھیس"

چنانچہ جوگیوں اور ہندو صوفیوں کے طور طریقے اختیار کئے۔ ہندوؤں سے کہا کہ حضرت علیؓ وشنو کے دسویں اوتار تھے۔ چنانچہ پیر صدر الدین نے اسی حکمت عملی سے ہندوؤں کو اپنے مذہب کا پیرو بنایا۔

صوفیوں اور شیعوں میں جو بنیادی اختلاف تھا اسماعیلیوں نے اس کو بہت کم کر دیا۔ شیعہ مفسر ملا حیدر آملی اپنی تفسیر "بحر الانوار" میں لکھتے ہیں:۔

"تصوف مرتضوی طریقہ ہے۔ تصوف اور شیعیت ہم معنی ہیں"

مصری عالم ڈاکٹر زکی مبارک، لکھتے ہیں۔

شیعیت اور تصوف کے درمیان نقطہ اتصال علیؓ کی شخصیت ہے جو شیعوں کے معبود اور صوفیاء کے امام ہیں"

اکثر و بیشتر مزاروں کے سجادہ نشین مذہب امامیہ اختیار کر چکے ہیں اور اپنے بزرگوں کے عقیدت مندوں سے یہ کہتے ہیں کہ صاحب مزار بھی امامیہ مذہب ہی کے پیرو تھے۔

قادری، سہروردی اور چشتی سلسلوں کے اکثر و بیشتر حضرات علیؓ کو وصی نبی مانتے ہیں۔ حالانکہ یہ عقیدہ اہل سنت والجماعت کے عقیدہ کے سراسر خلاف ہے جو یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ حضرت علیؓ وصی رسول تھے وہ دوسرے لفظوں میں تینوں خلفائے راشدین کو نعوذ باللہ غاصب تسلیم کرتا ہے۔

١ حضرات خلفائے ثلاثہ کے ہاتھ پر بیعت، بیعت حکومت بھی تھی اور بیعت ارادت بھی۔ اس کے باوجود جو طریقت اور تصوف کے شجروں میں رسول اکرمؐ اور حضرات علیؓ کے اسمائے گرامی کے درمیان سے حضرات خلفائے ثلاثہ کے اسمائے گرامی نکال دیئے گئے اور یہ تاثر دیا گیا کہ یہ حضرات خلافت ظاہری پر فائز تھے جس کی اہمیت نہیں۔ اصل خلافت باطنی ہے اس پر حضرت علیؓ فائز تھے، حالانکہ یہ تاثر گمراہ کن ہے۔ اس طرح تصوف کے شجروں پر باطنیت کا غلبہ ہے۔

تصوف میں خرقہ پوشی رائج ہے۔ اس کا موجد ابو سالم خراسانی تھا۔ جس کا مقصد اسلامی مملکت اور مسلمانوں کے عقائد میں انتشار پھیلانا تھا۔ خرقہ پوشی کو تقدس کا رنگ دینے کے لئے خرقہ مشائخ کی روایت گڑھی گئی۔

امرد پرستی اور اغلام بازی جیسی حیا سوز اور خلاف فطرت برائیاں مجوسیوں میں رائج تھیں۔ ان کو تصوف اور سلوک میں "مفید اور مطلق کا ادارک" اور "مجاز میں حقیقت کی یافت" کا باوقار نام دے کر منتہائے کمال پر پہنچنے کا ذریعہ قرار دیا گیا۔

مسلمان بت پرستی نہیں کرتے لیکن تصوف کے ذریعہ ان کو قبر پرستی پر اس درجہ مائل کیا گیا کہ اس کے آگے بت پرستی بھی مات ہو جاتی ہے۔ صوفیاء ہی کی تعلیمات کا نتیجہ ہے کہ ہند و پاک میں معروف قبروں کے علاوہ کتنے ہی لال شاہ، گلابی شاہ، چیونٹی شاہ، مکوڑے شاہ، بریانی شاہ، مچھلی والے شاہ، کٹورے شاہ وغیرہ کی قبروں کی باقاعدہ پرستش ہوتی ہے۔ اور ان قبروں پر "سجدہ تعظیمی" کرنے، پھول چڑھانے۔ نذرانے دینے۔ غلاف پہنانے اور چادر اوڑھانے، منتیں اور مرادیں مانگنے ہی کو تصوف کے زیر اثر اسلام سمجھا جاتا ہے۔ اصحاب قبور کے تصرفات اور ان کے اختیارات کو صوفیا نے بڑھا چڑھا کر پیش کیا۔

ان خود ساختہ اور غیر اسلامی مراکز کی وجہ سے اسلام اور اس کی مرکزیت کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا۔

اسلام شخصیت پرستی کی لعنت سے پاک ہے۔ قرامطہ نے اسلام کو اس امتیازی صفت سے محروم کیا۔ اور تصوف کے ذریعہ شخصیت پرستی کو اسلام میں داخل کر دیا۔

قرامطہ نے مسلمانوں میں مسلسل اس گمراہ کن عقیدوں کی تبلیغ کی کہ

شریعت اور طریقت دو جداگانہ چیزیں ہیں۔ جب ایک شخص طریقت کے دائرہ میں قدم رکھتا ہے اس کے لئے شریعت کی پابندی لازمی نہیں رہتی۔ جی چاہے پابندی کرے جی چاہے نہ کرے۔

ملامتیہ فرقہ نے اس گمراہ کن عقیدہ کے ساتھ ساتھ یہ تعلیم بھی تصوف کے ذریعہ دی کہ ایسے کام کرو جن کی وجہ سے لوگ تمہیں برا کہیں۔ جب لوگ برا سمجھیں گے۔ اور گالیاں دیں گے تو نفس امارہ، نفس مطمئنہ میں تبدیل ہو جائے گا۔

ان دشمنان اسلام نے مسلمانوں کے مذہبی ادب کے ہر شعبہ میں اپنے عقیدے شامل کر دیئے۔ اور ایسی روایات کو شہرت دی جو نہ نقلاً صحیح ہے اور نہ عقلاً بلکہ ان کی لغویت اظہر من الشمس ہے۔ قرامطہ نے بہت سی روایات وضع کر کے صوفیوں تک پہنچا دیں۔ صوفیوں نے اپنی مجلسوں میں ان وضعی روایات کو مسلسل کہا یہاں تک کہ ان کو عوام کی قبولیت حاصل ہو گئی۔ اب ان روایات کو صوفیانہ لٹریچر سے خارج کرنا ناممکن ہو گیا۔ ان کی داخل کردہ روایات صوفیوں کے دماغوں میں اس طرح پیوست ہو چکی ہیں کہ اگر کوئی مسلمان ان جھوٹی روایات کو جھوٹی کہہ دے تو عوام اس مسلمان کی سخت مخالفت کریں گے اسی طرح تصوف کی کتابوں میں حذف و اضافہ کر کے لاکھوں مسلمانوں کو گمراہی کا سامان مہیا کر دیا۔ ابن عربی (وفات ۶۳۸ھ) کی تصانیف میں اکثر عبارتیں شریعت کے خلاف ہیں۔ اس طرح ابن عربی اور ان کے بعد سارے ہی صوفیوں کا عقیدہ ہے کہ "الولایتَ افضلُ من النَبوّتَ" اس میں تو کوئی شک ہی نہیں کہ یہ عقیدہ اہل سنت والجماعت کے عقیدہ کے بالکل خلاف ہے۔ البتہ دیکھنا یہ ہے کہ اہل تصوف نے اس عقیدہ کو واقعی قبول کر لیا یا دشمنان اسلام سبائی شیعوں نے اپنے عقائد اہل تصوف کی تصانیف میں شامل کر دیں۔

(علامہ اقبال کی تصنیف "تاریخ تصوف" "اسلامی تصوف میں غیر اسلامی نظریات کی آمیزش" اور "تصوف اور شیعیت" سے اقتباس)

صوفی اولیاء کے فرمودات

(بلا تبصرہ)

اولیاء اللہ

لغوی اعتبار سے ولی وہ ہے جو اللہ تعالیٰ سے قریب ہے اور اس کا دوست ہے۔ مسلمانوں میں جو ایمان اور تقویٰ میں خاص مقام رکھتے ہیں وہ عمومی طور پر اولیاء کے زمرہ میں شامل ہیں۔ لیکن تصوف کے اثر کے تحت مسلم عوام نے اولیاء کو ایک اصطلاح بنالیا اور اہل تصوف کی چند مخصوص شخصیتوں ہی کو اولیاء کے زمرہ میں شامل کرکے ان کے تعلق سے ایسی ایسی بے سروپا باتوں کو اپنے عقائد کا جزو بنالیا ہے کہ الاماں مثلاً یہ کہ اولیاء غیب کی باتیں جانتے ہیں، مستقبل کے واقعات ان کے سامنے بے نقاب رہتے ہیں، انسان کے دلوں کے حالات سے واقف رہتے ہیں، معتقد کے آنے سے پہلے ہی جان لیتے ہیں کہ وہ کیا مانگنے آیا ہے، جو بھی ان کی زبان سے نکلتا ہے وہ وقوع پذیر ہوجاتا ہے۔ وہ لوگوں کی مرادیں پوری کرتے ہیں اور بگڑی بنادیتے ہیں۔ ان کی خوشنودی دنیا و آخرت سنوار دیتی ہے اور ان کی ناراضی انسان کی دنیا و آخرت میں خسارہ کا باعث بنتی ہے۔ ان کا معتقد ان کو پکارے تو مرنے کے بعد بھی اس کی سنتے ہیں۔ پکار کا جواب دیتے ہیں اور معتقد کی مدد کو پہنچ جاتے ہیں۔ اولیاء ہماری دعاؤں کو اللہ تعالیٰ تک پہنچانے کا وسیلہ ہیں۔ اولیاء جب تک ان کا جی چاہے دنیا میں رہتے ہیں اور جب چاہیں پردہ کرلیتے ہیں۔ مرنے کے بعد بھی لوگوں کی مرادیں پوری کرتے ہیں۔ جس طرح دنیوی حکومتوں کی طرف سے عمال اور کارکن مقرر ہوتے ہیں اسی طرح محکمہ قضا و قدر کی جانب سے دنیوی امور کا انتظام اولیاء اللہ کے سپرد ہوتا ہے وغیرہ۔ ان عقائد باطلہ پر کسی تبصرہ کی ضرورت نہیں۔

جیسے جیسے عجمی اثرات بڑھتے گئے تصوف جو اسلام کی سرزمین میں ایک اجنبی پودا ہے بن بلائے مہمان کی طرح داخل ہوکر مسلم عوام کے عقائد میں بگاڑ کا باعث بنا۔ پہلی صدی ہجری ان عقائد سے ناآشنا تھی۔

دوسری صدی ہجری سے جو صوفیا گذرے ہیں ان کے حالات اور ان کی تعلیمات سے واقفیت ضروری ہے۔ صوفیائے کرام کی تعلیمات ان کے ملفوظات میں قلمبند ہیں۔ عموماً ہر مرشد کے ملفوظات ان کا خلیفہ قلمبند کرلیتا تھا۔

دوسری صدی ہجری

حضرت ابراہیم بن ادھمؒ (وفات ۱۶۲ء)

حضرت ابراہیم بن ادھم کا شمار سرتاج صوفیاء کرام میں ہوتا ہے۔ ان کا ایک واقعہ داتا گنج بخش (ابوالحسن علی بن عثمان ہجویری) نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف "کشف المحجوب" میں یوں بیان کیا ہے:-

"آپ خضر علیہ السلام سے بیعت تھے اور بلخ کے امیر تھے۔ ایک دن شکار کو گئے اور ہرن کا پیچھا کیا۔ اللہ تعالیٰ نے ہرن کو گویائی عطا کی اور اس نے آپ سے پوچھا۔ "کیا تم اسی لئے پیدا کئے گئے ہو؟" یہ سنتے ہی حضرت ابراہیم ادھم نے توبہ فرمائی اور زہد و ریاضت اختیار کی۔"

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ "انیس الارواح" میں لکھتے ہیں۔

"ایک دفعہ حضرت خواجہ ابراہیم بن ادھم کہیں جارہے تھے کہ ایک طرف سے نوحہ کی آواز آئی۔ فوراً رانگ گرم کرکے اپنے کانوں میں ڈال لیا اور بہرے ہوگئے۔"

تیسری صدی ہجری

حضرت بایزید بسطامیؒ۔ (وفات ۲۶۱ء)

حضرت بایزید بسطامیؒ کا شمار صوفیا میں ہوتا ہے۔ خود حضرت بایزید بسطامیؒ اپنے متعلق کہتے تھے۔ "میں پاک ذات ہوں۔ میری بلندی شان کا کیا پوچھنا۔" اس قول کے متعلق حضرت داتا گنج بخشؒ لکھتے ہیں۔ "درحقیقت یہ کہنے والا حق تعالیٰ ہی ہے پردہ عبد میں ہے۔" (کشف المحجوب)

حضرت جنید بغدادیؒ۔ (وفات ۲۹۸ء)

حضرت جنید بغدادیؒ کے تعلق سے مولانا اشرف علی تھانوی نے لکھا ہے۔

"حضرت جنید بغدادیؒ کے سامنے سے ایک کتا گذرا۔ آپ کی نگاہ اس پر پڑ گئی۔ اس قدر

صاحب کمال ہوگیا کہ شہر کے کتے اس کے پیچھے دوڑے ۔ وہ ایک طرف بیٹھ گیا ۔ سب کتوں نے اس کے گرد بیٹھ کر مراقبہ کیا ۔" (امداد المشتاقین)

حضرت جنید بغدادیؒ کے مرشد حضرت سری سقطیؒ (وفات ۲۵۳ ھ) نے حضرت جنید بغدادیؒ سے کہا ۔" تم نے رات خواب میں نبی کریمؐ کی زیارت کی ہے "۔ انھوں نے پوچھا ۔" آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا؟ " فرمایا ۔" میں اللہ تعالیٰ کے جمال سے خواب میں مشرف ہوا ۔" باری تعالیٰ ارشاد فرمایا ۔" میں نے اپنے حبیب کو جنید کے پاس بھیجا ہے کہ اسے حکم دیں کہ وہ وعظ کہے ۔" (کشف المحجوب)

چوتھی صدی ہجری

حضرت منصور حلاجؒ (وفات ۳۰۹ھ) (ان پر علحدہ مضمون شریک اشاعت ہے ۔)

حضرت ابو بکر شبلیؒ ۔ (وفات ۳۳۴ھ)

حضرت ابو بکر شبلیؒ کے پاس ایک ہوشیار شخص تلاش حق میں حاضر ہوا ۔ شبلی نے فرمایا ۔ جو کچھ میں تم سے کہوں گا وہ تم نہ کر سکوگے ۔ اس نے کہا میں ضرور کروں گا تو فرمایا ۔ کمرے میں جاؤ چالیس دن بیٹھو اور کہو کہ لاالہ الااللہ شبلی رسول اللہ' وہ چالیس دن تک یہی کلمہ پڑھتا رہا ۔ چالیس روز کے بعد شبلیؒ نے کہا ۔ میں تمہارا اعتقاد آزمانا چاہتا تھا کیونکہ بے اعتمادی سے کام نہیں بنتا ۔ (جوامع الکلم ۔ ملفوظات خواجہ گیسو درازؒ مجلس روز یکشنبہ غرہ ماہ شعبان ۸۰۲ ہجری ۔)

اس روایت پر تبصرہ کرتے ہوئے شیخ عبدالکریم جیلی اپنی کتاب " الانسان الکامل " میں لکھتے ہیں کہ " اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت شبلی کی شکل میں موجود تھے ۔"

حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ سے مروی ہے کہ آپ نے ایک طالب سے کلمہ لاالہ الااللہ چشتی رسول اللہ " پڑھوایا اور جب اس نے پڑھ لیا تو اسے بیعت کر لیا اور خلعت عطا کی اور صراحت فرمائی کہ میں نے تیرا اعتقاد آزمانے کے لئے ایسا کیا تھا ۔ (فوائد السالکین ۔ ملفوظات حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ ۔ مرتبہ حضرت بابا فرید گنج شکر مجلس روز دوشنبہ ماہ ذیقعدہ ۵۸۴ھ)

اسی مجلس میں حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ نے فرمایا کہ میں نفل نماز میں مشغول

تھا کہ پیرو مرشد نے آواز دی ۔ میں نماز ترک کر کے حاضر ہوا فرمایا ۔ تو کیا کر رہا تھا ۔ میں نے عرض کیا ۔ نفل نماز پڑھ رہا تھا کہ آپؒ کی آواز سنی اور نماز چھوڑ کر حاضر ہو گیا آپ نے فرمایا ۔ بہت اچھا کیا کیونکہ اس طرح حاضر ہونا نفل نماز سے افضل ہے ۔"

پانچویں صدی ہجری

حضرت داتا گنج بخش لاہوری (وفات ۴۶۵ھ)

حضرت ابوالحسن علی بن عثمان ہجویری داتا گنج بخش کے نام سے مشہور ہیں ۔ حضرت داتا گنج بخش نے عورت کے متعلق لکھا " بہشت میں پہلا فتنہ جو آدم کے تعلق سے ہوا اس کی اصل عورت تھی ۔ پہلے پہل جو فتنہ دنیا میں ظاہر ہوا یعنی ہابیل وقابیل کی لڑائی کا سبب بھی عورت تھی اور جب خدا نے چاہا تو دو فرشتوں (ہاروت و ماروت) کو سزا دے تو اس کا سبب بھی عورت کو قرار دیا اور آج دینی اور دنیوی تمام فتنوں کے اسباب کا سبب بھی عورتیں ہی ہیں ۔

چھٹی صدی ہجری

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ ۔ (وفات ۵۶۱ھ)

حضرت عبدالحق محدث دہلوی نے حضرت غوث الاعظم کا قول نقل کیا ہے ۔

" اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے وعدہ فرمایا ہے کہ میرے مریدوں، اہل طریق اور میرے عقیدت مندوں کو جنت میں داخل فرمائے گا ۔" یہ بھی فرمایا کہ " اگر میرا مرید اچھا نہیں تو کیا ہوا، میں تو اچھا ہوں پروردگار کی قسم جب تک میرے تمام مرید جنت میں نہیں جائیں گے میں بارگاہ خداوندی میں نہیں جاوں گا ۔ اگر مشرق میں میرے کسی مرید کا پردہ عفت گر رہا ہو اور میں مغرب میں ہوں تو یقینا اس کی پردہ پوشی کروں گا ۔" (اخبار الاخیار)

حضرت خواجہ عثمان ہارونی ۔

انیس الارواح خواجہ عثمان ہارونی کے ملفوظات کا مجموعہ ہے جسے ان کے مرید حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری نے قلمبند کیا ہے ۔ اس کا ایک اقتباس درج ذیل ہے : ۔" میرے ہمسایہ میں میرا ایک پیر بھائی تھا ۔ جب اس کا انتقال ہوا لوگ

تجہیزوتدفین سے فارغ ہو کر واپس ہوئے۔ میں اس کی قبر پر بیٹھا رہا۔ عالم شغولیت میں دیکھتا ہوں کہ عذاب کے فرشتے اس کے پاس آئے اور چاہتے تھے کہ عذاب کریں اتنے میں حضرت پیرومرشد تشریف لائے اور فرشتوں سے مخاطب ہو کر کہا اسے عذاب مت دو۔ یہ میرا مرید ہے۔ فرشتے واپس ہوئے۔ تھوڑی دیر بعد پھر آئے اور عرض کی باری تعالیٰ کا فرمان ہے کہ یہ شخص آپ کا مرید تو تھا لیکن آپ کے طریقے سے برگشتہ تھا آپ نے فرمایا کہ حال ایسا ہی ہے مگر اس نے اپنی ذات کو میرے پلہ میں باندھا۔ اس کی حمایت میرے ذمہ ہے۔ یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ فرشتوں کو حکم ہوا۔ واپس چلے آؤ۔ اس شخص کو عذاب نہ دو ہم نے اسے حضرت کی خاطر بخش دیا ہے"

ساتویں صدی ہجری

حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری۔ (وفات ۶۲۷ھ)

دلیل العارفین حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ کے ملفوظات پر مشتمل ہے جنھیں ان کے خلیفہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ (وفات ۶۳۳ھ) نے مرتب فرمایا تھا۔ اس کا ایک اقتباس درج ذیل ہے:۔

"ایک مسجد میں عذاب قبر کے متعلق گفتگو کے دوران فرمایا کہ "ایک بزرگ بصرہ کے ایک قبرستان میں بیٹھے تھے۔ ہمارے متصل ایک مردہ کو عذاب قبر ہو رہا تھا ان بزرگ نے جب یہ حال دیکھا تو زور سے نعرہ مار کر زمین پر گر پڑے۔ ہم نے اٹھانا چاہا تو معلوم ہوا کہ جان قالب سے پرواز کر گئی ہے پھر تھوڑی دیر میں ان کا بدن پانی ہو کر ناپید ہو گیا۔ اسی طرح فرمایا کہ دو درویش قوالی سنتے سنتے زمین پر گر پڑے۔ ان کا خرقہ زمین پر پڑا رہا اور جسم اس کے اندر سے غائب ہو گیا۔"

ایک مجلس میں خواجہ اجمیریؒ نے فرمایا:۔

بروز قیامت انبیاء اولیاء سب قبروں سے اٹھائے جائیں گے۔ ان کے کندھوں پر کمبل پڑے ہونگے جن میں کم و بیش ایک لاکھ تاگے تانے کے اور ایک لاکھ بانے کے ہوں گے۔ ان کے مرید اور بچے ان تاگوں کو اس وقت تک پکڑے رہیں گے جب تک خلق ہنگامہ محشر سے فارغ نہ ہو۔ پھر انھیں پل صراط پر پہنچا دیا جائے گا اور وہ بیتس ہزار برس کے راستوں کو ایک آن میں طے کریں گے اور بہشت میں داخل

ہوں گے۔"

حضرت خواجہ صاحب نے ایک مجلس میں فرمایا کہ رسول اکرمؐ کا وصال ہوا تو آپ نے اصحاب کہف کے غار کو دیکھا اور انھیں سلام کیا۔ اللہ نے ان کو زندہ کیا اور سلام دلوایا۔ رسول اکرمؐ نے ان کو اسلام کی دعوت دی جسے انھوں نے قبول کیا۔

ایک مجلس میں فرمایا۔" اللہ تعالیٰ نے دوزخ کو پیدا کیا تو اسی روز ایک سانپ کو بھی پیدا کیا اور فرمایا۔" اے سانپ ہم تجھے ایک امانت سپرد کرتے ہیں۔" سانپ نے جواب دیا۔" مجھے منظور ہے۔" حکم ہوا" منہ کھول دے"۔ سانپ نے منہ کھولا تو فرشتوں کو حکم ہوا کہ دوزخ لاؤ اور سانپ کے منہ میں رکھ دو۔ اب دوزخ سانپ کے منہ میں ہے۔ اگر دوزخ سانپ کے منہ میں زیر زمین نہ ہوتی تو تمام عالم جل جاتا۔

ایک مجلس میں فرمایا۔" جنگل میں ایک مرے ہوئے درویش کی لاش کو دیکھا کہ ہنس رہی تھی۔ پوچھا تم مر چکے ہو، ہنستے کیوں کر ہو۔ جواب دیا: حق تعالیٰ کی محبت میں ایسا ہی ہوتا ہے۔

حضرت خواجہ قطب الدینؒ بختیار کاکی (وفات ۶۳۳ھ)

فوائد السالکین حضرت خواجہ بختیار کاکی کے ملفوظات کا مجموعہ ہے جن کو ان کے خلیفہ حضرت خواجہ فریدالدین گنج شکر (وفات ۶۷۰ھ) نے مرتب فرمایا ہے۔ اس میں حضرت بختیار کاکی کے متعلق لکھا ہے کہ آپ کی والدہ جو پندرہ پارے کی حافظ تھیں ایام حمل میں تلاوت میں مصروف رہتی تھیں۔ اس لئے آپ پیدائش ہی سے پندرہ پارے کی حافظ تھے۔

خواجہ صاحب نے ایک مجلس میں فرمایا" بدخشاں میں ایک بزرگ نے حاکم وقت سے ایک خانقاہ تعمیر کروائی۔ پھر آپ نے حکم دیا کہ ہر روز ایک کتا خرید لائیں جب کتے لائے گئے تو ان کو سجادہ پر بیٹھا کر فرماتے۔" خدا کے سپرد کیا۔" پھر تو وہ کتے ایسے ہو گئے کہ پانی پر چلتے اور جس کسی کو تعویذ دیتے وہ اچھا ہو جاتا۔

ایک مرتبہ فرمایا۔" حضرت خواجہ قطب الدین چشتی کو خانہ کعبہ کا اشتیاق ہوتا تو فرشتے کعبہ کو چشت لاتے اور خواجہ قطب الدین درود زیارت فرماتے۔"

حضرت شیخ محی الدین ابن عربی ۔(وفات ۶۳۸ھ)

ان پر علحدہ مضمون شامل اشاعت ہے۔

حضرت خواجہ فرید الدین گنج شکرؒ ۔(وفات ۶۷۰ھ)

راحت القلوب حضرت خواجہ فرید الدین گنج شکر کے ملفوظات کا مجموعہ ہے جن کو حضرت خواجہ نظام الدین اولیا۔(وفات ۷۲۵ھ) نے مرتب فرمایا۔آپ کے لقب گنج شکر کی وجہ تسمیہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ ایک دفعہ راستہ میں ایک بنجارہ گذرا جس کے تھیلوں میں شکر بھری ہوئی تھی۔آپ نے پوچھا، بوروں میں کیا ہے؟" اس نے جواب دیا۔نمک ہے گھر جاکر دیکھا تو ان میں نمک ہی نمک تھا۔وہ روتا ہوا خدمت میں آیا تو فرمایا۔وہ شکر تھی تو شکر ہوجائیگی۔چنانچہ وہ شکر بن گئی۔ایک اور واقعہ بھی بیان کیا گیا ہے۔ایک دفعہ آپ جنگل میں عبادت کر رہے تھے پیاس کی شدت بڑھی تو تلاش پر ایک کنواں نظر آیا جس میں پانی زیادہ گہرائی پر تھا اور بغیر ڈول اور رسی کے پانی کا نکالنا مشکل تھا۔اتنے میں دو ہرن آئے۔جب وہ کنویں پر پہنچے تو پانی اوپر تک آگیا۔ہرن پانی پیۓ اور چلے گئے۔جب خواجہ صاحب پانی کے لئے بڑھے تو پانی پھر گہرا ہوگیا۔غیب سے آواز آئی۔تم نے ڈول اور رسی پر بھروسہ کیا۔ہرن میرے بھروسہ پر آئے تو میں نے انھیں پانی پلایا۔خواجہ صاحب ندامت کے ساتھ واپس گئے اور چالیس دن تک چلہ کشی کی۔چالیسویں روز بھوک اور پیاس نے ستایا تو چند کنکر اٹھاکر منہہ میں رکھ لئے جو منہہ میں جاتے ہی شکر بن گئے۔

ایک مجلس میں فرمایا۔"ایک سیاح نے بیان کیا کہ اس نے شہر دمشق کو ویران پایا۔دریافت پر معلوم ہوا کہ بعض باشندوں نے وظیفہ ترک کردیا تھا۔مغلوں کا لشکر آیا اور شہر کو اجاڑ کر رکھ دیا۔

ایک دفعہ فرمایا:"ملک الموت نے ایک نوجوان کو جو واصلان حق میں تھا ہر جگہ ڈھونڈا لیکن پتہ نہ پایا۔بالآخر سجدہ میں سر رکھ کر دعا کی کہ باری تعالیٰ نے مجھے اس نوجوان کا پتہ بتادیں۔حکم ہوا کہ فلاں خرابہ میں تلاش کرو لیکن ملک الموت کو وہاں بھی پتہ نہ چلا۔باری تعالیٰ نے کہا۔"اے ملک الموت! تو واصلان حق کی روح قبض نہیں کرسکتا اور نہ انھیں دیکھ سکتا ہے۔"

ایک مجلس میں فرمایا: مولانا جلال الدین رومی جب نماز کا وقت آتا تو غائب ہوجاتے۔معلوم ہوا کہ وہ شرعاً اور تعظیماً خانہ کعبہ میں نماز پڑھتے ہیں۔"

ملفوظات میں لکھا ہے کہ ایک سادھو حضرت بابا فرید الدینؒ کی خدمت میں آیا تو آپ نے فرمایا کوئی کرامت دکھاؤ۔وہ ہوا میں اڑنے لگا۔بابا فرید نے اپنی جوتیاں ہوا میں چھوڑ دیں جو سادھو سے بھی اونچائی پر اڑنے لگیں۔سادھو نے اعتراف کیا کہ جس کی جوتیوں کا یہ رتبہ ہے وہ خود کس رتبہ کا ہوگا۔

ایک مجلس میں اپنی ریاضت کے متعلق فرمایا۔"میں بیس سال عالم تفکر میں کھڑا رہا۔مجھے یاد نہیں کہ اس بیس سال میں میں نے کچھ کھایا ہو۔حضرت عمر کے متعلق فرمایا ایک دہی بیچنے والا راستہ میں کھڑا رو رہا تھا کہ اس کا دہی گر گیا اور زمین میں جذب ہوگیا تھا۔حضرت عمرؓ نے درّہ اٹھاکر للکارا کہ اے زمین تو دہی واپس دیتی ہے یا نہیں؟ یہ سن کر زمین شق ہوگئی اور دہی بیچنے والا اپنا کٹورا دہی سے بھر لیا۔"

ایک دفعہ فرمایا: حضرت عمرؓ اپنا خرقہ سی رہے تھے۔آپ کی پشت سورج کی گرمی سے گرم ہوگئی۔حضرت عمرؓ نے غصہ سے سورج کی طرف دیکھا۔فرشتوں کو حکم الٰہی ہوا کہ سورج کا نور سلب کردیں کہ اس نے حضرت عمرؓ کے ساتھ گستاخی کی ہے۔فرشتوں نے فوراً سورج سے نور لے لیا اور کل جہاں تاریک ہوگیا۔رسول اکرمؐ نے خیال کیا کہ شاید قیامت قائم ہوگئی ہو۔اچانک جبریل آئے اور کہا: یا رسول اللہ قیامت قائم نہیں ہوئی ہے بلکہ سورج کا نور حضرت عمرؓ سے گستاخی کی وجہ سے سلب کرلیا گیا ہے۔رسول اکرمؐ نے حضرت عمرؓ کو بلاکر سفارش کی۔حضرت عمرؓ نے سورج کو معاف کردیا اور تمام دنیا روشن ہوگئی۔ایک مجلس میں فرمایا:"حضرت خواجہ عبداللہ سہیل تستری کا وصال ہوا تو ایک یہودی نے جنازہ کے قریب آکر کہا کہ اگر آپ تلقین کریں تو میں ایک ہزار یہودیوں کے ساتھ اسلام قبول کروں گا۔ابھی اس نے بات بھی پوری نہ کی تھی کہ خواجہ عبداللہ تستری نے دونوں آنکھیں کھول کر کلمہ پڑھا۔اس پر سب یہودی مسلمان ہوگئے۔اسی طرح جب حضرت خواجہ قطب الدین مودود چشتی کا وصال ہوا تو مریدوں نے چاہا کہ جنازہ اٹھائیں لیکن جنازہ معلق ہوکر چلنے لگا۔دفن کے بعد معلوم ہوا کہ جنازہ کو فرشتے اٹھائے ہوئے تھے۔یہ بیان کرکے

آپ نعرہ مار کر بیہوش ہوگئے اور دیر تک بیہوش پڑے رہے۔

ایک مجلس میں فرمایا: "معاویہ اپنے بیٹے یزید کو کندھے پر لئے رسول اکرمؐ کے سامنے سے گذرے۔ رسول اکرمؐ نے تبسم فرمایا اور کہا۔ سبحان اللہ ایک دوزخی ایک جنتی کے کندھے پر سوار ہے۔ حضرت علیؓ نے پوچھا۔ معاویہؓ کا بیٹا دوزخی کیسے ہوگا۔ رسول اکرمؐ نے فرمایا۔ اے علیؓ۔ یزید بد بخت میرے حسن اور حسین اور ان کی اولاد کو شہید کرادے گا۔ حضرت علیؓ نے چاہا کہ یزید پلید کو قتل کردیں۔ رسول اکرمؐ نے روکا اور فرمایا۔ اللہ کا حکم ایسا ہی ہے تقدیر کی مخالفت نہیں کرنی چاہیئے۔

مولانا جلال الدین رومیؒ۔ (وفات ۶۷۳ھ)

مولانا جلال الدین رومی کے ملفوظات پر مبنی ایک کتاب "فیہ مافیہ" ہے۔ اس میں درج کی ہوئی ایک روایت یہ ہے:۔ "نقل ہے کہ ایک شب آنحضرت صلعم صحابہ کے ساتھ کسی غزوہ سے واپس آئے تو فرمایا کہ یہ بانگ دہل اعلان کردو کہ آج کی رات ہم شہر کے باہر بسر کریں گے اور کل صبح شہر میں داخل ہوں گے۔ صحابہ نے وجہ دریافت کی تو فرمایا۔ ہوسکتا ہے کہ تم اپنی بیویوں کو اجنبی لوگوں کے ساتھ مباشرت میں مشغول پاؤ۔"

مولانا رومی کے ساتھی شمس الدین اخلاقی نے لکھا ہے۔ "مولانا روم کی زوجہ کے دل میں خیال آیا کہ مولانا ایک عرصہ سے میری جانب ملتفت نہیں ہیں۔ معلوم نہیں شہوانی جذبات باقی ہیں یا فنا ہوگئے۔ (مولانا کو بذریعہ کشف ان کا خیال معلوم ہوگیا)۔ رات کو مولانا ان کے پاس گئے۔ جذبات شہوانی کا یہ عالم تھا کہ ان کی زوجہ پریشان ہوکر استغفار کرنے لگیں۔ مولانا نے ستر بار جماع کیا۔ پھر فرمایا۔ "مردان خدا ہر شئے پر قادر ہیں۔ ترک یا قلت مباشرت کا باعث استغراق ہے۔" پھر فرمایا۔ آنحضرتؐ اور ان کی ایک زوجہ میں بھی یہی معاملہ ہوا تھا۔ ایک دن انھوں نے ایک چڑے چڑیا کو جفت ہوتے دیکھ کر آپ سے کچھ کہا۔ بوقت شب آپؐ نے ان سے نوے بار قربت فرمائی اور فرمایا۔ ہم نے خود لذات دنیا کو ترک کر دیا ہے ورنہ یہاں کچھ کمی نہیں ہے۔" (مناقب العارفین)

آٹھویں صدی ہجری

حضرت خواجہ نظام الدین اولیا۔ (وفات ۷۲۵ھ)

راحت المحبین حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کے ملفوظات ہیں جن کو حضرت امیر خسروؒ نے مرتب کیا تھا۔ ایک مجلس میں فرمایا:۔

"جب حضرت عیسیٰؑ آخری زمانہ میں دنیا میں اتریں گے تو اپنے معجزہ سے ایک مردہ کو زندہ کریں گے اور وہ حضرت علیؓ کے والد ابو طالب ہونگے۔"

ایک دفعہ فرمایا: حضرت ایوبؑ نے اللہ سے دعا کی کہ مجھے بارہ ہزار زبانیں دے تاکہ ہر زبان سے تیرا ذکر کروں۔ ان کی دعا قبول ہوئی اور ان کے جسم میں بارہ ہزار کیڑے پیدا ہوئے۔"

حضرت یوسفؑ کے تعلق سے فرمایا: "ایک دفعہ حضرت یوسفؑ نے اپنے والد حضرت یعقوبؑ کو دیکھکر تعظیم کے لئے گھوڑے سے اترنا چاہا جس میں کچھ دیر ہوگئی۔ جبریلؑ آئے اور کہا: تم نے گھوڑے سے اترنے میں تاخیر کردی اس لئے تمہاری اولاد میں کوئی پیغمبر نہیں ہوگا۔"

حضرت سلیمانؑ کے متعلق فرمایا: "حضرت سلیمان کے باورچی خانہ میں روزانہ ستر ہزار اونٹ نمک لاتے تھے اور وہ اسی روز صرف ہوجاتا تھا۔"

حضرت موسیٰ کے متعلق فرمایا: "جب حضرت موسیٰ پیدا ہوئے تو فرعون نے انھیں گرم تنور میں ڈلوایا۔"

حضرت ابو بکر صدیقؓ کے تعلق سے فرمایا: "ایک چیونٹی حضرت صدیق اکبر کے پاؤں تلے آگئی اور شدت درد سے آہ کھینچی۔ حضرت صدیق نے دعا کی کہ اگر تیری بارگاہ میں میری کچھ عزت ہے تو اس چیونٹی کو زندہ کردے۔ وہ چیونٹی فوراً زندہ ہوگئی۔"

"اسی طرح ایک مرتبہ حضرت صدیق داڑھی میں کنگھی کر رہے تھے۔ ایک بال اڑ کر یہودیوں کے قبرستان میں گیا۔ اس کی برکت سے تین دن تک یہودیوں پر عذاب قبر نہیں ہوا۔"

حضرت قطب الدین مودود چشتی کے متعلق فرمایا: "ایک بڑھیا روتی ہوئی آئی اور عرض کیا: "میرے اکلوتے بیٹے کو بادشاہ نے ناحق سولی دیدی ہے یہ سن کر حضرت مودود چشتی سرِدار پہنچے اور اس لڑکے کی لاش سے مخاطب ہو کر کہا کہ اگر تو ناحق مارا

گیا ہے تو اٹھ کھڑا ہو ۔ لڑکا اسی وقت زندہ ہو گیا ۔"

نویں صدی ہجری

اسماعیلی (باطنی) داعیوں نے نویں صدی ہجری کے آغاز میں ہندوستان آکر صوفیوں کو اپنی تعلیمات کی اشاعت کے لئے آلہ کار بنایا اور ایسا طریق عمل اختیار کیا کہ ان تعلیمات میں مقامی لوگوں کے عقائد کی رعایت بھی رکھی اور جوگیوں کے طریقے بھی اختیار کئے ۔ صوفیوں اور سبائیوں اور اہل ہند کے عقائد میں جو اختلاف تھے اسماعیلیوں نے ان کو بہت کم کر دیا ۔

حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز (وفات ۸۲۵ ہجری)

حضرت خواجہ سید محمد حسینی گیسو دراز کے بموجب حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء نے فرمایا کہ ایک بزرگ نے یہ وصیت کی کہ جب وہ فوت ہو جائے تو اس کی میت کے قریب محفل سماع منعقد کی جائے، پھر دفن کیا جائے ۔ چنانچہ جب وہ بزرگ فوت ہوئے تو میت کے پاس سماع کا انتظام ہوا ۔ ساتویں روز وہ اٹھ کر رقص کرنے لگا اور پھر چارپائی پر گر گیا ۔

حضرت گیسو دراز فرماتے ہیں کہ ایک بد عقیدہ شخص نے بادشاہ کو صوفیوں سے بدظن کر دیا جس پر بادشاہ نے صوفیوں کو شہر سے نکال دینے کا حکم دیا ۔ صوفیوں کو معلوم ہوا تو تین دن کی مہلت مانگی اور یہ بھی درخواست کی کہ انھیں آخری بار مجلس سماع منعقد کرنے کی اجازت دی جائے ۔ بادشاہ نے درخواست منظور کی اور محل کے سامنے صوفیوں کو سماع کا انتظام کرنے کا موقع دیا اور خود جھروکہ سے سماع کا منظر دیکھنے لگا ۔ بادشاہ کا کم سن بیٹا بھی جھروکہ میں موجود تھا وہ نیچے گر گیا اور اس کے جسم کے اعضاء زمین پر بکھر گئے ۔ بادشاہ صوفیوں پر ناراض ہو کر بدلہ لینے کا ارادہ کر رہا تھا کہ صوفیوں نے بادشاہ کو کہلا بھیجا کہ بچہ کی میت کو ان کے پاس بھیج دیا جائے چنانچہ بچہ کے اعضاء کو ایک دری میں لپیٹ کر مجلس سماع میں رکھ دیا گیا ۔ کچھ ہی دیر بعد دری میں حرکت پیدا ہوئی اور جب اسے کھولا گیا تو بچہ اٹھ کر بھاگا ۔ بادشاہ جھروکہ کے نیچے اتر آیا اور صوفیوں سے معافی مانگی ۔ (جوامع الکلم ۔ ملفوظات خواجہ گیسو دراز ۔ مجلس روز چہار شنبہ ۹ رمضان المبارک ۸۰۲ھ)

اسی مجلس میں خواجہ صاحب نے شیخ ابو علی دقاق (وفات ۴۲۰ھ) کا قول کیا ہے کہ السماع اقرب الطرق الی اللہ یعنی سماع اللہ کی طرف پہنچنے کا قریب ترین راستہ ہے ۔

تعزیئے اور علم

تعزیئے کی مذہب فرقہ اہل باطل میں کوئی اہمیت نہیں ۔ اور رسوم عزاداری کی طرح تعزیہ بھی بہت بعد کی ایجاد ہے ۔ چنانچہ شیعی کتاب "مجاہد اعظم" کے بموجب ۔

"تعزیئے جس طرح ہندوستان میں ہوتے ہیں کہیں بھی نہیں ہوتے یہاں تک کہ ایران میں بھی جو شیعوں کا خاص گھر ہے ان کا رواج نہیں" ۔

آخر اس رواج کی ابتداء کب ہوئی، کس نے کی، اور کیوں ہوئی؟ ۔

افسوس کہ اس سوال کے جواب میں تاریخ خاموش ہے ۔ جس طرح ماتم و سینہ کوبی اور نوحہ خوانی کا رواج معزالدولہ کے زمانہ سے پہلے کسی ملک میں تاریخ سے نہیں پایا جاتا، یعنی سانحہ کربلا سے تین سو برس تک کسی ملک میں ماتم حسین نہیں منایا گیا ۔ اسی طرح تعزیہ کا رواج بھی بہت بعد کی ایجاد ہے ۔

اس سلسلہ میں ایک خیال یہ ہے کہ اس رسم کو امیر تیمور لنگ نے ایجاد کیا ۔ جو اثنا عشری تھے ۔ چنانچہ غلام احمد فرقت کا کوری المعرفت (شیعی ماہنامہ) حیدر آباد بابت محرم ۱۳۸۹ھ میں لکھتے ہیں ۔

" ایک روایت یہ ضرور مشہور ہے کہ سب سے پہلا تعزیہ صاحب قران امیر تیمور نے رکھا تھا اور اس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ تیمور کو حضرت امام حسینؓ سے بے حد عقیدت تھی اور وہ ہر سال کربلائے معلیٰ روضہ اطہر کی زیارت کو جاتا تھا ایک سال جنگ و جدال میں وہ اس قدر مصروف رہا کہ زیارت نہ کر سکا ۔ چنانچہ اس نے روضہ اقدس کی شبیہہ منگوا کر اس کو تعزیہ کی صورت میں بنوالیا ۔ اور اس کی

زیارت سے تسکین حاصل کر لی۔"

آج فرقہ اہل باطل کو تعزیہ داری پر بے حد اصرار ہے۔اور وہ اسے اپنا مذہبی فریضہ بنا کر پیش کرتے ہیں۔حالانکہ مندرجہ بالا حقائق کی روشنی میں یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ مذہب سے تو اس کا دور کا بھی لگاؤ نہیں ہے۔

رہ گئی اس کی مذہبی رو سے حیثیت تو اہل سنت کے یہاں تو اس کی جرمت (یعنی ناجائز ہونا) بالکل ظاہر ہے۔

خود شیعہ مذہب کے رو سے بھی تعزیہ داری حرام ہے۔چنانچہ فرقہ اہل تشیع کی مشہور کتاب **لایحضرہُ الفقیہ** میں جعفر صادق کی روایت ہے۔

"جو شخص دوبارہ قبر بنائے یا اس کی شبیہہ بنائے وہ اسلام سے خارج ہو گیا"

تعزیہ اور گنیش کی یکسانیت بھی دلچسپ ہے۔

گنیش جی کی پیدائش کے بارے میں روایت بیان کی جاتی ہے کہ ایک بار پاروتی نے نہانا چاہا۔خیال ہوا کہ کوئی غیر نہ آجائے۔انھوں نے اپنے جسم کا میل نکالا، اس کا ایک پتلا بنایا۔اس میں روح پھونک دی پھر اسے پہرہ دینے کے لئے کھڑا کر کے آرام سے نہالیا اور اس کو اپنے بیٹے کے طور پر پالنے لگیں۔بعض راکشسوں کو دیوتاؤں کا ایسا عجیب بیٹا پسند نہ آیا۔کسی نے موقع پا کر ایک دن اس کا سر کاٹ لیا اور چلا گیا۔پاروتی رونے دھونے لگی تو شیوجی نے تلاش شروع کی لیکن نہ سر ملا نہ راکشس دکھائی دیا۔واپسی میں ہاتھی کا کٹا ہوا سر ملا۔اسے اٹھالائے اور پاروتی کے چوکیدار کے دھڑ سے جوڑ دیا۔وہ چلنے پھرنے لگا۔اس کا نام گنیش یا گنپتی رکھا۔جنوبی ہند میں شیو، پاروتی اور گنیش، تثلیت کے ماننے والے آباد ہیں۔ان کا نشان ترشول یعنی تین پھل کا بھالا ہے۔برہمنوں نے تری مورتی کے ساتھ آریائی دیوتا شامل کر کے اور ان کے اختیارات میں ردوبدل کر کے "پنچ جتا پرستی" کی ابتداء کی۔

۱۔شیوجی کی خلاقی اور رزاقی وشنوجی کو دے دی۔
۲۔برہما دیوتا کو امن و امان اور بارش کا دیوتا مقرر کیا۔
۳۔شیوجی کو موت کا دیوتا قرار دیا۔

۴۔پاروتی جی کو گانے بجانے اور دل بہلانے کی دیوی بنایا گیا۔
۵۔گنیش جی سے علم و حکمت چھین کر ان کو جنگ و جدال کا دیوتا بنایا گیا۔

گنیش جی کے ماننے والے گنیش کا پتلا بنا کر دس دن تک اس کی تعظیم و تکریم اور پوجا کرتے ہیں اور پھر اس کو جلوس کی شکل میں لے جا کر پانی میں ڈال دیتے ہیں۔

اہل فرقہ باطل کو جنھوں نے مسلمانوں کے ایک خانوادہ کو ایران کے شاہی خاندان کا جوڑ لگایا تھا اور پنج تن کا تصور بھی اپنایا تھا۔گنیش جی کی شخصیت میں دلچسپی پیدا ہوئی اور تعزیہ کی رسم کو گنیش جی کے متعلقہ رسومات کے مماثل رائج کیا گیا۔

تعزیے بھی ایک جگہ بٹھائے جاتے ہیں اور دس دن کے بعد ان کو جلوس کی شکل میں لے جا کر پانی میں "ٹھنڈے" کیا جاتا ہے۔

شیعہ دانشور ہوش بلگرامی (نواب ہوش یار جنگ) اپنی کتاب "ہماری بت پرستیاں" میں رقم طراز ہیں:۔

"میں آپ سے دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ کیا تعزیہ و علم کی نمائش قبر پرستی اور بت پرستی کے علاوہ کسی اور جذبہ سے متعلق ہے؟"

آپ ایک خدا کے ماننے والے ہیں وہ خدا جو دانا بھی ہے اور بینا بھی۔قادر بھی ہے اور توانا بھی، زندہ بھی ہے اور گویا بھی، اس لئے آپ کی پیشانی کو اسی کے سامنے جھکنا چاہیئے اور معبود برحق کی عبادت سے درس سربلندی حاصل کرنا چاہیئے۔

پھر اے صاحبان توحید! اے آفریدگار واحد کے پرستار!

یہ لکڑی اور کپڑے کے ہاتھ سے بنائے ہوئے کھلونوں اور مٹی کے ڈھیروں کے سامنے نیائش و فروتنی کیوں؟ یقیناً اسلامی ضمیر کو اس پر شرم آنی چاہیے۔ ضمیر جو معبود حقیقی کی پرستش کے سوا کسی غیر اللہ کے آستانہ پر سر جھکانا پسند کر سکتا، وہ ضمیر جو صرف خدائے واحد کی پرستاری کو زندگی کا اصل مقصد سمجھتا ہے۔یقیناً تعلیم یافتہ مسلمان تعزیہ و علم کو خدا نہیں سمجھتے مگر عوام ان کے توسل سے عقیدہ کشائی کے ضرور آرزومند رہتے ہیں۔ اور ان کا گمراہ ضمیر ان سے وہ صفات خداوندی منسوب کرنے میں تامل نہیں کرتا جو صرف خدا کے لئے مخصوص ہیں۔

اولاد ان سے مانگی جاتی ہے، شوہر کے التفات ان سے طلب کئے جاتے ہیں۔

بچوں کی زندگی، بیماروں کی صحت اور مالی پریشانیوں سے نجات، ان سے چاہی جاتی ہے۔اس میں شک نہیں کہ ایمان ہم کو رسول اور آل رسول ہی سے ملا ہے۔خدا کو ہم نے انھیں کے ذریعہ سے پہچانا ہے۔توحید کے اسرار انھیں نے ہمیں بتائے ہیں لیکن یہ تو سوچئے کہ انھوں نے ہماری زندگی کی اصلاح کے لئے کیا طریقے اختیار کئے۔ ہمارے ذہن و دماغ سے اوہام کیونکر مٹائے اور معبودان باطلہ سے چھڑا کر صرف ایک خدا سے رشتہ جوڑنا کس طرح بتایا۔"

ہوش بلگرامی آگے لکھتے ہیں:۔

"مسلمانان ہند نے تو غضب کیا کہ تعزیہ داری کی عقیدت مندانہ رسم کے ساتھ دنیا کی ساری بدعتیں جمع کر دیں۔اور وہ بدعتیں کیں جن سے ہر سنجیدہ انسان کو شرم آنی چاہئے ان حالات میں اگر اغیار ہم پر آوازے کستے ہیں اور ان مراسم کو رام لیلا کے سوانگ سے تعبیر کر کے ہمارے ایمان کا مضحکہ اڑاتے ہیں، تو اس میں برا ماننے اور تیوریوں پر بل ڈالنے کی کیا ضرورت ہے؟

کیا میرے بروران ملت اس سے انکار کر سکیں گے کہ عقائد کا یہ غلو خواہ کیسے ہی حسن نیت پر مبنی ہی، اسلام کی تعلیمات سے اس کو کوئی دور کا بھی تعلق ہو سکتا ہے

مذہب تفضیلیہ

مذہب تفضیلیہ کے پابند حضرات اہل سنت ہیں جن پر پورے طور پر یہ مثل صادق آتی ہے کہ "ازایں سو رانده وازآں سو درمانده"۔شیعہ تو ان کو شیعہ نہیں کہہ سکتے سنی بھی انھیں کہنے سے بیزار معلوم ہوتے ہیں۔

حضرات تفضیلیہ حضرت علی کو، حضرات ابو بکر اور حضرت عمر پر فضلیت دیتے ہیں۔یعنی علی کو افضل اور شیخین کو مفضول جانتے ہیں۔اسی عقیدہ کے ساتھ فرقہ اہل باطل کی طرح یہ حضرات پنج تن پاک اور چہاردہ معصوم کا عقیدہ بھی رکھتے ہیں۔یہ فرقہ اکثر مسلک حنفی رکھتا ہے، کچھ لوگ مسلک شافعی کے بھی پیرو ہیں۔یہ

مسئلوں کی طرح ابن سباء کے شاگردوں نے ضرورتاً بہت گناہ کرنے کے لئے اور بہت سی مشکلات کا جواب دینے کے لئے گھڑلیا ہے۔جب کبھی کوئی جواب نہ بن پڑا تقیہ کی آڑ لے لی۔مذہب سبائی پر بہت سے اعتراضات وارد ہوتے ہیں۔ان سب کے جواب میں تقیہ مدد کے لئے پہنچ جاتا ہے۔یعنی سبائیوں نے دینی عقائد اور تاریخی واقعات کے سلسلہ میں بہت سے جھوٹ پھیلا دیئے۔عام اصول ہے کہ ایک جھوٹ کو نبھانے کے لئے سو (۱۰۰) جھوٹ بولنے پڑتے ہیں لیکن تقیہ ایسا حربہ ہے کہ سو جھوٹ کو نبھانے کے لئے ایک تقیہ کافی ہے۔یہاں صرف چند مثالیں دی جاتی ہیں:۔

۱۔اسلام کی مخالفت اور اپنے فتنوں کو بڑھاوا دینے کے لئے سبائیوں نے اس بڑے جھوٹ کو پھیلایا کہ پہلے تین خلفاء حق پر نہ تھے مرتد تھے۔اور غاصب تھے۔دوسری طرف وہ اس تاریخی حقیقت کا انکار نہ کر سکے۔کہ حضرت علیؓ نے ان تین سے نہ صرف بیعت کی بلکہ ان کے مشیر رہے۔سبائی حضرت علیؓ کو مومن متقی اور شجاع بھی مانتے ہیں۔یہاں ایک بڑا سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت علیؓ نے مرتدوں اور غاصبوں کے خلافت کیسے تسلیم کر لی۔سبائی اپنے جھوٹ کو نبھانے کے لئے کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ نے تقیہ کیا تھا۔

۲۔ان تینوں خلفاء کے زمانہ میں جو احکام دیئے گئے حضرت علیؓ نے ان کو بھی تسلیم کیا مثلاً سبائی ایک جھوٹ یہ بیان کرتے ہیں کہ متعہ کو جو نہ صرف حلال تھا بلکہ اس کو ایک عبادت کا درجہ حاصل ہے۔حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ خلافت میں زبردستی حرام کر دیا تھا۔حضرت علیؓ نے نہ صرف اس حکم کو تسلیم کیا بلکہ اپنے زمانہ خلافت میں اس کے حلال ہونے کا اعلان نہیں کیا۔اس کا یہ جواب دیا جاتا ہے کہ حضرت علیؓ نے تقیہ کیا تھا۔

۳۔سبائی ایک جھوٹ یہ کہتے ہیں کہ باغ فدک رسول اکرمؐ کی ذاتی جائیداد تھی اور رسول اکرمؐ کے بعد فاطمہؓ اس کی وارث تھیں۔حضرت ابو بکر صدیقؓ نے حضرت فاطمہؓ کو باغ فدک سے محروم کر دیا تھا۔تینوں خلفاء کے زمانہ میں وہ باغ حضرت فاطمہؓ یا ان کے ورثا کو نہیں دیا۔اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضرت علیؓ نے اس بات میں خلفا ثلاثہ کی کیوں پیروی کی۔وہ باغ حضرت فاطمہؓ کے ورثاء کو کیوں نہ دیا اس کا

فرقہ ہمیشہ ائمہ خاندان پیغمبر کا دم بھرتا ہے۔اور مصائب اہل بیت نبوی پر شیعوں کی طرح واویلا مچایا کرتا ہے۔

جاننا چاہئے کہ مسلمان یا سنی ہو سکتا ہے یا شیعہ مگر ان دونوں کے بین بین کوئی مذہب نہیں رکھ سکتا۔دونوں مذہب اپنے اپنے اصول کی پابندی رکھتے ہیں۔مگر یہ فرقہ ایک عجیب درمیانی رنگ رکھتا ہے۔یعنی عصمت چہاردہ معصوم کا عقیدہ تو فرقہ اہل باطل کا سا ہے اور امر خلافت میں عقیدہ اہل سنت کا پابند ہے۔یہ متناقض عقیدے شخص واحد کے دماغ میں کیونکر جگہ پاسکتے ہیں۔راقم کے فہم سے باہر ہے"
(نواب امداد امام۔مصباح الظلم بہ عنوان "حضرات تفضیلیہ کا بے تکاپن")

تفضیلیہ اہل سنت کی طرح شیخ عبدالقادر جیلانی (ولادت ۴۷۰ھ وفات ۵۶۱ھ) سے خاص عقیدت رکھتے ہیں۔اہل سنت غوث پاک سے وہی ارادت رکھتے ہیں جو فرقہ اہل باطلہ علی کے ساتھ۔وقت مشکل میں اہل سنت پیران پیر کو اسی طرح یاد کرتے ہیں جس طرح فرقہ باطلہ حضرت علی کو۔

اہل سنت کا یہ عقیدہ معلوم ہوتا ہے کہ معراج میں پیر و دستگیر رسول اکرمؐ کے ساتھ تھے، شیخ عبدالقادر جیلانیؒ اپنی ولادت سے تقریباً پانچ سو سال پہلے معراج میں رسول اکرمؐ کے ساتھ کیسے رہ سکتے ہیں؟ حضرت علی اور شیخ عبدالقادر ان دونوں بزرگوں کے متعلق غلو کرنے میں شیعہ اور تفضیلیہ مساوی درجہ رکھتے ہیں۔

حضرت علی کو خلفائے ثلاثہ یعنی حضرات ابوبکر، عمر، عثمان پر فوقیت اور فضلیت دینے سے شیعوں کے بنیادی عقیدہ کی تائید ہوتی ہے اور شیخ عبدالقادر جیلانی سے عقیدت رکھنا شیعوں کو کافر جاننا ہے۔کیونکہ شیخ عبدالقادر جیلانی نے رفض کو کفر قرار دیا تھا۔(اسی بناء پر اہل تشیع شیخ عبدالقادر جیلانی سے بغض رکھتے ہیں اور اس کا اظہار یوں کرتے ہیں کہ نہ عبدالقادر نام رکھتے ہیں، نہ جیلانی، نہ دستگیر نہ غوث) اس لئے تفضیلی عقیدہ میں اندرونی تضاد (Self Contradiction) ہے۔

اردو کے عظیم شاعر اکبر الہ آبادی نے اس مذہب کے تعلق سے کہا

مذکر کے لئے ہی (HE) ہے۔مونث کے لئے شی (SHE) ہے
ہمارے حضرات واعظ۔نہ ہیوں میں نہ شیوں میں

تقیہ

تقیہ کے لغوی معنی پرہیزگاری کے ہیں۔فرقہ اثنا عشریہ اصطلاحی معنی یہ بتلاتے ہیں کہ کسی بڑے نقصان کے مقابلہ میں اس سے کم درجہ کے نقصان کو گوارا کرنا۔یا کسی بڑے گناہ سے بچنے کے لئے اس سے چھوٹا گناہ اختیار کرلینا۔اگر بات یہیں رہتی تو کوئی بات نہ تھی لیکن سبائیوں نے اپنے اماموں کے حوالوں سے ایسی باتیں کہی ہیں کہ تقیہ جھوٹ اور محض جھوٹ کو کہا گیا۔تقیہ کرنے کے لئے خوف جان یا خوف آبرو کی شرط نہیں۔

بقول امام باقر تقیہ ہر ضرورت میں ہو سکتا ہے۔جس شخص کو ضرورت پیش آتی ہے وہی اس ضرورت سے خوب واقف ہوتا ہے۔ضرورت کا فیصلہ اس کی اپنی رائے پر منحصر ہے۔جب چاہے تقیہ کرلے۔"

تقیہ کا مطلب ہوتا ہے اپنے قول یا عمل سے واقعہ اور حقیقت کے خلاف یا اپنے عقیدہ کو ضمیر، مذہب و مسلک کے خلاف ظاہر کرنا اور اس طرح دوسروں کو دھوکے اور فریب میں مبتلا کرنا۔تقیہ کے لئے پوری آزادی ہے۔نہ کچھ قیود ہیں نہ کچھ حدود۔شیعوں کے امام جعفر کہتے ہیں:۔"دین کے دس حصے ہیں ان میں سے نو حصے تقیہ کرنے میں ہیں۔جو تقیہ نہ کرے وہ بے دین ہے"۔

شیعوں کے امام باقر فرماتے ہیں:۔

"تقیہ میرا دین ہے اور میرے باپ دادا کا دین ہے۔جو تقیہ نہ کرے اس کا ایمان نہیں"۔

واقعہ یہ ہے کہ تقیہ کا وجود نہ حضرت علی کے زمانہ میں تھا نہ حضرت حسین کے اور نہ ہی کسی اور امام کے زمانہ میں۔یہ اخلاق سوز مسئلہ بھی اور بہت سے

مسئلوں کی طرح ابن سباء کے شاگردوں نے ضرورتاً بہت گناہ کرنے کے لئے اور بہت سی مشکلات کا جواب دینے کے لئے گھڑلیا ہے۔ جب کبھی کوئی جواب نہ بن پڑا تقیہ کی آڑ لے لی۔ مذہب سبائی پر بہت سے اعتراضات وارد ہوتے ہیں۔ ان سب کے جواب میں تقیہ مدد کے لئے پہنچ جاتا ہے۔ یعنی سبائیوں نے دینی عقائد اور تاریخی واقعات کے سلسلہ میں بہت سے جھوٹ پھیلادیئے۔ عام اصول ہے کہ ایک جھوٹ کو نبھانے کے لئے سو (۱۰۰) جھوٹ بولنے پڑتے ہیں لیکن تقیہ ایسا حربہ ہے کہ سو جھوٹ کو نبھانے کے لئے ایک تقیہ کافی ہے۔ یہاں صرف چند مثالیں دی جاتی ہیں:۔

۱۔ اسلام کی مخالفت اور اپنے فتنوں کو بڑھاوا دینے کے لئے سبائیوں نے اس بڑے جھوٹ کو پھیلایا کہ پہلے تین خلفاء حق پر نہ تھے مرتد تھے اور غاصب تھے۔ دوسری طرف وہ اس تاریخی حقیقت کا انکار نہ کرسکے کہ حضرت علیؓ نے ان تین سے نہ صرف بیعت کی بلکہ ان کے مشیر رہے۔ سبائی حضرت علیؓ کو مومن متقی اور شجاع بھی مانتے ہیں۔ یہاں ایک بڑا سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت علیؓ نے مرتدوں اور غاصبوں کے خلافت کیسے تسلیم کرلی۔ سبائی اپنے جھوٹ کو نبھانے کے لئے کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ نے تقیہ کیا تھا۔

۲۔ ان تینوں خلفاء کے زمانہ میں جو احکام دیئے گئے حضرت علیؓ نے ان کو بھی تسلیم کیا مثلاً سبائی ایک جھوٹ یہ بیان کرتے ہیں کہ متعہ کو جو نہ صرف حلال تھا بلکہ اس کو ایک عبادت کا درجہ حاصل ہے۔ حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ خلافت میں زبردستی حرام کردیا تھا۔ حضرت علیؓ نے نہ صرف اس حکم کو تسلیم کیا بلکہ اپنے زمانہ خلافت میں اس کے حلال ہونے کا اعلان نہیں کیا۔ اس کا یہ جواب دیا جاتا ہے کہ حضرت علیؓ نے تقیہ کیا تھا۔

۳۔ سبائی ایک جھوٹ یہ کہتے ہیں کہ باغ فدک رسول اکرمؐ کی ذاتی جائیداد تھی اور رسول اکرمؐ کے بعد فاطمہؓ اس کی وارث تھیں۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے حضرت فاطمہؓ کو باغ فدک سے محروم کردیا تھا۔ تینوں خلفاء کے زمانہ میں وہ باغ حضرت فاطمہؓ یا ان کے ورثا کو نہیں دیا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضرت علیؓ نے اس بات میں خلفا ثلاثہ کی کیوں پیروی کی۔ وہ باغ حضرت فاطمہؓ کے ورثاء کو کیوں نہ دیا اس کا

جواب دیتے ہیں کہ حضرت علیؓ نے تقیہ کیا تھا۔

حضرت علیؓ اور تمام ائمہ تقیہ کرتے تھے۔ علانیہ خلفائے ثلاثہ سے عقیدت رکھتے تھے اور ان کے اعمال بھی بالکل سُنیوں کی طرح تھے۔ لیکن فرقہ باطلہ کے بموجب ان کے عقائد اس کے خلاف تھے۔ وہ سنیوں کے سامنے سنی بن جاتے تھے اور فرقہ اہل باطل کے سامنے فرقہ اثناء عشری بن جاتے تھے۔ فرقہ اثناء عشری یہ کہتے ہیں کہ انھوں نے تقیہ کیا تھا۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کیسے معلوم ہوا ان کا اصلی مذہب کیا تھا۔؟ ممکن ہے کہ وہ مسلمان ہی نہ ہوں بلکہ اپنے آبائی مذہب پر ہوں اور محض تقیہ سے اپنے کو مسلمان بتاتے ہوں، ان کا صوم صلوٰۃ اور حج کرلینا قابل اعتبار نہیں۔ سب تقیہ سے ہوگا۔ حقیقت میں ان تمام معقول اعتراضات کا کوئی جواب نہیں۔ اس لئے لازماً یہ ماننا پڑتا ہے کہ حضرت علیؓ اور تمام ائمہ پر قطعی اتہام ہے کہ وہ تقیہ کرتے تھے۔

اسلام کی بنیاد سچائی پر ہے۔ رسول اکرمؐ تو ایسے سچے تھے کہ آپؐ کا لقب صادق امین ہوگیا تھا۔ قبل بعثت ہی سے سب لوگ آپؐ کو صادق اور امین کے لقب سے پکارا کرتے تھے۔ صادق وہ ہے جو اپنے قول، فعل، خیال اور نیت میں سچا ہو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سچائی سے کافر اور دشمن بھی انکار نہیں کرسکتے۔ آپؐ کی سچائی بھی آپؐ کے نبی ہونے کی ایک قوی دلیل اس وجہ سے ہے کہ جو شخص لوگوں سے کبھی جھوٹ نہ بولا ہو وہ بھلا اللہ پر اتنی سخت تہمت کیونکر لگائے گا کہ اس نے مجھے رسول بنا کر بھیجا ہے۔

سبائیوں کا عقیدہ اس کے بالکل خلاف ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ ہر شخص کو اپنے حالات اور موقف کے تحت اس بات کی آزادی ہے کہ وہ جھوٹ کو اختیار کرے انھوں نے فریب آمیز طریقوں سے عیبوں کو ہنر اور گناہوں کو نیکیاں قرار دیا اور مختلف پہلوؤں سے گناہوں کے ارتکاب کی ترغیب دی۔ ساری دنیا کے عیوب اور مذموم اخلاق کی اصلاح ممکن ہے۔ لیکن نہیں ہے تو اس فرقہ کی جو عیوب اور اخلاق بد کی تقدیس کرتا ہو۔

یہ فرقہ ظاہرہ طور پر حضرت علیؓ کی عظمت کو مبالغہ آمیز حد تک بڑھاتا ہے۔

لیکن دراصل ان کو تقیہ باز، بزدل، فریبی، اور جھوٹا بناتا ہے کہ ان کے دل میں کچھ ہوتا تھا کہتے کچھ اور تھے۔ ظاہر اور تھا باطن اور تھا۔ تیس (۳۰) سال تک خلفائے ثلاثہ کے ساتھ ساتھ رہے اور ان کی تعریف کرتے رہے۔ حضرت عمرؓ کو تو اپنی بیٹی دی۔ حالانکہ ان کو کافر جانتے تھے۔ بالفاظ دیگر حضرت علی کو منافق قرار دیتے ہیں۔

تقیہ نے قلوب کو گندہ کر دیا۔ فریب و دغابازی خصلت ہے۔ مگر سبائیوں کے ہاں ثواب ہو جاتی ہے۔ فرقہ اثناء عشریہ کے امام جعفر سے روایت ہے کہ ایک شخص منافقوں میں سے مر گیا حضرت حسینؓ اس کے جنازے کے ہمراہ چلے راستہ میں ان کا ایک غلام ملا۔ حسینؓ نے دریافت کیا، تو کہاں جاتا ہے۔ کہا اس منافق کی صلوٰۃ جنازہ پڑھنا نہیں چاہتا۔ اس لئے بھاگتا ہوں۔ حسینؓ نے فرمایا میری داہنی جانب کھڑے ہو جانا۔ جو کچھ مجھے کہتے ہوئے سنے وہی کہنا۔ جب میت کے ولی نے تکبیر کہی تو حسین نے بھی تکبیر کہہ کر یہ دعا مانگی۔

یا اللہ فلاں بندے پر ہزار لعنتیں کر جو ساتھ ساتھ ہوں اس بندے کو دوسرے بندوں میں اور دوسرے شہروں میں رسوا کر اس کو آگ میں ڈال اور اس پر سخت عذاب کر کیونکہ وہ تیرے دوستوں سے دشمنی رکھتا تھا اور میرے نبی کے اہلبیت سے بغض رکھتا تھا۔

غور کی بات ہے کہ حسینؓ کو فریبی ظاہر کیا گیا ہے اور اس پر طرہ یہ کہ غلام کو بھی فریب اور منافقت کی تعلیم دی۔ منافق کی صلوۃ جنازہ جائز نہ تھی تو نہ پڑھتے۔ لیکن شریک ہو کر چپکے چپکے بددعا کرنا جب کہ میت کے اعزاء یہ سمجھ رہے ہوں کہ حسینؓ دعائے خیر کر رہے ہیں"۔ اقتباس از "(آیات بینات)"

فرقہ اثناء عشریہ کے لئے ایک مصیبت یہ تھی کہ جناب امیر سے لے کر گیارھویں امام تک سب کے سب اسی روش پر تھے جو صحابہ کرام کی تھی اور ہمیشہ صحابہ کرام کے محامد اور اوصاف بیان کیا کرتے۔ خود جناب امیر برابر نمازوں میں ان کے شریک رہے۔ اور جہادوں میں ان کو مشورہ دیتے رہے۔

فرقہ اثناء عشریہ نے یہ محسوس کیا کہ ایسی بات پیدا کرنی چاہیئے کہ باوجود اس موافقت ظاہری کے ائمہ کی مخالفت صحابہ سے قائم رہے۔ اور مذہب تشیع کی جڑ

مضبوط کی جائے تب ایک دلچسپ اصول قائم کیا یعنی ظاہر کا باطن سے مخالف ہونا۔ اور جھوٹ بولنا۔ مگر چونکہ یہ لفظ نہایت مکروہ تھا اور اگر اسی کو عقیدہ میں داخل کرتے تو جو سنتا اس عقیدہ سے نفرت کرتا۔ اس لئے اس کی حقیقت کو ایک خوشنما لفظ کے پردے میں ظاہر کیا اور جھوٹ بولنے اور ظاہر وہ باطن سے مخالف ہونے کا نام تقیہ رکھا اور اس کو سارے سوالوں کا جواب اور کل شبہات و شکوک کا حل ٹھہرایا مگر افسوس کہ یہ خیال نہ کیا کہ صورت اصلی لباس سے نہیں بدل سکتی۔ جھوٹ کا کوئی نام کیوں نہ رکھو جب اس کے معنی کہو گے اس کی برائی ظاہر ہو جائے گی خواہ نام اس کا تقیہ رکھو خواہ اسے اصول دین میں داخل کرو۔

پس تقیہ کی تعریف میں اماموں کی طرف سے روایتیں وضع کرنا شروع کیں۔ اور نہ صرف اس کے جواز پر قناعت کی بلکہ اس کے واجب ہونے اور اس کی فضیلت میں ایسی روایتیں گھڑیں کہ صوم و صلوٰۃ کے ثواب بھی تقیہ کے ثواب کے مقابلہ میں نیست و نابود ہو گئے۔ تقیہ کے منکر کو کافر بنایا۔

حبیب صاحب نواقض الروافض نے لکھا کہ:۔

ابوبکر صدیقؓ تقیہ کے سبب اسلام لائے تھے۔ تو قاضی نور اللہ شوستری مصائب النواصب میں لکھتے ہیں:۔

"یہ قاضی جھوٹا ہے کوئی شیعہ یہ بات نہیں کہہ سکتا اس لئے کہ تقیہ پاک لوگوں کا دین ہے۔ کیونکر ممکن ہے کہ ابوبکرؓ تقیہ کرتے"

غرض تقیہ کو اماموں کا دین ٹھہرا دیا گیا۔

فرقہ اثناء عشریہ نے تقیہ کے ذریعہ سنیوں کی دار و گیر سے نجات پائی۔ ناصبیوں یعنی سنیوں کے سارے مضبوط دلائل تقیہ کا حوالہ دینے کی وجہ سے خاک میں مل گئے۔ سنیوں کے بڑے بڑے عالموں نے فرقہ اثناء عشریہ ہی کی کتابوں سے خلفاء کی فضیلت کی حدیثیں اماموں کی زبان سے نکالیں۔ اور ان کو سند کے طور پر پیش کیا۔ اور فرقہ اثناء عشریہ کو لاجواب کرنا چاہا۔ لیکن فرقہ اثناء عشریہ کے ایک ادنیٰ طالب علم بلکہ جاہل شیعہ نے جواب دیا کہ یہ حدیث تقیہ کے سبب امام نے فرمائی۔ اس طرح بڑے بڑے متکلمین اور فقہاء کو ایک شیعہ لڑکے نے چپ کر دیا۔ جب کوئی روایت

شیعہ صاحبان کو ان کے خانہ ساز عقائد کے خلاف پڑتی ہے اور مضر ثابت ہوتی ہے تو اثناء عشری حضرات نہایت آسانی سے یہ توجیہ کر دیتے ہیں کہ امام کا یہ فرمان بطور تقیہ کے صادر ہوا ہے یہ محض حیلہ اور عذر لنگ ہے۔

حقیقت میں جو فائدہ مذہب تشیع کو تقیہ کے سبب سے ہوا ہے وہ کسی دوسرے عقیدہ سے نہیں ہوا۔

اصول کافی میں ایک روایت ہے کہ زرارہ ابو جعفر سے اور وہ محمد باقر سے روایت کرتے ہیں:۔

> میں نے ان سے ایک مسئلہ دریافت کیا تو انھوں نے مجھے جواب دیا پھر ایک دوسرا شخص آیا اور اس نے بھی وہی مسئلہ دریافت کیا۔ امام نے اسے میرے جواب کے خلاف دوسرا جواب دیا۔ پھر ایک تیسرا شخص آیا اور اس نے بھی وہی مسئلہ دریافت کیا تو امام نے اسے ہم دونوں کے جواب کے خلاف جواب دیا۔ جب وہ دونوں چلے گئے تو میں نے پوچھا اے فرزند رسول یہ دونوں شخص عراق کے باشندے اور آپ کے فرقہ اثناء عشریہ میں سے تھے۔ آپ سے مسئلہ دریافت کرنے آئے تھے۔ آپ نے ہر ایک کو دوسرے کے خلاف جواب دیا۔ امام نے جواب دیا اے زرارہ یہی ہمارے اور تمہارے حق میں بہتر ہے۔ اور ہماری اور تمہاری بقا کا سبب ہے۔ اگر تم سب لوگ ایک ہی بات پر متفق ہو جاؤ تو لوگ تم کو ہم سے روایت کرنے میں سچا سمجھنے لگیں گے اور یہ بات ہماری اور تمہاری دونوں کی زندگیوں کو کم کرنے والی ہوگی۔

ایک طرف شیعہ ائمہ کی اطاعت فرض مانتے ہیں۔ دوسری طرف اماموں کا یہ حال ہے کہ تقیہ کی وجہ سے ان کی تعلیمات مشکوک، ان کے اقوال غیر معتبر اور ان سے منسوب روایات میں حد درجہ اختلاف موجود ہے اور پھر ان اختلافات کا سبب دریافت کرنا انسانی طاقت سے باہر ہے۔ اب ان اماموں کے احکام پر اپنے مذہب کی بنیاد رکھنے والے شیعہ کس قول کو درست مانیں اور کسے غلط؟۔ کسے تقیہ قرار دیں اور

کسے حقیقت؟ کس پر عمل کریں اور کسے ترک کریں؟۔ اس مشکل کو محسوس کر کے فرقہ اثناء عشریہ کے مجتہد اعظم مولوی دلدار علی اپنی مایہ ناز کتاب "اساس الاصول" میں اپنی بیچارگی کا حال اس طرح بیان کرتے ہیں:۔

> "ائمہ سے منقول احادیث کے درمیان شدید اختلافات ہیں حتیٰ کہ کوئی حدیث ایسی نہیں مل پائے گی جس کے مقابلہ میں اس کی مخالف دوسری حدیث نہ ہو۔ اور کوئی روایت ایسی نہ ہوگی جس کی ضد میں دوسری روایت نہ ہو۔ یہی اختلاف بعض لوگوں کا مذہب فرقہ باطل سے پھر جانے کا سبب بن گیا۔ ان اختلافات کے اسباب بہت زیادہ ہیں۔ جیسے کہ تقیہ اور موضوع روایات یا سامع کو اشتباہ پیدا ہونا یا کسی حدیث کا منسوخ، مخصوص یا مقید ہونا۔ ان کے علاوہ بھی بہت سے اسباب ہیں۔ اکثر اسباب کا ائمہ سے منقول روایات میں ذکر موجود ہے۔ لیکن ان اسباب میں سے ایک دوسرے سے مختلف دو حدیثوں میں اس طرح امتیاز کرنا کہ اختلاف کا سبب متعین ہو جائے بہت ہی دشوار اور طاقت انسانی سے باہر ہے جیسا کہ پوشیدہ نہیں ہے۔
>
> ("آیات بینات" اور "تعارف مذہب شیعہ" سے اقتباس)

تین تیرہ نو اٹھارہ

"تین تیرے نو اٹھارہ" اعداد نہیں۔ یہ ایک محاورہ ہے۔ تین تیرہ نو اٹھارہ کرنا یا صرف "تین تیرہ کرنا" کے معنی ہیں منتشر کرنا۔ پراگندہ کرنا، ضائع کرنا وغیرہ۔ یہ محاورہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ شیعیت نے کس طرح اسلام کا شیرازہ بکھیرنے کی کوشش کی۔ دینی عقائد اور اقتدار کو نقصان پہنچایا۔

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ عزاداری اور ماتم فرقہ اثناء عشریہ کی شناخت

ہے۔وہ حسینؓ اور علیؓ کا غم ضرور مناتے ہیں اور ایسا کرتے ہوئے شرعی حدود سے بھی آگے بڑھ جاتے ہیں۔لیکن مخصوص تواریخ کو خوشیاں بھی مناتے ہیں اور اس میں بھی حد اعتدال سے تجاوز کرتے ہیں۔

اسلام میں خوشی منانے کے دن صرف دو ہیں یعنی عید الفطر اور عید الضحیٰ۔یہ دونوں علی الترتیب ماہ صیام اور حج کے بعد منائے جاتے ہیں۔خوشی کے ان دنوں کا تعلق اہم عبادات کی ادائی سے ہے۔ان دونوں کی ابتدا بھی اللہ کی عبادت یعنی دو رکعت صلوٰۃ اور خطبہ سے ہوتی ہے۔خوشی کے ان دونوں مواقع پر مسلمان سادگی کو ملحوظ رکھتے ہیں۔

اسلام میں غم منانے کا کوئی دن نہیں ہے۔حتیٰ کہ رسول اکرمؐ کی وفات کی تاریخ کو بھی سوگ منانے کا کوئی حکم نہیں ہے۔ابتدائی دور میں بھی اس تاریخ کو سوگ منانے کا رواج نہیں رہا اور نہ خلفائے راشدین نے رسول اکرمؐ کا سوگ منایا، نہ ہی حضرت علیؓ یا حضرت حسینؓ نے۔

مجوسی تاریخوں کا حساب رکھنے میں بڑے ماہر تھے۔سعد اور نحس دنوں کا تعین انھوں نے کر رکھا تھا، اسی طرح خوشی اور سوگ کے دن منانے کا بھی رواج تھا۔یہی طریقہ سابقہ ادیان میں رائج تھا جو انسانی بگاڑ سے وجود میں آئے۔

انہی مجوسیوں نے جب اپنے خود ساختہ عقائد کو رائج کیا اور چند شخصیتوں کو اپنا ہیرو اور چند شخصیتوں کو اپنا دشمن قرار دیا تو اول الذکر کے یوم وفات کو سوگ منانے اور ثانی الذکر کی وفات پر خوشی منانے کی ابتداء کی اور یہ کوشش کی کہ مسلمان بھی ان ایام کو سوگ یا خوشی منائیں

شیعہ جو خوشی کا دن مناتے ہیں ان میں سے ایک عید "آخری چہار شنبہ" ہے۔اس کی تفصیل سے واقف ہونے پر عبرتناک حقیقت سامنے آتی ہے کہ کس طرح اہل باطل نے اپنی تعبیرات اور اپنے عقائد کو مسلمانوں کے ذہن پر مسلط کیا۔

مسلمان بھی ماہ صفر کے آخری چہار شنبہ کو "عید چہار شنبہ" مناتے ہیں۔کرامات اولیاء میں مرقوم ہے کہ خواجہ معین الدین چشتیؒ ماہ صفر کے آخری چہار شنبہ کو دو رکعت نفل نماز پڑھتے تھے جس میں بعد سورہ فاتحہ تین تین بار، سورہ اخلاص،

سورہ ناس اور سورہ فلق، پڑھتے تھے۔مسلمان تفصیل میں گئے بغیر خوشی مناتے ہیں۔سیر کو جانا اور سبزہ کو روندنا ضروری خیال کرتے ہیں۔یہ بھی خیال کرتے ہیں کہ اس عید کو منانے سے تمام سال زندگی عیش و آرام میں گزرے گی عوام سے کہا جاتا ہے کہ رسول اکرمؐ نے اس دن غسل صحت فرمایا تھا۔اگر پوچھا جائے کہ یہ بیماری کونسی تھی کہ جس کا غسل فرمایا تو اس کا کوئی جواب نہیں دیتے۔

شیعہ روایت کے بموجب ۲۷/ صفر ۲۴ ہجری کو بدھ کے دن حضرت عمرؓ کی شہادت واقع ہوئی۔اصل خوشی ذی الحجہ کے آخری بدھ کی ہے۔جو ہجری سال کا بھی آخری بدھ قرار پاتا ہے۔اگر ۲۷/ صفر کو رسول اکرمؐ کے بیمار ہونے کی یا غسل صحت کرنے کی تاریخ قرار دیا جائے تو اہل تشیع اس دن اس لئے خوشی مناتے ہیں کہ دور ستر اختتام کو پہنچا اور دور فترت کا آغاز ہوا، یعنی باطنی اسلام کے پھیلانے کے لئے راستہ صاف ہو گیا۔جس کا عقیدہ ہے کہ مطلع امامت مقطع نبوت ہے یعنی نبوت کا چراغ گل ہو گیا تو امامت نے طلوع کیا۔

۱۲/ ربیع الاول یوم وفات النبی کی خوشیاں اسی سے متعلق ہیں اور ۲۷/ صفر کو آپ کے مرض الموت لاحق ہونے کا دن ہے۔اس کو غسل صحت کا نام دے کر یوم جشن قرار دیا گیا۔

تین تیرہ نو اٹھارہ کی تفصیل یہ ہے کہ شیعوں کے لئے خوشی منانے کے دو دن حضرت حسینؓ اور حضرت علیؓ کے یوم پیدائش ہیں جو ان کی اپنی روایت کے بموجب ۳/ شعبان اور ۱۳/ رجب ہیں۔خوشی منانے کے دو اور دن حضرت عمرو بن سعد بن ابی قاصؓ کی وفات ۹/ ربیع الاول اور حضرت عثمانؓ کی شہادت ۱۸/ ذی الحجہ ہیں۔

حضرت علیؓ اور حضرت حسینؓ کے یوم پیدائش منانا عمرو بن سعد کا یوم وفات منانا ان دونوں کو خوشی کا دن قرار دینا آسان تھا لیکن امیرالمومنین حضرت عثمانؓ جیسے اولوالعزم اور خلیفہ راشد کی شہادت کی خوشی منانا، اہل سنت کی اکثریت اور دبدبہ خلافت کے پیش نظر آسان نہ تھا اس لئے اہل تشیع نے یوم شہادت عثمانؓ یعنی ۱۸/ ذی الحجہ کو عید غدیر کا نام دیا اور یہ مشہور کیا کہ اس دن رسول اکرمؐ نے حضرت علیؓ کو ولیعہد یعنی اپنا جانشین مقرر کیا تھا اور وضعی روایات کے سہارے ۱۸/

ذی الحجہ کو خوشی کا دن قرار دیا ۔ حالانکہ ان کے پیش نظر ۱۸/ ذی الحجہ ۳۵ھ ہوتا ہے جب کہ سبائی بلوائیوں نے حضرت عثمانؓ ذی النورین کو مظلومانہ شہید کیا اور حضرت علیؓ کی خلافت کا اعلان کر دیا ۔

عید نہم (۹/ ربیع الاول) کا جواز یوں پیدا کرتے ہیں کہ :

شیعوں کے نزدیک عزاداری یکم محرم سے شروع ہوتی ہے جس کا سلسلہ چہلم تک یعنی ۲۰ صفر تک رہتا ہے ۔ پھر حضرت زینبؓ ہمشیرہ حضرت حسینؓ کی وفات ۲۵/ محرم رسول اکرمؐ کی وفات ۲۸ صفر، حضرت حسنؓ کی وفات ۲۸/ صفر اور حسن عسکری یعنی شیعوں کے گیارھویں امام کی وفات ۸/ ربیع الاول تک بھی غم منایا جاتا ہے ۔

سوگ کے ان ایام یعنی یکم محرم سے ۸/ ربیع الاول تک اہل تشیع شادی بیاہ یا خوشی کی اور کوئی تقریب انجام نہیں دیتے ۔ نئے کپڑے نہیں پہنتے وغیرہ ۔ ۹/ ربیع الاول کو عید نہم منا کر سوگ منانا بند کرتے ہیں ۔

شیعہ نام تو عمرو بن سعد کا لیتے ہیں لیکن ان کے پیش نظر امیر المومنین حضرت عمرؓ کی شہادت کی خوشی منانا ہوتا ہے ۔ معتبر روایات کے بموجب ذی الحجہ کے آخری ایام میں ابو لولوء نے ہرمزان، حفینہ، سلیمان فارسی اور کعب احبار کی ملی بھگت سے امیر المومنین حضرت عمرؓ پر قاتلانہ حملہ کیا اور یکم محرم کو انؓ کی شہادت واقع ہوئی ۔

شیعہ چونکہ محرم میں خوشی نہیں منا سکتے اس لئے ۸/ ربیع الاول کو ایام سوگ کے اختتام کے فوری بعد حضرت عمرؓ کی شہادت کی خوشی عید نہم کے نام سے مناتے ہیں ۔

عمرو بن سعد بن ابی وقاص کے یوم وفات کو خوشی منانا بھی ہرگز مناسب نہیں ۔ وہ رسول اکرمؐ کے ماموں زاد بھائی تھے ۔ حضرت سعد حضرت حمزہ کے حقیقی ماموں تھے اور سیدہ آمنہ کے چچازاد بھائی تھے ۔ حضرت سعد قادسیہ کے فاتح تھے ، اسی لئے عجمیوں کو ان سے نفرت ہے ۔

جوانانِ اہلِ جنت کے سردار

ترمذی کی روایت میں حضرت ابو سعید خدریؓ کا بیان ہے کہ رسول اکرمؐ نے ارشاد فرمایا کہ :۔

حسنؓ اور حسینؓ جوانان اہل جنت کے سردار ہونگے ۔

اس حدیث میں چند اشکال ہیں ۔

۱۔ جس وقت رسول اکرمؐ نے یہ ارشاد فرمایا کیا حسنؓ، حسینؓ نوجوان تھے ؟ حالانکہ مسلمانوں میں عام خیال ہے جو اہل تشیع کا پیدا کردہ ہے کہ ان ہر دو کی عمر رسول اکرمؐ کی رحلت کے وقت چھ، سات سال تھی، ہماری تحقیق کی رو سے تو دو، تین سے سال زائد نہ تھی ۔

۲۔ ہمارے علماء کے بموجب جنت میں سب ہی نوجوان ہونگے ۔ ان میں حضرت حسینؓ کے والد حضرت علیؓ چچا جعفر طیارؓ اور دادا ابو طالب بھی ہوں گے ۔ کیا یہ دونوں بچے ان حضرات کے بھی سردار ہوں گے ؟ ۔

۳۔ اسی طرح انبیاء علیہ السلام بھی سب نوجوان ہوں گے ۔ اس روایت کی رو سے کیا حضرات حسنین انبیاء کے بھی سردار ہوں گے ؟

۴۔ یہ مسلمہ ہے کہ ہمیشہ ایک گروہ کا صرف ایک ہی سردار ہوتا ہے ۔ یہ بات کہ حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ دونوں سردار ہوں گے محل نظر ہے ۔

۵۔ اسلام میں چونکہ شخصیت پرستی نہیں ہے اور اللہ کے نزدیک اکرام کی بنیاد تقویٰ پر ہے اور کسی شخصیت کا اعتراف اس کی خدمات کے پیش نظر ہوتا ہے اس لئے اگر کسی کو جنت کا سردار بنانا ہی تھا تو ان کو سردار بنانا چاہیے تھا جنھوں نے جنگ بدر میں حصہ لے کر ابو جہل کو قتل کیا تھا اور اس طرح تاریخ عالم کا دھارا بدل دیا تھا ۔

ترمذی نے اس روایت کو دو سندوں سے نقل کیا ہے ۔ دونوں میں یزید بن ابی زیاد الکوفی (یزید نام نہ رکھنے کا رواج فرقہ اثنا عشریہ میں بعد میں پڑا ۔) شیعہ موجود ہے ۔ یہ وہ شخص ہے جس نے عبداللہ بن مسعودؓ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ

مشرق کی جانب سے سیاہ جھنڈے ظاہر ہوں گے ان کے ساتھ امام مہدی ہوں گے۔

امام احمد فرماتے ہیں:۔

اس کی حدیث ردی ہوتی ہے۔اور سیاہ جھنڈوں والی روایت بالکل ردی ہے

ابن ابی حاتم کہتے ہیں۔ان کا حافظہ خراب تھا۔

ابو اسامہ کہتے ہیں:۔

اگر یہ پچاس قسمیں بھی کھائے گا تب بھی میں اسے سچا نہ مانوں گا۔ہمارے نزدیک حافظہ کی خرابی ایک غلط فہمی ہے۔یہ ایک ماہر تقیہ باز انسان تھا۔

اس مضمون کی ایک روایت ابن ماجہ میں ابن عمر سے مروی ہے کہ حضرات حسنینؓ نوجوانان جنت کے سردار ہوں گے اور ان کے والدان سے بہتر ہوں گے۔اس روایت کا راوی معلیٰ بن عبد الرحمن ہے۔دار قطنی کہتے ہیں وہ ضعیف ہے کذاب ہے۔

ابو حاتم کہتے ہیں متروک الحدیث ہے۔علی بن المدینی کہتے ہیں یہ احادیث وضع کرتا تھا عقیلی نے امام داود سے نقل کیا ہے کہ یحییٰ بن معین سے اس بارے میں سوال کیا گیا تو فرمایا اس کی (راوی کی) سب سے بہتر حالت تو موت کے وقت تھی جب اس سے یہ کہا گیا کہ تو اللہ سے استغفار کیوں نہیں کرتا۔تو جواب میں کہنے لگا۔

"مجھے اللہ سے مغفرت کی امید نہیں کیونکہ میں نے حضرت علیؓ کی فضلیت میں نوے (۹۰) احادیث وضع کیے ہیں۔"

قارئین خود فیصلہ کر لیں کہ ایک شخص مرتے وقت خود اقرار کر رہا ہے کہ میں نے رسول اکرمؐ کی ذات پر جھوٹ بولا ہے اور ایک دو نہیں نوے (۹۰) احادیث وضع کر کے رسول اکرمؐ کی جانب منسوب کی ہیں۔جن میں سے ایک یہ "سید الشباب اہل الجنۃ" والی کہانی ہے۔پھر بھی ہمارا مولوی ہر جمعہ کو اس کو دہرانا ضروری سمجھتا ہے۔

امام ترمذی کی ایک اور روایت ہے۔حضرت علیؓ فرماتے ہیں:۔

میں رسول اکرمؐ کے ساتھ تھا سامنے حضرت ابو بکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ آ گئے۔آپؐ نے فرمایا یہ دونوں جنت میں تمام اولین اور

آخرین میں جتنے بوڑھے ہوں گے۔سب کے سردار ہوں گے۔

بجز انبیاء و رسل کے اے علی دونوں کو مطلع نہ کرنا۔

یہ بھی خوب ہے کہ ابو بکرؓ اور عمرؓ کی ذات کا مسئلہ سامنے آیا تو انبیاء و رسل خارج کر دئے گئے اور جب حسنینؓ کا معاملہ آیا تو بات گول کر دی گئی۔

پھر ہر دو روایات سے یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ خود حضرت علیؓ جوانوں کے صف میں داخل ہوں گے یا بوڑھوں کی۔ابو بکرؓ و عمرؓ کی قیادت قبول کر لیں گے یا اپنے صاحب زادگان کی۔

"ان دونوں کو مطلع نہ کرنا"۔والی بات بھی بڑی دلچسپ ہے۔

حضرت علیؓ ہی کے پوتے حضرت زین العابدینؒ نے یہ راز زہری پر ظاہر کر دیا۔

حضرت زین العابدینؒ کو یہ راز کی بات کیسے معلوم ہو گئی کیوں کہ جس سال حضرت علیؓ کی شہادت ہوئی اسی سال حضرت زین العابدینؒ پیدا ہوئے۔

حدیثیں وضع کرنے والے نے شاید اس دنیا پر قیاس کر کے جنت میں بھی افسری و ماتحتی، سرداری و بندگی کو ضروری سمجھا۔

فتنہء وضع حدیث
نے
فتنہء انکار حدیث کو جنم دیا،

یہ بات ذہن میں رکھنے کے لائق ہے کہ حدیث کی تمام کتابیں اعتبار و صحت کے لحاظ سے ایک درجہ کی نہیں ہیں۔صحاح ستہ کے علاوہ حدیث کی جتنی کتابیں ہیں ان کے بارے میں علماء کا قول ہے کہ ان کی حدیثیں نہ تو قابل عمل ہیں نہ لائق نقل، سوائے ان لوگوں کے لئے جو علم الرجال سے واقف اور علل احادیث سے آگاہ ہیں۔

اکثر کتب میں صحیح اور حسن، ضعیف اور معروف، غریب اور شاذ، منکر اور

خطا سب احادیث بھری ہوئی ہیں۔ان کے مصنفین کا مقصد یہ رہا کہ جو کچھ پائیں جمع کردیں اور تنقید، تہذیب و تلخیص کا کام آنے والوں کے لئے چھوڑدیں۔ان کے علاوہ صحاح ستہ کے بعد وہ مصنفین ہیں جنھوں نے ایسی احادیث کو جمع کیا جو صحاح ستہ میں موجود نہ تھیں، جو اسانید میں چھپی ہوئی تھیں، ان میں سے روایتیں لے کر اکٹھا کردیا، یا جو احادیث لوگوں کی زبانوں پر جاری تھیں یا جن کو غیر محتاط واعظ بیان کرتے تھے یا بنی اسرائیل کی روایات یا صحابہ اور تابعین کی روایات تھیں' جن کو عمداً احادیث قرار دیا گیا۔چنانچہ اس قسم کی احادیث ابن حبان، کامل بن عدی' خطیب ابونعیم، ابن عساکر، دیلمی اور خوارزمی کی کتابوں میں پائی جاتی ہیں۔ان کتابوں کا یہ حال ہے کہ ان کی سب سے عمدہ اور صحیح احادیث وہ ہیں جو ضعیف ہیں اور سب سے بدتر وہ ہیں جو موضوع اور منکر ہیں۔

اس کے علاوہ وہ احادیث بھی ہیں جو صوفیا کی زبانوں پر تھیں اور جن کو صوفیا کے ذریعہ شہرت حاصل ہوگئی۔ایسی موضوع احادیث نے بھی شہرت حاصل کی جن کو بے باک لوگوں نے حدیثوں میں ملادیا اور ان کے ایسے قوی اسناد بیان کئے جن میں جرح ممکن نہیں اور ایسے بلیغ کلام میں نقل کیا جس کا صادر ہونا، رسول اکرمؐ سے بعید نہیں۔اس فریب سے اسلام میں بڑی مصیبت پیدا ہوگئی اور جھوٹے اقوال حدیثوں میں مل گئے۔

اس قسم کی احادیث جن کتابوں میں درج ہیں وہی کتابیں فرقہ اثنا عشریہ اور معتزلیوں کی ہیں۔اہل تشیع اپنے باطل عقیدوں کے اثبات اور اہل حق کو الزام دینے کے لئے ان کتابوں کی روایتیں پیش کرتے ہیں جن سے محقق بھی دھوکہ کھا جاتے ہیں۔سب سے بڑھ کر یہ ہوا کہ بعضوں نے مغالطہ دینے کے لئے حدیث کا علم حاصل کرکے احادیث معتبرہ کی روایت کرنی شروع کی مگر اسی درمیان میں اپنے عقائد باطلہ کو ان ہی اسناد سے جو انھوں نے سیکھ رکھے تھے روایت کردیا اس سے اکثر محدثین نے دھوکا کھایا۔ابن شہاب زہری، جابر جعفی اور ابوالقاسم سعد بن عبداللہ الشعری قمی ایسے ہی اشخاص میں سے تھے۔یہ ایسے پرکار تھے کہ حقیقت میں تو شیعہ تھے مگر بہت سے محدثین کو دھوکا دیا، اور غلط حدیثوں کو صحیح حدیثوں کی صورت بنا کر ان

کی صحت کا یقین دلایا یہاں تک کہ ترمذی، ابوداؤد اور نسائی نے جابر کی حدیثوں و اپنی کتابوں میں نقل کردیا۔

اسی طرح اصلح نامی ایک شیعہ نے سنیوں کی بیخ و بن اکھاڑنے کی تدبیر کی اور یحییٰ بن معین جیسے محقق نے اس پر اعتماد کیا اور تحقیق کے بعد اس کا حال کھلا تو فریب ظاہر ہوا۔لیکن چونکہ ان اشخاص کی بیان کی ہوئی احادیث حدیث کی کتابوں میں راہ پاگئیں اس لئے اکثروں کو دھوکا ہوتا ہے، اور حدیث کا نام سن کر ان کے اعتقاد میں خلل پڑتا ہے۔حقیقت یہ ہے کہ ایسی تمام موضوع روایات نہ احادیث ہیں نہ قول پیغمبر صلعم، بلکہ مغالطہ دینے والی مفتری کا لطیفہ ہیں۔اس قسم لوگوں میں ابن ابی الحدید بھی ہیں۔

روایت اور درایت کے اصولوں کو جاننے والے نیز حدیثوں کی صحت اور غلطی کے پرکھنے والے دھوکا نہیں کھاسکتے۔ایسے لوگ وضعی احادیث اور جھوٹی روایات کو آسانی سے رد کرسکتے ہیں۔محدثین نے ہر حدیث کی سند بیان کی ہے اور راویوں کے نام لکھ دیئے ہیں اس طرح ہر شخص کے لئے تنقید اور تنقیح کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔جھوٹ اور سچ میں تمیز کرنے کا ذریعہ مہیا ہے۔

جب کوئی حدیث یا روایت ہمارے سامنے آئے تو ضرور ہے کہ ہم اس بات پر نظر کریں کہ وہ حدیث از روئے اصول روایت صحیح ہے یا نہیں؟

اگر ہم کو معلوم ہو کہ اس حدیث کے بیان کرنے والوں میں سے کوئی ایک راوی بھی جھوٹا اور غیر معتبر ہے یا عقیدہ باطلہ سے اس کا تعلق ہے اور اس نے اپنے عقیدہ کی حمایت میں اس حدیث کو روایت کیا تو ہم اس کو نہ مانیں گے، اور نہ ایسی احادیث سے مخالفین اہل سنت کا استدلال کرنا جائز ہوگا۔اس لئے کہ حدیث اور روایت خبر ہے اور خبر میں صدق و کذب دونوں کا احتمال ہوتا ہے۔کذب کا احتمال دور کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کے بیان کرنے والے ثقہ' متدین اور صادق القول ہوں۔

اگر وہ خبر اتنی سندوں میں بیان کی گئی ہو کہ عادتاً ان سب کا اجماع جھوٹ پر محال ہو اور ابتداء سے انتہا تک اس کے راوی ان عیوب سے پاک ہوں جن سے

روایت میں خلل اور شبہ پیدا ہوتا ہے تو وہ خبر صحت کے اعلیٰ درجہ پر سمجھی جائے گی اور اسی قسم کی خبر کو متواتر کہتے ہیں۔ صرف اسی قسم کی احادیث مفید علم و یقین ہوتی ہیں اور ان پر اعتقاد کی بنیاد قائم ہو سکتی ہے مگر اس قسم کی احادیث بہت کم ہیں۔

کوئی حدیث اتنی سندوں اور اتنے طریقوں سے بیان نہ کی گئی ہو، مگر اس کے تمام راوی نہایت ثقہ، نہایت معتبر اور نہایت متدین ہوں کم سے کم دو طریقوں سے بیان کی گئی ہو تو اس میں بھی صدق کی جانب غلبہ ہوگا۔ ایسی خبر اصطلاح میں "مشہور" کہی جاتی ہے۔ اور ماننے کے لائق ہوگی۔

اگر کوئی خبر اتنی سندوں اور اتنے طریقوں سے جن پر متواتر یا مشہور کا اطلاق نہ ہو سکے بیان کی گئی ہو تو وہ متصل السند غیر معطل ہوگی اور اگر اس کے راوی ثقہ متدین اور معتبر ہوں تو وہ مفید علم یقین نہ ہوگی بلکہ اس سے صرف افادہ ظن ہوگا مگر اسے بھی صحیح سمجھیں گے اور اس پر عمل کرنا جائز ہوگا، لیکن اصل اعتقادات میں بوجہ اس کے کہ اعتقاد کے لئے یقین ضروری ہے۔ وہ بناءِ اعتقاد نہ ہوگی۔

اگر کوئی راوی ایسا ہو جو جھوٹا ہو، اور جان بوجھ کر جھوٹی روایت کرتا یا کثرت سے غلطی کرتا ہو یا غیر محتاط ہو یا فاسق ہو یا اہل بدعت سے ہو یا حافظہ اچھا نہ ہو تو ایسے راوی کی بیان کی ہوئی حدیث اعتماد کے قابل نہ ہوگی۔

اگر وہ ملعون، مکذب ہو تو وہ حدیث موضوع ہے۔

اگر متہم بکذب ہو تو وہ حدیث متروک ہے۔

اگر روایت میں غلطی یا غفلت کرتا ہو یا اس کا فسق ظاہر ہوا تو وہ حدیث منکر ہے اگر مبہم ہو تو اس کی حدیث غیر مقبول ہے۔ اس لئے کہ خبر کے لئے شرط قبول راوی کی عدالت ہے۔ جب اس کا نام مبہم ہو اور معلوم نہ ہو کہ کون ہے تو اس کی عدالت کیونکر معلوم ہو سکتی ہے۔ اور کیونکر اس کی خبر قبول کی جا سکتی ہے۔

اس طرح صحاح ستہ میں جتنی حدیثیں درج ہیں وہ سب صحت کے ایک درجہ پر نہیں ہیں یہاں تک کہ بخاری اور مسلم جو اصح الکتب سمجھی جاتی ہیں ان کی نسبت بھی کہا گیا ہے کہ۔

إِنَّهُ صَحِيْحٌ عَلٰى ظَنِّ مُصَنِّفِهٖ وَ غَلَبَةِ ظَنِّهٖ وَاَمَّا السَّهْوُ وَالنِّسْيَانُ فَمِنْ

لوازم طبع الانسان

ترجمہ: ۔یہ بات مصنف کے گمان اور گمان غالب کے بموجب درست ہے رہی غلطی اور بھول چوک وہ تو انسانی طبیعت کے لوازم میں سے ہے۔

اور ان کی بعض حدیثوں میں اور بعض راویوں میں کلام کیا گیا ہے۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ امام بخاری نے صرف فرمودات رسول ہی جمع کئے ہیں درآنحالیکہ بخاری نے صرف فرمودات رسول ہی نہیں بلکہ اس عہد کی تاریخ کے مطابق واقعات بیان کئے ہیں۔ حدیث کی صحیح تعریف امام بخاری کے نزدیک ان تمام امور پر حاوی ہے جن کا تعلق کسی نہ کسی حیثیت سے رسول اکرمؐ اور ان کے عہد کی تاریخ سے رہا ہو۔ چنانچہ امام بخاری نے اپنے مجموعہ کا نام "الجامع الصحیح المختصر من امور رسول اللہ وایامہ" رکھا ہے۔ جو بعد کو صحیح بخاری کے نام سے مشہور ہوا۔ اس میں جمع القرآن کی روایت بھی موجود ہے جو رسول اکرمؐ کے وصال کے بعد کا واقعہ ہے۔ ایسے ہی اور کئی واقعات اس میں شامل ہیں۔ بعض علماء نے بیان کیا ہے کہ بخاری نے چار سو تیس (۴۳۰) سے زائد ایسے آدمیوں سے روایت کی ہے جو مسلم میں نہیں ہیں اور ان میں اسی (۸۰) اشخاص ایسے ہیں جن کے ضعف کی نسبت کلام کیا گیا ہے۔

اسی طرح ۶۲۰ ایسے آدمیوں سے مسلم نے روایت کی ہے جو بخاری میں نہیں ہیں اور ان میں سے ۱۶۰ آدمی ایسے ہیں جن کے ضعیف ہونے کی نسبت گفتگو کی گئی ہے۔ ایسی حدیثیں جن میں کوئی علت پائی گئی ہے وہ صحیحین میں ۲۱۰ ہیں۔

امام نووی نے کہا کہ صحیحین کی حدیثوں پر عمل کرنے کو جو امت نے اجماع کیا ہے اس میں یہ لازم نہیں آتا کہ امت کا اس امر پر بھی اجماع ہے کہ وہ احادیث قطعی الصدور اور رسول اکرمؐ کا قطعی کلام ہے۔

بخاری و مسلم نے جہاں تک انسانی طاقت سے ہو سکتا ہے کہ صحیح حدیثوں کے جمع کرنے میں بے انتہا کوشش کی۔ اسی لئے حدیثوں کی تمام کتابوں میں ان کا درجہ اعلیٰ اور افضل قرار پایا مگر آخر وہ بھی انسان تھے۔ حضرت چاہئے اجتہاد مجتہدین اور تحقیق محققین باقی ہے۔ وضعی حدیثوں کے علاوہ اور بھی قدرتی اسباب ایسے ہیں جن کی وجہ سے روایات میں اختلاف پڑنا اور ان کی صحت میں شک ہونا ممکن ہے۔ چنانچہ علماء

حدیث نے اس کے آٹھ اسباب بیان کئے ہیں:۔

۱۔حدیث کے مطلب کی غلط فہمی،

۲۔حدیث کا مطلب صاف صاف بیان کرنے کی عدم قابلیت،

۳۔حدیث کے معنی سمجھنے میں دو راویوں کا باہم اختلاف،

۴۔راوی کے حافظہ کا قصور، یا تو اس سے حدیث کا کوئی جز چھوٹ گیا، یا دو مختلف حدیثیں باہم خلط ملط ہو گئیں۔

۵۔راوی کا کسی جز حدیث کی تفصیل از خود بیان کرنا اس غرض سے کہ سننے والا بہ آسانی اس کو سمجھ جائے لیکن سننے والے نے اس تفصیل کو بھی حدیث کا ایک حصہ سمجھا۔

۶۔راوی نے اپنی گفتگو میں رسول اکرمؐ کے چند کلمات بیان کئے اور سننے والوں نے اس کے تمام کلام کو حدیث سمجھ لیا۔

۷۔وہ اختلاف جو زبانی روایات کے سلسلہ سے خود بخود عارض ہوتا ہے۔

۸۔مختلف حالات جن میں کہ راوی نے رسول اکرمؐ کو دیکھا تھا، یا کچھ فرماتے سنا، یا کرتے دیکھا تھا۔

حدیث کے طالب علموں کو جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے ان کا اظہار بلند پایہ عالم مولانا عبیداللہ سندھی نے یوں کیا ہے:

"جس قدر میری توجہ قرآن مجید کی طرف بڑھتی گئی میرے لئے طالب علموں کو بخاری کی بعض احادیث کا سمجھانا مشکل ہوتا گیا"۔

ایک طرف مولانا عبیداللہ سندھی ماہر دین کو یہ کہنا پڑا تو دوسری طرف غیر مسلم معاندین اسلام کو موقع ملا کہ صحاح ستہ کی موضوع روایات کو سامنے رکھ کر اسلام کی فرضی تصویر پیش کریں۔ اس کی ایک تازہ مثال رام سروپ کی کتاب "احادیث کے ذریعہ اسلام فہمی" (Understanding of Islam through Hadees) " ہے۔

اگر کوئی شخص نفس حدیث ہی سے انکار کر دے کہ حدیث دین میں حجت نہیں تو وہ منکر حدیث ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر احادیث وضع نہ کی جاتیں تو انکار

حدیث کی نوبت ہی نہ آتی۔

("اعجاز القرآن و اختلاف قراءت" "موضوع اور ضعیف حدیثوں کا چلن" "فتنہ وضع حدیث اور موضوع احادیث کی پہچان اور "گلدستہ احادیث" سے اقتباس)

مشہد حسینی

مولف نزہتہ القلوب نے بیان کیا ہے کہ حضرت علی کے نجفی مشہد کی طرح حضرت حسین کا کربلائی مشہد بھی عضدالدولہ نے تعمیر کروایا تھا۔ یعنی ۳۶۹ ہجری یا اس سے چند سال بعد مشہد حسینی تعمیر ہوا۔

حادثہ کربلا (۶۱ ہجری) کے بہت بعد سے (۲۳۶ ہجری سے) یعنی عباسی خلیفہ متوکل (۲۳۲-۲۴۶ ہجری) کے ابتدائی عہد سے میدان کربلا میں زراعت ہونے لگی تھی

مولف نزہتہ القلوب نے بیان کیا ہے کہ حضرت علی کے مشہد کی طرح حضرت حسین کا کربلائی مشہد بھی عضدالدولہ نے تعمیر کروادیا تھا۔ یعنی ۳۶۹ ہجری یا اس سے چند سال بعد مشہد حسینی تعمیر ہوا۔

یہ بات ذہن نشین رہے کہ حضرت حسینؓ اور ان کے ساتھیوں اور مخالفین کے مقتولین کو بھی ایک ہی گڑھے میں دفن کیا گیا تھا۔

واقعہ کربلا کے بعد فریقین کے مقتولین کی یکجائی تعداد ۱۵۴ بتائی گئی ہے۔

ملا باقر مجلسی لکھتے ہیں:۔

"جناب سید الشہداء کے جسم کو اس مقام میں جو اب ہے دفن کیا گیا اور علی بن حسینؓ (علی اکبر) کو ان کے پائیں دفن کیا گیا اور تمام شہداء کو ان کے پائیں میں ایک ہی جگہ دفن کیا گیا"۔

اس طرح یہ گنج شہیداں سربراہ قافلہ حضرت حسینؓ کے نام سے موسوم ہو کر "تربت حسین" کہلایا۔ جب بنی بویہ کے عہد میں عمارت تعمیر کی گئی تو مشہد حسینی سے موسوم ہوا۔ بنی امیہ کے عہد خلافت کے خاتمہ ۱۳۲ھ تک یعنی نصف صدی کے

عرصہ میں وہاں کوئی نشان بھی نہ تھا۔ کیونکہ عہد صحابہ و تابعین میں پختہ قبریں بنانے کا رواج نہ تھا۔ تاریخی واقعات بھی اس کے موئید ہیں کہ اس زمانہ میں زیارت قبور کا سلسلہ شروع نہیں ہوا تھا۔

حضرت حسین کے داماد مصعب بن زبیر (برادر عبد اللہ بن زبیر) مع اہلیہ سکینہ بنت حسین عرصہ تک عراق و کوفہ میں رہے۔ کبھی زیارت کے لئے کربلا نہیں گئے اور نہ اہل خاندان میں سے کوئی شخص زیارت کے لئے گیا اور نہ ان کی نسل کے کسی فرد کی میت تعمیر مشہد سے پہلے وہاں دفن ہوئی۔ البتہ عباسی خلافت قائم ہونے کے کچھ عرصہ بعد وہاں قبریں بن گئیں۔ اور کرامتوں کی حکایتیں وضع ہونا شروع ہوئیں۔ تقریباً ایک صدی کے عرصہ میں تربت حسین کی کرامات اور اس کی زیارت کے ثواب کا مبالغہ کے ساتھ چرچا کیا گیا۔ اور وہ طرح طرح کی مشرکانہ بدعات کا مرکز بن گئی۔ بعض سیاسی قسمت آزما مثلاً عبید اللہ بن میمون القدح اور اس کا باپ یہاں معتکف ہو بیٹھے۔

ملا باقر مجلسی نے تربت حسین کی ایک مرتبہ زیارت کرنے کو رسول اکرمؐ کے نوے (۹۰) مرتبہ حج و عمرہ کے مساوی ہونے کے معنا تشریح کی ہے۔ کچھ اس قسم کی باتیں پھیلائی گئیں:

"حضرت ابراہیمؑ گھوڑے پر سوار صحرائے کربلا سے گذر رہے تھے یکایک گھوڑا سر کے بل زمین پر آرہا۔ حضرت ابراہیمؑ کا سر پتھر سے ٹکرا گیا اور خون بہنے لگا۔ استغفار کرنے پر جبرئیل نازل ہوئے اور کہا اس مقام پر نور دیدہ مصطفے و فرزند پسندیدہ علی مرتضیٰ قتل ہوں گے۔ جبرئیل نے قاتل حسین کا نام یزید ہی بتایا اور کہا کہ آسمان کے رہنے والے لوح و قلم اس پر لعنت کرتے ہیں۔ چنانچہ حضرت ابراہیمؑ نے لعنت بھیجنی شروع کی۔ ان کا گھوڑا بھی ہر لعنت پر آمین کہتا جاتا تھا"۔

اسی طرح حضرت حسینؓ کی قبر کا معاملہ سخت مشتبہ ہے۔ موجودہ قبریں قطعی فرضی ہیں۔ حضرت علی بن حسینؓ جو واقعہ کربلا کے بعد تیس سال تک زندہ رہے کبھی اپنے والد بزرگوار کی قبر کی زیارت کے لئے کربلا نہیں گئے۔ ایک تو اس وجہ سے کہ اس وقت مسلمان زیارت قبر کے لئے سفر کی ممانعت پر یقین رکھتے تھے۔ دوسرے یہ

کہ کربلا میں قبروں کا کوئی پتہ ہی نہ تھا۔

دوسری صدی ہجری کے اختتام تک وہاں کسی مزار یا زیارت گاہ کا وجود نہ تھا۔ میمون القداح نے جو اصلاً یہودی تھا۔ فرضی تربت حسین پر اعتکاف کیا۔ جاہل مسلمانوں میں کربلا کے تقدس اور تربت حسین کی کرامات و تصرفات کے فرضی قصے پھیلائے۔ یہاں کی مٹی کو خاک شفا قرار دیا اور یہیں سے اس نے خلافت عباسیہ کے خلاف سازشیں کیں۔ خلیفہ مامون الرشید کے زمانہ میں ایک قبہ تعمیر کیا گیا۔

خلیفہ متوکل علی اللہ نے ان سازشوں پر یورش کی اور ۲۴۹ ہجری میں اس مقبرہ کو منہدم اور زمین کو برابر کر دیا اور حکم دیا کہ جو شخص تین دن کے بعد یہاں پایا جائے قتل کر دیا جائے اور جس جگہ مقبرہ تھا وہاں زراعت کروائی۔ جب ۳۲۲ھ میں بنو بویہ بغداد پر قابض ہوئے تو ان میں سے معزالدولہ نے ۳۶۹ھ میں یعنی زائد از سو سال بعد مفروضہ جگہ پر مقبرہ بنوایا۔ ایسی صورت میں اسے قبہ حسین کہنا سراسر فریب ہے۔

شعبان کی پندرھویں شب کے تعلق سے ایک فرضی روایت میں کہا گیا ہے کہ زیارت امام حسین اس شب کی خصوصیت ہے۔ پیغمبران اور ملائکہ اس شب کو خدا سے رخصت لے کر حسین کی زیارت کو آتے ہیں۔ اگر ان کی قبر کا نقشہ بنا کر زیارت حسین پڑھیں تو گویا آپ نے بھی سب سے مصافحہ کر لیا۔ ان باتوں میں اشکال یہ ہیں:-

۱۔ اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ انبیاء و ملائکہ زیارت حسین کے لئے آتے ہیں۔ یہ بھی تو ممکن ہے وہ امیر ابن زیاد کے ساتھیوں کی زیارت کے لئے آتے ہوں جنھوں نے حضرت حسین کی حفاظت میں جانیں قربان کیں۔

۲۔ یہ دعویٰ کہ انبیاء کرام حضرت حسین کی زیارت کے لئے آتے ہیں تو گویا وہ تمام ارواح عالم بالا میں ہیں۔ جب کہ حضرت حسین کی روح ابھی مزار میں ہی ہے۔

فاطمی حکمران المعزالدین (۳۴۱-۳۶۵ ہجری) نے شام و حجاز پر حملے کئے پھر مصر آکر مشہور کیا کہ حسین بن علی کا سر جو کہتے ہیں کہ ۶۱ھ میں عسقلان میں دفن کیا گیا تھا اب ۳۶۴ھ میں مصر منتقل کر لیا گیا ہے۔ چنانچہ اب تک مصر میں "مسجد سیدنا حسین" اسی کی یادگار ہے

منصور حلاج

ابوالمغیث حسین بن منصور حلاج شیراز سے قریب ایک گاؤں طوس میں ۲۴۴ ہجری میں پیدا ہوئے ۔ ان کے والد روئی دھننے کا کام کرتے تھے اس لئے لقب حلاج ہوا ۔ حلاج نے سولہ برس کی عمر میں قرآن مجید حفظ کیا اور سہل بن عبداللہ تستری کے مرید ہوئے ۔ پھر ان کی اجازت بغیر حسن بصری کے مدرسہ میں پہنچے ۔ اس وقت ان کی عمر (۳۰) سال تھی ۔ بصرہ کے قیام کے زمانہ میں ان کی دوستی بنی مجاشع سے ہو گئی جو حکومت وقت کی نظروں میں کھٹکتے تھے ۔ اسی وجہ سے حلاج کو بھی اس باغی گروہ کا ہمنوا سمجھا گیا ۔ چنانچہ حلاج بصرہ چھوڑ کر بغداد میں عمرو بن عثمان مکی کے ہاں گئے اور ان کے مرید بن کر تصوف اختیار کیا ۔ اسی زمانہ میں شادی کی اور چار بچے تولد ہوئے ۔ عمرو بن عثمان مکی سے ان کے تعلقات اچھے نہ رہے اور حلاج جنید بغدادی کے پاس پہنچے اور وہاں چھ سال قیام کیا ۔ بغداد میں حلاج کے مریدوں کی تعداد زیادہ ہونے لگی تو حکومت وقت نے انھیں مشکوک نگاہوں سے دیکھا ۔ حلاج حج کے لئے روانہ ہوئے اور حج کے بعد تین سال تک مکہ میں قیام کیا ۔ مکہ سے خوزستان گئے ۔ پانچ سال مشرقی ایران میں گذارنے کے بعد تستر گئے ۔ ۲۹۱ھ میں دوبارہ حج کیا ۔ حج کے بعد ہندوستان آئے اور ملتان کے راستہ کشمیر تک گئے اور پھر بغداد پہنچے ۔

وزیر اعظم حامد بن عباس نے حلاج کے عقاید باطلہ کی وجہ خلیفہ مقتدر باللہ کو مشورہ دیا کہ حلاج کو قتل کر دیں ۔ حلاج کا عقیدہ حلول مطلق پر تھا یعنی ہر چیز میں اللہ حلول کئے ہوئے ہے ۔ جس کو بھی پوچھو وہ اللہ ہی ہے ۔ کوئی اور نہیں ۔ حلاج کا بعض اشعار کا ترجمہ یہ ہے ۔ پاک ہے وہ جس نے ناسورت کو چمکتے ہوئے لاہوت کا روشن بھید بنا کر ظاہر کیا ۔ پھر وہ اپنی مخلوقات میں کھانے پینے والے کی شکل میں آشکار ہوا ۔ یہاں تک کہ اس کو اس کی مخلوق نے اس طرح دیکھا جیسے ایک دیکھنے والا دوسرے کو دیکھتا ہے ۔" ایک اور جگہ لکھتا ہے میں نے اللہ کے دین کا انکار کیا میرے نزدیک یہ انکار واجب ہے ۔ دوسرے مسلمانوں کے نزدیک یہ بہت برا ہے ۔"

۲۹۷ھ میں حلاج کے خلاف پہلا فتویٰ ابن داؤد اصفہانی نے دیا ۔ جس کی بنا

پر اسے جیل میں رکھا گیا ۔ ۲۹۸ھ میں حلاج جیل سے فرار ہو کر سوئیں (خوزستان) گئے لیکن ۳۰۱ھ میں انھیں دوبارہ گرفتار کیا گیا اور آٹھ سال جیل میں رکھنے کے بعد رہا ہوئے ۔ ۳۰۷ھ میں حامد بن عباس کے اصرار پر پھر گرفتار ہوئے ۔ ان کے خلاف علماء کی جوراسی شہادتیں پیش کی گئیں ، اور ایک سال تک مقدمہ چلتا رہا لیکن نظریہ حلول پر ان کا اصرار رہا ۔ آخر کار خلیفہ مقتدر باللہ نے اپنے وزیر حامد بن عباس کے حوالہ کر دیا ۲۴/ ذوالقعدہ ۳۰۹ھ م ۲۷/ مارچ ۹۲۲ھ کو انھیں پھانسی دی گئی اور لاش کو جلا کر راکھ دریا میں پھینک دی گئی ۔ حلاج کے غیر اسلامی عقاید کے باوجود کوفیوں کی اکثریت نے ان کی تائید کی اور عوام میں ایسی باتیں مشہور کر دی گئیں جو خلاف عقل بھی ہیں اور دینی عقائد کے خلاف بھی ۔ تذکرہ اولیاء میں لکھا ہے کہ حلاج کے ہر عضو سے اناالحق کی آواز آتی تھی اور ان کے خون کا ہر قطرہ اللہ اور اناالحق کی شکل اختیار کر لیتا تھا ۔ تاریخ قزوینی میں ایسی مبالغہ آمیز روایات درج ہیں کہ جب منصور کو دار کی طرف لے جایا گیا تو اس نے کہا کہ جب مجھے جلایا جائے گا تو دجلہ کا پانی چڑھ جائے گا اور بغداد کے غرق ہو جانے کا خدشہ ہو گا ۔ ایسے وقت میں میری راکھ کو دجلہ میں ڈال دینا ۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا ۔ جب راکھ پانی میں پھینکی گئی تب سیلاب تھما ۔

منصور نے دعویٰ کیا تھا کہ وہ قرآن جیسی عبارت لکھ سکتا ہے ۔ ایک دفعہ شیخ ابو عمرو بن عثمان مکی نے دریافت کیا یہ کیا لکھ رہے ہو ۔ تو جواب دیا کہ قرآن کا جواب لکھ رہا ہوں ۔ چنانچہ کتاب الطواسین لکھی ۔ جس میں طاسین السراج ، طاسین الفہم ، طاسین الصفا ، طاسین النقطہ وغیرہ شامل ہیں ۔ کتاب الطواسین میں نہ تو قرآن مجید کی بلاغت ہے نہ حکمت ، البتہ وہ منصور کو پھانسی دینے کا ایک اور جواز پیش کرتی ہے ۔

(علامہ اقبال کی تصنیف " تاریخ تصوف " سے اقتباس)

منصور حلاج

حلول

حلول کے لغوی معنیٰ ہیں نزول ہونا یا اترنا۔ اصطلاح میں ذات باری کا اپنے مقام سے اتر کر کسی انسان، جانور، نباتات یا جمادات میں داخل ہونا حلول ہے اللہ تعالیٰ کے (نعوذ باللہ) اترنے یا کسی پر مسلط ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ قرآن مجید کا ارشاد ہے اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى (طه ۲۰۔۵) رحمٰن (اللہ تعالیٰ) عرش پر مستوی ہے۔

اللہ تعالیٰ ان معنوں میں حاضر و ناظر نہیں کہ وہ اپنی ذات کے لحاظ سے ہر ہر جگہ موجود ہو بلکہ وہ علم، اقتدار اور تصرف کے لحاظ سے حاضر و ناظر ہے۔

مخالفین اسلام نے جو غیر اسلامی تصورات اور عقیدے مسلمانوں میں رائج کر دیئے، ان میں حلول کا عقیدہ بھی ہے۔

اس نظریہ کی بنیاد ہے کہ اگر کوئی شخص غیر معمولی ریاضتوں کے ذریعہ نفس کی صفائی اور روح کی بالیدگی پیدا کرے یا پھر کسی کو ورثہ میں یہ چیزیں ملی ہوں تو ذات باری اس کے اندر حلول کر جاتی ہے یعنی لاہوت، ناسوت میں اور موجود، وجود میں اترتا ہے۔

یہ نظریہ اہل ہند سے لیا گیا۔ چنانچہ ہندوؤں میں رشی، منی، اور بدھ مت کے پیرو جنگلوں اور پہاڑوں میں گوشہ نشین ہو کر سخت ریاضتیں کرتے ہیں۔ عیسائیوں میں بھی یہ نظریہ پایا جاتا ہے اور قرون وسطیٰ میں عیسائیوں، راہبوں کی غیر معمولی ریاضتیں تاریخ کا جزبن چکی ہیں۔

"حلول مطلق" کا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات ساری کائنات میں حلول کئے ہوئے ہے پہلے یہ فرقہ جہنیہ کا عقیدہ تھا۔ منصور حلاج (منصور حلاج پر مضمون شامل اشاعت ہے) کے ذریعہ تصوف میں در آیا۔ یہاں تک کے بعد کے تقریباً تمام صوفیوں نے حلول کے فلسفہ کو درست اور بجا ہی نہیں بلکہ تصوف کا اصل راز گردانا

حلولِ مطلق کا عقیدہ وحدت الوجود کے عقیدہ سے بہت قریب ہے۔

مسلمانوں میں اس نظریہ کی ابتدا عبداللہ بن سبا کے پیروؤں سے ہوئی۔ ان کا عقیدہ تھا کہ اللہ تعالیٰ حضرت علیؓ کی ذات میں حلول کر آیا ہے اور حضرت علیؓ کے بعد یکے بعد دیگرے ان کی اولاد میں۔ اس طرح سب آئمہ اللہ کے اوتار ہیں۔ حضرت علیؓ کی خدائی کا عقیدہ خود ان کی زندگی میں شروع ہو گیا تھا۔ قوم زط (ہندوستان کے جاٹ کے ستر آدمی جو عبداللہ بن سبا کے پیرو تھے حضرت علیؓ کو "الٰہ" کہتے تھے۔ جب وہ حضرت علیؓ کو سمجھانے پر بھی اپنے اس عقیدہ باطل کو بدلنے تیار نہ ہوئے تو حضرت علیؓ نے ان کو آگ میں جھونک دینے کا حکم دیا۔ یہ جاٹ الوہیت علیؓ کے عقیدہ میں اتنے پختہ تھے کہ آگ میں جھونکنے پر بھی پکارتے رہے۔ لَا یعذب الا رَبُّ النَّار (آگ کا عذاب کوئی نہیں دیتا، سوائے اس کے جو آگ کا رب ہے) اس طرح اپنے آخری لمحات میں بھی علیؓ کی الوہیت کی گواہی دیتے جان دی۔

پھر حلول کا عقیدہ نصیریہ، کیسانیہ، قرامطہ اور باطنیہ سے ہوتا ہوا، صوفیاء میں داخل ہو گیا۔ اس عقیدہ کے زیر اثر ایسی روایتیں وضع کی گئی ہیں کہ معراج کے وقت رسول اکرمؐ کو پردے کے پیچھے سے حضرت علیؓ کی آواز آئی اور جو ہاتھ باہر آیا وہ حضرت علیؓ کا ہاتھ تھا اور وہ انگوٹھی بھی نظر آئی جو حضرت علیؓ پہنے تھے۔ اسی طرح کہا جاتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے کوہ طور پر جو آواز سنی تھی وہ حضرت علیؓ کی آواز تھی۔

منصور حلاج بھی اس عقیدہ کے علمبردار تھے۔ ان کا دعویٰ تھا کہ:۔
"مجھ میں اللہ حلول کر گیا ہے" اسی وجہ سے وہ "انا الحق" کا نعرہ لگاتے تھے۔ اس غیر اسلامی عقیدہ کی بناء پر ۳۰۹ ہجری میں انہیں بغداد میں قتل کر دیا گیا اور لاش کو جلا کر راکھ دریا میں بہا دی گئی۔ حلول کا عقیدہ مسلمہ طور پر قرآن کی تعلیمات کے مغائر ہے لیکن اس کے باوجود صوفیوں کی اکثریت نے منصور کے حق پر ہونے اور ان کو عبرت ناک سزائے موت دینے والوں کے باطل پر ہونے کا فیصلہ دیا۔

خارجی

حضرت عثمانؓ کی خلافت کے آخری دور میں اور ان کی شہادت کے بعد حضرت علیؓ کی تائید کرنے والے ایرانی اور عراقی مجوسی غلام تھے جو جنگوں میں گرفتار ہو کر مسلمانوں کی غلامی میں رہتے ہوئے اپنی ناکامیوں کا بدلہ لینے کے لئے اور زیادہ تر اسلام کی مخالفت میں ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت حضرت علیؓ کی پارٹی میں شریک ہو گئے تھے۔ لیکن صحابہ اور تابعین کی ایک خاصی تعداد بھی شہادت حضرت عثمانؓ کے بعد حضرت علیؓ کو رسول اکرمؐ کے قریبی رشتہ دار ہونے کی حیثیت سے اور انہیں ایک نیک آدمی سمجھ کر ان کی بیعت میں شریک ہو گئی تھی۔ یہ حضرات حضرت علیؓ کے نام سے واقف تھے پر ان کی عادات و خصائل سے بالکل واقف نہیں تھے۔ جب انہوں نے حضرت علیؓ کی فوج میں شامل ہو کر ان کو قریب سے دیکھا تو ان کا عقیدہ متزلزل ہونے لگا۔ اس طرح خارجی اصلاً حضرت علیؓ کی پارٹی کے ارا کین تھے۔

ابن جریر طبری نے لکھا ہے کہ معرکہ جمل کے بعد حضرت علیؓ نے اعلان کیا کہ بصرہ کے مقتولوں کا مال جامع مسجد کے احاطہ میں جمع کر دو تاکہ ان کے وارث اسے لے جائیں تو حضرت علیؓ کی پارٹی والوں نے کہا یہ بڑے تعجب کی بات ہے کہ ان لوگوں کا خون تو ہمارے لئے حلال ہے مگر ان کا مال حرام۔ اس پر حضرت علیؓ نے جواب دیا۔

"جو اشخاص ہمارے مقابلہ میں قتل ہوئے وہ میری جانب سے ابتدا ہونے کے باعث قتل ہوئے اس لئے ان کا مال نہیں لیا جا سکتا۔" اسی وقت سے وہ لوگ جو بعد میں خارجی ہو گئے۔ حضرت علیؓ کی اندرونی طور پر مخالفت کرنے لگے۔

علامہ مرتضیٰ جو غالی شیعہ ہیں لکھتے ہیں کہ۔

"حضرت علیؓ کی فوج میں ایسے لوگ بھی تھے جو اولاد صحابہ تھے اور حضرت علیؓ کے جانی دشمن ان کے دلوں میں خلفائے ثلاثہ کا عدل اور فضل جما ہوا تھا۔ اگر حضرت علیؓ اس وقت اظہار حق کرتے تو بہت دشواری ہو جاتی۔ اسی سبب سے عالم

خلافت میں بھی ان پر اظہار حق حرام تھا۔ اور تقیہ واجب تھا۔" (ہدایتہ الشیعہ)

قاضی نور اللہ شوستری فرماتے ہیں کہ:

حضرت علیؓ کے ساتھ قریش کے صرف پانچ ہی آدمی تھے اور ان کے تیرہ گھرانوں کے بانی سب لوگ حضرت معاویہ کے ساتھ تھے۔ اسی لئے حضرت علی کو فتح نصیب نہیں ہوئی۔ صفین کی جنگ میں حضرت علیؓ نے اعتراف کیا کہ وہ کسی مجلس شوریٰ کے انتخاب سے خلیفہ نہیں ہوئے بلکہ باغیوں کو ٹولی نے انھیں خلیفہ بنا دیا۔ جب انھوں نے قبول کر لیا۔ حضرت علیؓ نے تحکیم معاہدہ پر بہ حیثیت خلیفہ نہیں بلکہ "اہل کوفہ اور ان کے دیگر اعوان وانصار جو مومن و مسلم ہیں۔" کے سردار کی حیثیت سے کیا۔ اس سے یہ بات واضح ہو گئی کہ مجوسی ان کے اعوان اور اعراب کے مسلمان ان کے انصار ہیں۔ ظاہر ہے کے عربوں نے اس بات کا برا مانا۔ علاوہ ازیں حضرت علیؓ بار بار حضرت امیر معاویہؓ اور ان کے طرف داروں کی توہین وتذلیل کرتے۔ اور ان کے خلاف دشمنان اسلام جیسے ناشائستہ اور ناموزوں فقرے استعمال کرتے۔ اس سے بھی ان کے پر خلوص ساتھیوں کو بہت برا معلوم ہوا اور حضرت علیؓ نے عربوں کی نگاہوں میں اپنا مرتبہ خود کھو دیا۔ حکم کا فیصلہ ہوا تو حقیقت حال ظاہر ہو گئی اور ان کے ساتھی حضرت علیؓ سے کھلم کھلا بگڑ بیٹھے اور حضرت علیؓ کو "اے اللہ کے دشمن" کہہ کر خطاب کیا۔

ابن جریر طبری لکھتے ہیں کہ:

قرآن مجید کے ہوتے ہوئے انسانوں کو حکم بنانا خارجیوں کے نزدیک کفر تھا۔ وہ حضرت علی کو کافر کہتے اور کہتے کہ اے اللہ کے دشمن تو نے احکام الہیٰ میں مداہنت سے کام لیا اور حکم بنایا۔ طبری نے ابو مخنف کی روایت بیان کی کہ عراقی جنگ صفین کو جاتے ہوئے حضرت علیؓ کے دوستوں کی طرح گئے لیکن جب وہاں سے لوٹے تو دشمنی وعناد کے جذبات لے کر لوٹے۔

بلاذری کی ایک روایت کے مطابق حضرت علیؓ کے قرآن خوان اور زہد کیش ساتھیوں نے ان سے بغاوت کی۔ حضرت علیؓ ان سے لڑے اور نہروان کی جنگ میں انھیں قتل کر ڈالا۔ اس کا یہ اثر ہوا کہ ان کے لشکر والے بہت سے اہل کوفہ جن کے

ساتھی نہروان میں قتل ہوگئے حضرت علیؓ سے بگڑ بیٹھے ۔ ان کے دلوں میں ایک دوسرے سے عداوت پیدا ہوگئی اور ان کا اتحاد ختم ہوگیا ۔

غرض صلح کے معاہدے پر دستخط کر کے جب حضرت علیؓ لوٹے تو ان کی فوج انتشار کا شکار ہو چکی تھی اور پارٹیوں میں تقسیم ہو چکی تھی ایک پارٹی جو خالص عراقیوں اور ایرانیوں پر مشتمل تھی، حضرت علیؓ کو "امام" سمجھتی تھی اور خارجی حضرت علیؓ کو کافر سمجھتے تھے ۔

صفین کی جنگ کے بعد بارہ ہزار خارجیوں نے حضرت علیؓ کے ساتھ کوفہ واپس ہونے کے عوض مقام حروراء میں جا کر قیام کیا ۔ شیث بن ربعی کو اپنا سردار منتخب کر کے حضرت علیؓ کے خلاف اعلان جنگ کیا اور اعلان کیا کہ حضرت علیؓ پر فتح حاصل ہونے کے بعد اللہ کے ہاتھ پر بیعت ہوگی ۔ اللہ اور رسول کی ہدایات پر عمل ہوگا ۔ خلافت کا کام مشورہ سے طے پائے گا ۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر عمل ہوگا اللہ کے علاوہ کسی کا حکم نہیں چلے گا ۔

اس کے برخلاف شیعان علیؓ نے کوفہ پہنچ کر حضرت علیؓ کے ہاتھ پر دوبارہ بیعت کی کیونکہ ان کے خیال کے مطابق حضرت علیؓ اللہ کی طرف سے پیدائشی امام تھے، ان کے خیال میں خلافت کا قیام اجماع امت سے کوئی تعلق نہیں رکھتا ثالثوں نے حضرت علیؓ کو خلیفہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا اس لئے شیعان علیؓ نے ان کی دوبارہ بیعت کی ۔ اگر ان کی بات درست تھی تو پھر خود ان کے امام یعنی حضرت علیؓ نے معاہدہ تحکیم پر دستخط کر کے اپنے پیدائشی حق کو ثالث کے سپرد کیوں کر دیا ۔

خارجیوں کا کہنا کہ حضرت علیؓ کافر ہیں غلط ہے ۔ حضرت علیؓ جنگ بدر میں شریک تھے اور اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا کہ اہل بدر سب کے سب جنتی ہیں ۔ حضرت علیؓ حدیبیہ میں شریک رہے ۔ یہ ضرور ہے کہ وہ بیعت رضوان سے پھر گئے اور اللہ سے کئے ہوئے وعدہ کی خلاف ورزی کی ۔ اس کے باوجود اہل بدر ہونے کی وجہ سے اللہ ان کو جنت میں داخل فرمائے گا ۔

جب خارجی ناراض ہو کر علحدہ ہوگئے تو حضرت علیؓ نے خارجی لیڈروں کو خط لکھا کہ ۔ چونکہ حکم نے اپنے نفس کی خواہش کے مطابق فیصلہ کیا ہے ہم اس کو نہیں

مانتے اور اپنی سابقہ حالت پر لوٹ آتے ہیں اور اپنے اور تمہارے دشمن کے خلاف لڑنے چلتے ہیں تم ہمارا ساتھ دو ۔ خارجیوں نے جواب دیا کہ اللہ کے دین کا تو کوئی مسئلہ نہیں ہے ۔ وہ تو صرف تمہارا ذاتی معاملہ ہے تم نے حکم کا فیصلہ ماننے سے اس لئے انکار کیا کہ وہ تمہارے مفاد کے خلاف ہے ۔

شاہ ولی اللہ محدثؒ دہلوی نے لکھا ہے کہ :

حضرت علیؓ کی تمام جنگیں اپنی خلافت کے لئے تھیں نہ کہ اسلام کی بزرگی اور برتری کے لئے (ازالۃ الخفاء جلد اول) ۔

جب خارجیوں نے حضرت علیؓ کی مدد سے انکار کیا تو اپنے مجوسی مشیروں کے مشورہ پر حضرت علیؓ نے اپنے فوج کو جو امیر معاویہؓ کے خلاف جنگ کے لئے تیار کی تھی خارجیوں کے خلاف استعمال کی ۔ خارجیوں نے عبداللہ بن وہب کو اپنا امیر منتخب کیا اور بارہ ہزار لوگوں کے ساتھ نہروان کے پل پر جمع ہوگئے ۔ نہروان کی جنگ میں عبداللہ بن وہب مارے گئے اور ان کے ساتھ پانچ ہزار سے زیادہ خارجی مارے گئے جس کی وجہ سے کوفہ اور اس کے اطراف واکناف میں حضرت علیؓ کے خلاف غم وغصہ کی لہر دوڑ گئی ۔ حضرت امیر معاویہؓ کو جب خبر ہوئی تو انھوں نے حضرت علیؓ کے طرفداروں سے خط وکتابت کی ۔ انھیں عزت ومنزلت کی توقعات دلائیں تو وہ لوگ حضرت علیؓ سے ٹوٹ کر حضرت معاویہؓ کی جانب مائل ہوگئے ۔ اسی بناء پر حضرت معاویہؓ کہا کرتے تھے کہ جنگ صفین کے بعد حضرت علیؓ سے مقابلہ کے لئے نہ لشکر کی ضرورت پڑی نہ سامان جنگ کی ۔

خارجیوں کے خلاف کامیابی حاصل کرنے کے بعد حضرت علیؓ نے اپنی فوج کو حکم دیا کہ وہ شام کی طرف کوچ کرے ۔ لیکن فوج کے سپاہیوں نے بہانہ کیا کہ ان کے ہتھیار مسلمانوں کے گلے کاٹتے کاٹتے کند پڑ گئے ہیں ۔ اس لئے کوفہ واپس چلنا چاہئے تاکہ ہتھیار تبدیل کئے جا سکیں مگر جب کوفہ واپس ہوئے تو اپنے گھروں میں بیٹھ گئے ۔ حضرت معاویہؓ کے خلاف جنگ کے لئے تیار نہ ہوئے حضرت علیؓ کے بیٹے محمد کا بیان ہے کہ جنگ نہروان کے بعد انھوں نے اپنے والد بزرگوار کا علم پانچ مرتبہ بلند کیا کہ لوگ جمع ہوں لیکن ہر مرتبہ طویل انتظار کے بعد اسے اکھاڑنا پڑا ۔ کوئی

فوج میں بھرتی کے لئے خود کو پیش نہیں کرتا تھا۔ نہج البلاغہ میں حضرت علیؓ کا ایک خطبہ درج ہے جس میں فرماتے ہیں:۔ کیا یہ امر قابل تعجب نہیں کہ معاویہ اعانت اور عطا کے بغیر جفاکاروں کو دعوت دیتا ہے اور سب اس کی پیروی دل و جان سے کرتے ہیں اور میں تم کو اعانت اور عطا کے ساتھ دعوت دیتا ہوں تو تم میرے پاس سے متفرق ہوجاتے ہو اور میرے سامنے اختلافات کرتے ہو۔ ایک دوسرے خطبہ میں کہتے ہیں ۔" میں اپنے سو نافرمان سپاہیوں کا تبادلہ معاویہؓ کے دس فرماں بردار سپاہیوں سے کرنے کے لئے تیار ہوں"۔

حضرت علیؓ نے عبداللہ بن عباس کو جب وہ بصرہ کے گورنر تھے ایک خط میں لکھا:۔

" میری تو اللہ سے یہی دعا ہے کہ وہ مجھے کسی طرح ان لوگوں سے چھٹکارا دیدے اور ان سے علیحدگی کا کوئی ذریعہ پیدا کردے۔ اللہ کی قسم! اگر میری یہ آرزو نہ ہوتی کہ میں دشمن سے مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہوجاؤں تو میں یہ بات پسند کرتا کہ ان کے ساتھ ایک دن بھی نہ گذاروں۔" لیکن حضرت علیؓ کو پچھتاوا اس وقت ہوا جب کہ ان کا سرغنہ ساتھی مالک اشتر نخعی مرگیا۔ اس کی زندگی میں حضرت علیؓ کے سارے کام ان کی اجازت کے بغیر سرانجام پاتے تھے۔

خارجی شیعان علیؓ ہی سے ہیں، جنہوں نے حضرت عثمانؓ کو شہید کیا۔ پھر جنگ جمل، جنگ صفین میں حصہ لیا۔ ان افتراق پیدا کرنے والوں، خلیفہ راشد کو شہید کرنے والوں اور خارج از اسلام ہونے والوں کو خارجی کہا جانا چاہئے تھا لیکن یہ ایک ستم ظریفی ہے کہ جب وہ اپنے موقوف سے رجوع کرچکے اور حضرت علیؓ کا ساتھ چھوڑ دیا اور ان کی مخالفت کی تو ان کو خارجی کہا گیا۔

شیعوں کی کتابوں میں خوارج کو حضرت امیر کی پارٹی قرار دینے کی کوشش کی گئی ہے لیکن یہ صریحاً جھوٹ ہے۔

حضرت علیؓ کے اعوان و مددگار جو شیعان علیؓ کہلائے تحکیم تک تو ان کے عقائد میں کوئی تبدیلی عمل میں نہیں آئی۔ جو لوگ تحکیم کے موقع پر ٹوٹے وہ خوارج کہلائے۔ رفتہ رفتہ انہوں نے اپنے عقائد میں بھی تبدیلیاں کرلیں۔

ابن حزم نے لکھا ہے پوتیوں اور نواسیوں سے نکاح کرنا ان کے پاس جائز تھا صبح اور شام یہ صرف ایک رکعت نماز پڑھتے تھے۔ سورۂ یوسف کو قرآن مجید کا حصہ نہیں سمجھتے تھے۔ حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کی خلافت کے منکر تھے۔ یہ جتنے حضرت علیؓ کے مخالف تھے، اتنے ہی حضرت معاویہ کے دشمن تھے۔ بنوامیہ سے انہوں نے انیس برس تک شدید جنگ کی۔ حجاج بن یوسف نے ان کا زور توڑا۔ بنو عباس کے دور تک ان کا زور رہا پھر یہ سیاسی غارتگر جنہوں نے مسلمانوں کا بہت خوں بہایا ختم ہوگئے۔

رسول اکرم سے نکاح کے وقت حضرت خدیجہؓ کی عمر

سیدہ خدیجہ کا نکاح پہلے عتیق سے ہوا تھا۔ عتیق ہی کی کنیت ابوہالہ تھی، یہ دو علحدہ شخص نہ تھے۔ ان کے بچوں کا نام ہند اور ہالہ تھے۔ پھر عتیق کا انتقال ہوگیا، چھوٹے بچوں کی وجہ سے سیدہ خدیجہ نے نکاح سے پرہیز کیا۔ اکثر شرفائے مکہ نکاح کے خواہاں تھے۔ مگر سیدہ خدیجہ ان سے مطمئن نہ تھیں۔ اس وقت وہ پچیس یا چھبیس سال کی تھیں، اگر چالیس سال ہوتیں جیسا کہ عام طور پر بیان کیا جاتا ہے تو شرفائے مکہ اتنے خواہاں نہ ہوتے۔ اس اثنا میں ابو طالب نے رسول اکرمؐ کو اپنی بیٹی دینے سے انکار کردیا تو رسول اکرمؐ کو اس کا رنج ہوا۔ دوستوں نے مشورہ دیا کہ خدیجہ سے نکاح کرلو۔

سیدہ خدیجہ جانتی تھیں کہ رسول اکرمؐ امین ہیں غریبوں یتیموں کا درد رکھتے ہیں۔ ان سے اور ان کے یتیم بچوں سے محبت کرسکتے ہیں۔ اس لئے راضی ہوگئیں اور نکاح ہوگیا۔ رسول اکرمؐ کی عمر اس وقت ۲۳، ۲۴ سال تھی۔ سیدہ خدیجہ آپ سے چار پانچ سال بڑی تھیں۔ یعنی ۲۷، ۲۸ سال کی تھیں ابن حبیب کی روایت کے بموجب جب

رسول اکرمؐ سے شادی کے وقت حضرت خدیجہؓ کی عمر ۲۸ سال تھی (کتاب الحبر) جسے دشمنانِ اسلام نے پندرہ سال کا فرق بنادیا۔ انہوں نے خاص مقاصد سے ایسا کیا، اور رنگ آمیزی کی مگر اس کا بطلان اس حقیقت سے ہوجاتا ہے کہ چالیس سال کے بعد کسی عورت کے سات آٹھ بچے نہیں ہوسکتے۔

سیدہ خدیجہ کی شادی شدہ زندگی ۲۷ سال ہوئی۔ پہلے سترہ سال میں ۷ یا ۸ بچے ہوئے، یعنی ۴۳ سال کی عمر تک بچے ہوئے نہ کہ ۵۵ سال تک ہوتے رہے، جیسا کہ مجوسیوں نے لکھا ہے۔

سیدہ خدیجہ کے بطن سے سب بچے بعثت نبوی سے پہلے ہوئے اور سب دو دو سال کے وقفہ سے ہوئے۔ اس کی تفصیل ذیل میں درج ہے:۔

سال قبل ہجرت	نام	حالات
۲۹	قاسم	ان کی کی وفات پر سورہ کوثر نازل ہوا.
۲۷	زینب	ان کے شوہر خالہ زاد بھائی ابوالعاص اموی تھے۔ ان کے بیٹے علی اور بیٹی امامہ تھیں۔
۲۵	طاہر	
۲۳	رقیہ	
۲۱	طیب	
۱۹	فاطمہ	حضرت فاطمہ حضرت عائشہ سے دو سال بڑی تھیں۔
۱۷	ام کلثوم	گیارہ ہجری میں تیس سال کی عمر میں انتقال ہوا۔
۱۵	عبداللہ	ایک روایت کی رو سے طیب و طاہر دونوں لقب ان ہی کے تھے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مجوسیوں نے کس مقصد سے شادی کے وقت سیدہ خدیجہ کی عمر ۴۰ سال ہونا بیان کیا۔

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مقصد یہ ثابت کرنا تھا کہ سیدہ خدیجہ سے رسول اکرم کو صرف ایک دختر حضرت فاطمہ پیدا ہوئیں اور دوسری بیٹیاں سابق شوہر سے ہوئیں اس لئے انہوں نے شادی کے وقت ان کی عمر ۴۰ سال بتائی۔ اور اس

جھوٹ کو اتنا دہرایا گیا کہ عوام نے اس کو سچ سمجھ لیا۔ اس مقصد کے تحت آپ کے پہلے شوہر کے نام اور ان کی کنیت کو دو شخص قرار دے کر دوسرا جھوٹ یہ گھڑا کہ آپ کے سابقہ شوہر علی الترتیب عتیق اور ابوہالہ تھے۔

حضرت علی کے والد کا نام عبدالمناف تھا۔ مگر چونکہ مناف بت کا نام تھا، تو مسلمانوں نے انہیں ابو طالب کہنا شروع کیا یعنی طالب کے ابا۔ لوگ طالب کو بھول گئے اور ابو طالب کو یاد رکھا۔ طالب جنگ بدر میں مسلمانوں کے خلاف لڑنے آئے اور مارے گئے۔ حضرت علی کے والد کے دو ناموں سے یہ شک نہیں ہوتا کہ یہ دو شخص تھے۔ مگر حضرت خدیجہؓ کے سابق شوہر کے دو نام ہونے سے لوگوں نے یقین کر لیا کہ رسول اکرم سے شادی سے پہلے ان کے دو شوہر رہ چکے تھے۔ کسی نے یہ غور نہ کیا کہ جس عورت کے بطن سے ۴۰ سال تک دو بچے ہوئے وہ چالیس سے ۵۶ سال کی عمر تک آٹھ بچوں کی ماں کیسے بنی۔

مجوسیوں نے محض ابو طالب کی اہمیت بڑھانے کے لئے یہ لکھا ہے:۔

خدیجہ بنت خویلد عرب کے مشہور تاجرہ تھیں۔ ابو طالب نے محمدؐ کو مال تجارت دلوایا تھا۔ دوسری روایت میں لکھا ہے کہ ابو طالب نے نہیں بلکہ حضرت حمزہ نے یہ شادی کروائی۔ اسی طرح روایتوں میں جو کہا گیا ہے کہ خدیجہ بڑی مالدار اور دولت مند خاتون تھیں درست نہیں، ان کے والد کوئی بڑے تاجر نہ تھے اور ان کی سات اولادیں تھیں۔ جن میں سے ایک خدیجہ تھیں۔ خدیجہ کے مرحوم شوہر عتیق بھی کوئی بڑے تاجر نہ تھے۔ یہ سب روایتیں گھڑی ہوئی ہیں۔ یہ بھی درست نہیں کہ رسول اکرمؐ خدیجہ کے کاروبار میں مستاجر (سیلز مین) تھے۔

("ابدی پیغام کے آخری پیغمبر" سے ماخوذ)

خطبات جمعہ

جمعہ جامع جماعات ہے

صلوۃ پنج وقتہ کے لئے محلہ کی مساجد ہیں جو محدود حلقہ میں اشاعت دین، ڈسپلن اجتماعی شعور اور بے شمار ثقافتی منافع کا باعث ہوتی ہیں۔ شہروں اور بڑی آبادیوں میں اشاعت دین اور متذکرہ امور کو نسبتاً بڑے پیمانے پر انجام دینے کے لئے شریعت نے جامعہ مسجدوں کا نظام قائم کیا ہے اور اس کے لئے ہفتہ واری اجتماع جمعہ کے دن مقرر کیا ہے شریعت نے اقامت جمعہ کا اہتمام اس لئے کیا ہے کہ ہفتہ میں ایک دن بڑی جماعت جس میں سارے شہر کے مسلمان (اور اگر شہر بہت بڑا ہو تو شہر کے ایک حصہ کے مسلمان) شریک ہو کر شعائر دین کا عظیم الشان مظاہرہ کریں اور سب مسلمان دینی اور دنیوی فوائد حاصل کریں۔

اس عظیم مقصد کو پیش نظر رکھا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ صلوۃ جمعہ جامع مسجد ہی میں ادا کی جائے۔ عام مسجدوں میں صلوۃ جمعہ ادا نہ ہونی چاہیئے۔ اکثر علما کا قول بھی اس کی تائید میں ہے کہ تعدد جمعہ نہ ہونا چاہیئے۔

شریعت نے ایک ناحیہ میں ایک ہی مقام پر صلوٰۃ جمعہ ادا کرنے کا حکم دیا ہے۔
ناحیہ آج کل کی اصطلاح میں گرداوری حلقہ (Revenue Circle) کو کہہ سکتے ہیں

(رسالہ "جمعہ جامع جماعات ہے" سے اقتباس)

ابلاغ عامہ کی اہمیت سے ہر شخص واقف ہے۔ ایک معمولی جلسہ کے انعقاد کے لئے منتظمین کو حسب ذیل امور کا انتظام کرنا پڑتا ہے۔

(۱) موزوں جگہ کا انتخاب اور اس کا مناسب اعلان،

(۲) تاریخ اور وقت کا تعین اور اس کا اعلان،

(۳) متوقع شرکاء کا انتخاب اور ان کو فرداً فرداً اطلاع دینا،

(۴) مقرر کا انتخاب اور اس کو پابند کرنا کہ وقت پر تشریف لائے۔

(۵) موضوع کا انتخاب،

مسلمانوں پر اللہ تعالیٰ کا بڑا فضل ہے کہ صلوۃ جمعہ کے ذریعہ ایک ایسا خود کار نظم قائم کر دیا گیا ہے جس میں وقت مقررہ اور مقام مقررہ پر تمام مسلمان جمع ہو جاتے ہیں اور خطیب بھی موجود رہتا ہے منبر رسول سے ایک شہر یا ایک ناحیہ کے مسلمانوں کو مخاطب کر سکتا ہے۔ اب مسلمانوں کے لئے صرف ایک کام باقی رہ جاتا ہے کہ وہ ایسے موضوع یا موضوعات کا انتخاب کریں جو ان کی فلاح دارین کا باعث ہو۔

افسوس ہے کہ آج کل کے خطبات بنے بنائے اور عربی زبان میں ہوتے ہیں جن سے بیشتر مسلمان اور بعض دفعہ تو خود خطیب بھی ناواقف ہوتے ہیں۔

خطبات جمعہ

جمعہ کا اجتماع اور خطبہ کے حکم کا مقصد یہ تھا کہ ہفتہ میں ایک بار مسلمانوں کو ان کے مسائل اور ضرورت کے مطابق ہدایات دی جائیں اور یہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا بھی ایک اہم ذریعہ تھا۔ خطبہ دراصل ایک وعظ تھا اور رسول اکرمؐ کے بعد خلفائے راشدین اور صحابہ کا یہی عمل رہا۔ اس کے بعد جو عربی حکومتیں قائم ہوئیں ان میں بھی خلفائے اور سلاطین کو مساجد کے منبروں پر خطبہ دیتے ہوئے تاریخ میں دیکھا جا سکتا ہے۔ اب خطبہ کے معنی یہ رہ گئے ہیں کہ عربی زبان میں چھپے ہوئے خطبات میں سے ایک خطبہ پڑھکر سنا دیا جائے۔ اگر سنجیدگی سے غور کیا جائے تو یہ طریقہ عمل دراصل اعمال دینیہ کے ساتھ کھلا مذاق ہے۔

خطبات جمعہ میں ابلاغ عامہ کا ایک خاص پہلو سامنے آتا ہے۔ مقررہ دن، مقررہ وقت اور مقررہ جگہ پر سب مسلمان جوق در جوق جمع ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح تمام دنیا کے مسلمان اپنے اپنے شہروں کی جامع مسجد میں جمع ہو جاتے ہیں خلیفہ وقت یا ان کے مقرر کئے ہوئے خطیب جو باتیں کرتے ہیں ان سے تمام دنیا کے مسلمان ایک ہی وقت میں واقف ہو جاتے ہیں۔ اس عظیم پلیٹ فارم (منبر رسولؐ) سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ اس کو ایک رسمی چیز بنا دینا بڑی بدبختی ہے۔

مسجدوں میں ایسے خطیب ہونے چاہیئے جن کو یہ قابلیت حاصل ہو کہ زبانی وعظ کہہ سکیں اور جمعہ کے خطبہ کے لئے تیار ہو کر آئیں ۔ خطبہ کی عبارت یا تقریر موثر ہونی چاہیئے ۔ قوم کی موجودہ حالت خطیب کے پیش نظر ہو ۔ وہ آج کے مسائل سے واقف ہوں اور ان کا حل پیش کریں نہ کہ ان مسائل کا جو آج سے پانچ سو برس پہلے درپیش تھے ۔

جو خطبات عربی زبان میں آج کل رائج ہیں وہ تو اس وقت کے لئے بھی موزوں نہ تھے جس وقت کے لئے لکھے گئے تھے ۔ پھر آج کی حالت کا کیا ذکر ۔ شریعت نے کیسی عمدہ مصلحت رکھی ہے کہ جمعہ کے خطبہ کو فرض صلوٰۃ کا قائم مقام قرار دیا ۔ اور اس کی سماعت کو فرض بتلایا ۔

رسول اکرمؐ صلوۃ جمعہ کی امامت خود فرماتے اور خطبہ ارشاد فرماتے ۔ آپ کے بعض خطبے متعدد کتب میں نقل ہیں ۔ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ خطبہ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء سے شروع کرتے اور مسلمانوں کو موقتی مسائل کے متعلق ہدایات دیتے ۔ یہ خطبے فی البدیہہ ہوتے ۔

بعد کے زمانہ میں بھی خلیفہء وقت اپنے مرکز اور مستقر خلافت میں بذات خود امامت کرتے اور فی البدیہہ خطبے دیتے ۔ اسی طرح صوبوں میں بھی ان کے نائب اور گورنر یہ فرائض انجام دیتے خلفائے اربعہ کے زمانہ تک حمد و ثناء کے سوا خطبوں میں کسی کا نام نہ لیا جاتا تھا اور نہ اللہ اور رسول کے سوا کسی کی حمد و ثنا کی جاتی ۔

مورخ ابن خلدون کہتے ہیں :۔ حضرت عبداللہ بن عباس (جو حضرت علیؓ کی جانب سے بصرہ کے عامل تھے) پہلے شخص تھے جنہوں نے خلیفہء وقت حضرتؓ علی کے لئے بر سر منبر دعائے خیر کی تھی ۔ کہ "یا اللہ علی کی امر حق پر مدد کیجئے ۔" اس کے بعد سے یہ رواج چل پڑا کہ خطبوں میں خلیفہء وقت کے لئے دعا کی جاتی تھی ۔ حضرت ابن عباس علوی پارٹی کے ممتاز رکن تھے اس زمانہ میں علوی پارٹی خانہ جنگیوں میں مبتلا تھی ۔ اپنے قائد اور چچازاد بھائی کے لئے دعائے خیر کرنا قدرتی بات تھی کوئی امر شرعی نہ تھا ۔ کیونکہ اس وقت کے سب جھگڑے سیاسی اقتدار کے سلسلہ کے تھے ۔ حضرت ابن عباسؓ نے امر حق پر مدد کی دعا مانگی تھی ۔ مدح و ثنا نہیں کی تھی حضرت علیؓ کی

خلافت کے زمانہ میں جو افسوسناک اختلافات پیدا ہوئے ان کے نتیجہ میں روافض اور خوارج دو سیاسی پارٹیاں بن گئیں جنہوں نے بعد میں مذہبی رنگ اختیار کر لیا ۔ روافض حضرات ابو بکرؓ، عمرؓ اور عثمانؓ تینوں بزرگوں کی بدگوئی کرتے تھے اور خوارج حضرت عثمانؓ، علیؓ، معاویہؓ اور عمرو بن العاص کی ۔ ان جلیل القدر صحابہ کی بدگوئی کرنا موجوب فساد تھا ۔ اس لئے جمعہ کے خطبوں میں ان کا نام بنام ذکر کر کے ان کے لئے رضائے الہیٰ کی دعا کرنا سب و شتم کے سدباب کی غرض سے اختیار کیا گیا اور مصلحت دینی کے اعتبار سے اس کو مستحب قرار دیا گیا تھا اور نہ بقول شیخ الاسلام ابن تیمیہ اہل سنت کے نزدیک خطبوں میں ان بزرگوں کا ذکر ضروری نہیں ۔

خطبوں میں نام لینے کی ابتداء اموی خلافت کے زمانہ سے اس طرح ہوئی کہ تین خلفا حضرات ابو بکرؓ، عمرؓ اور عثمانؓ کے ساتھ چوتھے خلیفہ کے طور پر حضرت معاویہ کا ذکر خطبوں میں ہوتا تھا مگر حضرت علی کا نام شامل نہیں کیا جاتا تھا ۔ کیونکہ ان لوگوں کے نزدیک حضرت علیؓ کی خلافت مکمل نہیں ہوئی تھی ۔ اسی طرح اندلس وغیرہ میں بھی یہی عمل تھا ۔ ان کا کہنا تھا کہ پہلے تینوں خلفاء اور حضرت معاویہؓ کی خلافتوں پر مسلمان متفق و متحد تھے اور ان کے زمانوں میں تلوار کفار کے مقابلہ میں نیام سے باہر اور مسلمانوں کے خلاف نیام میں رہی ۔ اس کے برخلاف علیؓ کی خلافت کی حد تک ان کی بیعت پر تمام مسلمان متفق نہ ہوئے اور ان کی کل مدت خلافت میں فتنہ برپا رہا اور اس عرصہ میں کفار کے مقابلہ میں تلوار تو نیام میں رہی اور مسلمانوں کے خلاف نیام کے باہر ہی رہی ۔ حضرت علیؓ کا نام خطبوں میں شامل نہ کرنے کے علاوہ ان کی بدگوئی بھی کی جانے لگی تھی اور اکثر بنی امیہ حضرت عثمانؓ کے معاملہ میں حضرت علیؓ کو مورد الزام قرار دیتے تھے ۔

خلیفہ عمر بن عبدالعزیزؒ نے اس رسم کو اپنے زمانہ خلافت میں ختم کر دیا تھا ۔ مگر ان کا زمانہ خلافت تقریباً ڈھائی برس رہا ۔ اس لئے یہ رسم ترک نہ ہوئی ۔ جب خلافت بنی امیہ کا خاتمہ ہو کر عباسی خلافت قائم ہوئی تو حضرت علی کا ذکر خلفائے راشدین کے زمرہ میں ہونے لگا ۔ حضرت معاویہؓ کا نام ترک کر کے حضرت علیؓ کا نام خطبوں میں شامل کیا گیا ۔ حضرت حمزہؓ اور حضرت عباسؓ پر تو سب و شتم کا رواج کبھی

نہیں ہوا تھا لیکن عباسی خلفاء کے مورث اعلیٰ ہونے کی وجہ سے حضرت عباسؓ کا اور حضرت عباسؓ کے بھائی حضرت حمزہؓ کا ذکر خطبوں میں شامل کیا گیا۔

چوتھی صدی ہجری میں عباسی خلافت جب کمزور ہو گئی تو عبیدیوں کے ارمنی قائد جوہر نے مصر کے عباسی عامل کو شکست دے کر اپنا تسلط قائم کیا اور عبیدیوں کا خطبہ رائج کیا۔

سلطان صلاح الدین ایوبی کے زمانہ سے پھر خطبہ عباسیہ مصر میں رائج ہوا۔

شیعہ امیرالامراء بنی بویہ نے اپنے اپنے وقت میں اپنے عقیدہ کے مطابق خطبے تیار کروا کر شیعہ خطیب مقرر کئے تھے جو خطبوں میں صرف حضرت علیؓ اور ائمہ شیعہ کا ہی ذکر کرتے۔ خطیبوں کو حکم دیا گیا کہ خطبوں میں درود حضرت محمدؐ و علیؓ و فاطمہؓ، حسنؓ حسینؓ پر پڑھیں۔ بنی بویہ کے بعد اس بدعت کا خاتمہ ہوا۔ امیرالمومنین القادر باللہ (۳۸۱ - ۴۲۲ ہجری) نے جو دیندار خلیفہ تھے علماء کا اجتماع کیا۔ فضائل شیخین بیان کئے شیعہ خطیبوں کو معزول کر کے سُنّی خطیب مقرر کئے۔

ابتدائی دو ڈھائی صدیوں تک عالم اسلامی میں لکھے ہوئے خطبے پڑھنے کا رواج نہیں تھا بنی امیہ کی خلافت میں اور بنی عباس کے ابتدائی دور میں خلیفہ وقت خود امامت کرتے اور برجستہ خطبہ دیتے۔ العقد الفرید میں خلفائے عباسی کے متعدد خطبات جمعہ درج ہیں۔

بعد میں خلافت کی جانب سے فصیح البیان عالم بطور خطیب مقرر کئے جاتے جن کو یہ قابلیت حاصل ہوتی کہ وہ فی البدیہہ خطبہ دے سکیں۔ رفتہ رفتہ لوگ خطبہ کا مضمون تصنیف کرنے لگے قدیم ترین شخص جن کا ذکر خطبات کی مصنف کی حیثیت سے ملتا ہے ابی یحییٰ عبدالرحیم بن محمد بن اسماعیل بن نباتہ (وفات ۳۷۴ ہجری) تھے۔ یہ نسباً بنی امیہ سے تھے۔ مشہور شیعہ برادران شریف الرضی و شریف المرتضیٰ دونوں ان کے شاگرد رہ چکے تھے۔ آخر زمانہ میں علاقہ حلب میں قیام رہا۔ جہاں بنو حمدان کی حکومت تھی جو رافضی تھے۔ ابن نباتہ سیف الدولہ بن حمدان کے متوسلین میں شامل ہوئے۔ بارہ مہینوں کے خطبہ جمعہ تصنیف کئے۔ خطبہ ثانی میں حسنین اور ان کی والدہ کے ذکر کی ابتداء کی۔ ان کے خطبات ملک شام کے علاوہ حجاز میں بھی رائج

ہوئے۔

ابن بطوطہ نے سفر مکہ کے حالات میں لکھا ہے کہ:

خطیب صلوٰۃ جمعہ کے لئے سیاہ عمامہ اور سیاہ لباس پہن کر آتے۔ دو موذن ان کے ساتھ ہوتے اور سیاہ جھنڈے لئے ہر دو جانب کھڑے رہتے۔ خطیب خطبہ جمعہ میں رسول اکرمؐ پر درود پڑھتے جس میں آل محمدؐ کا شمول ہوتا۔ پھر چاروں خلفا کے اور صحابہ کرامؓ کے اور رسول اکرمؐ کے دونوں چچا دو نواسوں اور ایک صاحبزادی فاطمہ اور ان کے والدہ حضرت خدیجہؓ کے نام لیتے اور رضائے الٰہی کی دعا کرتے۔ ان بزرگوں کے ناموں کے ساتھ مبالغہ آمیز مدح سرائی کا تصور اس زمانہ کے لوگوں کو نہ تھا۔

ہندوستان میں فرنگی محل لکھنؤ کے مولانا عبدالحی نے خطبات جمعہ تیار کئے۔ جن میں واقعہ کربلا کو شامل کر دیا گیا ہے۔ مولانا موصوف کے علاوہ اور بہت سے علماء نے خطبے تصنیف کئے اور خطبہ ثانی میں مناقب کی بیشتر وضعی حدیثوں کے الفاظ بیان ہوئے۔

مولانا اشرف علی تھانوی کے بارہ مہینوں کے خطبوں میں حضرات حسنینؓ اور ان کی والدہ کی سرداری اہل الجنۃ کی حدیثیں اور حضرت عباسؓ اور ان کی اولاد کی دعائے مغفرت ترمذی کے حوالے سے نقل کر دی گئی ہیں۔ اشخاص بنی ہاشم کے مدح میں سب سے معتدل یہی خطبات ہیں۔ لیکن مناقب کی حدیثوں کو انہوں نے بلاکم و کاست لے لیا۔

تفضیلی خطبہ ثانی میں خلفائے راشدین کے علاوہ رسول اکرمؐ کے چچاؤں کا ذکر کرتے ہیں۔ رسول اکرم کی ایک صاحبزادی کا ذکر سیدۃ النساء کہہ کر ان الفاظ سے کیا جاتا ہے۔ کہ صلوٰۃ اللہ اور سلام ہو ان کے پدر پر خود ان کے شوہر پر اور ان کے دو بیٹوں پر۔ حضرت فاطمہؓ کا نام تو نہیں لیا جاتا لیکن دو مرتبہ شیعوں کا وضع کردہ لقب البتول لیا جاتا ہے۔ خطبات جمعہ ہوں یا عیدین ان میں رسول اکرمؐ کی چار صاحبزادیوں میں سے صرف تیسری صاحبزادی حضرت فاطمہ کا نام لیا جاتا ہے۔ دیگر تین صاحبزادیوں حضرت زینبؓ، حضرت رقیہؓ اور حضرت ام کلثومؓ کا نام نہیں لیا جاتا۔ اول تو یہ کہ خواہ ایک کا ہو یا چار کا خطبات میں صاحبزادیوں کا ذکر کرنا غیر ضروری

ہے ۔ اگر دین کی خاطر انہوں نے جو صعوبتیں برداشت کیں اس کا بیان مطلوب ہو تو اور بات ہے ۔ یا بطور عقیدت نام لینا ہی ہو تو چاروں کا نام لینا چاہئے ۔ اس کے برخلاف ایک ہی صاحبزادی کا نام لیا جاتا ہے ۔ قطع نظر اس کے کہ یہ تخصیص نا مناسب ہے اس سے مسلمانوں میں بھی یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ رسول اکرم کی صرف ایک ہی صاحبزادی تھیں ایک زمانہ میں سیاسی اسباب کی بنا پر بعض فرقے مثلاً خارجی وغیرہ حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ کو عقیدت کی نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے۔

جب بنی بویہ کو اقتدار حاصل ہوا جو غالی شیعہ تھے تو انہوں نے رد عمل کے طور پر خصوصیت کے ساتھ حضرت فاطمہؓ کا نام خطبات میں شامل کیا۔

تین صاحبزادیوں کے ذکر کو شامل نہ کرنے کی ایک وجہ یہ تھی کہ یہ تینوں بنی امیہ میں بیاہی گئی تھیں ۔ اور اہل باطل کو بنی امیہ سے بیر تھا۔ حضرت فاطمہؓ کی نام کی شمولیت سے مسلمانوں کو اعتراض نہ تھا اس لئے انہوں نے ان خطبات کو قبول کر لیا۔

اب جب کہ حالات بدل چکے ہیں بعض گوشوں سے رسول اکرمؐ کی تین صاحبزادیوں کو مبارک نسل نبوی سے خارج قرار دیا جا رہا ہے ، اور بڑے تحقیر آمیز کلمات کے ساتھ ان مقدس ہستیوں کا ذکر "روایتی بیٹیوں" اور رولی بیٹیوں" کے عنوانات سے کیا جا رہا ہے تو یہ ضروری ہو گیا ہے کہ رسول اکرمؐ کی چاروں صاحبزادیوں کا ذکر خطبات میں کیا جائے ورنہ حق بات تو یہ ہے کہ خطبات میں صاحب زادیوں کا ذکر دینی ضرورت نہیں ۔ حضرت فاطمہؓ کے دونوں صاحب زادوں کے ذکر میں الفاظ دوسروں کی اتباع میں کہے جاتے ہیں ۔ ان خطبات میں حضرت علیؓ کی قرابت کا اظہار رسولؐ کے بھائی اور بتول کے شوہر کے الفاظ سے کیا جاتا ہے مگر حضرت عثمانؓ کی ایسی ہی قرابت کا اظہار نہیں ہوتا اور ان کے دوہرے داماد ہونے کا ذکر بھی اکثر نہیں کیا جاتا ۔ حضرت ابو بکرؓ، عمرؓ کے رشتوں کا بھی ذکر نہیں کیا جاتا ۔ آپ کے بڑے نواسہ حضرت علی بن ابو العاص کا ذکر نہیں کیا جاتا جو رومیوں کے خلاف جہاد میں شہید ہوئے ۔ خود ہاشمی بزرگوں میں حضرت جعفر طیار کا نام نہیں لیا جاتا ۔ یعنی جو نام بھی ان خطبات میں لئے جاتے ہیں وہ خدمات کی بنیاد پر نہیں لئے

جاتے ۔ صرف سیاسی مصالح کی بناء پر جس بات کی ابتدا کی گئی اس کا سلسلہ آج تک جاری ہے ۔ ہاشمیوں کے نسلی و خاندانی امتیازات کے ذکر کا جو سلسلہ عباسی عہد خلافت میں شروع ہوا وہ آج تک جاری ہے حالانکہ جن سیاسی اغراض کی بناء پر یہ سلسلہ شروع ہوا تھا وہ خواب و خیال ہو گئیں ۔ تقلید جامد کے پرستار خطیبوں نے وضعی حدیثوں اور من گھڑت روایتوں کے بیان سے اب تک چھٹکارا حاصل نہیں کیا ۔ تفضیلیہ خطبہ میں انتہائی غلو سے وہ القاب حضرت علیؓ کے ذکر میں بیان کئے جاتے ہیں جو کسی طرح بھی حضرت علیؓ کے حالات و واقعات سے مطابق نہیں رکھتے ۔ بلکہ دیو مالائی قسم کے مہملات ہیں ۔ تفضیلی خطبات میں حسنین کو امامین ہمامین کہا جاتا ہے ۔ (حضرت حسنؓ صرف مختصر ملت تک خلیفہ رہے) امامین ہمامین کہنا حقیقت کے بھی خلاف ہے اور عقل ، نقل و لغت کے اعتبار سے بھی مہمل ہے ۔ وہ ایسا تو دوسروں کی اتباع میں کہتے ہیں جس سے عقیدہ ختم نبوت پر ضرب پڑتی ہے کیونکہ اہل باطل کے نزدیک امام کا درجہ نبی سے بلند تر ہے ۔

("تحقیق سید و سادات" سے اقتباس)

خلیفہ منصور کا مکتوب

نفس ذکیہ کے نام

دوسرے عباسی خلیفہ ابو جعفر منصور (۱۳۶-۱۵۸ ہجری) اور محمد الارقط بن علی بن عبد اللہ المحض کی باہمی مراسلت کی شکل میں ایک تاریخی دستاویز ملتی ہے جس سے شیعیت اور اس کے خود ساختہ عقائد کا پول کھلتا ہے ۔

محمد الارقط نفس ذکیہ کہلاتے ہیں ۔ حضرت حسن کی اولاد میں سب سے پہلے انہوں نے خروج کیا اور اولاد علی میں سب سے پہلے انہوں نے مہدی ہونے بلکہ بقول روافض نبی ہونے کا دعویٰ کیا ۔ محمد الارقط زبان کے ہلکے تھے مگر سیاسی چالیں خوب جانتے تھے ۔ ان کے والد عبد اللہ المحض سیاسی اقتدار کے بڑے حریص تھے ۔ جب عباسی

تحریک کے ایک داعی کے قاصد نے امام ابراہیم عباسی کو اطلاع دی کہ خراسان میں آپ کی بیعت لی گئی ہے اور لشکر فراہم ہوگئے ہیں تو عبداللہ المحض نے حسد کی وجہ سے اموی خلیفہ کو اطلاع دیدی اور ساتھ ہی یہ بھی لکھا کہ میں کارروائی سے بری الزمہ ہوں ۔ اس مخبری کی وجہ سے عباسی امام اور ان کے رشتہ دار گرفتار کر لئے گئے ۔ عبداللہ المحض کو اس مخبری کے صلہ میں اموی خلیفہ نے دس ہزار دینار عطا کئے ۔

عباسی دعوت محمدالارقط کی پیدائش سے پہلے شروع ہو چکی تھی ۔ خلافت عباسیہ کے قیام کے بعد جب وہ ابوالعباس السفاح سے ملے تو سفاح نے امیوں کے ہاں عباسیوں کے خلاف مخبری کے باوجود انہیں گراں بہا عطیات دیئے اور فیاضانہ سلوک کیا۔

نفس ذکیہ اور ابوجعفر منصور کی مراسلت سے یہ شرمناک بات ثابت ہوتی ہے کہ دوسری صدی ہجری ہی میں مسلمان دشمنان اسلام کی سازشوں کا بری طرح شکار ہو چکے تھے ۔ حکومت الہیٰ کا تصور ذہنوں سے اوجھل ہو چکا تھا ۔ علوی اور عباسی خانوادوں نے (اور ان کے عجمی حواریوں نے جو اسلام دشمن بھی تھے اور مفاد پرست بھی) پہلے تو مل کر خلافت کو رسول اکرمؐ کی وراثت قرار دیا اور مسلمانوں میں "اہل بیت" "امامت" وغیرہ کے غیر اسلامی تصورات رائج کر کے عوام کا استحصال کیا ۔ حضرت حسینؓ کو جب کوفی شیعان علیؓ نے قتل کر دیا تو حادثہ کربلا کے تعلق سے انتہائی مبالغہ آمیز باتیں مشہور کر کے اس واقعہ کو سیاسی استحصال کا حربہ بنایا اور خلافت یعنی مسلمانوں کی مرکزیت کے خلاف عوام کو مشتعل کیا ۔ جب عباسیوں کو اقتدار حاصل ہو گیا تو علوی اور عباسی ایک دوسرے کے خلاف ہو گئے اور باہمی اختلاف یہ تھا کہ علوی وراثت کے حقدار بیٹی کی اولاد کو سمجھتے تھے، عباسی وراثت کے حقدار چچا کی اولاد کو سمجھتے تھے ۔

محمدالارقط (نفس ذکیہ) نے عباسیوں کی خلافت کو تسلیم نہیں کیا ۔ یہ اور ان کے بھائی ابراہیم بن عبداللہ علوی خلافت قائم کرنے کی جدوجہد کر رہے تھے ۔ جب محمدالارقط نے خروج کیا اور مہدی ہونے کا دعویٰ کیا تو ان کے چچازاد حسن بن زید نے جو مدینہ کے گورنر تھے ان کے خلاف مخبری کی ۔ محمدالارقط اپنے بھائی ابراہیم کو

لے کر سندھ کی طرف فرار ہو گئے ۔ کچھ عرصہ بعد واپس آکر پھر خروج کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے ۔

۱۴۵ ہجری میں نفس ذکیہ نے حجاز میں اپنی خلافت کا اعلان کر کے بیعت لی ۔ اسی زمانہ میں منصور اور نفس ذکیہ کے درمیان مراسلت ہوئی ۔ پہلا مکتوب منصور نے لکھا، جو سورہ المائدہ کی اس آیت سے شروع ہوتا ہے ۔ اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِیْنَ یُحَارِبُوْنَ اللّٰہَ ___ الخ انہوں نے نہایت مناسب الفاظ میں نفس ذکیہ سے وعدہ کیا کہ اگر وہ بغاوت کا خیال ترک کر دیں تو نہ صرف ان کو معاف کر دیا جائے گا بلکہ ان سے بہتر سلوک کیا جائے گا ۔ اس کا جواب نفس ذکیہ نے منصور کو تلخ الفاظ میں دیا اور یہ دعویٰ کیا کہ خلافت در حقیقت رسول اکرمؐ کی وراثت ہے اور ہم اولاد فاطمہؓ ہی اس کے وارث ہیں ۔ کوئی دوسرا شخص مستحق خلافت نہیں ہو سکتا ۔ نفس ذکیہ نے لکھا:۔

"میں بھی تمہارے لئے ویسی ہی امان پیش کرتا ہوں جیسی تم نے پیش کی ہے تم جانتے ہو کہ خلافت ہمارا حق ہے اور ہمارے ہی شیعوں کی بدولت تم نے خلافت کو حاصل کیا ہے ۔ ہمارے باپ علیؓ وصی اور امام تھے ۔ ہم جو ان کے بیٹے تھے زندہ ہیں پھر ہمارے ہوتے ہوئے تم کیسے خلافت کے وارث بن گئے ۔ تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ جاہلیت اور اسلام دونوں میں بنی ہاشم میں سے جو نسبی فضائل و مفاخر ہم کو حاصل ہیں وہ کسی اور کو حاصل نہیں ہو سکے ۔ زمانہ جاہلیت میں رسول اکرمؐ کی دادی فاطمہ بنت عمرو کے شکم سے ہم ہیں نہ کہ تم ۔ خاص کر میں ہاشم کی اولاد میں سب سے بہتر اور ماں باپ کے لحاظ سے سب سے بڑھ کر ہوں ۔ میری رگوں میں امہات اولاد (ام ولد) کا غیر عربی خون مطلق نہیں ہے ۔ میرے نسب کو اللہ نے ہمیشہ ممتاز رکھا ۔ دنیا میں سب سے افضل محمدؐ ہیں ۔ میں ان کا بیٹا ہوں ۔ صحابہؓ میں میرے باپ علیؓ نے سب سے پہلے صلوۃ ادا کی ۔ پھر حضرت فاطمہؓ ہیں جو ان کی بیٹیوں میں سب سے بہتر اور جنتی عورتوں کی سردار ہیں ۔ زمانہ اسلام میں ہاشم کے بہترین فرزند حضرت حسنؓ و حسینؓ ہیں جو بہشتی جوانوں کے سید ہیں ۔ ان میں سے بڑے یعنی حسن کا میں بیٹا ہوں ۔ اب دیکھو حضرت علیؓ والدین کی طرف سے ہاشم کے بیٹے ہیں ۔ امام حسنؓ والدین کی طرف

سے عبدالمطلب کے بیٹے ہیں اور میں والدین کی طرف سے رسول کا بیٹا ہوں۔

اللہ نے ہمارا امتیاز ہمیشہ قائم رکھا۔یہاں تک کہ (جنت اور) جہنم میں بھی اس نے اس کا لحاظ کیا یعنی میں اس شخص کا بیٹا ہوں جو جنت میں سب سے بڑا درجہ رکھتا ہے اور اس شخص کا بیٹا ہوں جو جہنم میں سب سے ہلکا عذاب پائے گا یعنی ابو طالب۔اس طرح میں نیکوں میں سب سے بہتر نیک اور گنہگاروں میں سب سے کمتر گنہگار کا فرزند ہوں۔

میں اللہ کو گواہ کر کے تم کو ہر چیز کی سوائے کسی شرعی حد یا کسی معاہد کے حق کے جو تمہارے ذمہ ہو امان دیتا ہوں اور میں بہ نسبت تمہارے عہد کا زیادہ پابند ہوں۔ تم نے مجھ کو جو امان دی ہے وہ کونسی ہے؟ ابن ہبیرہ والی یا وہ جو تم نے اپنے چچا عبداللہ کو یا ابو مسلم خراسانی کو دی تھی۔"

نفس ذکیہ کے اسی مکتوب کے جواب میں خلیفہ منصور نے زیر بحث مکتوب لکھا:۔

یہ عبرت کا مقام ہے کہ قرآن مجید نے جس نسبی فخر کو ختم کر کے تقویٰ کو عزت و اکرام کی بنیاد قرار دیا تھا اور رسول اکرمؐ نے جس کو نخوت جاہلیت قرار دے کر فتح مکہ کے دن اپنے پیروں کے نیچے روند ڈالا تھا اس کو علوی اور عباسی دونوں اپنے حق خلافت کے ثبوت میں پیش کر رہے تھے۔دونوں کے مقاصد شخصی تھے نہ کہ جمہوری ورنہ اس سے پہلے کبھی خلافت کو رسول کی وراثت تصور نہیں کیا گیا تھا۔

عباسیوں نے اسی راستہ سے بنی امیہ کو ختم کر کے خلافت حاصل کی لیکن جب کامیابی حاصل ہو گئی تو علویوں سے الگ ہو گئے اور شیعیت کی مخالفت کی۔عباسیوں کے ہاتھوں "اہل بیت" پر ایسے مظالم ہوئے کہ وہ بنی امیہ کے دور کو یاد کرنے لگے۔ جن غیر عرب عناصر کے تعاون سے عباسیوں نے اقتدار حاصل کیا تھا ان عناصر کے نرغے سے بچ نہ سکے۔

خلیفہ منصور کے پاس جب نفس ذکیہ کا مکتوب پہنچا تو کاتب نے جواب لکھنے کی اجازت چاہی۔منصور نے کہا:۔یہ تمہارا کام نہیں ہے۔جب حسب نسب اور خاندان کے جھگڑے آپڑے ہیں تو خود مجھے جواب لکھنا چاہئے۔چنانچہ منصور نے خود لکھا:۔

ابو جعفر عبداللہ بن محمد امیر المومنین کی جانب سے محمد بن عبداللہ کے نام

تمہارا خط مجھ کو ملا۔عوام کو برانگیختہ کرنے اور جہلاء میں مقبول بننے کے لئے تم نے یہ نسبی مفاخر جوڑ رکھے ہیں۔جن کی ساری بنیاد عورتوں پر ہے حالانکہ عورتوں کا وہ درجہ نہیں ہے جو چچا کا ہے۔تم کو معلوم ہے کہ اللہ نے جس وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا۔اس وقت ان کے چچاؤں میں سے چار زندہ تھے (حمزہ، عباس، ابو طالب اور ابو لہب) ان میں سے دو اسلام لائے جن میں سے ایک میرا باپ تھا اور دو کافر رہے جن میں سے ایک تمہارا باپ تھا۔تم نے عورتوں کا ذکر کر کے ان کی قرابت پر فخر کیا ہے یہ نادانی ہے۔اگر عورتوں کو نسبی فضیلت میں سے کوئی حصہ ملتا تو ساری فضیلت رسول اللہ کی والدہ کے لئے ہوتی لیکن اللہ تو جس کو چاہتا ہے اپنے دین سے سربلند کرتا ہے۔

تعجب ہے کہ ابو طالب کی والدہ بنت عمرو پر بھی تم نے فخر کیا ہے۔سوچو تو ان کے بیٹوں میں سے کسی کو بھی اللہ نے اسلام کی ہدایت نہ کی اور اگر کرتا تو اس کے زیادہ حق دار نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے والد ہو سکتے تھے لیکن وہ تو جس کو چاہتا ہے اسی کو ہدایت دیتا ہے۔

تم نے اس پر بھی فخر کیا ہے کہ حضرت علیؓ والدین کی طرف سے ہاشمی ہیں اور حضرت حسنؓ والدین کی طرف سے عبدالمطلب کے بیٹے ہیں اور تمہارا نسب والدین کی طرف سے رسول تک پہنچتا ہے۔اگر یہ کوئی واقعی فضیلت ہوتی تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس کے زیادہ مستحق ہوتے لیکن وہ تو صرف ایک ہی طرف سے ہاشمی ہیں۔

پھر تم اپنے آپ کو رسول کا بیٹا کہتے ہو۔حالانکہ قرآن نے اس سے بالکل انکار کیا ہے۔مَاکَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِکُمْ (۳۳۔۴۰) محمد تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہ تھے ہاں تمہارا یہ کہنا درست ہے کہ تم ان کی بیٹی کی اولاد ہو اور یہ بے شک ایک قریبی رشتہ ہے لیکن اس کے ذریعہ سے کسی قسم کی میراث نہیں مل سکتی اور نہ اس سے تم امامت کے حقدار ہو سکتے ہو۔اسی قرابت کی بنیاد پر تمہارے باپ حضرت علیؓ نے ہر طرح پر خلافت حاصل کرنے کی کوشش کی۔حضرت فاطمہ کو ابو بکرؓ سے لڑا کر رنجیدہ کرایا۔اسی غصہ میں ان کی بیماری کی بھی کسی کو

اطلاع نہیں کی اور جب انہوں نے انتقال فرمایا تو رات ہی کو لے جاکر ان کو دفن کر دیا مگر کوئی حضرت ابو بکرؓ کو چھوڑ کر ان کی خلافت پر راضی نہ ہوا۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بیماری کے زمانہ میں بھی وہ موجود تھے۔ لیکن نماز پڑھنے کا حکم آپ نے حضرت ابو بکرؓ کو دیا۔ ان کے بعد حضرت عمرؓ خلیفہ ہوئے پھر انتخاب خلیفہ اصحاب شوریٰ کے سپرد ہوا اس میں بھی (حضرت علی) انتخاب میں نہ آسکے اور حضرت عثمانؓ خلیفہ ہوئے ان کے بعد انہوں نے (حضرت علیؓ) حضرت طلحہؓ و زبیرؓ پر سختی کی۔ حضرت سعد بن وقاصؓ سے بیعت لینی چاہی، انہوں نے اپنا پھاٹک بند کر لیا۔ جب حضرت علیؓ گزر گئے، حضرت حسنؓ ان کی جگہ پر آئے تو خلافت کو حضرت معاویہؓ کے سپرد کر دیا، اور مدینہ چلے گئے۔ لہذا اگر تم کچھ حق بھی تھا تم اس کو فروخت کر چکے۔ تمہارا یہ کہنا کہ اللہ نے جہنم میں بھی تمہارے امتیاز کا لحاظ رکھا کہ تمہارے باپ ابو طالب کو اس میں سب سے کمتر عذاب ملے گا نہایت افسوس ناک ہے۔ اللہ کا عذاب خواہ کم ہو یا زیادہ مسلمان کے لئے فخر کی چیز نہیں ہے۔ یہ جو تم نے لکھا ہے کہ تمہاری رگوں میں عجمی خون مطلق نہیں ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تم آنحضرتؐ کے فرزند ابراہیم سے بھی بڑھ کر اپنے آپ کو سمجھتے ہو۔ حالانکہ وہ ہر لحاظ سے تم سے افضل تھے۔ خود تمہارے خاندان میں زین العابدین تھے وہ تمہارے دادا حسنؓ بن حسنؓ سے بہتر تھے۔ پھر ان کے بیٹے محمد باقر تمہارے باپ سے بہتر اور ان کے بیٹے جعفر صادق تم سے بہتر ہیں حالانکہ ان سب کی رگوں میں عجمی خون ہے۔

تم یہ بھی دعویٰ کرتے ہو کہ نسب اور ماں باپ کے لحاظ سے تم کل بنی ہاشم سے بہتر ہو۔ بنی ہاشم میں سے رسول اللہ بھی ہیں۔ تمہیں یہ تو پیش نظر رکھنا چاہئے کہ قیامت کے دن اللہ کو منہ دکھانا ہے۔

صفین کے معاملہ میں تمہارے باپ حضرت علیؓ نے حکم سے پیمان کیا تھا کہ ان کے فیصلہ پر رضامند ہو جائیں گے تم نے یہ سنا ہو گا کہ حکم نے ان کو خلافت سے معزول کر دیا تھا۔ یزید کے عہد میں تمہارے عم حسینؓ بن علی ابن زیادہ کے مقابلہ کے لئے کوفہ آئے اور جو لوگ ان کی حامی تھے انہیں کے ہاتھوں قتل ہوئے۔ ان کے بعد تمہارے خاندان کے کئی آدمی یکے بعد دیگرے خلافت لینے کے لئے اٹھے۔ بنی امیہ نے

ان کو قتل کیا اور سولی پر چڑھایا۔ یہاں تک کہ ہم مستعد ہوئے اور ہم نے تمہارا اور اپنا سب کا انتقام ان سے لیا۔ وہ نماز کے بعد تمہارے اوپر جو لعنتیں بھیجا کرتے تھے اس کو ہم نے بند کیا۔ تمہارے رتبے بڑھائے۔ اب انہیں امور کو تم ہمارے سامنے بطور حجت کے پیش کرتے ہو۔ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ ہم نے حضرت علیؓ کی فضلیت کا جو اظہار کیا ہے تو ہم ان کو حضرت عباسؓ و حمزہؓ سے بھی بڑھ کر تسلیم کرتے ہیں؟ وہ سب لوگ محفوظ گذر گئے اور حضرت علیؓ ان جنگوں میں الجھے جن میں مسلمانوں کی خون ریزی ہوئی۔

تمہیں یہ بھی معلوم ہو گا کہ زمانہ، جاہلیت میں سقایہ اور زمزم کے متولی حضرت عباسؓ تھے نہ کہ ابو طالب۔ حضرت عمرؓ کی عدالت میں تمہارے باپ نے اس کا دعوی بھی پیش کیا مگر فیصلہ ہمارے حق میں ہوا۔

رسول اللہ نے جس وقت وفات پائی اس وقت ان کے اعمام میں سے سوائے حضرت عباسؓ کے اور کوئی زندہ نہ تھا۔ اس لئے کل اولاد عبد المطلب میں سے آنحضرت کے وارث وہی ہیں۔ پھر بنی ہاشم میں سے بہت سے لوگ خلافت حاصل کرنے کے لئے اٹھے۔ لیکن بنی عباس ہی نے اس کو حاصل کیا لہذا، قدیم استحقاق اور جدید کامیابی حضرت عباسؓ اور ان کی اولاد ہی کے حصہ میں آئی۔

بدر کی لڑائی میں تمہارے چچا طالب اور عقیل کی وجہ سے مجبوراً حضرت عباسؓ کو بھی آنا پڑا۔ ورنہ وہ دونوں بھوکوں مرجاتے یا عتبہ اور شیبہ کے پیالے چاٹتے۔ ہمارے ہی باپ کی بدولت اس ننگ و عار سے بچے۔ نیز آغاز اسلام میں قحط کے زمانہ میں حضرت عباسؓ ہی نے ابو طالب کی امداد کی۔ پھر تمہارے چچا عقیل کا فدیہ بھی بدر میں انہوں نے ادا کیا۔ الغرض جاہلیت اور اسلام دونوں میں ہمارے احسانات تم پر ہیں۔ ہمارے باپ نے تمہارے باپ پر احسان کئے اور ہم نے تم پر احسان کئے اور جن رتبوں پر تم خود اپنے آپ کو نہیں پہنچا سکے تھے ان پر ہم نے تم کو پہنچایا اور جو انتقام تم نہیں لے سکے تھے وہ ہم نے لئے۔ والسلام۔

(تاریخ اسلام از شاہ معین الدین احمد ندوی۔ حصہ سوم جلد اول صفحات ۳۴ تا ۴۲ اور ملت اسلامیہ کی تاریخ حصہ دوم صفحات ۲۹ تا ۳۳ سے ماخوذ)

دُلدُل

عام طور پر کسی جانور کے متعلق کھود کرید اور چھان بین کی ضرورت نہیں پڑتی ۔ کیونکہ اس سلسلہ کی تفصیلات پر کسی دینی عقیدہ کا دارومدار نہیں ہوتا لیکن چونکہ بعض لوگوں نے دلدل کی عظمت و تقدس کو ایمانی عقیدہ کا درجہ دے لیا ہے اور محرم کے مہینہ میں کسی سجے بنے خون آلود گھوڑے کو دلدل کا فرضی نام دے کر اس کا جلوس نکالا جاتا ہے اور پنجہ کا نشان لگایا جاتا ہے ۔ اس کی زیارت کو ذریعہ نجات سمجھا جاتا ہے ۔ نفع و نقصان میں دخیل مان کر اس سے یا اس کے ذریعہ مرادیں مانگی جاتی ہیں اور اس سے متعلق من گھڑت قصے بیان کئے جاتے ہیں ۔ اس لئے مناسب سمجھا گیا کہ تاریخی شہادتوں کی روشنی میں صحیح نتائج اخذ کئے جائیں ۔

ہجرت نبوی کے چھٹے سال رسول اکرمؐ نے روم، ایران، مصر، وغیرہ کے سربراہوں کے نام خطوط بھیجے جن میں آپ نے انھیں اسلام قبول کرنے کی دعوت دی۔

مصر کے بادشاہ مقوقس کو جب حضرت حاطب ابن ابی بلتعہ کے ہاتھوں اسلام کا دعوت نامہ وصول ہوا تو اس نے بڑے ادب و احترام سے اسے چوما ۔ اگرچہ اسلام قبول نہیں کیا لیکن اپنی طرف سے جوابی خط اور تحایف دے کر رسول اکرمؐ کے قاصد کو بعد عزت و اکرام واپس کیا ۔

شاہ مصر مقوقس نے رسول اکرمؐ کی جناب میں ماریہ قبطیہ اور ان کی بہن سیریں کو بھیجا ۔ اپنے گدھے کو جس کا نام یعفور تھا اور اپنے خچر کو جس کا نام دلدل تھا تحفتاً بھیجا ۔ یہ مادہ خچر سفید تھی ۔ ان دنوں عرب میں ایسا خچر نہ تھا (طبقات ابن سعد)

موسیٰ نے اپنے والد ابراہیم سے روایت کی کہ دلدل رسول اکرمؐ کے پاس ایک مادہ خچر تھی اس کے ہمراہ ایک گدھا بھی تھا جس کا نام عفیر تھا ۔ مادہ خچر حضرت معاویہ کے زمانہ تک زندہ رہی ۔" (حضرت معاویہؓ ۱۹ھ سے ۴۱ھ تک گورنر رہے)

(طبقات ابن سعد)

ابن جریر طبری (شیعہ مورخ) لکھتے ہیں کہ "مادہ خچر دلدل کو مقوقس نے ایک گدھے عفیر کے ساتھ رسول اکرمؐ کی خدمت میں بھیجا تھا ۔ عرب میں سب سے پہلی خچر یہی دیکھی گئی ۔ یہ آپ کے بعد ایک عرصہ تک زندہ رہی یہاں تک کہ معاویہؓ کے عہد حکومت تک زندہ تھی ۔" (تاریخ طبری)

علامہ ابن کثیر لکھتے ہیں: ۔

ان تحفوں میں مابور نامی نامرد غلام دو کالے موزے اور دلدل نام کی ایک سفید مادہ خچر شامل تھی ۔ (البدایہ والنہایہ)

ملا باقر مجلسی (ایرانی شیعہ مجتہد) نے "حیات القلوب" میں بھی یہی تفصیل دی ہے ۔

تاریخی روایات سے پتہ چلتا ہے کہ کبھی کبھی آپ دلدل کو سواری کے لئے استعمال فرماتے تھے ۔ لیکن غیر معتبر مذہبی داستانوں میں ہے کہ خچر آپ نے حضرت علیؓ کو دیا تھا ۔ ان کی شہادت کے بعد یہ حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کی سواری میں رہی اور کربلا کے حادثہ کے بعد حضرت حسینؓ کی ایرانی اہلیہ شہربانو اس پر سوار ہوکر "کسی "نامعلوم منزل" کی جانب روانہ ہوگئیں ۔ بعض کا کہنا ہے کہ دلدل کوفیوں کے ہاتھوں حضرت حسینؓ کی شہادت کے بعد دریائے فرات میں ڈوب گئی ۔

دلدل نامی خچر کے حضرت علیؓ کو دئے جانے کی روایت سراسر غلط ہے کیونکہ رسول اکرامؐ متروکہ چیزوں میں دلدل کا ذکر بھی ملتا ہے ۔ آپ کے وصال کے بعد یکے بعد دیگرے حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت عثمانؓ ذوالنورین کو منتقل ہوئی ۔ حضرت عثمانؓ کی مظلومانہ شہادت کے بعد عجمی فسادیوں نے حضرت علیؓ کی خلافت قائم کردی تو دلدل بھی آپ تک پہنچی ۔ فسادیوں کے دباؤ کے تحت حضرت علیؓ کو دارالخلافہ مدینہ منورہ کو ہنگامی طور پر چھوڑنا پڑا ۔ جس کے نتیجہ میں زندگی کے آخری لمحات تک مدینہ واپس نہ آسکے ۔ اس لئے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ کوفہ جاتے ہوئے حضرت علی دلدل کو ساتھ لے جاسکے یا نہیں ۔ حضرت معاویہؓ کے دور میں دلدل کے موجود ہونے کی شہادت ملتی ہے اور یہ ممکن بھی ہے ۔ اگر حضرت معاویہؓ

کے ابتدائی دور یعنی ۱۹ تا ۴۱ھ تک دلدل کی موجودگی کو تسلیم کیا جائے تو اس وقت تک اس کا زندہ رہنا قرین قیاس ہے۔ لیکن حادثہ کربلا (۶۱ھ) تک دلدل کا موجود ہونا قرین قیاس نہیں۔

رسول اکرمؐ کی سواری کا شرف صرف دلدل ہی کو نہیں ملا بلکہ کئی جانور ہیں جنہیں آپ نے سواری کے لئے استعمال فرمایا۔ ان تمام میں قصویٰ نامی اونٹنی کو یہ شرف حاصل ہے کہ ہجرت کے وقت آپ اور حضرت ابو بکر صدیقؓ نے اس پر وہ تاریخی سفر کیا جس نے دنیا کی تاریخ بدل دی، اسی طرح ایک اونٹنی کو یہ شرف حاصل ہے کہ جب آپ ۸ھ میں مکہ معظمہ میں فاتحانہ داخل ہوئے تو اس وقت آپ اس پر سوار تھے اور آپ کے ساتھ اس اونٹنی پر آپ کے بڑے نواسہ حضرت علیؓ (حضرت زینب کے فرزند) آپ کے ساتھ تھے۔ یا پھر اس قصویٰ کو خاص اہمیت حاصل جس پر بیٹھ کر حجتہ الوداع کے موقع پر آپ نے خطبہ دیا تھا۔

دلدل کے نام سے دراصل ایک قدیم اور نہایت کریہہ تصور کو اسلام کے چوکھٹے میں پیش کرنے کی مذموم کوشش ہے۔ نمرود بابل سے بھاگ گیا اور غائب ہو گیا۔ چند روز بعد اس کا گھوڑا (یونانی اس گھوڑے کو یونی کارن کہتے تھے۔ ہندو ویدوں میں اسی طرح کے گھوڑے کا نام اہی شروا ہے۔ ہم اسے دلدل کہتے ہیں) واپس آگیا۔ لوگ گھوڑے سے لپٹ گئے اور ڈھاریں مار مار کر روتے رہے۔ نمرود کی ماں (استھر الیسٹر یا یا عربی اشطور جو اب نمرود کے بیٹے کی ماں بن چکی تھی) نے لوگوں کو بتایا کہ نمرود ایک رات کو اسی طرح خاموشی سے واپس آئے گا جس طرح غائب ہوا ہے۔ تم انتظار کرو۔ چنانچہ لوگ سال بہ سال اسی کی واپسی کا انتظار کرتے رہے اور ایک مقررہ دن گھوڑے کو گلی گلی گھماتے رہے۔ اور اعلان کرنے لگے کہ نمرود کا گھوڑا واپس آگیا ہے کسی دن اس کا سوار بھی واپس آجائے گا انتظار کرو اور یہی آج تک کر رہے ہیں۔

(رسالہ دلدل۔ ایک تاریخی جائزہ۔ اور ارمغان نجم سے اقتباس)

درود

قرآن مجید میں کہیں بھی درود کا ذکر نہیں۔ یہ فارسی لفظ ہے۔ جس کا مصدر "درودن" ہے۔ یعنی جڑ کاٹنا۔ فصل کاٹنا۔ اس کا متبادل لفظ اردو میں دور کرنا ہے۔

عجمیوں نے جس قرآنی اصطلاح کو بگاڑ کر لفظ درود کو رائج کیا ہے وہ صلوۃ ہے اللہ کے لئے ہو تو صلوٰۃ (رکوع اور سجود کی عبادت ہو گی اور رسولؐ کے لئے ہو تو صلوۃ سے مراد وہ دعائیہ کلمات ہیں جن سے جماعت سے وابستگی کا اظہار ہوتا ہے جس میں جذبات تشکر بھی ہوتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو رسول اکرمؐ کی امت سے وابستہ کیا

قرآن مجید کی آیت: سِاِنَّ اللّٰہَ وَ مَلٰئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ وَ سَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا (۳۳۔۵۶) کا یہ ترجمہ کیا جاتا ہے کہ: "اللہ اور اس کے فرشتے پیغمبر پر درود بھیجتے ہیں۔ پس اے مومنو تم بھی پیغمبر پر درود بھیجو۔" (ترجمہ مودودی صاحب)

قرآن مجید میں صلوٰۃ اور اس کی مشتقات صَلِّ۔ صَلُّوْا۔ صَلّٰی۔ یُصَلِّیْ۔ تصلی۔ ہر جگہ ان کا مفہوم عبادت دعا سے ہے۔ ہر جگہ یہ دعائیہ کلمات ہیں۔

لفظ درود کو موضوع روایات میں داخل کر دیا گیا ہے۔ حتیٰ کہ موطا امام مالک وغیرہ صحیح بخاری میں دو متضاد روایات ملتی ہیں۔

ابو سعید خدری سے روایت ہے ہم نے رسول اکرمؐ سے سوال کیا آپ پر سلام پڑھنا تو ہم جانتے ہیں درود کیسے پڑھیں تو فرمایا پڑھو۔

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰٓی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰٓی اِبْرَاہِیْمَ وَعَلٰٓی اٰلِ اِبْرَاہِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ۔

یہ روایت ان ہی الفاظ میں موطا امام مالک میں بھی درج ہے۔

دوسری روایت، ابن ابی اوفی سے مروی ہے کہ جب کوئی رسول اکرمؐ کی خدمت میں صدقہ لاتا تو آپ فرماتے اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی عَلَیْہِ (اے اللہ اس پر برکت

ورحمت فرما) ایک روز میرے والد بھی صدقہ لائے ۔ تو آپ نے فرمایا اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی آلِ اَبِی اَوْفٰی (اے اللہ ابی اوفی کے بچوں کو برکت دے اور ان پر رحمت فرما)

اس سے معلوم ہوگیا کہ صَلِّ ۔ یَصَلُّوْنَ ۔ کے الفظ کوئی جادو منتر یا کوئی رسمی اور آسمانی دعا کے نہیں اور نہ محمد یا آل محمدؐ سے مخصوص ہیں ۔ یہ دعائیہ کلمات ہیں جو آپس میں ایک دوسرے کے لئے بھی استعمال ہوسکتے ہیں ۔ اپنے لئے بھی دعا ان قرآنی دعائیہ کلمات میں کی جاسکتی ہے اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی اَبِیْ اَوْفٰی وَ اَہْلِ بَیْتِی (اے اللہ میرے ماں باپ اور میرے گھر والوں پر رحمت و برکت نازل فرما ۔ اس کا پورا مفہوم انگریزی کے May God Bless You یا May God Bless Us سے ظاہر ہوتا ہے ۔

واضح رہے کہ صحاح ستہ یا موطا میں درود کا جزو صلوٰۃ ہونا کہیں بھی درج نہیں ہے ۔ نہ کوئی ایسی روایت ہے جس سے معلوم ہو کہ رسول اکرمؐ کے بعد تین سو سال میں بھی کسی صحابی یا تابعی نے صلوۃ میں درود پڑھی ۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ پہلی روایت الحاقی ہے ۔

یہ دعا دراصل " ویلمی بنی بویہ " کی اختراع ہے ۔ اور ان ہی کے حکم سے ہماری کتابوں میں جو اس زمانہ میں ہاتھ سے لکھی جاتی تھیں داخل کر دیا گیا ۔ معزالدولہ (وفات ۳۵۲ ھ) اور عضدالدولہ (وفات ۳۷۲ ھ) نے جہاں دوسرے مذاہب کی کتابوں کے ترجمہ کروائے وہیں ابتدائی دور کی اسلامی کتابوں کی نقل کروانے کا انتظام بھی کیا ۔ اور موقعہ سے فائدہ اٹھا کر شیعی عقیدہ کی باتیں ان میں داخل کروادیں ۔

اس کام کے لئے پہلے مرحلہ میں ایک دعائیہ کلمہ کو درود کا نام دیدیا گیا ۔ پھر " جڑ کاٹنے والی " طویل دعائیں تیار کر کے ان کا نام " درود " رکھا گیا ۔ تاکہ عقیدہ توحید کی جڑ کٹ جائے اور مسلمانوں پر فلسفہ آل محمدؐ کا رنگ چڑھ جائے ۔ اس طرح بیسیوں درود مدون کروائے مثلاً درود تاج درود لکھی ۔ درود ابراہیمی ۔ درود جامی ۔ درود سعدی ۔ درود نظامی وغیرہ ۔

سورہ احزاب کی آیت ۵۶ کو نئے معنی پہنائے گئے ۔ اور درود کو رواج دینے

کے لئے یہ طریقہ رائج کیا گیا جو خطیب خطبہ جمعہ میں آیت اِنَّ اللّٰہَ وَ مَلٰئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ ط یٰاَیُّھَاالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوا عَلَیْہِ وَ سَلِّمُوْا تَسْلِیْماً (۳۳ : ۵٦) کی تلاوت کرتا ہے تو سب مصلی حسب ذیل درود دہراتے ۔ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ و عَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ بِعَدَدِ مَنْ صَلّٰی وَ صَامَ ۔ اے اللہ درود بھیج محمدؐ اور آل محمد پر تمام نمازیوں اور روزہ داروں کی تعداد میں ۔ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ و عَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ بِعَدَدِ مَنْ قَعَدَ وَ قَامَ ۔ اے اللہ درود بھیج محمد اور آل محمد پر کھڑے اور بیٹھے نمازیوں کی تعداد میں ۔ یعنی اگر پانچ سو مصلی ہوں تو اللہ تعالیٰ پر لازم آتا ہے ہر مصلی کی طرف سے (۵۰۰) بار درود بھیجے ۔ دوسرے یہ کہ اگر بالفرض اللہ تعالیٰ نے حکم بھی دیا ہے کہ محمدؐ پر درود بھیجیں تو اس حماقت کا کیا جواز ہے کہ یہ لئے اللہ تعالیٰ کو حکم دیں کہ اے اللہ تو محمدؐ اور آل محمدؐ پر درود بھیج ۔ یعنی اللہ تعالیٰ بھی یہ پڑھے ۔ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّد تو وہ کس سے کہے گا؟ خود سے ؟ یا اس کا بھی نعوذباللہ کوئی اور اللہ ہے ۔؟

صحاح ستہ تفسیر طبری اور سیرت ہشام ان سب میں درود شریف کی روایت داخل کی گئی ۔ یہ شرارت یہیں ختم نہیں ہوی ۔ انجیل بارنا باس کے نسخہ میں بھی اس " درود شریف " کو شامل کر دیا گیا ۔

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَعَلٰی آلِ محمد خاص شیعی درود ہے ۔ یہ قرآن مجید کی تکذیب کرتا ہے ۔ قرآن مجید نے بتلادیا کہ حضرت محمدؐ کو اولاد نرینہ نہیں دی گئی ۔ ان کی نسل چلانا مقصود مشیت نہیں ۔ ان کا کام امت جاری رکھے گی ۔

مسلمانوں کا دعائیہ کلمہ یہ ہے ۔ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَبَارِکْ وَ سَلَّمْ (اللہ آپ پر اپنے رحمتیں اور سلامتی نازل فرمائے)

بھلا رسول اکرمؐ ایسی دعا کیسے سکھا سکتے تھے ۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں آل ابراہیم کو سرزمین عرب سے نکالنے کے لئے مبعوث فرمایا تھا ۔ اور بتلا دیا تھا کہ :۔

ہم نے ان کو بندر بنا کر بے ملک و بے دیار کر دیا ہے ۔ (۲: ٦۵)

ان پر ذلت و مسکنت طاری کر دی ۔ وہ اللہ تعالیٰ کے غضب میں آگئے وغیرہ

صلوٰۃ التحیات کے بعد ختم ہوجاتی ہے۔اس کے بعد "درود ابراہیمی" زائد ہے

آل محمدؐ اور آل ابراہیم سے ہر دو کے پیرو اور اتباع کرنے والے مراد لی جائے تو البتہ اس درود کے پڑھنے کا جواز پیدا ہوتا ہے۔

درود کا ان الفاظ میں لکھنا صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّمْ عربی قواعد کے مطابق غلط ہے۔عربی میں حرف جار کا عطف صرف اسم ظاہر پر ہوتا ہے۔یعنی اگر محمد کا لفظ ہوتا تو پھر یہ درود ٹھیک قرار پاتا۔اس لئے قاعدہ کے مطابق حرف جار دوبارہ لانا پڑتا ہے۔جیسے صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وعلیٰ آلِہٖ وَسَلَّمْ

اس صورت میں آل سے مراد امت مسلمہ ہوگی لیکن جس فرقہ نے اس غلط درود کو رواج دیا ہے ان کے نزدیک آل سے مراد امت مسلمہ نہیں بلکہ رسول اکرم کا خاندان ہے جو ان کے عقیدہ کے مطابق رسول کے وجود کا حصہ ہیں اس لئے انہیں علحدہ ظاہر کرنے کے لئے حرف جار "علیٰ" استعمال کرنے کی ضرورت نہیں۔اگر ان کا استدلال تسلیم کر لیا جائے تو اس کی زد ختم نبوت کے عقیدہ پر پڑتی ہے یعنی آپ کی وفات کے بعد نبوت کا جز آپ کی آل میں موجود رہا اور یہی اس فرقہ کا عقیدہ ہے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ فرماتے ہیں:۔

لَمْ یَأمُرَ اللّٰہُ بالصَّلاۃِ عَلیٰ مُعَیَّنٍ غَیْرَ النَّبِی (یعنی نبی کے علاوہ معین طور پر اور کسی کو صلوٰۃ بھیجنے کا اللہ نے حکم نہیں دیا) ابن تیمیہ نے نہایت اہم نکتہ بیان کیا ہے۔ جس طرح صلوٰۃ کی مختلف شکلوں میں صرف ایک شکل جب کہ صلوٰۃ بندوں کی طرف سے اللہ پر ہو اصطلاح میں صلوٰۃ ہے۔یعنی صلوٰۃ ادا کرنے کے طریقہ کو معین کر دیا گیا ہے۔اسی طرح صلوٰۃ جب مسلمانوں کی طرف سے رسول پر ہو تو اس کو التحیات کا اصطلاحی نام دے کر معین کر دیا گیا۔یہ صلوٰۃ یعنی التحیات غیر نبی پر نہیں بھیجی جاسکتی

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں:۔

لَا تَنبغی الصَّلاۃُ الاّ عَلَی النَّبِیِّ وَلٰکِنْ یَدْعی لِلْمُسْلِمِیْنَ وَ

الْمُسْلِمَاتِ بالاستغفار (لوایح الانوار البھیۃ)

یعنی سوائے نبی کے اور کسی پر صلوٰۃ نہیں بھیجنی چاہئے البتہ مسلمان مرد اور عورت کے لئے دعائے مغفرت کی جائے۔

علامہ ابن کثیر لکھتے ہیں:۔

اللّٰھُمَّ صَلِّ عَلیٰ مُحَمَّدٍ فمعناہٗ عظمہ فی الدنیا باعلاء ذکرہٖ و اظھار دعوتہٖ وَابقاءِ شریعتہٖ وفی الاخرۃِ تضعیف اجرہٖ و مثوبتہ (النھایۃ فی غریب الحدیث والاثر)

یعنی نبی پر صلوٰۃ بھیجنے سے مراد ہے کہ دنیا میں ان کے ذکر کی برتری ان کی دعوت کے اظہار اور بقائے شریعت کے ہونے سے ان کی عظمت اور آخرت میں ان کے اجر و ثواب کی زیادتی ہو۔

نبی پر مومنوں کی صلوٰۃ کا مطلب یہ ہے کہ ان کے لائے ہوئے قانون کو تسلیم کر کے اس پر عمل پیرا ہوں۔دل سے صَلّوا عَلَیْہِ وَ سَلِّمُوا تَسْلِیْماً کی تعمیل کریں۔تسلیما سے مراد ہے۔نبی کے لائے ہوئے ضابطہ حیات کو تسلیم کرنا اور اس پر عمل پیرا ہونا۔نبی پر صلوٰۃ (جس کو درود کہا جاتا ہے) سے مراد آپ کے انقلاب انگیز اور شاندار کارناموں اور آپ کے تعلیمات کی عظمت و یکتائی کا اس طرح دل پر چھا جانا ہے کہ آپ کی پیروی اور آپ کے نقش قدم پر چلنے کی امنگ اور آرزو پیدا ہو۔

حضرت ابو بکرؓ صدیق کے خطبات میں جو مختلف کتب میں نقل ہیں اللہ اور اس کے رسولؐ کی حمد و نعت کے سوا کسی دوسرے شخص کا خواہ آپ کے چچا ہوں یا داماد، بیٹیاں ہوں ہو یا نواسے اشارۃً بھی کوئی ذکر نہیں۔اسی طرح دوسرے خلفائے راشدین حضرت عمر حضرت عثمان یا حضرت علیؓ کے خطبوں میں خواہ جمعہ و عیدین کے ہوں یا دیگر مواقع کے مضمون خطبہ میں اللہ اور رسول کے سوا نہ کسی اور کا ذکر ہوتا تھا اور نہ ہی صلوٰۃ و سلام میں کسی اور کا نام لیا جاتا تھا۔اور نہ اللہ جل شانہ، کے حکم صَلُّوا عَلیہ و سلّموا تسلیما کے تو تمام مصلی ایک آواز ہو کر اللّٰھُمَّ صَلِّ عَلیٰ مُحَمَّدٍ وآلِ مُحَمَّدٍ کہتے ہیں غیر اسلامی ذہن کی نشاندہی کرتا ہے۔

یوں بھی غور طلب ہے کہ جب اللہ کا حکم صَلُّوا عَلَیْہِ وَ سَلِّمُوا تَسْلِیْماً

سنایا جائے تو مسلمان الثا اللہ سے کہتے ہیں کہ: ۔اے اللہ تو محمد پر صلوۃ بھیج اور پھر اس دعا میں غیر نبی کو بھی شامل کر لیتے ہیں۔ (ڈاکٹر زاہد علی نے اس بات کی نشاندہی کی ہے)

جب عجمیوں نے صلوۃ میں غیر نبی کو شامل کرنے کی ابتدا کی تو کچھ مسلمانوں نے تو اس کو یہ کہہ کر قبول کر لیا کہ آل سے مراد امت مسلمہ ہے۔ کچھ نے آل محمد کے ساتھ اصحاب، ازواج و ذریات وغیرہ کو شامل کر دیا حالانکہ غیر نبی پر معین طور پر صلوۃ بھیجنے کا اللہ نے حکم نہیں دیا۔

دلائل الخیرات کے اکثر درود قرون ثلثہ کے بعد کے علماء کے بنائے ہوئے ہیں جیسے عبدالقادر جیلانی، شیخ ابو محمد عبدالحق ابن سبعین، امام محی الدین المعروف بجنید الیمن وغیرہ ان کا ذکر مطالع المسرت فی شرح دلائل الخیرات میں موجود ہے۔

دلائل الخیرات کو مطلق درود پر قیاس کرنا بھی صحیح نہیں ہے کیونکہ اس میں ایسے درود ہیں جن کے الفاظ رسول اکرمؐ سے منقول نہیں ہیں۔ اور ایسے الفاظ کے ساتھ جو رسول اکرمؐ سے مروی نہ ہوں درود پڑھنا درست نہیں۔

(فلسفہ آل محمد و کرامات درود شریف اور سبائی سبز باغ صفحات ۱۹۳ تا ۱۹۹ سے اقتباس)

ذکر

ذکر سہ حرفی مادہ ذکر سے مشتق ہے۔ جس کے لفظی معنی یاد کرنا۔ خیال کرنا غور کرنا تذکرہ کرنا۔ نصیحت کرنا۔ اور یاد دہانی کرنا ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی یاد کو ذکر کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ذکر یہ ہے کہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ ہی کا خیال دل و دماغ میں بسا رہے۔

رات دن ہر دم اسی کی لو رہے دل میں لگی

یعنی اللہ تعالیٰ کو حاضر و ناظر جانیں اور اللہ تعالیٰ کے قانون کو اور اس کے دئے ہوئے احکام کو ہمیشہ ملحوظ رکھیں۔ ظاہر ہے کہ اگر ذہن کی تربیت اس طرح ہو تو

انسان گناہوں سے دور ہو جاتا ہے اور اس پر نیکیوں کا غلبہ رہتا ہے۔ قرآن مجید کا ارشاد ہے:۔

وَاذكروا اللهَ كَثيرًا لَعَلَّكُم تُفلِحُون (قرآن ۸: ۴۵)

اور اللہ کا ذکر کثرت سے کرو تا کہ تم فلاح پاؤ۔

انسان کو چونکہ نطق یعنی گویائی عطا ہوئی ہے اس لئے انسان کے لئے ذکر سے مراد یہ بھی ہے کہ موقع بہ موقع اللہ کا نام زبان سے بھی لے۔

ذکر قرآن مجید کا تعارفی لفظ ہے۔ اس کو اصطلاح قرار دینا غیر درست ہے۔ صوفیا نے جس طرح اور اصطلاحات وضع کر لیں ذکر کو بھی اصطلاح قرار دے کر ایسے معنی پہنائے جو اصل سے مطابقت نہیں رکھتے اور ذکر کے ایسے ایسے طریقے بتائے جن کا جواز شریعت میں نہیں۔

اللہ تعالیٰ نے ذکر کا حکم دیا لیکن کوئی ہیئت نہیں بتائی نہ اس کا کوئی طریقہ متعین کیا نہ ہی رسول اکرمؐ نے ذکر کی کوئی صورت گری کی۔ اب اگر کوئی فرقہ ذکر کو اصطلاح قرار دے کر کسی خاص طریقہ پر اجتماع کے ساتھ ایک آواز پر اور مخصوص طریقہ پر ذکر کرنے کے رواج کی ابتدا کرے تو یہ بدعت کی تعریف میں آئے گا۔

علامہ ابو اسحاق شاطبی لکھتے ہیں:۔

جب شریعت نے کسی چیز کی ترغیب دی مثلاً۔ اللہ کا ذکر، سو اگر ایک گروہ اس کا التزام کرے کہ ایک زبان ہو کر ایک آواز سے ذکر کرتا ہے یا عام اوقات سے ہٹ کر کسی معلوم اور مخصوص وقت وہ ذکر کرتا ہے تو شریعت کی ترغیب اس معین تخصیص اور التزام پر ہر گز دلالت نہیں کرتی بلکہ اس کے خلاف دلالت کرتی ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود سے ایک روایت کا خلاصہ یہ ہے کہ:

ان کا گزر ایک مسجد میں ذاکرین کی ایک جماعت پر ہوا، جس میں ایک شخص کہتا تھا۔ سو مرتبہ اللہ اکبر پڑھو تو حلقہ نشین لوگ کنکریوں پر سو مرتبہ تکبیر کہتے۔ پھر وہ کہتا سو مرتبہ لاالہ الا اللہ پڑھو تو وہ سو مرتبہ تہلیل پڑھتے۔ پھر وہ کہتا سو مرتبہ سبحان اللہ کہو تو وہ کنکریوں پر سو دفعہ تسبیح پڑھتے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود نے پوچھا:۔ تم ان کنکریوں پر کیا پڑھتے ہو؟ وہ کہنے

لگے :۔ ہم تکبیر، تہلیل و تسبیح پڑھ رہے تھے۔ ابن مسعود نے فرمایا:۔ تم ان کنکریوں پر اپنے گناہ شمار کرو، میں اس کا ضامن ہوں کہ تمہاری نیکیوں میں سے کچھ بھی ضائع نہ ہو گی۔ تعجب ہے تم پر اے امت محمد کیا ہی جلد تم ہلاکت میں پڑ گئے۔ ابھی تک صحابہ اکرام تم میں بکثرت موجود ہیں۔ ابھی رسول اکرمؐ کے کپڑے پرانے نہیں ہوئے اور ابھی تک آپ کے برتن نہیں ٹوٹے اور تم بدعت اور گمراہی کا دروازہ کھولتے ہو؟

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے کسی جگہ بھی غیر اللہ کے ذکر کا حکم نہیں دیا۔ کیونکہ غیر اللہ میں تو کسی قسم کی بھی طاقت یا قوت نہیں ہے لیکن تصوف میں مختلف قسم کے اذکار کی تعلیم اور تلقین کی جاتی ہے۔ مثلاً

نظام القلوب مصنفہ شیخ نظام الدین چشتی اورنگ آبادی میں " ذکر پنج فرقی" کا طریقہ لکھا ہے کہ:

سیدھی جانب منہ کر کے یا محمدؐ۔ بائیں جانب منہ کر کے یا علی۔ اوپر دیکھ کر یا فاطمہ، سامنے منہ کر کے یا حسن اور دل میں یا حسین کہے۔

ہندوؤں کا پنج جنا جپ بھی ایک دیوی سیتاجی اور چار بزرگوں کے ناموں کا ذکر جہری ہے جو ایک خاص شکل میں بیٹھ کر سورج دیوتا کی طرف منہ کر کے کیا جاتا ہے اور آخری ذکر میں بائیں طرف سر جھکا کر قلب پر ضرب لگائی جاتی ہے۔

(فلسفہ آل محمد و کرامات درود شریف سے اقتباس)

ذوالفقار

ہجرت نبوی کے دوسرے سال معرکہ بدر پیش آیا۔ اس میں مشرکین مکہ کے ستر آدمی مارے گئے۔ اور تقریباً اتنے ہی قیدی مسلمانوں کے ہاتھ لگے۔ قتل ہونے والوں میں منبہ بن حجاج بھی تھا جیسے سیرت ابن ہشام کے مطابق حضرت حمزہ اور حضرت سعد بن ابی وقاص نے قتل کیا۔ ذوالفقار نام کی تلوار اسی مشرک کی تھی جو اس موقع پر مال غنیمت میں حاصل ہوئی اور رسول اکرمؐ نے اپنے لئے مخصوص فرمالی۔

اس پر تو اتفاق ہے کہ ذوالفقار بدر کے مال غنیمت میں ہاتھ آئی، اس میں البتہ اختلاف ہے کہ یہ پہلے کس کی ملک تھی۔ ایک قول ہے کہ وھب بن منبہ کی تلوار تھی ایک قول ہے کہ منبہ بن الحجاج کی تھی۔ ایک قول یہ ہے کہ عاص بن منبہ بن الحجاج کی تھی ایک قول یہ بھی ہے کہ حجاج بن علاط نے رسول اکرمؐ کو بطور ہدیہ دی تھی۔

طبقات ابن سعد میں لکھا ہے کہ رسول اکرمؐ کو بطور ہدیہ دی تھی۔

طبقات ابن سعد میں لکھا ہے کہ رسول اکرمؐ نے شمشیر ذوالفقار اپنے حصہ سے زائد لے لی۔ جو منبہ بن حجاج کی تھی۔ شیعہ مورخ طبری نے بھی یہی لکھا ہے۔

امام ابن تیمیہ لکھتے ہیں ذوالفقار علیؓ کی نہیں ابو جہل کی ایک تلوار تھی جسے مسلمانوں نے جنگ بدر کے دن مال غنیمت میں حاصل کیا۔

ہو سکتا ہے کہ متذکرہ اشخاص میں سے کسی نے اسے بطور اعزازی تلوار سردار مکہ (ابو جہل) کی خدمت میں پیش کی ہو۔ ابو جہل نے جنگ بدر میں اس کو استعمال کیا ہو۔ رسول اکرمؐ نے بھی اس کو اپنے قبضہ میں اسی لئے رکھا ہو گا کہ شمشیر ذوالفقار مشرکین مکہ میں سے کسی نے اپنے سربراہ کی خدمت میں بطور اعزاز دی تھی۔ مال غنیمت میں حاصل ہونے کے بعد مسلمانوں کے سربراہ کے پاس رہنا ہی مناسب تھا۔

خواہ اصل مالک کوئی رہا ہو یہ بات تو قطعی ہے کہ یہ تلوار کسی مشرک کی تھی اور مسلمانوں کے خلاف استعمال کرنے لائی گئی تھی اور اس کے مشرک مالک نے اس کا نام ذوالفقار رکھا تھا۔

عرب کسی چیز کا نام رکھتے تو مسمی کی نمایاں خصوصیات کو نام سے ظاہر کرتے عربی میں "فقر" اس گڑھے کو کہتے ہیں جس میں گہرائی ہو۔ نیز ریڑھ کی ہڈی میں جڑے ہوئے مہروں کے اتار چڑھاؤ کو بھی "فقار" کہتے ہیں اس تلوار میں آرائش و زیبائش کے لئے اوپر کی جانب کنگورے بنائے گئے تھے۔ اسی لئے ذوالفقار یعنی "کنگورے دار" نام دیا گیا۔

طبقات ابن سعد سے معلوم ہوتا ہے کہ جنگ احد کے موقع پر رسول اکرمؐ نے اپنی ایک تلوار ابو دجانہ انصاری کو دی تھی۔ لیکن ذوالفقار کسی کو نہیں دی گئی۔ یہ

ہمیشہ رسول اکرمؐ کے پاس رہی۔اس کا واضح اور ناقابل تردید ثبوت یہ ہے کہ آپ کی وفات کے بعد آپ کے متروکہ ہتیاروں میں ذوالفقار بھی یکے بعد دیگرے حضرت ابو بکر صدیقؓ حضرت عمرؓ حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ تک پہنچی۔

رسول اکرمؐ یا آپ کے بعد تین صحابہ کے دور میں اس تلوار کو استعمال کرنے کی شہادت نہیں ملتی۔کیونکہ سربراہ مسلمانوں کی قیادت کرتے تھے جنگوں میں راست تلوار کو استعمال کرنے کا موقع کم ہی ملتا تھا۔اس لئے تیس سال سے زائد عرصہ تک مستور رہنے کے بعد جب ذوالفقار حضرت علیؓ کے ہاتھ میں آئی تو اسلامی فتوحات کے لئے استعمال ہونے کے بجائے سازشیوں اور معاندین اسلام کی بپا کردہ خانہ جنگی میں مسلمانوں کے بے محابہ قتل عام کی ترغیب و تحریک کے لئے استعمال ہوئی۔یہی وجہ ہے کہ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد عجمی اثرات کے تحت اچانک ذوالفقار نمودار ہوئی۔اس کی اہمیت اور فضلیت کی من گھڑت اور بے سروپا باتوں کو رواج دیا گیا۔

ایک داستان اس طرح بیان کی جاتی ہے کہ ابو رافع فرماتے ہیں کہ جنگ احد میں رسول اکرمؐ کا علم حضرت علیؓ کے پاس تھا اور مشرکین کا طلحہ بن ابی طلحہؓ کے پاس حضرت علیؓ نے مشرکین کے علمبردار کو قتل کیا۔نو افراد نے یکے بعد دیگرے جھنڈا سنبھالا اور حضرت علیؓ نے ہر ایک کو قتل کیا۔جبرئیلؑ نے رسول اکرمؐ سے پوچھا آپ یہ کارنامے دیکھ رہے ہیں؟ رسول اکرمؐ نے جواب دیا میں اس سے ہوں اور یہ مجھ سے پھر ہمیں آسمان سے ایک آواز آئی۔

لا فتیٰ الا علی ولا سیفَ الا ذوالفقار

علی کے سوا کوئی جوان نہیں اور ذوالفقار کے سوا کوئی تلوار نہیں

ابو رافع رسول اکرمؐ کے غلام تھے۔یہ پہلے حضرت عباسؓ کے غلام تھے۔۸ھ میں اسلام قبول کرنے کے بعد حضرت عباسؓ نے انہیں حضورؐ کی خدمت میں پیش کر دیا۔اس طرح یہ حضورؐ کی غلامی میں ۸ھ کے بعد آئے۔جو واقعہ ان کی جانب منسوب کیا گیا ہے۔وہ شوال ۳ھ کا ہے۔جنگ احد کے وقت ابو رافع مکہ میں تھے۔اسی سے صاف ظاہر ہے کہ یہ روایت من گھڑت ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جنگ احد میں علم حضرت مصعب بن عمیر کو دیا گیا تھا جو اسی جنگ میں شہید ہوئے۔جنگ کی ابتداء میں کفار کے دو علمبردار قتل ہوئے۔ایک کو حضرت علیؓ اور دوسرے کو حضرت حمزہؓ نے قتل کیا۔اس کے بعد عام جنگ شروع ہوئی۔مشرکین کے جو علمبردار قتل ہوئے ان کے قاتل کا کوئی علم نہیں۔جو تفصیل شیعہ مورخ ابن جریر طبری نے دی ہے یہ ہے:۔

150

ایک روایت حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی جانب منسوب کی جاتی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ احد کے روز آسمان سے ایک ندا آئی۔**لَا فَتیٰ اِلَّا عَلی وَلَا سَیفَ اِلَّا ذُوالفقَار** حالانکہ حضرت ابن عباسؓ کی عمر جنگ احد کے وقت پانچ چھ سال کی تھی اور وہ اس وقت مکہ میں تھے۔

ایک داستان یہ بھی ہے کہ حضرت علیؓ بدر کے کنویں میں کود گئے۔جس میں جنات کا بسیرا تھا۔انہیں ذوالفقار سے قتل کر کے زمین کے اندر سرزمین عراق پہنچ گئے اور وہاں کفار سے جنگ کر کے انہیں مسلمان کیا۔

اس داستان کے لغو ہونے کا قطع نظر اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ عراق کے کفار بہت پہلے ہی مسلمان ہو چکے تھے۔حضرات ابو بکرؓ عمرؓ اور عثمانؓ کے دور میں عراق پر حملے ہوئے اور انہوں نے اس کو فتح کیا حضرت علی نے اہل عراق کو قتل کیا تو دراصل مومنین کو قتل کیا۔

حافظ محمد بن عبدالرحمن السخاویؒ (وفات ۹۰۲ھ) لکھتے ہیں۔یہ قول کہ ذوالفقار کے علاوہ کوئی تلوار نہیں ایک تابعی باقر کا قول ہے جو حسن بن عرفہ نے اپنے رسالہ میں ایک واہی سند سے نقل کیا ہے یعنی عمار بن محمد کے ذریعہ سعد بن طریف الحنظلی الکوفی سے اور اس نے باقر سے کہ بدر کے روز آسمان سے یہ ندا آئی محب الطبری نے الریاض النضرہ میں حضرت علیؓ کے مناقب میں اس کا ذکر کیا۔

ایک روایت ہے کہ امام رضا سے پوچھا گیا کہ ذوالفقار کہاں سے آئی تھی تو فرمایا کہ جبریل آسمان سے لائے تھے۔اس کا قبضہ چاندی کا تھا (الشافی ترجمہ اصول کافی

اصول کافی کے بموجب رسول اکرمؐ کا تمام ترکہ حضرت علیؓ کو ملا۔پھر وراثتاً چلتا

رہا ۔ جب حضرت حسینؓ کربلا جانے لگے تو یہ متروکات ام المومنین ام سلمہ کے پاس رکھوائے بعد میں زین العابدین نے آکر ان متروکات کو حاصل کیا ۔ (الشافی) اس طرح کربلا میں ذوالفقار حضرت حسین کے پاس نہ تھی ۔

ایک شیعی روایت یہ ہے کہ ذوالفقار کو جبرئیل آسمان سے لے کر رسول اللہ کے پاس آئے اور اللہ کا یہ ارشاد آپ کو پہنچایا کہ ہم نے تمام دنیا میں دیکھا مگر اس تلوار کا اہل سوائے علیؓ کے کوئی نظر نہیں آیا ۔ اس لئے آپ یہ تلوار جناب علیؓ کو عطا کر دیں ۔

ان روایات پر کسی تبصرہ کی ضرورت نہیں ۔

(رسالہ ذوالفقار از محمد عظیم الدین صدیقی سے اقتباس)

رافضی

رفض کے لغوی معنی توقع پاکر آنا اور خطرہ پاکر بھاگ جانا ہیں ۔ عربی کی مشہور لغت " منتہی الارب " کے بموجب رافضہ اس لشکر کو کہتے ہیں جس نے اپنے سردار کو چھوڑ دیا ہو، اور اس سے سرکشی پر آمادہ ہو ۔

نایاب عربی لغت " المنجد " کے بموجب " رافضہ وہ جماعت ہے جس نے اپنے قاید کا ساتھ لڑائی میں چھوڑ دیا ۔ جنگ کے علاوہ بھی ان لوگوں نے اس قسم کی حرکتیں کی تھیں ۔ "

لغت کے بموجب رفض کے معنی ترک مذہب کے نہیں بلکہ جو شخص بھی اپنے سردار کا ساتھ چھوڑ دے، عربی زبان کی رو سے رافضی کہا جاسکتا ہے ۔ مذہبی ادب میں شیعہ اور رافضی مترادف الفاظ کے طور پر استعمال ہوتے ہیں اور یہ نام شیعہ فرقہ ہی کے لئے مختص ہو چکا ہے ۔

شیعوں کو اہل سنت الجماعت رافضی کہتے ہیں تو وہ ناراض ہوتے ہیں لیکن یہ اس دور کی بنائی ہوئی اصطلاح نہیں بلکہ اہل عرب کا اور ائمہ شیعہ کا فرمودہ ہے ۔

شیعہ مذہب کے ایک معتبر راوی ابونصیر نے ایک دن جعفر صادق سے کہا مسلمانوں نے ہمارا نام بہت برا رکھا ہے تو امام جعفرؒ نے پوچھا کیا مسلمان تم لوگوں کو رافضی کہتے ہیں ۔ ابونصیر نے کہا: جی ہاں ۔

جعفر صادق نے کہا: ۔ تمہارا یہ نام ان لوگوں نے نہیں رکھا بلکہ اللہ نے رکھا ہے ۔ (فروغ کافی)

رسالہ " اصلاح " کھجوہ ، ضلع سارن میں شیعی عالم حکیم محمد جعفر بنارسی کا مضمون شائع ہوا جس میں انہوں نے بہ تصریح یہ لکھا تھا کہ: ۔

" فرقہ حقہ امامیہ کا تولائی نام شیعہ اور تبرائی نام رافضہ ہے "

تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت علیؓ کے عہد میں عبداللہ بن سبا کے پروپیگنڈوں سے ایک گروہ پیدا ہوا تھا جو خود کو شیعان علیؓ کے نام سے یاد کرتا تھا اور محبت اہل بیت کا دعوی دار تھا ۔ مرکز گریزی اور فتنہ پروری ان کا مقصد تھا ۔ چنانچہ یہ لوگ جمل اور صفین کے معرکوں میں پیش پیش رہے ۔ جب جان کی بازی لگی تو حضرت علیؓ سے کنارہ کش ہوگئے ۔ بعض سخت گیر افراد نے خارجیت کی داغ بیل ڈالی اور بعض پھر اپنی قدیم روش پر آگئے اور شیعان علیؓ کہلانے لگے ۔ یہ جماعت بہت لالچی اور بزدل تھی ۔ فساد افترا سے ان لوگوں کا خمیر تیار ہوا تھا ۔ اتحاد بین المسلمین سے ان کے سینے خالی تھے ۔ اسی جماعت کے کرتوت کا نتیجہ کربلا کا خونین معرکہ تھا ۔

اس جماعت نے ہشام بن عبدالملک (۱۰۵ - ۱۲۵ ہجری) کے زمانہ میں زید بن زین العابدین کو ورغلانا شروع کیا کہ حضور آپ حکومت وقت کے خلاف علم جہاد بلند فرمائیے ۔ ہم آپ کے اور آپ کے باپ دادا کے شیعہ ہیں ۔ اس وقت ہماری جماعت بھی بہت بڑی ہے ۔ ہم آپ کے قدموں پر اپنی جانیں نثار کرنے کو تیار ہیں ۔ غرض زید کو خوب سبز باغ دکھائے ۔

نیرنگی وقت کہ زید بار بار تجربہ کے باوجود پھر ان کے دھوکہ میں آگئے اور مرکزی حکومت کے خلاف اعلان جنگ کر دیا ۔ چالیس ہزار شیعوں نے زید کے ہاتھ پر بیعت کی اور اقرار کیا کہ ہم تادم آخر آپ کا ساتھ نہیں چھوڑیں گے ۔ جب یہ خبر مشہور ہوئی تو مخلص مسلمانوں نے جاجاکر زید کو سمجھانا شروع کیا کہ یہ آپ کیا کر رہے ہیں

اور کن جعل سازوں کی باتوں میں آرہے ہیں۔یہ آپ دیکھ چکے ہیں کہ آپ کے باپ دادا کے ساتھ انہوں نے کس قسم کے سلوک کئے تھے یہی تو وہ جماعت ہے جس نے حسینؓ کو کربلا میں بلا کر اپنے ہاتھوں شہید کیا۔ان تجربات کے بعد بھی پھر آپ ان لوگوں کے وعدوں کا اعتبار کیوں کرتے ہیں۔مگر زید نے ان مخلصوں کی بات نہ سنی اور شیعوں کے پھندے میں آگئے۔اور مسلمہ بن کہیل سے کہا، نہیں یہ چالیس ہزار افراد میرے اور میرے باپ دادا کے شیعہ ہیں۔یہ کہہ کر خروج کر دیا۔

عین اس وقت جب کہ دونوں طرف کے لشکر صفیں باندھ رہے تھے۔چند شیعہ اٹھے اور انہوں نے زید سے پوچھا:۔ شیخین کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے اور شیخین پر تبرا کرنے کو کہا زید نے انکار کیا اور کہا:۔

وہ دونوں میرے نانا کے وزیر تھے۔اور کہا کہ، نیکیوں کے سوا کسی بری بات کو ان کی طرف منسوب کرنا اچھا نہیں سمجھتا۔یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ بعض اکابر شیعہ نے بیعت فسق کر دی اور یہ کہتے ہوئے میدان سے ہٹ گئے کہ ہم کو ایسے امام کی ضرورت نہیں۔ہم مدینہ جاتے ہیں اور وہاں جعفر صادق کو امام بنالیں گے۔

شیعوں کے اس رفض اور شکست عہد سے زید بہت افسردہ خاطر ہوئے اور بے ساختہ ان کی زبان سے یہ الفاظ نکلے "یَاقومِ اِنَّکُم رَفَضتُمونِی" یعنی اے قوم تو مجھ سے سرکش ہو گئی صرف پانچ سو آدمی ان کے ساتھ باقی رہے۔زید نے جنگ جاری رکھی۔اور ناکام ہو کر اپنی جان دیدی۔اس طرح پہلی مرتبہ لفظ رافضی وجود میں آیا۔

رجب کے کونڈے

برصغیر کے کمزور عقیدہ اہل سنت والجماعت میں رجب کے کونڈوں کی بدعت رائج ہے یعنی بائیس رجب کو کھیر اور پوریاں بنا کر حضرت جعفر صادق کے نام سے فاتحہ دیتے ہیں یعنی اس کو حضرت جعفر صادق کی نیاز کا نام دیا گیا۔اس نیاز میں اس

بات کا اہتمام کیا جاتا ہے کہ فاتحہ مکان کے اندرونی حصہ میں پس پردہ ہو اور کھیر اور پوریوں کو گھر سے باہر نہ لے جایا جائے ہاتھ بھی گھر کے اندر ہی دھونے کا اہتمام کیا جاتا ہے۔

اگر تاریخی اعتبار سے دیکھیں تو حضرت جعفر صادق کی زندگی کا کوئی اہم واقعہ بائیس رجب سے تعلق نہیں رکھتا۔ان کی پیدائیش آٹھ رمضان ۸۰ھ کو اور وفات شوال ۱۴۸ھ میں ہوئی۔حقیقت تو یہ ہے کہ منافقوں کو حضرت معاویہ کے انتقال کے بعد ہی کھل کر ریشہ دوانیاں کرنے کا موقع ملا۔اس لئے ان کا انتقال رافضیوں کے لئے باعث مسرت ہوا اور انہوں نے حضرت معاویہ کی وفات کے دن کو اپنے لئے خوشی کا دن قرار دیا۔رسول اکرمﷺ کے برادر نسبتی اور کاتب وحی امیر المومنین حضرت معاویہ بن ابی سفیان کی وفات ۲۲ رجب ۶۰ھ کو ہوئی یعنی جعفر صادق کی پیدائش سے پہلے۔رافضیوں نے ابتداء میں اہل سنت والجماعت سے ڈر کر اس بدعت کو اس طرح رائج کیا کہ اس میں رازداری برتی۔تاکہ حضرت امیر معاویہ کے یوم وفات کو خوشی کا دن قرار دینے کا راز ظاہر نہ ہو انہوں نے نہایت چالاکی سے رفتہ رفتہ اس بدعت کو اہل سنت والجماعت میں رائج کر دیا لیکن اس خوبی کے ساتھ کہ آج تک اہل سنت اس بات سے پوری طرح واقف نہیں کہ آخر اس نیاز کو بائیس رجب ہی کو کیوں انجام دیا جاتا ہے۔برصغیر میں خفیہ طریقہ پر یہ سلسلہ لکھنؤ سے شروع کیا گیا گھر گھر میٹھا پکوان اہتمام سے تیار کیا جاتا ہے اور شرط ہوتی ہے کہ گھر سے باہر وہ سامان خورد نوش نہ جانے پائے۔جب بکثرت گھروں میں یہ سلسلہ جاری ہوا اور اس کی نوعیت دریافت کی جانے لگی تو کہہ دیا گیا کہ یہ حضرت جعفر صادق کی فاتحہ ہوتی ہے۔جو شخص یہ فاتحہ کرے اس کی مرادیں پوری ہوتی ہیں۔(عترت رسول صفحہ ۲۳)

اس بدعت کے ساتھ جو عجیب کہانی جوڑ دی گئی ہے۔اس سے خود اس نیاز کو جاری کرنے کا حقیقی مقصد سامنے آتا ہے۔

اس عجیب کہانی کا آغاز یوں ہوتا ہے کہ ایک غریب لکڑہارا رہتا تھا۔وہ تنگ دستی سے پریشان ہو کر کمائی کی خاطر پردیس چلا گیا۔بارہ برس تک باوجود محنت کے اس کی حالت نہ سدھر سکی۔اس کی غیر موجودگی میں اس کی بیوی اور زیادہ پریشان

ہو گئی وہ اور اس کے بچے فاقوں کی زندگی گذارنے لگے۔ لکڑہارن نے مجبور ہو کر مدینہ کے وزیر کے گھر ملازمت کر لی۔ لیکن شوہر کی گھر سے دوری کی وجہ سے وہ بہت غمگین رہا کرتی تھی۔ ایک دن لکڑہارن وزیر کی ڈیوڑھی میں صفائی کر رہی تھی وہاں حضرت جعفر صادق کا گذر ہوا۔ انہوں نے رک کر اپنے ساتھیوں سے پوچھا کہ یہ کونسا مہینہ ہے اور آج کونسی تاریخ ہے۔ عقیدت مندوں نے عرض کیا یہ رجب کا مہینہ ہے اور بائیسویں تاریخ ہے۔ جعفر صادق نے پوچھا کہ تم کو معلوم ہے کہ بائیس رجب کی کیا فضیلت ہے؟ عقیدت مندوں نے عرض کیا کہ آپ ہی بہتر جانتے ہیں۔ ارشاد ہوا اگر کوئی گردش روزگار سے کسی مصیبت میں مبتلا ہو یا رزق کی تنگی ہو یا اس کی کوئی اور حاجت پوری نہ ہو رہی ہو تو اس کو چاہئے کہ بائیس رجب کو نہا دھو کر عقیدت کے ساتھ بازار سے نئے مٹی کے کونڈے لا کر انہیں گھی میں تلی ہوئی خستہ پوریوں سے بھرے۔ پھر صاف چادر بچھا کر کونڈوں کو اس چادر پر رکھے اور پورے اعتقاد کے ساتھ میری فاتحہ کروائے اور میرا وسیلہ لے کر اللہ سے دعا مانگے تو اس کی ہر مشکل دم کے دم میں پوری ہو جائیگی۔ اگر اس عمل کے بعد بھی کسی کی مراد پوری نہ ہو تو وہ قیامت کے دن میرا دامن پکڑ کر مجھ سے باز پرس کر سکتا ہے۔ لکڑہارن کو گردش روزگار سے نجات حاصل کرنے کا گُر معلوم ہوا تو اس نے بھی نہایت عقیدت سے کونڈے بھرے اور حضرت جعفر کی فاتحہ کروا کر ان کے وسیلہ سے اپنی پریشانیوں کے خاتمہ کی دعا کی۔ ادھر لکڑہارن یہ دعا مانگ رہی تھی ادھر لکڑہارے کو جنگل میں لکڑیاں کاٹتے ہوئے ایک بڑا شاہی دفینہ مل گیا۔ مختصر یہ کہ کونڈوں کی برکت سے لکڑہارے کے دن پھر گئے اور وہ بڑی شان و شوکت سے مدینہ پہنچا اور وزیر کے محل کے پاس ایک عالی شان مکان تعمیر کروا کر امیرانہ زندگی بسر کرنا شروع کر دیا۔ وزیر کی بیگم کو اس بات کی خبر نہ ہوئی کہ اس کے محل کے پاس ایک لکڑہارے نے اپنا شاندار مکان تعمیر کروایا ہے۔ ایک دن جب وزیر کی بیگم بالاخانے پر چڑھیں تو انہوں نے یہ مکان دیکھا۔ تحقیق کروائی کہ اتنا بڑا مکان اچانک کیسے تعمیر ہو گیا اور کس کا ہے۔ جب معلوم ہوا کہ یہ اسی لکڑہارن کا مکان ہے جو آپ کے پاس خادمہ رہ چکی ہے تو اس کو بلوایا اور حقیقت حال دریافت کیا۔ لکڑہارن پوری داستان بے کم و کاست بیان

کر دی اور کہا کہ یہ حضرت جعفر صادق کے نام کے کونڈوں کی برکت ہے۔ وزیر کی بیگم نے مسکرا کر کہا تیری باتیں دل کو نہیں لگتیں بھلا کونڈوں کا بھرنا بھی کوئی کارنامہ ہے جو آدمی کو زمین سے اٹھا کر آسمان تک پہنچا دے۔ مجھے تیری بات پر یقین نہیں آتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ تیرے شوہر نے کہیں ڈاکہ ڈال کر یہ دولت حاصل کی ہے ادھر وزیر کی بیگم یہ باتیں کر رہی تھی ادھر اس کے شوہر پر جو بڑا وزیر تھا بادشاہ کا عتاب نازل ہوا۔ ہوا یہ کہ چھوٹے وزیر نے موثر طریقہ پر کان بھرے کہ بڑا وزیر خائن ہے اور اس نے بادشاہ کی بڑی دولت اپنے قبضہ میں کر رکھی ہے۔ اگر یقین نہ آئے تو اس کا حساب لیا جائے۔ بادشاہ نے بڑے وزیر کو معزول کر دیا اس کی ساری جائیداد ضبط کر کے اسے شہر بدر کر دیا۔ وزیر اپنی بیگم کے ساتھ روانہ ہوا۔ اس کی جیب میں ایک پیسہ بھی نہ تھا۔ صرف دو درہم کسی طرح بیگم کے پاس رہ گئے تھے۔ راستہ میں ایک خربوزہ خرید لیا اور اسے رومال میں باندھ لیا کہ بھوک لگنے کی صورت میں کام آئے۔ جس دن وزیر کو شہر بدر کیا گیا اسی دن شہزادہ شکار کو گیا شام تک واپس نہ آیا تو بادشاہ کو تشویش ہوئی۔ چھوٹے وزیر نے عرض کیا کہ جس راستہ سے شہزادہ شکار کو گیا تھا اسی راہ سے معزول وزیر بھی گیا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ شہزادہ کو کوئی گزند نہ پہنچائے۔ بادشاہ نے سواروں کو دوڑایا اور دم کے دم میں بڑے وزیر کو گرفتار کر کے بادشاہ کے پاس لایا گیا۔ بادشاہ نے پوچھا یہ تمہارے رومال میں کیا ہے۔ معزول وزیر نے عرض کیا خربوزہ ہے۔ جب رومال کھول کر دیکھا تو خربوزہ کی جگہ خون میں لتھڑا ہوا شہزادہ کا سر تھا۔ اب تو شاہی غصہ کی انتہا نہ رہی۔ حکم ہوا کہ دونوں کو جیل بھیج دیا جائے اور صبح سویرے انہیں پھانسی دیدی جائے۔ یہ دونوں بے گناہ جیل پہنچ کر سخت پریشان ہوئے کہ نہیں معلوم ہم سے کونسی خطا سرزد ہوئی کہ اتنی بڑی مصیبت سر پر آ گئی۔ معزول وزیر نے اپنی بیگم سے پوچھا کہ آخر کیا بات ہے۔ بیگم نے کہا کہ مجھ سے کوئی گناہ سرزد نہیں ہوا البتہ کچھ دن ہوئے میں نے حضرت جعفر کے کونڈوں پر ایمان لانے سے انکار کیا تھا۔ پھر بیگم نے لکڑہارے کی پوری داستان سنائی۔ اس کے بعد وزیر اور اس کی بیگم نے توبہ کی اور کونڈے بھرنے کی منت مانی۔ ادھر ان دونوں نے امام کا وسیلہ پکڑا اور ادھر شہزادہ صحیح سلامت گھر آ گیا۔ رومال کو کھول کر دیکھا گیا

تو اس میں خربوزہ نکلا۔ بادشاہ نے وزیر اور اس کی بیگم کو رہا کر دیا اور ان سے پوچھا کہ یہ سب کیا ماجرا تھا تو وزیر نے لکڑہارے کی پوری داستان سنادی۔

اس عجیب داستان میں شروع سے آخر تک دشمنان اسلام کی شکست خوردہ ذہنیت کار فرما صاف نظر آتی ہے۔ رزق کی فراہمی اور حاجت روائی سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کوئی نہیں کر سکتا۔ ان امور کے لئے کسی کو وسیلہ بنانا دراصل اسلام کے بنیادی عقیدہ کی نفی کرنا ہے۔

شکست خوردہ دشمن نے جب یہ دیکھا کہ مسلمانوں کو میدان میں شکست نہیں دی جا سکتی تو اس نے مسلمانوں کے عقیدہ توحید ہی پر ضرب لگائی۔ جو اس کہانی میں صاف نظر آتی ہے۔ جعفر صادق اللہ کے حضور میں عجز و انکساری کے ساتھ دعا مانگنے کی تعلیم تو دے سکتے تھے لیکن یہ کبھی نہیں کر سکتے تھے اپنے نام کی منت منوائیں اور پھر یہ کہیں کہ اگر مراد پوری نہ ہو تو قیامت کے دن میرا دامن پکڑ کر مجھ سے بازپرس کر سکتے ہو۔ یہ دعویٰ تو کسی نبی نے بھی نہیں کیا تو رسول اکرمؐ کی اولاد میں پیدا ہونے والا ایک بزرگ کیسے کر سکتا ہے۔ یہ دراصل جعفر صادق کے نام پر گھڑی ہوئی ایک غلط روایت ہے جو عقائد باطلہ کو فروغ دینے کے لئے رائج کی گئی یعنی اس کے بموجب اللہ تبارک و تعالیٰ کے حضور میں سجدہ ریز ہونے کے بجائے حضرت جعفر کے نام کے کونڈوں کی منت مان لینا ہی کافی ہے۔

اس واقعہ کو حضرت جعفر صادق کے زمانہ کا بتلایا جاتا ہے ان کے زمانہ میں خلافت کا مرکز مدینہ منورہ نہیں رہا۔ اور نہ مدینہ منورہ کسی بادشاہ کا دارالسلطنت رہا۔ قصہ گو نے بادشاہ اور وزیر کا جو ذکر کیا ہے اس سے اس داستان کا جھوٹ ہونا ثابت ہوتا ہے۔

لکڑہارن کی منت مانتے ہی لکڑہارے کو دفینہ مل جانا اور وزیر کے گھر کے سامنے عالی شان محل کا تعمیر ہو جانا اور وزیر کی بیوی کو اس کی کانوں کان خبر نہ ہونا۔ خربوزہ کا شہزادہ کا سر بن جانا اور پھر اپنی اصلی حالت پر واپس آجانا یہ سب باتیں عقل و فہم کے خلاف ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی جن یا بھوت کی کہانی ہے۔ اس کے قطع نظر کہ فاتحہ درست ہے یا نہیں جو رواج ہے وہ تو یہ ہے کہ کسی کے مرنے کے

اس کے نام سے فاتحہ دالوی جاتی ہے۔ اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ فاتحہ زندوں کا بھی ہو سکتا ہے کیوں کہ لکڑہارن نے جعفر صادق کی زندگی ہی میں ان کی فاتحہ کی۔

میدان حشر میں سب انسان مادر زاد ننگے ہوں گے لیکن امام صاحب کے پاس لباس ہوگا اور ایسا دامن ہوگا جو پکڑا جا سکے۔

(رسالہ جات " کونڈوں کی حقیقت " " رجب کے کونڈے " " رجب کے کونڈے تحقیقی مقالہ " اور عترت رسول صفحہ ۲۳ سے اقتباس)

رجعت

اہل باطل کے پاس مسئلہ رجعت یہ ہے کہ:

جب امام مہدی ظاہر ہوں گے تب پیغمبر صاحب زندہ ہوں گے اور سارے اچھے اور پاک لوگ زندہ ہوں گے۔ حضرت خاتون جنت زندہ ہوں گی۔ حضرت علیؓ زندہ ہوں گے۔ اس وقت خلفائے ثلاثہ قبروں سے نکالے جائیں گے اور ان پر مقدمہ دائر ہوگا۔ ایک طرف حضرت علیؓ اپنا دعویٰ پیش کریں گے کہ میری خلافت غصب کی دوسری جانب فاطمہؓ مدعی ہوں گی کہ مجھے مجروح کیا۔ محسن کو شہید کیا۔ باغ فدک کو چھینا۔ بعد ثبوت یہ حکم ہوگا کہ یہ لوگ درخت سے لٹکائے جاویں اور ان کو پھانسی دی جائے اور ایسی خرافات اور واہیات باتیں لکھی ہیں کہ الامان۔ غرض اس وقت [illegible] وعدہ پورا ہوگا اور خلفائے ثلاثہ کی ذلت کامل ہو کر لوگوں پر ان کے نفاق کا حال کھلے گا۔

اہل باطل مسئلہ رجعت کی نسبت لکھتے ہیں کہ:۔

مسئلہ رجعت اثنا عشریہ کا خاص عقیدہ ہے۔ دوسرے تمام فرقے اس پاک اور نیک عقیدے سے محروم ہیں جو ان کی بدنصیبی ہے۔ (" ایرانی انقلاب امام خمینی اور شیعیت " سے اقتباس)

رجعت کا عقیدہ بھی شیعہ حضرات کے مخصوص عقائد میں سے ہے۔ یہ بھی عقیدہ امامت کا شاخسانہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ امام مہدی جب ظاہر اور غار سے برآمد ہوں گے تو اس وقت رسول اکرمؐ، حضرت علیؓ، سیدہ فاطمہؓ اور حضرت حسنؓ و حسینؓ تمام ائمہ اور تمام خواص مومنین زندہ ہو کر اپنی قبروں سے باہر آئیں گے اور امام مہدی کی بیعت کریں گے۔ سب سے پہلے رسول اکرمؐ اور حضرت علیؓ بیعت کریں گے۔ ابو بکرؓ، عمرؓ، اور عائشہؓ اور ان سے تعلق رکھنے والے کفار و منافقین بھی زندہ ہوں گے اور امام مہدی ان کو سزا دیں گے۔

"تحفۃ العلوم" میں عقیدہ رجعت کا بیان ان الفاظ میں کیا گیا ہے

"رجعت پر ایمان لانا واجب ہے یعنی جب امام مہدی ظہور فرمائیں گے اس وقت مومن خاص اور کافر منافق مخصوص زندہ ہوں گے اور ہر ایک اپنی داد اور انصاف کو پہنچے گا اور ظالم سزا پائے گا"۔

قرآن مجید کے بموجب مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ:۔ مرنے کے بعد تمام انسان قیامت میں ہی زندہ کئے جائیں گے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے جزا و سزا کا فیصلہ ہوگا۔

لیکن فرقہ باطلہ کے نزدیک قیامت سے پہلے امام مہدی کے ظہور پر بھی چند مخصوص افراد کو زندہ کیا جائے گا اور سزا و عذاب دینے والے خود امام مہدی ہوں گے اس طرح وہ خداوندی صفت "عزیز ذوانتقام" کے بھی حامل ہوں گے۔

رسول اکرمؐ صلوٰۃ میں
کس کو کاندھے پر بٹھاتے تھے

شیعہ اور شیعیت زدہ اہل سنت حضرات کا خیال ہے کہ رسول اکرمؐ، حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کو صلوٰۃ کے دوران کاندھے پر بٹھاتے تھے حالانکہ حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کی پیدائش تک صلوٰۃ میں عمل کثیر کو منع کر دیا گیا تھا

رسول اکرمؐ کی بڑی صاحبزادی سیدہ زینب ۲ھ کے شروع میں مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ آگئیں۔ ان کے آنے کے چند ماہ بعد ہی حضرت فاطمہ اور حضرت ام کلثوم کی رخصتی ہوئی۔

حضرت زینبؓ اور ان کے دونوں بچے حضرت علی اور حضرت امامہ ۳ھ سے چار برس تک یعنی حضرت زینبؓ کے شوہر حضرت ابو العاصؓ کے مدینہ آنے تک رسول اکرمؐ کے ساتھ ان کے گھر میں رہے۔

رسول اکرمؐ اپنے حجرے میں صلوٰۃ ادا کرتے تو یہ دونوں نواسے، نواسی، کھیلتے رہتے۔ حضرت امامہ چھوٹی تھیں۔ سجدہ کی حالت میں رسول اکرمؐ کی پشت پر چڑھ جاتیں۔

حضرت ابو قتادہ انصاری سے روایت ہے کہ رسول اکرمؐ صلوٰۃ کی حالت میں انھیں اپنی گردن پر بٹھائے ہوتے۔ جب آپ سجدہ میں جانے کا ارادہ فرماتے تو انھیں نیچے اتار دیتے اور جب کھڑے ہوتے تو انھیں گردن پر بٹھالیتے۔ (صحیح بخاری، مسلم ابو داؤد، مسند احمد، نسائی، ابن ماجہ)

شیعہ مذہب کی مشہور کتاب جلاء العیون میں مرقوم ہے کہ رسول اکرمؐ حضرت امامہ کو صلوٰۃ کے وقت کندھے پر بٹھائے ہوئے ہوتے تھے۔ (عترت رسول صفحہ ۴۶ سے ماخوذ)

رسول اکرمؐ کی کفالت

مسلمانوں میں نہ صرف عوام بلکہ اہل علم بھی اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ عبد المطلب کے انتقال کے بعد رسول اکرمؐ کی کفالت آپ کے چچا ابو طالب نے کی۔ اردو زبان کے تمام سیرت نگار تمام علماء و صوفیہ بلکہ سابقہ ادوار میں بھی اکثر یہی لکھتے آئے ہیں اور یہ بات ذہنوں میں بیٹھ گئی ہے۔

تقسیم ہند سے قبل ابو طالب کی کفالت کو ایک امر مسلمہ سمجھا جاتا تھا۔ جس

میں کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش نہ تھی اور یہ داستانیں لمانیات کا درجہ رکھتی تھیں۔ پاکستان میں محمود احمد عباسی نے "خلافت معاویہ ویزید" لکھ کر شیعیت کو چیلنج کیا۔ اس سے مسلمانوں کی تاریخ کی تحقیق شروع ہوئی۔ بہت سے حقائق کھل کر سامنے آئے۔

مایہ ناز عالم حکیم فیض عالم صدیقی اپنی کتاب "حقیقت شیعہ" میں لکھتے ہیں:۔

"ہماری تمام مروجہ تاریخیں ہمارے تمام علماء اور پیران عظام ہمارے سب کے سب واعظ اور خطیب ہماری تمام مجالس اور محافل غرض یہ کہ تمام معاشرہ الا ماشاء اللہ بری طرح اس غلط فہمی کا شکار ہے کہ عبدالمطلب کے بعد ابو طالب جن کا اصل نام عبد مناف (مناف بت کا بندہ) تھا رسول اکرمؐ کے کفیل ہوئے حالانکہ یہ واقعہ صریحاً بے بنیاد ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ عبدالمطلب کے انتقال کے بعد آپ کی پرورش آپ کے بڑے چچا زبیر بن عبدالمطلب نے کی۔ شیعی پروپیگنڈے نے اس حقیقت کے چہرے کو نہایت چالاکی سے مسخ کر کے ابو طالب کا مقام بلند کر کے دکھانے کے لئے تمام واقعہ کو توڑ موڑ کر معاشرے کے ذہنوں میں اس طرح راسخ اور پختہ کر دیا کہ آج بڑے بڑے عالم و فاضل بھی اس حقیقت سے واقف نہیں۔

عبدالمطلب کی وفات کے وقت ان کے چھ بیٹے۔ زبیر، حارث، عبدمناف، عبدالعزیٰ (ابولہب)، عباس، اور حمزہ زندہ تھے۔

عبدالمطلب کے بیٹوں میں سے زبیر، عبداللہ (رسول اکرمؐ کے والد) اور عبدمناف تینوں ایک ماں سے تھے (ابن قتیبہ) یہی بات ابن حزم نے "جمہرۃ الانساب" میں لکھی ہے۔ زبیر سب سے بڑے تھے۔

قدیم ترین مورخ ابو جعفر محمد بن حبیب (وفات ۲۴۵ھ) — نے کتاب "المحبر" میں لکھا ہے کہ عبدالمطلب کے بعد زبیر اور ان کے بعد ابو طالب سردار ہوئے۔

"اشراف قریش" میں ہے کہ حرب بن امیہ کے مرنے کے بعد جب عہدوں کی تقسیم ہوئی تو ہاشمی خاندان میں بالترتیب زبیر، ابو طالب، حمزہ اور عباس سردار ہوئے ۵۸۱ھ میں فجار کی جنگ ہوئی اس جنگ میں بنو ہاشم کے سردار زبیر تھے۔ رسول اکرمؐ کی عمر اس وقت بیس (۲۰) سال تھی۔ ابو طالب کا اس لڑائی میں کہیں ذکر نہیں آتا۔

زبیر بن عبدالمطلب نے حرب فجار کے بعد قدیم عہدنامہ کی تجدید کی جس کو "حلف الفضول" کہا جاتا ہے۔

زبیر کے بعد عبدمناف (ابو طالب) خاندان کے سردار ہوئے۔ ان کی مالی حالت بہت کمزور تھی۔ اس لئے وہ خاندانی عہدہ کو نبھا نہیں سکتے تھے۔ ان کی جگہ ان کے بھائی عباس سقایہ وغیرہ کے امور انجام دیتے تھے۔ ابو طالب صحت کے لحاظ سے بھی کمزور تھے۔ اور ان کے ایک پاؤں میں لنگ تھا۔ ابن قتیبہ نے المعارف میں قریش کے مختلف خاندانوں کے جسمانی نقائص والوں کی فہرست دی ہے۔ العرج (لنگڑے) کے عنوان کے تحت سرفہرست ابو طالب کا نام ہے۔ تجارتی سفر سے معذور تھے۔ اس لئے گھر پر ہی خوشبوئیں بنا کر بیچ لیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ عبدالمطلب کی یا زبیر کی سرداری کے زمانہ میں ان کا نام کہیں نہیں ملتا۔

ان حالات میں عبدالمطلب کی بصیرت کو دیکھتے ہوئے یہ ماننا پڑتا ہے کہ انھوں نے وفات کے وقت رسول اکرمؐ کی کفالت کا بوجھ یقیناً اس بیٹے کے سپرد کیا ہوگا جو کفالت کی اہلیت رکھتا ہو۔ اس مقام پر شیعوں نے قرعہ اندازی کا مفروضہ کھڑا کیا کہ عبدالمطلب نے کفالت کے لئے زبیر اور عبدمناف کے درمیان قرعہ ڈالا جو ابو طالب کے نام نکل آیا۔ جب عبدالمطلب کی وفات کے وقت ان کے چھ بیٹے زندہ تھے تو صرف دو کے درمیان قرعہ ڈالنا اس روایت کے وضعی ہونے کی دلیل ہے۔ بعض نے یہ شوشہ چھوڑا کہ پرورش زبیر اور ابو طالب نے کی۔ دونوں کی مالی حالت میں اتنا زیادہ تفاوت تھا کہ دونوں کے مل کر کفالت کرنے کی بات قابل اعتماد نہیں ہو سکتی پھر یہ بات کہی گئی ہے کہ زبیر کی وفات کے بعد ابو طالب نے پرورش کی زبیر کے انتقال کے وقت رسول اکرمؐ کی عمر زائد از بیس (۲۰) سال تھی۔ آپ نے اپنے چچا کی مالی حالت کے پیش نظر ان کے بیٹے کی کفالت اپنے ذمہ لی اور دوسرے بیٹے کی کفالت اپنے چچا عباس کے ذمہ کی تاکہ ابو طالب پر بوجھ کم ہو۔ چہ جائے کہ ابو طالب آپ کی کفالت کریں۔

شاہ بلیغ الدین صاحب کا خیال ہے کہ رسول اکرمؐ کے والد تاجر تھے اور انھوں نے اتنا ترکہ چھوڑا تھا جس سے آپ کی پرورش ہوئی۔ لیکن عہد جاہلیت کا رواج

تھا کہ لڑکیوں اور چھوٹے لڑکوں کو ترکہ نہ ملتا تھا۔ پھر دوسری بات یہ ہے کہ اگر ترکہ چھوڑا بھی تھا تو کمسن بچہ نے اس سے کیسے استفادہ کیا۔ ظاہر ہے کہ چچاؤں، زبیر، ابو طالب اور ابو لہب میں سے کسی نے سرپرستی کے فرائض انجام دیئے ہوں گے۔ قرآن مجید میں ذکر ہے۔ الم یجدک یتیما فاوی (کیا اللہ نے آپ کو یتیم نہیں پایا پھر آپ کو ٹھکانہ دیا) اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ٹھکانہ دینے کا ذکر فرمایا کفالت کا نہیں کیا۔ ٹھکانہ جہاں ابو طالب کا گھر ہو سکتا ہے۔ وہاں زبیر کا بھی گھر ہو سکتا ہے اور اپنے باپ کا گھر بھی۔ قرآن کی آیت کے طرز بیان سے ظاہر ہو رہا ہے کہ یہ ٹھکانہ اللہ تعالیٰ نے دیا تھا۔ اسی طرح ووجدک عائلا فاغنیٰ (اور اللہ نے آپ کو محتاج پایا تو غنی کیا) قرآن اس امر کی شہادت دے رہا ہے کہ آپ پر ایسا وقت بھی گذرا ہے کہ آپ نے تنگدستی اور فقر و فاقہ میں بھی گذارا۔ تاریخی اعتبار سے یہ دور اس وقت تک رہا جب تک آپ نے حضرت خدیجہؓ کے مال سے تجارت شروع نہیں فرمائی۔

ایک اور روایت کے بموجب آپؐ نے یہ ارشاد فرمایا کہ کوئی نبی ایسا نہیں گذرا جس نے بکریاں نہ چرائی ہوں۔ صحابہ نے دریافت کیا یا رسول اللہؐ آپؐ نے بھی؟ آپ نے فرمایا ہاں میں سکوں کے عوض اہل مکہ کی بکریاں چرایا کرتا تھا۔ اس حدیث سے یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ آپ اہل مکہ کی بکریاں چراتے اور معاوضہ سے اپنی گذر اوقات کرتے۔ اگر ابو طالب کی کفالت کو (جو خلاف واقعہ ہے) تسلیم بھی کیا جائے تو اس حدیث کا یہ مطلب ہوگا کہ ابو طالب نے آپ سے اہل مکہ کی بکریاں چرواکر معاوضہ سے خود استفادہ کیا۔ بعض لوگوں نے تو یہ بھی لکھا ہے کہ آپ بکریاں چرا کر اپنی گذر اوقات بھی کرتے رہے اور ابو طالب اور ان کے بچوں کا پیٹ بھی بھرتے رہے۔

مورخین کو چاہیئے کہ اب وہ تاریخ میں یہ تلاش نہ کریں کہ رسول اکرمؐ کا کفیل کون تھا بلکہ یہ تلاش کریں کہ ابو طالب کے دو بیٹوں عقیل اور طالب کا کفیل کون تھا۔

رسول اکرمؐ کی صاحبزادیاں

یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ رسول اکرمؐ کی چار صاحبزادیاں تھیں۔ اس بات کی تائید قرآن مجید کی آیت (۳۳۔۵۹) سے بھی ہوتی ہے۔ (ترجمہ) اے نبیؐ اپنی بیویوں اور بیٹوں اور اہل ایمان کی عورتیں سے کہدو کہ اپنے اوپر اپنی چادروں کے پلو لٹکالیا کریں۔ یہ زیادہ مناسب طریقہ ہے تاکہ وہ پہچان لی جائیں اور نہ ستائی جائیں۔ اللہ تعالیٰ غفور و رحیم ہے۔ (۳۳:۵۹)

یہاں رسول اکرمؐ کی صاحبزادیوں کے لئے جمع الجمع کا صیغہ استعمال ہوا ہے جو عربی زبان میں دو یا دو سے زیادہ کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

شیعہ مذہب کے تقریبا تمام اہم مصنفین نے اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ رسول اکرمؐ کی چار صاحبزادیاں تھیں۔ سبائیوں کی جانب سے جب بار بار رسول اکرمؐ کی تیسری صاحبزادی سیدہ فاطمہؓ کی فضلیت کا ذکر کیا گیا تو مسلمانوں کی جانب سے یہ سوال کیا گیا کہ دوسری تین صاحبزادیوں کے فضائل کیوں نہیں بیان کئے جاتے تو سبائیوں نے یہ کہدیا کہ رسول اکرمؐ کی صرف ایک بیٹی تھیں اور دوسری تین حضرت خدیجہؓ کے سابقہ شوہر سے تھیں۔ پھر آگے بڑھ کر یہ کہدیا کہ حضرت خدیجہؓ کے سابقہ شوہر عتیق تھے جب ان کا انتقال ہو گیا تو سیدہ خدیجہؓ نے ابو ہالہ سے عقد کیا۔ ان کا انتقال ہوا تو رسول اکرمؐ سے نکاح کیا عتیق ہی کی کنیت ابو ہالہ تھی۔ بہرحال سبائیوں نے یہ کہا کہ حضرت خدیجہ کی تین بیٹیاں یعنی سیدہ زینب۔ سیدہ رقیہ اور سیدہ ام کلثوم ان کے سابقہ شوہر سے تھیں۔ لیکن صرف اتنا کہدینے سے بات نہیں بنتی کیونکہ حسب ذیل کتب میں جو شیعوں کے نزدیک مستند مانی جاتی ہیں رسول اکرمؐ کی چار بیٹیاں ہونا تسلیم کیا گیا ہے:۔

(۱) ناسخ التواریخ فارسی جلد ۲ (۲) جلاء العیون اردو جلد اول (۳) مجالس المومنین (۴) حیات القلوب جلد ۲ (۵) فروغ کافی مترجم (۶) تذکرہ المعصومین (۷) اصول کافی (۸) کتاب الخصال (۹) نہج البلاغہ مصری جلد ۲ (۱۰) فیض الاسلام (۱۱) قرب الاسناد (۱۲) مراۃ

العقول شرح الاصول والفروع جلد ۱ (۱۳) تہذیب جلد ۱ (۱۴) تفسیر مجمع البیان جلد ۳ (۱۵) ترجمہ قرآن مجید مقبول احمد۔

جن شیعہ مولویوں نے یہ کہا کہ صرف حضرت فاطمہؓ رسول اکرمؐ کی صاحبزادی تھیں اور بقیہ تین صاحبزادیوں کا انکار کیا ان کی جانب سے یہ اعتراض کیا گیا کہ اگر یہ تین صاحبزادیاں رسول اکرمؐ سے تھیں تو رسول اکرمؐ نے کیوں اپنی بیٹیوں کا نکاح مشرکین سے کیا۔ خود سبائیوں کی طرف سے اسی کے جواب میں کہا گیا کہ رسول اکرمؐ نے تین صاحبزادیوں کا نکاح مشرکین سے تالیف قلوب اور دین حق کی تقویت کے لئے کیا (حیات القلوب)

رسول اکرمؐ کی سب سے بڑی صاحبزادی سیدہ زینب تھیں جو بعثت سے تقریبا دس سال قبل ۶۰۱ عیسوی میں پیدا ہوئیں۔ ان کا نکاح ان کے خالہ زاد بھائی حضرت ابو العاص سے سیدہ خدیجہؓ کی زندگی میں ہوا۔ حضرت ابو العاص بدر کے معرکہ میں گرفتار ہوئے۔ قیدیوں کی رہائی کی ایک شرط یہ رکھی گئی تھی کہ ان سے کوئی فدیہ لیا جائے۔ حضرت ابو العاص نے سیدہ زینب کا وہ ہار جو ان کو اپنی والدہ سے ملا تھا بطور فدیہ پیش کیا۔ یہ وہی ہار تھا جو رسول اکرمؐ نے حضرت خدیجہ کو دیا تھا۔ رسول اکرمؐ نے جب اس ہار کو دیکھا تو بہت متاثر ہوئے اور صحابہ سے مشورہ کر کے یہ ہار واپس کر دیا اور حضرت ابو العاص کو واپس جانے کی اجازت دی۔ رسول اکرمؐ نے رہائی کے وقت ان سے فرمایا کہ سیدہ زینب کو مدینہ بھیج دیں۔ حضرت ابو العاص نے مکہ معظمہ پہنچتے ہی اس حکم کی تعمیل کی لیکن ہبار بن الاسود نے مزاحمت کی اور نیزہ سے حملہ آور ہوا اس سے سیدہ زینب کا حمل ساقط ہو گیا۔ (زرقانی جلد ۳۔ صفحہ ۱۹۴۔ لحادی وحاکم)۔

سیدہ زینب کے ایک فرزند علی (بعثت نبوی کے پانچویں سال) اور ایک دختر امامہ پیدا ہوئے۔ حضرت علی نے جنگ یرموک (۱۳ ہجری) میں اکیس سال کی عمر میں شہادت پائی۔ (دیکھئے مضمون "حضرت علی کو کاندھوں پر اٹھانا") رسول اکرمؐ کی دوسری صاحبزادی سیدہ رقیہ تھیں جو ۶۰۳ء میں پیدا ہوئیں۔ وہ حسین و جمیل تھیں۔ ان کا نکاح حضرت عثمان بن عفان سے ہوا۔ ہجرت حبشہ میں حضرت عثمان کے ساتھ تھیں۔ ان کے تعلق سے رسول اکرمؐ نے فرمایا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے

بعد یہ پہلا جوڑا ہے جس نے دعوت حق کی خاطر ہجرت کی۔ ان کے ایک فرزند حضرت عبداللہ تھے۔ جنگ بدر کے روز (۱۷، رمضان ۲ھ) کو سیدہ رقیہ کا انتقال ہوا۔

رسول اکرمؐ کی تیسری صاحبزادی حضرت فاطمہ تھیں جن کی ولادت ۶۰۵ھ میں ہوئی۔ رسول اکرمؐ کی سب سے چھوٹی صاحبزادی سیدہ آمنہ تھیں جو اپنی کنیت ام کلثوم سے مشہور ہوئیں۔ ان کی ولادت ۶۰۹ عیسوی میں ہوئی ان کی ولادت کے بعد ہی سے رسول اکرمؐ فکر و ذکر اور تلاش حق میں مصروف رہے۔ یہ دور ۶۰۹ سے ۶۱۴ عیسوی پر محیط ہے (جس میں رسول اکرمؐ کا بیشتر وقت غار حرا میں گذرتا تھا۔)

رسول اکرمؐ کے نواسے اور نواسیاں

رسول اکرمؐ کے چار نواسے اور تین نواسیاں تھیں۔ لیکن سبائی سازشیوں نے خصوصی مقاصد کے تحت اور موضوع روایات کا سہارا لے کر نہ صرف تاریخ کو بدلنے کی کوشش کی، بلکہ ذہنوں کو اس درجہ متاثر کر دیا کہ عام مسلمان رسول اکرمؐ کے تمام نواسوں اور نواسیوں سے واقف تک نہیں۔ صرف ان ہی کو جانتے اور پہچانتے ہیں جن کا تعارف سبائیوں نے اپنے خاص مقصد سے کروایا۔

رسول اکرمؐ کے محبوب اور سب سے بڑے نواسہ علی تھے جو اپنی والدہ محترمہ حضرت زینب کی نسبت سے علی زینبی کہلاتے تھے۔ ان کے والد ابی العاص بن ربیعہ بن عبد شمس اموی تھے۔ حضرت علی زینبی نے رجب ۱۳ ہجری میں رومن ایمپائر کو زوال سے ہمکنار کرنے والی اس عظیم جنگ میں حصہ لیا جو تاریخ میں جنگ یرموک کے نام سے مشہور ہے۔ یہ جنگ حضرت عمر فاروقؓ کے زمانہ خلافت میں ہوئی۔ حضرت علیؓ اس جنگ میں جہاد کرتے ہوئے دونوں عالم کی کامرانیوں کا تاج سر پر رکھ کر شہادت سے سرفراز ہوئے۔ اس وقت ان کی عمر بائیس (۲۲) سال تھی۔ رسول اکرمؐ کے نواسوں میں ان کو شہادت کا رتبہ ملا۔ صرف انھوں نے کفار کے مقابلہ میں اعلائے کلمۃ اللہ کے لئے اپنی جان دی۔

شاعر مشرق علامہ اقبال بے بانگ درا میں "جنگ یرموک کا ایک واقعہ" کے عنوان سے ان ہی نواسہ۔ رسول کے شوق شہادت کو خراج عقیدت پیش کیا۔

رسول اکرمؐ کے دوسرے نواسہ حضرت عثمان غنیؓ کے فرزند حضرت عبداللہ ہیں۔ ان کی والدہ حضرت رقیہ سے حضرت عثمانؓ کا نکاح ہجرت حبشہ سے قبل ہوا۔ حضرت رقیہ کی وفات رمضان ۲ھ میں ہوئی۔ گویا حضرت عبداللہ اس سے قبل پیدا ہوئے۔ شیعی مورخ طبری نے ان کے تعلق سے یہ غلط روایت لکھی ہے کہ جب یہ سات سال کے تھے تو ان کی آنکھ میں ایک پرندے نے چونچ ماری جس کی تکلیف سے ان کا انتقال ہوا۔ لیکن مسعود جو طبری سے زیادہ خطرناک سبائی ہے لکھتا ہے:۔ "جب ان کی عمر (۷۰) سال کی ہوئی اور ان کی آنکھوں کے پپوٹے لٹک گئے تو ایک پرندے نے ان کی آنکھ میں چونچ ماری اور بڑھاپے کی وجہ سے کوئی علاج کارگر نہ ہوا۔ اسی تکلیف میں انتقال کر گئے۔ آگے کہتا ہے کہ ہمارے زمانہ میں (یعنی چوتھی صدی ہجری میں) ان کی اولاد سے مکہ میں ایک محلہ آباد ہے۔ اسی طرح ایک محلہ قرطبہ میں ہے اور اشبیلیہ میں بھی ان کی اولاد پائی جاتی ہے۔"

حضرت عبداللہ بن عثمان کا تعلق اموی گھرانہ سے تھا۔ بنوامیہ سے حضور کی اولاد کا تصور سبائیت کے بنیادی عقائد کے خلاف ہے۔ اسی لئے ان کی عمر کو ستر (۷۰) سے گھٹا کر سات بنایا گیا۔ اس سے دو فائدے حاصل کئے گئے۔

اول ان کی اولاد کا مسئلہ باقی نہیں رہا۔ دوم جب بقول طبری حضرت عبداللہ بچپن میں ہی انتقال کر گئے تو سبائیوں کے اس پروپیگنڈے کی راہیں ہموار ہو گئیں کہ رسول اکرمؐ کے صرف دو نواسے تھے۔ حالانکہ چار نواسے تھے جن میں دو صحابی تھے۔ ایک نواسے محسن کا انتقال بچپن میں ہوا۔

۱۔ حضرت علی بن ابی العاص۔ صحابی ۲۔ حضرت عبداللہ بن عثمان۔ یہ دونوں صحابی تھے ۳۔ محسن (پیدائش ۶ ہجری) ۴۔ حضرت حسن (پیدائش ۷ ہجری وفات ۴۹ ہجری) ۵۔ حضرت حسین (پیدائش ۹ ہجری وفات ۶۱ ہجری)

جہاں سبائی مورخین کا ظلم حضرت علی بن ابی العاص اور حضرت عبداللہ بن عثمان پر ہوا، وہیں رسول اکرمؐ کی سب سے بڑی نواسی حضرت امامہ پر ہوا۔ یہ تو

محدثین کرام کا احسان ہے کہ یہ باتیں ہمیں معلوم ہوئیں اور سبائیت کا پردہ چاک ہو گیا۔

حضرت امامہ حضرت علی بن ابی العاص کی بہن ہیں۔ رسول اکرمؐ اپنی نواسی سے اتنی محبت فرماتے کہ جب مسجد جاتے تو یہ حضرت امامہ آپ کے کاندھوں پر ہوتیں۔

حضرت ابوقتادہ انصاریؓ کا بیان ہے کہ رسول اکرمؐ صلوۃ کے دوران بھی انھیں اپنی گردن پر بٹھائے ہوتے۔ جب آپ سجدے میں جانے کا ارادہ فرماتے تو انھیں کاندھے سے اتار کر نیچے بٹھادیتے اور جب کھڑے ہوتے تو انھیں گردن پر بٹھالیتے۔ ابوقتادہؓ کہتے ہیں:۔ امامہ زینب بنت رسول اکرمؐ کی صاحبزادی تھیں، ان کے والد ابی العاص بن ربیعہ بن عبد شمس تھے۔ صحیح بخاری، مسلم، ابوداؤد، مسند احمد، نسائی، ابو ماجہ)

سبائیوں نے دوران صلوۃ کاندھوں پر بٹھانے کی بات حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ سے منسوب کی ہے۔ جب امامہ کمسن تھیں تو صلوۃ میں عمل کثیر کی اجازت تھی۔ جس وقت حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کمسن تھے اس وقت عمل کثیر کی اجازت باقی نہ رہی۔ عمل کثیر کی ممانعت کے بعد یہ کیسے ممکن تھا کہ رسول اکرمؐ حضرت حسنؓ یا حضرت حسینؓ کو صلوۃ کے دوران کاندھے پر اٹھاتے۔

ایک بار رسول اکرمؐ کے پاس ایک خوبصورت ہار تحفۃ آیا۔ آپؐ نے فرمایا:۔ یہ ہار میں اپنی سب سے محبوب ہستی کو پہناؤں گا۔ لوگوں نے خیال کیا کہ شاید یہ ہار حضرت عائشہؓ کو دیں گے۔ آپؐ نے اپنی پیاری نواسی سیدہ امامہ کو بلوایا اور نہایت شفقت اور محبت سے وہ ہار اپنے ہاتھ سے انھیں پہنایا۔

حضرت فاطمہؓ کے انتقال کے بعد حضرت علیؓ نے سیدہ امامہؓ سے نکاح کیا۔ حضرت فاطمہؓ نے اس کی وصیت کی تھی۔

حضرت فاطمہؓ کا انتقال رسول اکرمؐ کی وفات کے چھ ماہ بعد ہوا۔ گویا حضرت امامہؓ رسول اکرمؐ کی حیات میں سن بلوغ کو پہنچ چکی تھیں۔ اس لحاظ سے یہ اپنے بڑے بھائی حضرت علیؓ بن العاص سے زیادہ چھوٹی نہ تھیں۔ حضرت علیؓ بن ابی طالب

کی شہادت کے بعد یہ محمد بن جعفر بن ابی طالب کے نکاح میں آئیں ۔ جب ان کا انتقال ہو گیا تو کچھ دن بعد ۶۱ھ میں حضرت حسینؓ نے کوفہ جانے کا ارادہ کیا ۔ حضرت حسینؓ کی بہن زینب حضرت عبداللہ بن جعفرؓ (حضرت علیؓ کے سگے بھتیجے) کے نکاح میں تھیں ۔ عبداللہ بن جعفر نے زینب بنت علیؓ کو بھائی (حسینؓ) کے ساتھ جانے سے روکا لیکن زینبؓ نے شوہر کے حکم کو نہ مانا اس پر حضرت عبداللہ بن جعفر نے زینب بنت علیؓ کو طلاق دے دی اور امامہ بنت ابی العاص سے نکاح کر لیا ۔ یہ حضرت امامہؓ کا ایسا قصور تھا جو سبائی آج تک معاف نہ کر سکے ۔ اول تو ان کی ذات کو چھپانے کی کوشش کی ۔ اس میں کامیابی ہوتی نظر نہ آئی تو یہ دعویٰ کر بیٹھے کہ رسول اکرمؐ کی صرف ایک صاحبزادی حضرت فاطمہؓ تھیں ۔ بقیہ صاحبزادیاں (یعنی حضرت زینبؓ حضرت رقیہ اور حضرت ام کلثوم) حضرت خدیجہؓ کے پہلے خاوند سے ہیں ۔ اس طرح سبائیوں نے حضرت علی بن العاصؓ اور حضرت امامہؓ بنت ابی العاص کو رسول اکرمؐ کی اولاد سے خارج کر دیا ۔

رسول اکرمؐ کی تین نواسیاں تھیں ۔

۱۔ امامہ بنت ابی العاصؓ ۔ صحابیہ ۲۔ ام کلثوم بنت علیؓ (حضرت عمرؓ کے نکاح میں آئیں ۔ ان سے زید بن عمرؓ اور رقیہ بنت عمرؓ تولد ہوئے) ۳۔ زینب بنت علی ۔

زید ۔ عمرو ۔ بکر

ہر زبان میں یہ رواج ہے کہ جب کبھی عمومی طور پر کسی آدمی یا معمولی درجہ کے آدمیوں کا ذکر کیا جاتا ہے تو چند فرضی نام استعمال کئے جاتے ہیں ۔ مثلاً اردو میں تین نام زید، عمر اور بکر استعمال کئے جاتے ہیں ۔

اسی طرح انگریزی میں تین نام (Tom , Dicken and Harry) اسی مقصد کے تحت استعمال ہوتے ہیں ۔

اردو زبان میں جو نام استعمال کئے جاتے ہیں ان پر غور کیا جائے تو معلوم

ہوگا کہ سبائیوں نے مسلمانوں کی شخصیتوں میں سے جن کو اہمیت دینی چاہی انھیں وضعی روایات کے ذریعہ فضیلت دے دی اور جن کی اہمیت کو کم کرنا چاہا وضعی روایات اور دوسرے نت نئے طریقوں سے ان کی اہمیت کو کم کر دیا ۔ اہمیت کو کم کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی اختیار کیا کہ چند ناموں کو ناپسندیدہ قرار دے دیا ۔ شیعہ اور شیعیت زدہ افراد ان ناموں کو نہیں رکھتے ۔ مثلاً ابو بکر، عمر، عثمان، زید، معاویہ، یزید، عبدالقادر، غوث، دستگیر وغیرہ

دوسرا طریقہ یہ اختیار کیا کہ ان ناموں کو اس انداز سے استعمال کیا جس سے یہ اندازہ ہو کہ ان شخصیتوں کی کوئی اہمیت نہیں ۔ زید، عمر، بکر کے استعمال کا شمار اس دوسرے طریقے میں ہے ۔

حضرت زینبؓ کا نکاح رسول اکرمؐ سے

سیدہ زینب بنت جحش رسول اکرمؐ کی پھوپھی زاد بہن تھیں ۔ ان کا تعلق اموی خاندان سے تھا ۔ موصوفہ اپنے بھائیوں اور بھابھی کے ساتھ ہجرت کر کے حبشہ گئی تھیں ۔ وہاں دس سال غربت و مسافرت میں گذارے ۔ ہجرت حبشہ (۵ نبوی) ہی کی وجہ سے ان کی شادی نہ ہو سکی ۔ وہ حضرت عائشہ صدیقہ کی ہم عمر تھیں ۔

ان کے بڑے بھائی عبیداللہ بن جحش کے انتقال پر اپنی بھابھی سیدہ ام حبیبہ بنت ابو سفیان اور چھوٹے بھائی عبداللہ بن جحش کے ساتھ مدینہ تشریف لائیں ۔ نکاح کے لئے کوئی موزوں فرد نظر نہ آیا تو رسول اکرمؐ نے ان کا نکاح اپنے متبنیٰ فرزند سیدنا زید بن حارث سے کر دیا اور زر مہر خود ادا کیا ۔ واضح رہے کہ اس نکاح کے وقت زید کی بیوی ام یمن اور بیٹا حضرت اسامہ بن زید موجود تھے ۔

سیدہ زینب کو یہ رشتہ پسند نہ تھا وہ اموی خاندان کی بیٹی تھیں ۔ ایک آزاد کردہ غلام کی زوجیت میں رہنا پسند نہ کرتی تھیں ان کا طرز عمل زید کے لئے تکلیف دہ تھا ایک سے زیادہ مرتبہ بات رسول اکرمؐ تک پہنچی ۔ آپؐ نے بارہا سمجھا بجھا کر معاملہ

رفع دفع کیا۔ مگر ایک دن حضرت زید کو غصہ آگیا اور انھوں نے طلاق دے دی۔ اب سیدہ زینب کے ساتھ رسول اکرمؐ کے لئے بھی ایک مسئلہ پیدا ہو گیا۔ پہلے وہ غلام کی بیوی تھیں۔ رسول اکرمؐ نے اسلامی مساوات کو عملی شکل دینے کے لئے یہ نکاح کروایا تھا۔ اب وہ ایک مطلقہ ہو گئیں۔ جنھیں نیا اسلامی معاشرہ قبول کرنے کو تیار نہ تھا۔ ایک طرح سیدہ زینبؓ اسلام کے اعلیٰ اقدار کا شکار (Victim) ہو گئیں۔ ایسی عورت سے اب کون نکاح کرے گا جو غلام کی زوجیت میں رہ چکی ہو۔ سیدہ زینبؓ کو اس صورت حال سے جس میں ان کا کوئی قصور نہ تھا نکالنا ضروری تھا۔

اللہ تعالیٰ نے اس کا حل نکال دیا۔ یہ واقعہ جنگ خندق کے موقع کا ہے۔ سورہ الاحزاب میں اس مسئلہ کا حل تفصیل سے درج ہے۔ یہ سورہ ۵ھ کا بتایا جاتا ہے متعلقہ آیات کا ترجمہ درج ذیل ہے:۔

آیت ۳۷۔ "اور جب تم اس شخص (یعنی حضرت زید) جس پر اللہ نے احسان کیا اور تم نے بھی احسان کیا کہتے تھے کہ اپنی بیوی کو اپنے پاس رکھ۔ اللہ سے ڈر۔ تو وہ (زید) اپنے دل میں وہ بات چھپایا، جس کو اللہ ظاہر کرنے والا تھا اور لوگوں سے ڈرتا رہا۔ حالانکہ اللہ ہی زیادہ مستحق ہے کہ اس سے ڈرا جائے پھر جب زید نے اس سے قطع تعلق کر لیا تو ہم نے تم سے نکاح کر دیا تا کہ مومنوں کے لئے ان کے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں کو جن سے قطع تعلق کر لیں، کوئی تنگی و دشواری نہ رہے اور اللہ کا حکم تو پورا ہو کر رہتا ہے۔"

آیت نمبر ۴۰۔ "محمدؐ تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں۔ یہ اللہ کے رسول ہیں اور رسالت کا سلسلہ ختم کرنے والے (آخری نبی) ہیں۔ اور اللہ ہر چیز سے باخبر ہے"

آیت نمبر ۳۷۔ میں عجمی مجوسیوں نے معنی بدل دیئے اور الفاظ "اپنی بیوی کو اپنے پاس رکھ۔ اللہ سے ڈر" کے بعد کے الفاظ کو جس کے مخاطب زید ہی تھے بدل کر رسول اکرمؐ کو ان کا مخاطب بنا دیا گیا، گویا نعوذ باللہ رسول اکرمؐ اس بات کو چھپا رہے تھے جو ان کے دل میں تھی یعنی حضرت زینب سے نکاح کرنے کا خیال گویا یہ خیال اس وقت ذہن میں آیا تھا جب حضرت زینب زید کے نکاح میں تھیں۔ اس طرح

رسول اکرمؐ کی سیرت طیبہ پر ناروا حملوں کا جواز پیدا کیا ابن ابی حاتم اور ابن جریر طبری نے غیر صحیح آثار نقل کئے ہیں جن میں سے ایک بھی ثابت نہیں۔ ابن جریر طبری نے اپنی تاریخ میں ایک لغو روایت واقدی کے حوالہ سے نقل کی ہے جو کذاب اور دروغ گو ہے۔ اس کا مقصد بیہودہ روایتوں سے مسلم معاشرہ کو ذہنی گراوٹ میں مبتلا کرنا تھا۔

("ام المومنین سیدہ خدیجہؓ" اور "مذہبی داستانیں اور ان کی حقیقت" جلد ۲۔ صفحات ۱۰۳ و ۱۱۴ سے اقتباس)

سید

قرآن مجید کے اس بنیادی اصول کے تحت:۔ "اللہ تعالیٰ کے نزدیک تم میں وہی زیادہ قابل عزت ہے جو تم میں زیادہ متقی ہو" (۴۹: ۱۳) نسبی شرافت پر ناز کرنے والے در حقیقت ابلیس کے نقش قدم پر چل رہے ہیں۔ اس نے بھی اپنی تخلیقی نسبت پر فخر کر کے کہا تھا۔

"تو نے آدم کو مٹی سے پیدا کیا، مجھ کو آگ سے، اس لئے میں اس سے زیادہ اچھا ہوں" اسی طرح جو لوگ کہتے ہیں ہم نبی کی اولاد ہیں یا نبی کے خاندان کے ہیں اس لئے ہم ان لوگوں سے جو ہمارے ہم نسب نہیں اعلیٰ و افضل ہیں۔ وہ نامناسب بات کہتے ہیں۔

نسب کی حیثیت سہاگے کی ہے۔ ایمان اور عمل صالح اصل سونا ہے۔ ایمان و عمل صالح کے ساتھ نسبی شرافت ہو تو سونے پر سہاگہ ہے۔ جس کے پاس ایمان و عمل صالح نہیں وہ اگر نبی زادہ بھی ہو تو صرف سہاگہ رکھ کر اس پر کیا ناز کر سکتا ہے۔

اہل عرب نے لفظ سید کو نہ کبھی نسب و قومیت کے اظہار میں استعمال کیا نہ کوئی عرب و قریشی قبیلہ سید کہلایا۔ لفظ سید کا وہی مفہوم ہے جو ہماری زبان میں

سردار یا محترم کے الفاظ سے ادا ہوتا ہے ان ہی معنوں میں اہل عرب غیر قوم اور غیر مسلم اشخاص کو بھی محترم کے معنی میں سید کہتے ہیں۔

قریشی سردار و سربراہ اپنے اپنے خاندانوں کے سید کہلاتے تھے۔ نسب کا اظہار ان کی خاندانی نسبت (ہاشمی، اموی، مخزومی وغیرہ) سے ہوتا ہے۔ اسی طرح انصاری اور دوسرے عرب قبیلوں کے سردار و سربراہ بھی اپنے اپنے قبیلہ کے سید تھے۔

لفظ سید قرآن مجید میں صرف تین جگہ آیا ہے۔ ۳: ۳۹، ۳۳: ۶۷، ۱۲: ۲۵۔ پہلی دو آیتوں میں سید اور سادتنا کے معنی سردار کے ہیں۔ اور آخری آیت میں سید کا سے مراد اس کے (خاوند) سے ہے۔

رسول اکرمؐ کے ارشادات میں بھی لفظ سید سردار سربراہ ہی کے معنی میں استعمال ہوا۔ نسب و قومیت کے لئے ہرگز نہیں۔ اقوال صحابہ میں بھی سید کو اس کے اصلی مفہوم یعنی سردار، مالک و آقا کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔ عرب جاہلیت کے صدہا اشعار میں لفظ سید، سردار، سربراہ وغیرہ کے ہی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ قومیت اور نسب کے اظہار میں کبھی استعمال نہیں ہوا۔ کتب و تاریخ و انساب میں خواہ متقدمین کی تصانیف ہوں یا متاخرین کی یعنی آٹھویں، نویں صدی ہجری تک کی تصانیف میں الفاظ سید و سادات سرداران قبائل اور اکابر خاندان کی امتیازی حیثیت کے اظہار میں مستعمل ہوئے۔ کسی فرد یا خاندان کی قومیت و نسب کے لئے ہرگز استعمال نہیں ہوئے۔

قریش جو نسب کی بڑائی کے گھمنڈ میں مبتلا تھے اپنے مرکزی مقام میں پتھر کے بتوں کے ساتھ حسب و نسب کے گھمنڈ کا ایک معنوی بت بھی بنا رکھا تھا، فتح مکہ کے وقت رسول اکرمؐ نے جہاں خانہ کعبہ کے بتوں کو مسمار کیا۔ حسب و نسب کے فخر کے بت کا بھی یہ کہہ کر خاتمہ کر دیا۔ "اللہ نے جاہلیت کے غرور اور باپ دادا پر فخر کرنے کو آج سے مٹا ڈالا تم سب آدم کی اولاد ہو۔ اور آدم کا خمیر مٹی سے تھا"۔

رسول اکرمؐ سب انسانوں سے بلند و برتر تھے۔ لیکن آپ نے اپنے نام کے ساتھ کوئی تعظیمی لفظ نہ کبھی کہلوایا یا نہ لکھوایا۔ آپ کے متعدد مکتوب اور فرامین کتب تاریخ میں نقل ہیں۔ کچھ تو آج تک بھی موجود ہیں ان میں آپ کا اسم گرامی اس

طرح تحریر ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم، من محمد رسول اللہ الیٰ کسریٰ عظیم فارس۔

رسول اکرمؐ کی سنت کے اتباع میں خلیفہ بلافصل حضرت ابو بکر صدیقؓ کا بھی یہی طریقہ رہا۔ ان کے مکتوبات اور فرامین میں بھی اسی طرح لکھا ہے۔

" بسم اللہ الرحمن الرحیم، من عبداللہ ابی بکر خلیفہ رسول اللہ الیٰ عبیدۃ بن الجراح "

جو مکتوب حضرت ابو بکر صدیقؓ کے نام آتے ان کی عبارت بھی اسی طرح ہوتی

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ اللہ کے بندے ابو بکر خلیفہ رسول اللہ کے پاس ابو عبیدہ بن الجراح کی جانب سے "یہی طریقہ تمام خلفا کا رہا۔

امیر المومنین حضرت یزید کو عمال خلافت و سپہ سالار افواج جو مکتوب و رپورٹ ارسال کرتے اس کے سرنامہ کی عبارت بھی اسی طرح سادہ الفاظ میں ہوتی۔

" **بسم اللہ الرحمن الرحیم**۔ اللہ کے بندے یزید بن معاویہؓ امیر المومنین کی خدمت میں، منجانب:۔ مسلم بن عقبہ"

حضرت حسینؓ کو ان کی تائید کرنے والے اہل کوفہ نے جو خطوط بھیجے ان میں پہلا خط اس طرح شروع ہوتا ہے۔ "حسین بن علیؓ کو سلیمان بن صرد۔ وغیرہ کی جانب سے۔"

حضرت حسینؓ نے جواب میں جو مکتوب بھیجا تھا۔ اس کے ابتدائی فقرات سبائی مورخین نے یوں لکھے ہیں۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ حسین ابن علیؓ کی طرف سے جماعت مومنین و مسلمین کو"۔

بنی ہاشم نسباً قریش ہی کی ایک شاخ ہیں۔ انھیں دیگر قریشی خاندانوں بلکہ کل عرب اولاد اسماعیل علیہ السلام پر فضیلت بلاشبہ حاصل ہوئی کہ رسول اکرمؐ کی ولادت ہاشمی خاندان میں ہوئی۔ ہاشم کے صرف ایک فرزند عبدالمطلب بن ہاشم ہی کی نسل چلی۔ بہ اعتبار نسب سب قریشی خاندان اور خاندان بنو عبدالمطلب (ہاشمی)

یکساں ہیں ۔ مگر جب مناقب کی روایتیں وضع ہونا شروع ہوئیں تو بنو عبدالمطلب کی سیادت کی عموماً حضرت عباسؓ اور حضرت علیؓ اور ان کے دو فرزندوں حسنؓ اور حسینؓ کی سیادت کی حدیثیں خصوصاً وضع ہوئیں چند وضعی احادیث یہ ہیں :۔

۱۔ عبدالمطلب کی اولاد اہل جنت کی سردار ہے ۔

۲۔ حضرت عباسؓ سے روایت ہے کہ میں اور علیؓ رسول اکرمؐ کی خدمت میں گئے ۔ آپؐ نے فرمایا: تمہیں مبارک ہو میں تمام اولاد آدم کا سردار ہوں اور تم دونوں عرب کے سردار ہو"

۳۔ حضرت علیؓ کے بارے میں رسول اکرمؐ سے یہ قول منسوب کیا گیا ہے ۔
"اے علیؓ تم دنیا میں بھی سردار ہو اور آخرت میں بھی سردار ہو"۔

۴۔ ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرمؐ نے فرمایا: ۔"میرے یہ دونوں بیٹے حسنؓ و حسینؓ نوجوانان جنت کے سردار ہیں اور ان کے باپ ان دونوں سے بہتر ہیں"

ان وضعی احادیث میں بھی بہ اعتبار مضمون لفظ سید سے مراد نسبی سیادت نہیں بلکہ ان حضرات کو جنت کے لوگوں کا سردار بتایا گیا۔

یہ بات قابل لحاظ ہے کہ حضرت عباسؓ حضرت علیؓ حضرت حسنؓ حضرت حسینؓ کے ناموں کے ساتھ کسی زمانہ میں بھی لفظ سید کو "سابقہ" نہیں بنایا گیا۔ یعنی کبھی بھی سید عباسؓ بن عبدالمطلب ، سید علیؓ بن ابی طالب ، سید حسنؓ بن علیؓ یا سید حسینؓ بن علیؓ نہیں لکھا گیا۔

مختصر یہ کہ قریشی قبائل ہوں یا بنی ہاشم و بنی امیہ کا کوئی گھرانہ نسبی نسبت کے اظہار کے لئے محض لفظ سید کو کبھی استعمال نہیں کیا۔ احتراماً ایک دوسرے کو سیدی اور سیدنا کہتے رہے ۔ چنانچہ اسلاف وفضائل ذاتی کی بنا پر ملی خدمات کے اعتراف میں لفظ سید استعمال کیا جاتا تھا۔ قریش و بنی ہاشم کا کوئی خاندان نہ کبھی نسباً سید کہلایا اور نہ کسی شخص نے اظہار نسب میں اپنے منہ سے اپنے آپ کو سید کہا۔

چوتھی صدی ہجری کے اواخر میں بنی بویہ نے علیؓ و محمدؒ فرزندان ابو احمد موسوی کو جو اپنے وقت کے ممتاز ادیب تھے ۔ اور نسباً موسیٰ کے (جنھیں امامیہ اپنا ساتواں

امام کہتے ہیں) پردتوں میں سے تھے ، سبائی مسلک کے خدمات اور نہج البلاغہ کی تصنیف کے صلے میں ان دونوں بھائیوں کو شریف المرتضیٰ اور شریف الرضیٰ کے خطابات دیئے اس کے بعد سے الشریف ان کے اہل خاندان اور سب سے ہی ہاشمی افراد کے لئے بالعموم استعمال ہونے لگا۔ چنانچہ حضرت حسنؓ کی اولاد میں سے چند صدیوں بعد جو لوگ حرمین شریفین کے والی ہوئے ان کو شریف کا لقب دیا گیا۔ ان میں کے آخری شریف حسینؓ تھے ۔ جنھوں نے ترکی خلافت سے غداری کی تھی ۔ ان لوگوں نے اپنے کو کبھی سید نہ کہا۔ خود شریف المرتضیٰ و شریف الرضیٰ یا ان کے اہل خاندان نے غالی شیعہ ہونے کے باوجود اپنے کو کبھی سید نہ کہا۔ بلکہ نہج البلاغہ کے بعض خطبوں میں لفظ سید کو آقا و سردار ہی کے معنی میں استعمال کیا ہے ۔

عراق و ایران کے غالی شیعوں نے (جو کوفہ ، کربلا ، و نجف میں تاتاریوں سے امان پاکر مقیم تھے اور بعد میں تاتاری حکمران خدا بندہ کے شیعہ مسلک اختیار کر لینے سے تقویت حاصل کر لی تھی نسبی امتیاز کے لئے لفظ سید کا استعمال شروع کیا ۔ پھر غیر عرب ممالک خصوصاً ہندوستان میں لفظ سید کا استعمال سیادت نسبی کے ادعا کے لئے کیا اور سید و غیر سید کی تفریق پیدا ہو کر ذاتیں بن گئیں ۔

تحقیق سید و سادات" سے اقتباس)

سیدۃ النساء کون؟

اہل سنت میں اس مسئلہ کی حد تک اختلاف ہے کہ امت کی خواتین میں افضلیت کن کو حاصل ہے ۔ بعض ام المومنین حضرت خدیجہؓ کو اور بعض حضرت عائشہؓ کو فضیلت دیتے ہیں ۔ بعض اس طرح تطبیق دیتے ہیں کہ سبقت اسلام کے باعث ام المومنین حضرت خدیجہؓ کو اور بلحاظ علم ام المومنین حضرت عائشہؓ کو فضیلت حاصل ہے ۔ تمام ائمہ محدثین اور فقہا ان دونوں مسلکوں میں سے کسی ایک کے قائل ہیں ۔ متقدمین میں سے کوئی بھی اس کا قائل نہ تھا کہ حضرت فاطمہؓ کو ان امہات المومنین

میں سے کسی پر فضیلیت حاصل ہے۔

سبائیوں کا مسلک اس سلسلہ میں جداگانہ رہا ہے۔ان کے نزدیک پنج تن اس دنیا کی مٹی سے ہی پیدا نہیں ہوئے بلکہ ان پانچوں کا مادہ نور الہیٰ ہے۔ حضرت فاطمہؓ جنت کے اس سیب کے باعث پیدا ہوئیں جو رسول اکرمؐ نے معراج کے وقت کھایا تھا۔ سبائیوں کا کہنا ہے کہ انھیں خاتون جنت اس لئے کہا جاتا ہے کہ حضرت خدیجہؓ معراج سے قبل انتقال فرما چکیں تھیں۔ لیکن اس بات کو نظرانداز کر دیتے ہیں کہ حضرت فاطمہؓ حضرت خدیجہؓ ہی کی دختر ہیں۔

حضرت فاطمہؓ نبوت سے تقریباً سات سال قبل پیدا ہوئی تھیں۔ لیکن سبائی یہ ادعا. کرتے ہیں کہ نبوت کے بعد پیدا ہوئیں۔ معراج ہجرت سے ایک سال قبل واقع ہوئی۔اس سے یہ ظاہر ہوا کہ حضرت فاطمہؓ شیعوں کے بموجب ہجرت سے کچھ روز پیشتر پیدا ہوئیں اس لحاظ سے شادی کے وقت ان کی عمر تین ساڑھے تین سال تھی دراصل سبائیوں کے نزدیک سیدۃ النسا. حضرت فاطمہؓ بنت محمدؐ نہیں بلکہ فاطمہ بنت اسد مراد ہیں۔

حدیث جس کے باعث ہمارے علما. کو مغالطہ ہوا۔بخاری و مسلم میں پائی جاتی ہے۔ حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ جب رسول اکرمؐ کی علالت شروع ہوئی تو ایک دن حضرت فاطمہؓ آپ کو دیکھنے آئیں۔آپ نے مرحبا کہہ کر ان کا استقبال کیا اور ان کو بازو بٹھالیا اور ان سے سرگوشی میں کچھ کہا جس پر حضرت فاطمہؓ رونے لگیں دوبارہ سرگوشی فرمائی تو فاطمہؓ ہنسنے لگیں۔میں نے (حضرت عائشہؓ نے) فاطمہؓ سے سوال کیا کیا راز و نیاز کی باتیں ہوئیں۔فاطمہؓ نے جواب دیا میں رسول اکرمؐ کا راز افشا. نہیں کر سکتی۔رسول اکرمؐ کی وفات کے بعد میں نے فاطمہؓ سے پوچھا کہ رسول اکرمؐ نے جو گفتگو کی تھی وہ بیان کرو۔انھوں نے کہا اب کوئی حرج نہیں۔رسول اکرمؐ نے پہلی بار فرمایا تھا کہ "میری موت قریب آگئی ہے"۔اس پر میں رونے لگی دوبارہ آپؐ نے سرگوشی فرمائی کیا تو اس پر راضی نہیں کہ تو مومنین کی عورتوں کی سردار ہو یا اس امت کی عورتوں کی سردار ہو۔(مسلم)

بخاری میں آخری الفاظ یہ ہیں:۔

کیا تو اس پر راضی نہیں کہ جنتی عورتوں کی سردار ہو یا مومنین عورتوں کی۔

یہاں یہ امور غور طلب ہیں۔

۱۔ان روایتوں میں رسول پاکؐ نے جو خطاب فرمائے اس میں خود راویوں کا اختلاف ہے۔

۲۔ایک بیٹی جس کو یہ اطلاع دی گئی ہے کہ عنقریب اس کے والد کا انتقال ہونے والا ہے اور وہ اس بات پر رو رہی ہے کیا محض خطاب دے دینے سے وہ خوش ہو جائے گی۔

۳۔رسول اکرمؐ نے اپنی وفات قریب ہونے کی اطلاع مختلف مواقع پر ظاہر کر دی تھی یہ کوئی ایسی بات نہ تھی جو مخفی ہو۔

رسول اکرمؐ نے متعدد صحابہ کے مناقب بیان فرمائے اور فضیلت کا اظہار فرمایا تو کسی موقع پر بھی اخفا. سے کام نہیں لیا۔یہ ایسی خاص بات نہ تھی جو وفات رسولؐ تک ظاہر نہیں کی جا سکتی۔

۴۔ان روایات کی تنقیح کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس واقعہ کو حضرت عائشہؓ سے مسروق شعبی اور شعبی سے فراس بن یحییٰ نے نقل کیا ہے۔حافظ ابن حجر نے اس کے لئے لفظ صدوق استعمال کیا ہے جو سب سے کم درجہ کا لفظ ہے۔یہ ایسے راوی پر بولا جاتا ہے جس کے ناقابل اعتبار ہونے کا ثبوت نہ ہو لیکن اس پر اطمینان بھی نہ ہو۔ ایسے شخص کے بیان کو ہرگز حجت تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔

۵۔فراس تک اس روایت کا ہر راوی ہر زمانہ میں ایک ایک شخص رہا ہے۔ایسی حدیث کو احاد کہتے ہیں۔

۶۔سیدۃ النسا. اہل الجنت کے الفاظ بخاری کی روایت میں پائے جاتے ہیں مسلم کی روایت میں نہیں پائے جاتے کیونکہ اس میں کوئی سبائی راوی نہیں۔بخاری کا استاد فضل بن کین (کنیت ابو نعیم) سبائی ہے۔یہ ساری کرم فرمائی اسی ابو نعیم کی ہے۔

۷۔فراس کی روایت میں صراحت ہے کہ جب رسول اکرمؐ کھڑے ہو گئے تو حضرت عائشہؓ نے حضرت فاطمہؓ سے سرگوشی کے بارے میں پوچھا حالانکہ حضرت عائشہؓ کے یہاں آنے کے بعد رسول اکرمؐ کی ایسی حالت نہیں رہی تھی کہ کھڑے ہو سکیں۔

۸۔رسول اکرمؐ کی چار صاحبزادیاں تھیں۔حضرت زینبؓ اور حضرت رقیہؓ نے اسلام

کی خاطر مصائب برداشت کئے۔ان سب کو چھوڑ کر صرف حضرت فاطمہؓ کو سیدۃ النساء کا خطاب دینا محل نظر ہے۔

اب یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ دراصل سیدۃ النساء کون ہیں؟۔

پہلے قرآن پر غور کرنا چاہئے۔قرآن مجید میں ازواج مطہرات کو مخاطب کر کے کہا گیا ہے

"اور تم میں سے جو اللہ اور رسولؐ کی تابعدار رہے گی اور نیک عمل
کرتے رہے گی ہم اس کو دوہرا اجر دیں گے اور ہم نے اس کے لئے
عمدہ رزق مہیا کر رکھا ہے۔(۳۳:۳۱)

اللہ تعالیٰ نے مغفرت اور جنت حاصل ہونے کا ذکر نہیں کیا۔صرف آخری جز کا ذکر کیا۔یعنی ازواج مطہرات کی مغفرت کر دی گئی اور ان کو جنت بھی حاصل ہے۔اور مضارع کے بجائے ماضی کا صیغہ استعمال کیا یعنی جس چیز کا ذکر کیا جارہا ہے وہ یقینی ہے۔سبائیوں کے عقیدہ کی کہ ازواج مطہرات سے وہ مقام چھینا بھی جاسکتا ہے ماضی کا صیغہ لا کر نفی کر دی گئی۔

اللہ تعالیٰ نے متعدد بار ازواج مطہرات کو یا نساء النبی کہہ کر خطاب کیا۔پورے قرآن میں کسی مقام پر بھی یا بنات النبی کہہ کر صاحبزادیوں کو مخاطب نہیں کیا گیا اور نہ کسی جگہ ان کی فضیلت کا ذکر کیا گیا۔یہ امر خود اس کی دلیل ہے کہ امت کی خواتین میں ذکر کے قابل صرف ازواج مطہرات تھیں۔اگر کوئی اور خاتون اس مقام پر پہنچتیں تو اس کا بھی ضرور ذکر کیا جاتا۔حالانکہ سابقہ امتیوں میں سے مریم بنت عمران اور آسیہ امراۃ فرعون کا ذکر کیا۔ازواج مطہرات کی فضیلت کی صرف یہی ایک دلیل کافی ہے۔یہ بات بھی ثابت ہو گئی کہ ازواج مطہرات کا جنتی ہونا یقینی ہو گیا اور اس کا منکر قرآن کا منکر اور کافر ہو گا۔

جس طرح رسول اکرمؐ کو امت کے مقابلہ میں ہر عمل پر دوہرا اجر ملتا ہے (قرآن ۱۷:۷۴) اسی طرح ازواج مطہرات کے ساتھ اسی اصول کو بیان کرنے سے (قرآن ۳۳:۳۱) ثابت ہوا کہ رسول اکرمؐ کی وفات کے بعد ازواج مطہرات تمام امت

کی رہنما ہیں اور ان کی اقتدار امت پر لازم ہے۔اس سے ظاہر ہوا کہ کوئی امتی خواہ کتنا ہی بلند مقام حاصل کرے ازواج مطہرات کے مقام کو نہیں پہنچ سکتا۔اس لئے کہ جو عمل ابوبکرؓ عمرؓ یا فاطمہؓ یا رقیہؓ انجام دیں گی تو انھیں اکہرا اجر ملتا ہے۔اور وہی عمل اگر عائشہؓ یا ام حبیبہؓ انجام دیں تو انھیں دوہرا اجر ملتا ہے۔اس سے ظاہر ہوا کہ کوئی امتی ازواج مطہرات کے مقام کو حاصل نہیں کر سکتا۔خواہ اس کا امامت و ولایت کے عہدہ پر سرفراز ہونا فرض کر لیا گیا ہو۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

"اے نبی کی بیویو تم عام عورتوں کی طرح نہیں ہو بشرطیکہ تقویٰ
اختیار کرو"۔(قرآن مجید ۳۳:۳۲)

اب اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرتا ہے کہ حضرت فاطمہ کو سابقہ امتوں میں سے مریم بنت عمران آسیہ امراۃ فرعون یا اس امت میں امہات المومنین میں سے کسی پر فضیلت حاصل ہے تو یقیناً قرآن مجید کا انکار کر رہا ہے۔دنیا کی کسی عورت کو امہات المومنین کے برابر قرار دینا ہی گناہ عظیم ہے۔کجا کہ ان پر فوقیت دینا۔

رسول اکرمؐ کا ارشاد ہے:۔

"مردوں میں تو بہت کامل گذرے ہیں لیکن عورتوں میں مریم بنت
عمران اور آسیہ امراۃ فرعون کے علاوہ کوئی کامل نہیں اور عائشہ کو
تمام عورتوں پر ایسی فضیلت حاصل ہے جیسے ثرید کو کھانوں پر"۔

اس حدیث میں اس بات کی نفی فرمائی گئی کہ خواتین میں ان دو خواتین (یعنی مریم بنت عمران اور آسیہ امراۃ فرعون) کے علاوہ کامل نہیں ہوئی اس فرمان سے تمام خواتین خارج ہو گئیں لیکن رسول اکرمؐ نے حضرت عائشہؓ کو مستثنیٰ کر کے تمام عورتوں پر فضیلت دی سابقہ دو خواتین کے کمال کا ذکر کر کے حضرت عائشہ کو مستثنیٰ قرار دینا تمام جہاں کی خواتین پر فضیلت دینا خود اس امر کا ثبوت ہے کہ اصل مقام فضیلت حضرت عائشہؓ کو حاصل ہے۔یہ کسی اور کو حاصل نہیں ہو سکتا۔

قرآن مجید میں رسول اکرمؐ کی وفات کے بعد ازواج مطہرات سے شادی کرنے کی ممانعت کر دی گئی۔ایسی کوئی ممانعت رسول اکرمؐ کی صاحبزادیوں کے نکاح کے

تعلق سے نہیں۔

رسول اکرمؐ کا اپنی صاحبزادیوں کا دوسروں سے نکاح کرنا اور اللہ تعالیٰ کا لوگوں کو منع کرنا آپ کی ازواج سے نکاح نہ کیا جائے اس امر کا ثبوت ہے کہ ازواج مطہرات صاحبزادیوں کے مقابلہ میں یہ ایک ممتاز حیثیت رکھتی ہیں۔

ازواج مطہرات کی ایک اور فضیلت بھی ملاحظہ ہو۔ارشاد الہیٰ ہے:۔

"بلاشبہ نبی تو اہل ایمان کے لئے ان کی اپنی ذات پر مقدم ہے اور نبی کی بیویاں ان کی مائیں ہیں (۶:۳۳)

لہٰذا تمام امت پر بشمول حضرت علیؓ و حضرت فاطمہؓ امہات المومنین کی تعظیم و اطاعت فرض ہوئی کوئی بیٹی یا کوئی بیٹا ماں کے برابر نہیں ہو سکتا۔امہات المومنین کے مقابلہ میں یہ دعویٰ کہ حضرت فاطمہؓ "سیدۃالنساء اہل الجنۃ" ہیں قرآن کا صریح تمسخر ہے۔

اس کے پس پردہ وہ بغض کارفرما ہے جو سبائیوں کو ام المومنین حضرت عائشہؓ سے ہے کیوں کہ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد انھوں نے سب سے پہلے قصاص عثمانؓ کا دعویٰ کیا۔

حضرت عائشہؓ کی فضیلت کے لئے اس سے زیادہ واضح صراحت اور کیا ہوگی۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:۔

"پاک عورتیں پاک مردوں کے لئے اور پاک مرد پاک عورتوں کے لئے" (۲۶:۲۴)

چونکہ رسول اکرمؐ روئے زمین پر پاکیزہ ترین ہستی ہیں اس لئے ازواج مطہرات بھی سب سے پاکیزہ تر ہیں۔

ام المومنین حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ صحابہ کرام رسول اکرمؐ کی خدمت میں تحایف بھیجتے جب حضورؐ میرے یہاں مقیم ہوتے۔اس سے ان کی غرض حضورؐ کی خوشنودی کی ہوتی حتیٰ کہ ایک بار بقیہ ازواج مطہرات کو اس کی شکایت پیدا ہوئی۔ انھوں نے حضرت فاطمہؓ کو اپنا وکیل بناکر رسول اکرمؐ کی خدمت میں روانہ کیا۔ حضرت فاطمہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہؐ مجھے آپ کی ازواج نے بھیجا ہے۔ ابو قحافہ

(حضرت عائشہؓ کے دادا) کی بیٹی کے سلسلہ میں آپ سے عدل کے طالب ہیں۔آپؐ نے فرمایا۔

کیا تو اس سے محبت نہیں کرتی جس سے میں محبت کرتا ہوں۔

حضرت فاطمہؓ نے عرض کیا کیوں نہیں۔آپؐ نے ارشاد فرمایا۔

تو تو اس سے محبت کر۔

حضرت فاطمہؓ نے واپس جاکر ازواج مطہرات کی خدمت میں تمام کیفیت بیان کی۔انھوں نے اصرار کر کے حضرت فاطمہؓ کو دوبارہ بھیجنا چاہا تو حضرت فاطمہؓ نے کہا۔

اللہ کی قسم میں تو ان (حضرت عائشہؓ) کے سلسلہ میں کبھی آپؐ سے کلام نہ کروں گی۔

دراصل سبائی اور مجوسی جو حضرت فاطمہؓ کو "سیدۃالنساء اہل الجنۃ" قرار دیتے ہیں تو دراصل ان کی مراد فاطمہ بنت اسد ہوتی ہے۔ ملا باقر مجلسی حضرت علی کی ولادت کے حالات میں لکھتے ہیں۔جب حضرت فاطمہ بنت اسد حضرت علی کو گود میں لئے خانہ کعبہ سے باہر آئیں تو کہا۔

"اے گروہ مردم حق تعالیٰ نے خلق سے مجھے پیدا کیا اور زنان برگزیدہ پر جو مجھ سے پہلے ہو چکی ہیں مجھے فضیلت دی۔حق تعالیٰ آسیہ اور مریم بنت عمران کو برگزیدہ کیا اب حق تعالیٰ نے مجھے ان دونوں عورتوں سے برگزیدہ کیا۔اس لئے مجھ سے خانہ کعبہ میں برگزیدہ حق تعالیٰ فرزند پیدا ہوا اور میں تین روز اس خانہ محترم میں رہی۔طعام و میوہ ہائے بہشت کھائے۔"

اس کہانی کی رو سے فاطمہ بنت اسد تمام جہاں کی عورتوں پر فضیلت رکھتی تھیں۔بعثت رسولؐ سے قبل ان کے پاس وحی آئی اور اللہ تعالیٰ ان سے بلاواسطہ ہمکلام ہوا۔یہ شرف دنیا کی کسی اور عورت کو حاصل نہیں ہوا۔اس کہانی کی رو سے انھیں رسول اکرمؐ پر ایمان لانے کی بھی ضرورت نہ تھی۔نہ معلوم کیوں فتح مکہ کے بعد اسلام لائیں۔ان کو یہ سب مراتب کعبہ میں حضرت علی کو پیدا کرنے پر موقوف رہے

نہ کہ ایمان اور تقویٰ پر۔

سیدہ سکینہؓ

یہ مسلمانوں کی بدقسمتی ہے کہ رسول اکرمؐ کے اہل بیتؑ یعنی ازواج مطہرات اور بیٹیوں کے حالات زندگی پر جو کچھ ملتا ہے وہ عجمی دشمنان اسلام کا لکھا ہوا ہے اور ناقابل اعتبار ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ہم میں سے اکثر کو یہ بھی خبر نہیں کہ رسول اکرمؐ کی اولاد میں سیدہ فاطمہؓ کے علاوہ بھی کوئی تھا۔

رسول اکرمؐ کی اولاد نرینہ باقی نہ رہی تو ضروری تھا کہ آپؐ کے تینوں دامادوں اور ان کی تمام اولاد کے حالات اور کارنامے لکھے اور محفوظ کئے جاتے۔ آپؐ کے متبنیٰ بیٹے سیدنا زید بن حارث اور ان کے بیٹے اسامہ بن زید کے حالات اور کارنامے لکھے جاتے، جنھوں نے اٹھارہ سال کی عمر میں لشکر اسلام کی قیادت سنبھالی اور اللہ کی راہ میں شہید ہوئے۔ تمام اعلیٰ و ارفع شخصیتوں کو مجوسی شرپسند مورخوں نے پس پشت ڈال دیا اور ان کے بجائے اپنے بارہ اماموں اور چودہ معصوموں کا پروپیگنڈہ کیا جنھوں نے زندگی میں کوئی اہم خدمت انجام نہ دی۔ آج ہم کو خاندان نبوت میں چند شخصیتوں کے علاوہ کوئی نہیں ملتا۔

عام طور پر مسلمان اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ صرف علی اور آل علی اہل بیت رسول میں شامل ہیں کیونکہ وہ رسول کی بیٹی سیدہ فاطمہؓ سے متوسل ہیں۔ حالانکہ یہ آریائی اور عجمی عقیدہ کی تقلید ہے۔

سیدہ سکینہ بنت حسینؓ ایک مایہ ناز عالم فاضل اور ممتاز خاتون تھیں۔ ان کی ہر دلعزیزی کا اندازہ محض اس تاریخی روایت سے لگایا جاسکتا ہے کہ ان کے بال بنانے کا طریقہ ایسا مقبول ہوا کہ طرہ، سکینہ زبان زد خاص و عام ہوگیا۔ ان کے ہر عمل کی پیروی کرنا خواتین عرب کے لئے باعث فخر تھا لیکن افسوس کہ ان کے متعلق اتنا سننے میں آتا ہے کہ جب لٹا ہوا حسینی قافلہ دمشق پہنچا اور یزید کے سامنے پیش کیا گیا تو یزید

نے انھیں زنداں میں ڈال دیا جہاں وہ بھوک و پیاس سے بلک بلک کر مر گئیں۔ چنانچہ ہر سال محرم میں ایک تابوت نکالا جاتا ہے اور گلی گلی گھمایا جاتا ہے۔

یہ ایک سفید جھوٹ ہے جو دلیری سے بولا جاتا ہے۔ شیعہ ذاکرین کے بموجب واقعہ، کربلا کے وقت سکینہ پانچ سال کی تھیں۔

کہتے ہیں حسینؓ نے آپ کا نام امیمہ، تجویز کیا تھا مگر والدہ رباب بنت امراء القیس نے انھیں سکینہ پکارنا شروع کیا۔ امراء القیس عرب قبیلہ کلب کا عیسائی تھا۔ اس کی دو بیٹیاں سلمہ اور رباب حسنؓ اور حسینؓ کے حبالہ، عقد میں آئیں۔ حسین کے کچھ اشعار کا ترجمہ علی نقی نقوی نے اپنی کتاب "شہدائے کربلا" میں دیا ہے۔

"قسم ہے اللہ کی مجھے وہ گھر پسند ہے جس میں سکینہ و رباب رہتے ہیں۔ مجھے دونوں سے محبت ہے۔ میں اپنا مال ان پر صرف کرتا ہوں۔ اگر اس پر مجھے کوئی ٹوکے تو میں ٹوکنے والے کی پروا نہیں کرتا۔"

بقول نقوی صاحب

"حسینؓ کو ان کے بڑے بھائی حسنؓ نے مشورہ دیا تھا کہ رباب کو زیادہ خرچ نہ دیا کرو ورنہ وہ بچی کو بھی فضول بنادے گی۔ یہ اسی مشورہ کا جواب تھا۔"

ان اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ سیدہ سکینہ حضرت حسنؓ کی زندگی میں اتنی بڑی ہوچکی تھیں کہ وہ ان کی تربیت کی طرف سے متردد رہتے تھے۔ حضرت حسنؓ کی وفات ۴۹ھ میں ہوئی تو ظاہر ہے کہ سکینہ کا اس وقت پانچ سال ہونا شیعی روایت سے غلط ہوگیا۔ اس طرح واقعہ، کربلا کے وقت ان کی عمر سترہ اٹھارہ سال کی ہوجاتی ہے۔ اگر حضرت حسینؓ اور رباب کی شادی جو ۱۷ھ میں حضرت عمرؓ کے دور خلافت میں ہوچکی تھی اس کو نگاہ میں رکھیں تو سیدہ سکینہ کی پیدائش اس سے بھی پہلے ہوسکتی ہے اور واقعہ، کربلا کے وقت ان کا شادی شدہ ہونا اور چند بچوں کی ماں ہونا یقینی ہوجاتا ہے۔

سکینہ اور ان کی بڑی بہن فاطمہ کی شادیاں حضرت حسنؓ کی خواہش کے مطابق ان کے بیٹوں حسنؓ مثنیٰ اور عبداللہ سے ہوئیں۔ عبداللہ بن حسنؓ کی کنیت ابو بکر تھی۔ جس سے معلوم ہوا کہ سیدہ سکینہ ان سے صاحب اولاد بھی ہوچکی تھیں۔

ان نکاحوں کا ذکر نقی نقوی نے کیا ہے ۔ البتہ حضرت حسینؓ کی صاحبزادیوں کے نام نہیں بتائے ۔ ناسخ التواریخ کے شیعی مصنف نے لکھا ہے :۔ حضرت حسینؓ کے پانچویں بیٹے عبداللہ (کنیت ابو بکر) سے حسینؓ نے اپنی بیٹی سکینہ کا نکاح کر دیا تھا۔

شیعی روایات سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ حسینی قافلہ پر حملہ کرنے والے کوفی مجوسی زادے تھے نہ کہ شامی یا عرب ۔ اسی وجہ سے سیدہ سکینہ کو کوفیوں سے سخت نفرت تھی وہ جانتی تھیں کہ ان کے دادا علیؓ باپ حسین اور شوہر عبداللہ بن حسن اور دیگر عزیز و اقارب کو قتل کرنے والے وہی شیعان علیؓ تھے جو کوفہ میں آباد تھے ۔

ایک بار چند کوفی جو خود کو شیعان علیؓ کہتے تھے ۔ حج کے لئے آئے تو مدینہ بھی گئے اور سلام کرنے کے لئے سیدہ سکینہ کی خدمت میں پہنچے تو انھوں نے کوفیوں کو دیکھا تو صبر و تحمل کا مظاہرہ کیا ۔ نہ سخت و سست کہا نہ دروازہ سے دھتکارا ۔ تاہم صاف الفاظ میں کہہ دیا :۔

" اے اہل کوفہ ! خدا علیم و دانا ہے کہ میرا دل تمہاری طرف سے صاف نہیں ۔ تم ہی وہ غدار لوگ ہو جنھوں نے میرے باپ بھائی اور شوہر کو بے گناہ قتل کیا ۔ جب تمہارا یہ حال ہے تو مجھ سے ملنے کیوں آئے ہو " ۔ (روضۃ الاصفیاء)

بقول رام بالو سکینہ مولانا عبدالحلیم نے ۱۸۹۸ء میں حیدر آباد سے رسالہ دلگذار کو دوبارہ جاری کیا تو اس میں حضرت سکینہ کی سوانح قسط وار شائع کرنا شروع کیا ۔ حیدر آباد میں اس وقت شیعیت زدہ عہدہ داروں کا زور تھا ۔ انھوں نے ہدایت دی کہ اس مضمون کا سلسلہ روک دیں مولانا شرر نے بجائے اس مضمون کے خود رسالہ بند کر دیا ۔ ۱۹۰۰ء میں لکھنو جاکر اسے دوبارہ جاری کیا سب سے پہلے سکینہ بنت حسین کے حالات کا بقیہ حصہ تھا ۔

(کتاب " حیات سیدہ سکینہ " آیات بینات صفحات ۱۶۸ ، ۱۷۳ اور ۱۹۸ اور سبائی سبز باغ صفحات ۲۲۳ تا ۲۳۱ سے اقتباس)

ابتدائی سیرت نگار

سیرت نبویؐ سب سے پہلے ابن اسحٰق (وفات ۱۵۰ھ) نے مرتب کی ۔ اس کی لکھی ہوئی سیرت کو ابن ہشام (وفات ۲۱۸ھ) نے از سر نو تحریر کیا ۔ یہی نسخہ محفوظ ہے ۔

ابن اسحٰق ایک مجوسی غلام کا بیٹا تھا ۔ اس نے اپنے دماغ کی تیزی سے یونانی دیو مالا اور انجیل و توریت کو سامنے رکھ کر کتاب تیار کی ۔ اہل مدینہ نے سنا تو اسے شہر سے نکال دیا ، بغداد جاکر اس نے وہ کتاب عباسی خلیفہ ابو جعفر منصور (وفات ۱۵۸ھ کے سامنے پیش کی ۔ جعفر نے کہا :۔

اسے کم کرو ، یعنی مختصر کر دو مگر وہ نہ کر سکا تو یہ کتاب خزانہ میں رکھ دی گئی تاکہ آئندہ اس کی چھان بین کی جاسکے ۔

ہارون رشید کے زمانہ میں ابن اسحٰق کی سیرت ایک شیعہ بزرگ ابو محمد عبدالملک بن ہشام بن ایوب الحمیری کو دی گئی ۔ اس نے کاٹ چھانٹ کر درست کیا ۔ اور پوری کتاب دو جلدوں میں مرتب کر دی ۔ یہ سیرت ابن ہشام مشہور ہوئی اور مستند مانی گئی ۔

ابن ہشام یمن کے حمیری قبیلہ سے تعلق رکھتا تھا اور شیعیت میں غلو کرتا تھا ۔ باطنی تنظیم میں تعلیمیہ فرقے سے تعلق رکھتا تھا ۔ جو اس بات کی جان توڑ کوشش کر رہے تھے کہ دوسرے مذاہب کے علوم اور فلسفہ کو اسلام میں شامل کریں ۔

ابن ہشام ہی نے موطا امام مالک کو مستند احادیث کی کتاب تسلیم کرنے سے ہارون رشید کو روکا تھا ۔ ابن ہشام بصرہ میں پیدا ہوا ۔ مصر میں رہا ، پھر بغداد آیا اور ہارون رشید کا درباری عالم مقرر ہوا ۔ بعد کو وہ مصر چلا گیا اور وہیں فسطاط میں مدفون ہے ۔

ابن ہشام نے رسول اکرمؐ کا شجرہ نسب حضرت ابراہیمؑ تک پچاس نسلوں میں ملا دیا حالانکہ اس میں ڈھائی تین ہزار سال کا بعد ہے ۔ بلکہ اس نے حضرت ابراہیمؑ سے حضرت آدمؑ تک شجرہ بھی لکھ دیا اور گذشتہ بارہ سو سال میں کسی مسلمان نے

اس پر شک نہ کیا۔

شبر و شبیر

اہل تشیع کا عقیدہ ہے کہ شبر، شبیر، اور مشبر حضرت ہارون کے بیٹوں کے نام تھے۔ اور یہ روایت بیان کرتے ہیں کہ حضرت حسنؓ کی پیدائش کے بعد جبرئیلؑ نے اللہ تعالیٰ کا پیام پہنچایا کہ جیسے حضرت موسیٰ کے لئے حضرت ہارون تھے ویسے ہی حضرت علیؓ آپ کے لئے ہیں۔ اس لئے حضرت علیؓ کے بیٹوں کے نام حضرت ہارون کے بیٹوں کے نام پر رکھیں۔ اسی بناء پر حضرت علیؓ کے بڑے بیٹے کا نام حسن، جو شبر کا ہم معنی عربی نام ہے رکھا گیا۔ حضرت علیؓ کے دوسرے فرزند کا نام حسین رکھا گیا جو شبیر کے ہم معنی ہے اور تیسرے بیٹے کا نام محسن رکھا گیا جو مشبر کے ہم معنی ہے۔

شبر و شبیر عربی الفاظ نہیں ہیں، البتہ فارسی میں شپر اور شپیر موجود ہیں اور یہ مرکب الفاظ ہیں۔ ان کو شب پر (چمگادڑ) اور شب پیر لکھنا زیادہ درست ہے۔ شب پر کو شب پرا بھی کہا جاتا ہے۔

گر نہ بیند بروز شب شب پر
چشم خورشید را چہ گناہ

پس وجہ تسمیہ یہ ہوئی کہ باطنی حضرات حسنؓ سے ناراض تھے۔ کیونکہ انھوں نے حضرت امیر معاویہؓ سے صلح کرکے عجمی مفسدوں کو زک پہنچائی تھی اور گوشہ نشینی اختیار کرلی تھی۔ سبائی ان کو مذل المومنین اور عار المومنین اسی جذبہ کے تحت کہتے تھے، گوشہ نشینی اختیار کرنے کی وجہ سے فارسی بولنے والوں نے حضرت حسنؓ کو شب پر کا خطاب دے دیا۔

ایک بار چرند و پرند میں جنگ ہوئی تو شب پرا کبھی ادھر ہوجاتا کبھی ادھر۔ پرندوں سے کہتا میں اڑتا ہوں۔ پرندہ ہوں۔ چرندوں سے کہتا میں بچوں کو دودھ پلاتا ہوں اور انڈے نہیں دیتا۔ اس لئے تم میں سے ہوں۔ شب پرا کی خاص عادت یہ ہے

کہ وہ دن کو باہر نہیں نکلتا۔ سبائیوں کو یہ نام حضرت حسنؓ کے حسب حال معلوم ہوا اور رکھا گیا۔

اسی طرح حضرت حسینؓ کو شب پیر بلاوجہ نہیں کہا گیا۔ وہ باون سال کی عمر میں خلافت حاصل کرنے رات کی تاریکی میں مدینہ سے نکلے اور مکہ پہنچے۔ پھر مکہ سے بلا حج کئے رات کے اندھیرے میں نکل کھڑے ہوئے۔ کوفہ سے ایک منزل پہلے راستہ بدل کر چپکے سے دمشق کی طرف مڑ گئے اور خلافت کی گدی کوفے میں انتظار ہی کرتی رہی۔ چار منزلیں طے کرکے کربلا پہنچے تھے کہ حر کوفی نے اپنے پچاس ساٹھ ہمراہیوں کے ساتھ جالیا اور کوفہ واپس چلنے پر اصرار کیا۔ انھوں نے تین دن تک اس کے چنگل سے نکل بھاگنے کی کوشش کی اور رات رات بھر سفر کرتے رہے مگر صبح ہوتی خود کو کربلا میں ہی پاتے۔ (راستے سے واقف نہ تھے یا پھر رات کو راستہ دکھائی نہ دیتا تھا)۔

کوفیوں نے کہا:۔

اگر آپ ہمارے ساتھ جانا نہیں چاہتے تو وہ خطوط ہم کو دے دیجئے۔ جو ہم نے بھیجے تھے۔

انھوں نے خطوط دینے سے انکار کیا تو جنگ چھڑ گئی اور دونوں طرف کے بہتر (۷۲) افراد مارے گئے۔ مابقی کوفیوں نے خطوط تلف کرنے کے لئے حسینی قافلہ کے خیموں میں آگ لگادی اور بھاگ گئے۔ کوفہ پہنچ کر خود ہی واویلا مچانے لگے۔

انھیں حضرت حسینؓ سے شکوہ تھا کہ ان کا کہانہ مانا اور اپنوں کے ہی ہاتھوں مارے گئے۔ پس کوفیوں نے حضرت حسینؓ کو شب پیر کا لقب دیا۔ یعنی جب کوئی اندھا کنویں میں گرتا ہے تو لوگ اندھے ہی کو برا بھلا کہتے ہیں کہ دکھائی نہ دیتا تو رات کو گھر سے کیوں نکلا تھا؟۔

مولانا روم نے لکھا ہے۔

کور کورانہ مرد اندر بلا، تانہ افتی چوں حسین در کربلا

یہی شب پیر شبیر بن گیا۔

شہدا کی زندگی

قرآن مجید سے تاویل کی جاتی ہے کہ "شہدا کو مردہ نہ کہو۔ وہ زندہ ہیں اور اپنے رب کے پاس آرام سے ہیں"۔ "عند ربهم" (۲:۱۵۴) سے بات صاف ہو گئی کہ یہ زندگی اپنے رب کے حضور ہے یہ بات انسانی جسم کی حد تک نہیں ہے اور نہ ہی قبر کی زندگی ہے۔ قبر میں شہید بھی مردہ ہے۔ اس کی لاش گل سڑ کر مٹی میں مل جاتی ہے یقین نہ ہو تو اپنے کسی بڑے شہید کی قبر کھود کر دیکھ لو۔

اگر شہید کو مردہ نہ مانو تو شہدا کا ورثہ تقسیم نہ کرو۔ شہدا کی اولاد کو یتیم نہ کہو شہدا کی بیویوں کو بیوہ نہ کہو اور ان کی دوسری شادیاں نہ کرواؤ۔

اللہ تعالیٰ نے آگے ولکن لاتشعرون فرما کر سب کو خاموش کرا دیا کہ ان کی زندگی کے بارے میں تمہیں کچھ علم نہیں ہے۔ پس اس پر بحث کرنا فضول ہے۔ یہی حال خود رسول اکرمؐ کی حیات قبر کا ہے۔ اگر رسول اکرمؐ کو زندہ تسلیم کر لیا جائے تو خلافت کا سلسلہ غلط ہو جائے۔ حضرت فاطمہؓ کا ورثہ طلب کرنا غلط ہو جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا: انک میت وانهم میتون (۳۹:۳۰) یعنی یہ سب بھی مر جائیں گے اور آپ بھی مر جائیں گے جیسے انبیاء سابق مر گئے۔ پس معلوم ہوا کہ حیات النبی اور حیات قبر کا عقیدہ مشرکانہ اور غیر اسلامی ہے۔

شہربانو

مجوسیوں نے اسلام کی مخالفت میں یہ افسانہ گڑھ دیا کہ یزدگرد شاہ ایران کی بیٹی شہربانو حضرت حسینؓ کے نکاح میں آئی اور اس سے امام زین العابدین پیدا ہوئے، جنھیں شیعہ فخر العرب والعجم کہتے ہیں۔ اور انہی سلسلہ سے بارہ امام وجود میں آئے۔ ایران کی حکومت ایک خاندان کے ساتھ مخصوص تھی جو نسلاً چلی آ رہی تھی۔ یزدگرد

کے خاتمہ سے ساسانی خاندان کے افراد ختم ہو گئے۔ لیکن حضرت حسینؓ کی اولاد میں وہ خون گردش کر رہا ہے اور اسی لئے وہ خلافت اور امامت کے مستحق ہیں۔ بعد کے پیدا کئے ہوئے سیاسی نظریہ کو مستحکم کرنے کے لئے اس کو استقدامی اثر دیا گیا اور حضرت ابو بکر صدیقؓ کی خلافت کو اختلافی بنا کر پیش کیا گیا تاکہ اصل سازش پر پردہ پڑا رہے۔ اور حضرت علیؓ کی خلافت کے جھگڑے کھڑے کئے گئے۔ ان فرضی باتوں کی حضرت علیؓ کے عمل سے (کہ انھوں نے تینوں خلفاء کے ساتھ تعاون کیا تھا) مطابقت نظر نہ آئی تو تقیہ (یعنی جھوٹ) کا نظریہ گڑھ دیا گیا۔ حضرت عمرؓ نے ایران فتح کیا تھا، اس لئے ان سے بغض بھی مجوسیت کا لازم رہا۔

شہربانو کون تھیں، کب مدینہ پہنچیں، زین العابدین کو پیدا کر کے تاریخ سے کب اور کس طرح غائب ہو گئیں۔ یہ باتیں آج تک ایک معمہ ہیں۔

زین العابدین کی والدہ کا نام سلافہ تھا جو ایک باندی تھیں اور افریقہ سے گرفتار ہو کر آئی تھیں۔ ان کا اصل وطن کیا تھا اس میں اختلاف ہے۔ کوئی انھیں بربری اور کوئی سوڈانی قرار دیتا ہے۔

ابن حزم نے جمہرہ میں ایک قول نقل کیا ہے کہ عبد اللہ بن ابی سرح اموی نے جب حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں افریقہ پر حملہ کیا تو سوڈان سے گرفتار ہو کر آئیں لیکن نسلاً یہ سندھی تھیں۔

پہلے ہم حکیم فیض عالم صدیقی کی تحقیق پر نظر ڈالیں گے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

نہ معلوم اس داستاں کو کس نے جنم دیا، کس نے پروان چڑھایا اور ابتدائی طور پر کن لوگوں نے اسے شہرت دی۔ حسین کاظم زادہ نے بھی اس داستان سے اپنی مایہ ناز تصنیف کو زینت دیتے ہوئے خامہ فرسائی کی ہے کہ یزدگرد آخری ساسانی بادشاہ کی دختر شہربانو ایرانی قیدیوں کے ساتھ عمر بن الخطاب کے سامنے پیش ہوئی۔ انھوں نے دوسرے قیدیوں کے ساتھ اسے بھی بازار میں فروخت کئے جانے کا حکم دیا۔ حضرت علیؓ مانع ہوئے اور کہا:۔ شاہزادگان اور نجباء کو ننگے سر بازار میں لے جانا خلاف ادب ہے"۔ بالآخر شہربانو حضرت حسینؓ فرزند علی کے حصہ میں آئی۔ اس سبب سے خاندان علی ایرانیوں کے نظر میں ساسانی نسب رکھتا ہے اور

رسول اکرمؐ سے رشتہ کی بنا پر شرافت و امتیاز سے بھی مخصوص تھا۔ اسی سبب سے یہ خاندان جائز طور پر تخت کیانی کا وارث ہو سکتا تھا۔ اسی بنا پر زین العابدین جو شہر بانو کے بطن سے تھے، فخر العرب و العجم کہلاتے تھے۔ باپ کی طرف سے ان کا سلسلہ نسب بزرگ ترین عرب اور ماں کی طرف سے روئے زمین کے عظیم ترین سلاطین پر منتہی ہوتا ہے۔

ایک اور روایت کے بموجب ۳۰ھ میں کسریٰ کا آخری ساسانی بادشاہ یزدگرد جب مرو میں حضرت عبداللہ بن عامر اموی کے ہاتھوں مارا گیا تو اس کی تین بیٹیاں گرفتار کر کے مدینہ منورہ لائی گئیں۔ حضرت عمرؓ نے حسب معمول ان کو بیت المال کی لونڈیوں کے ساتھ رکھنے کا حکم صادر فرمایا تو حضرت علیؓ نے احتجاج کیا کہ اس حکم سے شاہی خاندان کے اسیروں کی توہین ہوگی۔

حضرت عمرؓ نے ان تینوں لڑکیوں کو حضرت علیؓ کے حوالہ کر دیا کہ جو چاہیں کریں۔ حضرت علیؓ نے ان شاہی اسیروں کی قیمت لگائی اور ایک کو اپنے بیٹے حسینؓ کے حوالہ کیا۔ دوسری کو اپنے ربیب محمد بن ابو بکرؓ (قاتل عثمانؓ) کو دیا اور تیسری کو حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو دیا۔

یہی داستان جب کربلا کو پہنچتی ہے تو اس پر جو حاشیہ آرائیاں ہوئی ہیں وہ حیران کن ہیں۔ ایک صاحب فرماتے ہیں۔

شہادت حسینؓ کے بعد ان کا گھوڑا خیمہ کے دروازہ پر آکر کھڑا ہو گیا۔ شہر بانو اس پر سوار ہو کر ایران کی طرف چل نکلیں۔ راستہ میں انھیں اپنا بھائی ملا جو حضرت حسینؓ کی مدد کے لئے آرہا تھا وہ شہر بانو کو ساتھ لے کر واپس چلا گیا۔

ایک اور صاحب فرماتے ہیں:۔ شہادت حسینؓ کے بعد شہر بانو دریائے فرات میں ڈوب کر مر گئیں۔ گویا خود کشی کی حرام موت مریں۔

یہ بات حیران کن ہے کہ شیعہ تو درکنار اہل سنت الجماعت بھی شہر بانو کے حالات اس طرح بیان کرتے ہیں کہ گویا یہ بھی دین کا ایک اہم حصہ ہے۔

شہر بانو نام کی کوئی عورت حضرت حسینؓ کی بیوی ہی نہیں تھی چہ جائیکہ وہ یزدگرد کی بیٹی ہو۔

تاریخ ایران کا مطالعہ کر کے شہر بانو کی تلاش کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ شہریار کا بیٹا یزدگرد ۱۳ھ میں تخت نشین ہوا۔ اس کی عمر اس وقت پندرہ سولہ سال تھی۔ یہ فاروق اعظم کی خلافت کا پہلا سال تھا۔ قادسیہ کے معرکہ کے وقت (محرم ۱۴ھ) اس کی عمر اٹھارہ سال تھی۔ یزدگرد مدائین چھوڑ کر بھاگ نکلا اور حلوان پہنچ گیا۔ اسلامی لشکر نے جب حلوان کا رخ کیا تو وہ مع اہل و عیال خانقاہ قم اور قاشان بھاگتا پھرا۔ بالآخر ۲۹ھ میں خراسان پہنچا اور ۳۰ھ میں اس کا خاتمہ ہو گیا۔ یزدگرد پر اسلامی لشکر نے کہیں بھی قابو نہیں پایا۔ اصل میں اس قصہ کا خالق زمخشری (وفات ۵۳۸ھ) ہے جو معتزلی بھی تھا اور سبائی بھی۔ وہ تاریخ سے ناواقف تھا۔ ابن خلقان بھی زمخشری کے چکر میں آگئے۔ طبری، ابن الاثیر یعقوبی، بلاذری اور ابن قتیبہ وغیرہ کسی نے اس واقعہ کو نہیں لکھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ افسانہ چھٹی صدی ہجری کی پیداوار ہے۔

مجوسیوں نے ایک داستان تصنیف کی اور اسے پھیلایا۔ قادسیہ کے معرکہ کے بعد اپنی جان بچا کر آگے آگے بھاگتے پھرنے والا سولہ سالہ کو لڑکی پیدا کر کے جوان کرنا اسے گرفتار کر کے مدینہ لانا اور حضرت حسینؓ کے نکاح میں دینا یہ سبائیوں کا معجزہ ہے۔

یزدگرد کی پوتی یا نواسی کا پتہ چلتا ہے جس کا نام شیریں دخت ہے، یہ خلیفہ ولید بن عبدالملک کے زمانہ میں ترکستان سے گرفتار ہو کر آئی اور خلیفہ کے حرم میں داخل ہوئی جس سے ان کے بیٹے یزید بن ولید بن عبدالملک پیدا ہوئے جو ۱۲۶ھ میں خلیفہ ہوئے اور صرف پونے چھ ماہ خلافت کی۔ اس لڑکی کو اس وجہ سے خصوصیت حاصل ہے کہ اس کے علاوہ کوئی ایرانی لڑکی کسی اموی کے حرم میں نہیں رہی۔

شہر بانو کی داستان محمد بن یعقوب کلینی اور ملا باقر مجلسی نے یوں بیان کی ہے۔

شیخ کلینی نے امام باقر سے روایت کی ہے کہ جب دختر یزدگرد کو عمر کے پاس لائے تو دختران مدینہ اس کے حسن و جمال کو دیکھنے کو ٹھے پر چڑھ آئیں۔ جب ان کو مسجد میں لائے تو ان کے چہرہ نورانی سے مسجد روشن ہو گئی۔ عمرؓ نے ان کے چہرے پر نظر کرنی چاہی تو شہزادی نے اپنا چہرہ چھپا لیا اور کہا "ہرمز اف ہو کہ اس کے فرزند تیرے اسیر

ہوں " ۔ عمرؓ نے کہا " اے گبرزادی مجھے دشنام دیتی ہے " اور چاہا ایذار سانی کرے ۔

جناب امیر نے فرمایا: ۔ یہ بزرگ زادی ہے ، تجھے سزاوار نہیں کہ اس سے بدسلوکی کرے ۔ جناب امیر نے عمر سے کہا: ۔ " دختر یزدگرد کو اختیار دے دے کہ مسلمانوں میں سے جسے چاہے پسند کرے ۔ اس کے حصہ غنیمت میں محسوب کردے " ۔

شہزادی نے اپنا ہاتھ امام حسینؓ کے سرپر رکھ دیا ۔ حضرت امیر نے نام پوچھا ۔ کہا " جہاں شاہ " جناب امیر نے فرمایا: ۔ " بلکہ چاہیئے کہ تمہارا نام شہربانو ہو ۔ " پھر امام حسینؓ سے فرمایا: ۔ " اے ابوعبداللہ ، اس دختر سے تمہارے یہاں ایک ایسا فرزند پیدا ہوگا وہ بہترین اہل زمین ہوگا " ۔ اسی وجہ سے زین العابدین کو ابن الخیرتین کہتے ہیں اس لئے کہ تمام عرب میں برگزیدہ خدا حضرت ہاشم تھے اور برگزیدہ عجم شاہ فارس ۔ اور نسب شریف (زین العابدین) دونوں سے متصل ہے (جلاء العیون جلد ۲ ۔ اصول کافی جلد ۱)

باقر مجلسی افسانہ گڑھتے ہوئے اپنا اگلا پچھلا بھول گئے ۔ کہتے ہیں ۔

اسی کے حصہ غنیمت میں اسے محسوب کردے یعنی جس پر بھی یہ لڑکی ہاتھ رکھے اسی کی باندی سمجھی جائے گی اور بقیہ مال غنیمت میں اسے کچھ نہ ملے گا ۔ اس نے حضرت حسینؓ کے سرپر ہاتھ رکھ دیا ۔ اس طرح یہ حضرت حسینؓ کی باندی ہوئی ۔ گویا ملا باقر کو یہ تسلیم ہے کہ حضرت زین العابدین ایک باندی کی اولاد ہیں کسی آزاد عورت کی اولاد نہیں ۔

بقول ملا باقر ، یہ لڑکی اتنی خوب صورت تھی کہ اس کے مشاہدہ کے لئے دختران مدینہ کوٹھے پر چڑھ آئیں ، ممکن ہے کہ دختران مدینہ اس لئے کوٹھے پر چڑھی ہوں کہ سیاہ فام سوڈانی عورت کو دیکھیں ۔ کیونکہ بقول ملا باقر مدینہ میں ایرانی لڑکیوں کی ایک باقاعدہ منڈی تھی جہاں دختران ایران فروخت ہوتی تھیں اور یہ سب خاندان بنی ہاشم کے حصہ میں آتی تھیں ۔ اس لڑکی نے ایران سے مدینہ تک بے پردہ سفر کیا لیکن حضرت عمر کو دیکھ کر منہ چھپالیا ۔

جناب امیر اسے بزرگ زادی بتاتے ہیں حالانکہ لفظ بزرگ فارسی ہے اور فارسی میں یہ لفظ بوڑھے کے لئے استعمال ہوتا ہے ۔ سرپر ہاتھ رکھنا بھی بتاتا ہے کہ شہربانو حضرت حسینؓ سے عمر میں بڑی تھیں ۔ لیکن ملا باقر اور ان سے قبل زمخشری نے یہ قلابازی کھائی کہ جناب امیر کے زبانی حضرت حسینؓ کو ابوعبداللہ کہلوایا گویا حضرت حسینؓ اس وقت صاحب اولاد تھے اور ان کے ایک لڑکا عبداللہ نامی پیدا ہوچکا تھا ۔ جب کہ شیعوں کا یہ دعویٰ ہے کہ حضرت حسینؓ چار یا پانچ ہجری میں پیدا ہوئے (ہماری تحقیق کے مطابق ۹ھ میں) یہ واقعہ ۱۴ھ کا ہے ۔ گویا دس سال عمر میں حضرت حسینؓ کے لڑکا پیدا ہوچکا تھا ۔ جس طرح یزدگرد کے سولہ سترہ سال کی عمر میں لڑکی پیدا ہوکر جوان ہوگئی تھی ۔

سب سے بڑا معجزہ یہ ہے کہ " دروغ گو را حافظہ نہ باشد " کے مصداق ، ملا باقر ایک صفحہ قبل لکھتے ہیں: ۔ حضرت حسینؓ کے ایک لڑکے عبداللہ تھے جو حالت طفولیت میں اپنے پدر عالی مقام کی گود میں تیر لگنے سے شہید ہوئے ، جن کو لوگ علی اصغر کہتے ہیں یعنی جو لڑکا ۱۴ھ سے قبل پیدا ہوچکا تھا ۔ وہ ۶۱ھ میں دودھ پی رہا تھا اور میدان جنگ میں والد کی گود میں تھا ۔ یعنی چھیالیس (۴۶) سال کا دودھ پیتا بچہ ۔

یہ کتنا بڑا معجزہ ہے ۔ اس معجزہ کے وجود میں کوئی شک نہیں کیا جاسکتا کہ یہ امام باقر کا ارشاد ہے ۔ البتہ ہمارے نزدیک ۱۴ھ میں اس بچہ کی پیدائش ہی ایک معجزہ ہے کہ حضرت حسینؓ کی عمر اس وقت چھ سال تھی اور شیعوں کے بموجب دس سال ۔

زین العابدین کو برگزیدہ عرب و عجم بنانے کے لئے ملا باقر مجلسی کا دعویٰ بلاوجہ نہیں ۔ زین العابدین کا رسول اکرمؐ سے تعلق حضرت فاطمہؓ کے واسطے سے تھا ۔ جو ننہیالی ہوا ۔

اہل تشیع ایرانی قومیت کے باعث اپنی ننہال ایران کے ساسانی خاندان کو قرار دے چکے تھے ۔ اس لئے ملا باقر نے ہاشم سے رشتہ جوڑا ۔ ہاشم سے رشتہ جوڑنے میں ایک فائدہ تو یہ ہوا کہ ابوطالب بارہ اماموں کے باپ بن گئے ۔ دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ حضرت علیؓ کی والدہ فاطمہ بھی ہاشم کی اولاد میں سے تھیں جن کو ملا باقر سیدۃ النساء اہل الجنۃ قرار دیتا ہے وہ بھی ہاتھ سے نہ گئیں ۔

جلاء العیون کا ترجمہ حال میں لاہور سے شائع ہوا، جس پر سید ظہور الحسن قبلہ کوثر بریلوی نے حاشیہ لکھا ہے۔ انھوں نے اس واقعہ کا رد کرتے ہوئے اپنی برادری کے لئے ایک نیا لائحہ عمل پیش کیا۔ (پوری تفصیل "مذہبی داستانیں اور ان کی حقیقت" حصہ اول تالیف علامہ حبیب الرحمن صدیقی کاندھلوی میں دیکھئے) وہ کہتے ہیں: ۔" یہ کہانی ہم لوگوں نے وضع نہیں کی بلکہ اہل سنت نے وضع کرکے ہماری کتابوں میں شامل کر دی ہے" (آج تک کسی سبائی نے یہ دعویٰ نہیں کیا تھا کہ ان کی کتابوں میں فلاں بات سنیوں نے شامل کی ہے۔ اس کے برخلاف ہم کئی سو سال سے یہ دعویٰ کرتے آئے ہیں کہ سبائیوں نے ہماری کتابوں میں ہزاروں روایات گڑھ کر شامل کر دی ہیں۔ فریق مخالف کی جانب سے یہ پہلا دعویٰ ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ وہ عاجز آچکے ہیں) حالانکہ کلینی نے سب سے پہلے یہ روایت نقل کی ہے۔

ملاباقر مجلسی نے اسے نقل کیا اور زمخشری نے ملاباقر مجلسی سے اس کہانی کو لیا۔ سنیوں نے اس کہانی کو ہرگز شامل نہیں کیا۔

بریلوی صاحب نے اس بات کو ضرور رد کر دیا کہ یزدگرد کی بیٹی نہ تو دور عمر میں آئی، نہ تو دور عثمانی میں۔ لیکن انھوں نے اس کا اقرار نہیں کیا کہ اس کا کوئی وجود نہ تھا۔ وہ مدینہ آئی ہی نہیں۔ یا وہ زین العابدین کی ماں نہ تھی۔ وہ ان تمام باتوں کو نظرانداز کر گئے۔ وہ اس قصہ کو نئے انداز میں پیش کرتے ہیں۔

حضرت علیؓ نے حریث بن جابر صیفی کو خراسان کا گورنر بنا کر روانہ کیا۔ حریث نے جب یزدگرد کی دو بیٹیاں شہربلغ اور گیہاں بانو حضرت علیؓ کے پاس بھیجیں حضرت علیؓ نے شہربانو امام حسینؓ کو اور گیہاں بانو محمد بن ابی بکر کو دے دیں۔ شہربانو سے امام زین العابدین اور گیہاں بانو سے قاسم بن محمد پیدا ہوئے۔

خراسان ۲۹ھ میں فتح ہو چکا تھا۔ وہاں اسلامی حکومت قائم تھی۔ ایرانیوں کی حیثیت ذمیوں کی تھی۔ ایسی صورت میں ۳۶ھ میں گرفتار کر کے بھیجنا اور حضرت علیؓ کا انھیں تقسیم کرنا دو امور حرام تھے۔ اہل سنت حضرت علیؓ کے تعلق سے ایسی سوچ رکھنے والوں پر لعنت بھیجتے ہیں۔

شیعہ احادیث

جس طرح اہل سنت کے یہاں صحاح ستہ (صحیح بخاری، مسلم، ترمذی، مسند ابن ماجہ، موطا، امام مالک اور سنن ابوداؤد) احادیث نبوی کے مجموعے ہیں جن میں رسول اکرمؐ کے ارشادات، اعمال، افعال اور واقعات سندوں کے ساتھ روایت کئے گئے ہیں اسی طرح شیعہ اثنا عشریہ کے ہاں بھی احادیث اور روایات کی کتابیں ہیں، لیکن ان میں رسول اکرمؐ کی حدیثوں کا حصہ تو بہت کم بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ شاذ و نادر ہی ہے شاید پانچ فیصد ہو۔ زیادہ تر اماموں ہی کے ارشادات، اعمال و احوال اپنی سندوں کے ساتھ روایت کئے گئے ہیں جن کو اہل تشیع احادیث کہتے ہیں اور شیعی نقطہ نظر سے ایسا ہی ہونا بھی چاہئے کیونکہ ان کے نزدیک اب قیامت تک کے لئے ائمہ ہی بندوں کے لئے اللہ کی حجت اور اللہ تعالیٰ کے نمائندے و ترجمان اور امت کے واسطے ہدایت کا وسیلہ ہیں اور ان ائمہ کا درجہ رسول اکرمؐ کے برابر اور دوسرے تمام نبیوںؑ رسولوں سے برتر و بالا ہے۔

شیعہ اثنا عشری کی کتب احادیث میں ان کے نزدیک سب سے مستند ابو جعفر یعقوب کلینی رازی (وفات ۳۲۸ھ) کی "الجامع الکافی" ہے۔ صحت و اعتبار کے لحاظ سے شیعوں کے نزدیک اس مجموعہ کا درجہ وہی ہے جو اہل سنت کے نزدیک صحیح بخاری کا ہے بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ۔ زیادہ اس لئے کہ شیعوں کے عقیدہ کے مطابق کلینی رازی نے یہ مجموعہ مرتب کرنے کے بعد ایک سفیر کے ذریعہ اس کو امام غائب کے پاس بھیجا۔ امام غائب نے اس کو ملاحظہ فرما کر اس کی توثیق و تصدیق فرمائی اور فرمایا: ۔"ھذا کاف لشیعتنا" یعنی یہ ہمارے شیعوں کے لئے کافی ہے۔ (جب کہ صحاح ستہ کسی معصوم ہستی کی مصدقہ نہیں ہے) اس میں سولہ ہزار سے زیادہ روایتیں ہیں۔

شیعوں کا خود اعتراف ہے کہ ان کے ائمہ کے اقوال میں بہت زیادہ تضاد ہے۔

چنانچہ "اساس الاصول" میں مولوی دلدار علی لکھتے ہیں: ۔

جو حدیثیں ائمہ سے منقول ہیں وہ بہت مختلف ہیں ۔ کوئی حدیث ایسی نہیں جس کے مقابلہ میں اس کی منافی حدیث نہ ہو ۔یہاں تک کہ یہی اختلاف بعض ناقص لوگوں کے مذہب شیعہ سے پھرجانے کا سبب بن گیا جیسا کہ شیخ الطائفہ نے " تہذیب والاستبصار " کے شروع میں اس کی تشریح کی ہے ۔یہی نہیں بلکہ ائمہ کے اصحاب جو ان سے روایت کرتے ہیں ان میں بھی امانت اور سچائی نام کی کوئی چیز نہ تھی ۔ پھر لوگوں نے ائمہ کی طرف منسوب کرکے جو مذہب نقل کیا ہے وہ کس طرح قابل اعتبار ہو سکتا ہے ۔

چنانچہ اصول کافی میں عبداللہ بن یعفور سے روایت ہے کہ : ۔میں نے امام جعفر صادق سے کہا، میں ان لوگوں سے ملتا ہوں تو تعجب ہوتا ہے جو آپ لوگوں کی ولایت کو نہیں مانتے بلکہ فلاں اور فلاں کو مانتے ہیں ان میں امانتداری اور سچائی ہے ۔ جو لوگ آپ کو مانتے ہیں ان میں نہ امانت ہے نہ سچائی، یہ سن کر امام جعفر صادق سیدھے ہو کر بیٹھ گئے ۔ پھر میری طرف غصہ کے ساتھ توجہ کی اور فرمایا: ۔جو شخص ایسے امام کو مانے جو اللہ کی طرف سے نہیں ہے ۔اس کا دین ہی معتبر نہیں اور جس نے ایسے امام کو مانا جو اللہ کی طرف سے ہے تو اس پر کچھ عتاب نہیں ۔

اس کے علاوہ تقیہ کی وجہ سے یہ کیسے معلوم ہوگا کہ مختلف جوابات میں سے کونسا جواب امام کا اعتقاد کے مطابق ہے اور کونسا ازراہ تقیہ ۔ پھر کس طرح معلوم ہوگا کہ راویوں کی کونسی روایت سچی ہے اور کونسی جھوٹی ۔

اگر اماموں کی ان صفات کو بفرض محال تسلیم بھی کرلیا جائے جو شیعہ بیان کرتے ہیں تو بھی اماموں کا صحیح مذہب شیعہ کتابوں سے معلوم نہیں ہو سکتا ۔

ایک طرف کہا جاتا ہے کہ امام معصوم ہیں ان کی اطاعت فرض ہے اور ان کا تقرر اللہ کی طرف سے ہوتا ہے ۔دوسری طرف حال یہ ہے کہ اماموں کی تعلیمات بالکل مشکوک ، ان کے اقوال غیر معتبر اور ان سے منسوب روایات کے اندر حد درجہ اختلاف موجود ہے اور پھر ان کے اختلافات کا سبب دریافت کرنا انسانی طاقت سے باہر ہے ۔

شیعوں نے وضعی روایات کو زیادہ شہرت دینے کے لئے بعض احادیث کے

نام بھی وضع کرلئے ہیں تاکہ صرف حدیثوں کا نام بیان کرکے معتقدین کو بار بار اس وضعی حدیث کی جانب متوجہ کیا جاسکے اور پوری حدیث بیان نہ کرنی پڑے ۔ مثلاً: ۔

١۔ **حدیث ثقلین** ۔ ثقلین سے مراد دو بھاری چیزیں ہیں ۔ شیعوں نے یہ روایت وضع کی ہے کہ غدیر خم کے مقام پر رسول اکرمؐ نے فرمایا تھا ۔" میں تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑتا ہوں ۔" کتاب اللہ اور میری عترت " ۔اس حدیث کے سلسلہ میں "آیات بینات " سے ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے "احتجاج طبرسی " میں ابوالفضل محمد بن عبداللہ شعبانی سے یہ روایت ہے:۔

رسول اکرمؐ اپنی وفات کے قریب مرض کی حالت میں فضل بن عباس اور ان کے غلام ثوبان کا سہارا لئے ہوئے صلوۃ کے لئے آئے اور بعد صلوۃ مکان کو واپس تشریف لے گئے اور ثوبان سے کہا ۔ تم دروازے پر بیٹھے رہو اگر کوئی انصار میں سے آوے تو اندر آنے سے منع نہ کرنا" ۔ پھر آپ پر غشی طاری ہو گئی ۔اتنے میں انصار آئے اور کہا کہ ہم رسول اکرمؐ کے پاس جانا چاہتے ہیں ۔

حاجب نے جواب دیا کہ آپؐ پر اس وقت غشی طاری ہے اور ازواج مطہرات آپ کے پاس ہیں ۔ یہ سن کر انصار رونے لگے ۔جب رسول اکرمؐ نے ان کے رونے کی آواز سنی تو پوچھا یہ کون ہیں ؟ ۔جواب میں عرض کیا گیا کہ انصار ہیں ۔آپؐ یہ سن کر علی و عباس پر سہارا لگا کر باہر تشریف لائے اور خطبہ فرمایا: ۔

> " اے لوگو کسی نبی نے دنیا سے انتقال نہیں کیا جس نے کچھ ترکہ نہ چھوڑا ہو ۔ میں تمہارے واسطے ترکہ میں دو چیزیں چھوڑتا ہوں ۔اللہ کی کتاب اور اپنے اہل بیت کو ۔ جو انھیں چھوڑدے گا اللہ اسے خراب کردے گا اور خبردار یہ انصار میرے عزیز اور میرے بچوں کے موافق ہیں اور میرے بھروسہ کے لوگ ہیں اور میرے محرم اسرار ہیں ۔ میں تم کو اللہ کے خوف اور ان (انصار) کے ساتھ نیکی کرنے کی وصیت کرتا ہوں ۔ جو ان میں نیک ہیں ان کی نیکی کو قبول کرو اور جن سے خطا ہو ان سے درگذر کرو " ۔

یہ آپ کے آخری الفاظ ہیں جو انصار کی شان میں فرمائے ۔ان لوگوں پر افسوس

ہے جو اہل بیت کے الفاظ جو انصار کے لئے استعمال ہوئے تھے محدود معنوں میں استعمال کرتے ہیں اور پھر انصار کو جنھیں رسول اکرمؐ نے اپنے عیال اور فرزندان کہا۔ مرتد اور خارج از دائرہ اسلام قرار دیتے ہیں۔

۲۔ حدیث بساط۔ حضرت سلمانؓ فارسی سے روایت بیان کی جاتی ہے کہ ایک مرتبہ حضرت حسنؓ نے حضرت علیؓ سے پوچھا:۔ اللہ نے حضرت سلیمان کو تخت سلیمانی عطا کیا تھا تو کیا اللہ تعالیٰ نے آپ کو بھی کچھ عطا کیا؟

حضرت علیؓ نے اپنا ہاتھ بلند کر کے نیچے کیا تو اس کے ساتھ ابر کا ایک ٹکڑا بھی زمین کی طرف کھینچتا چلا آیا۔ اسی طرح دوسرے ہاتھ کے اشارے سے ابر کا ایک اور ٹکڑا بھی زمین پر آگیا ایک پر حضرت علیؓ سوار ہوگئے اور دوسرے پر ان کے اصحاب۔

اس کے بعد انھوں نے ابر کو بلند ہونے کا حکم دیا۔ ان ٹکڑوں پر سوار ہو کر حضرت علیؓ اور ان کے اصحاب سد سکندری تک گئے۔ اور یاجوج ماجوج کا نظارہ کیا۔ پھر حضرت سلیمانؑ کو زندہ کیا۔ قوم عاد کے منکرین سے جنگ کی پھر مع اپنے اصحاب کے ابر کے ٹکڑوں پر مدینہ واپس آگئے۔ اس وضعی روایت پر کسی تبصرہ کی ضرورت نہیں۔

۳۔ حدیث سفینہ۔ اس نام سے دو حدیثیں منسوب ہیں۔ دوسری روایت کے راوی حضرت سفینہ ہیں۔

الف اہل بیت کی فضیلت میں شیعوں نے یہ حدیث وضع کی ہے۔

مَثَلُ اَہلِ بیتی فیکم کمثل سفینۃ نوح من رکبہا نجیٰ و من تخلف عنہا غرق و ہویٰ۔ (تم میری اہل بیت حضرت نوحؑ کی کشتی کی طرح ہیں کہ جو اس پر سوار ہوا نجات پا گیا اور جو مخالف ہوا ہلاک ہو گیا۔)

(ب) دوسری حدیث وضع کی گئی ہے۔

"خلافت تیس (۳۰) برس رہے گی پھر ملک ہو جائے گی"۔ ابو بکر بن اصوبی نے اس حدیث کو غیر صحیح بتایا۔ پھر کہا کہ "اگر بالفرض صحیح ہو تب بھی قابل قبول نہیں کیونکہ نصوص صریحہ کے خلاف ہے"۔ دراصل یہ حدیث محض اموی خلفا کی بے حرمتی کے لئے وضع کی گئی۔

حضرت سفینہ نے حضرت معاویہؓ سے بیعت کی تھی۔ امیر معاویہ کی اطاعت کا عہد کرنے کے بعد ایسی روایت کو وہ کیونکر بیان کر سکتے ہیں؟ وہ دین جو قید زمانی سے آزاد ہے، اس کے متعلق یہ کہنا کہ اس کا نظام صحیح بنیاد پر صرف تیس (۳۰) برس رہا ایک نامناسب بات ہے۔ افراد کی تبدیلی کی وجہ سے نظام کے معیار میں تبدیلیاں ممکن ہیں لیکن تیس (۳۰) برس کی تخصیص قطعاً غیر درست ہے۔

۴۔ حدیث منزلت۔ شیعوں کا کہنا ہے کہ غزوہ تبوک کے موقع پر رسول اکرمؐ نے حضرت علیؓ کو نائب بنا کر مدینہ میں قیام کرنے کا حکم فرمایا تھا لیکن جب حضرت علیؓ بعض لوگوں کے طعن و تشنیع کی بنا پر مدینہ چھوڑ کر تبوک پہنچے تو رسول اکرمؐ کا ارشاد ہوا کہ: علی میرے لئے ایسے ہی ہیں جیسے ہارون موسیٰ کے لئے تھے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہو سکتا۔

۵۔ مَن بکیٰ۔ حدیث من بکیٰ سے اس وضعی روایت کی طرف اشارہ ہے۔ **مَن بکیٰ علی الحسنان او بکی او تباکی فلہ الجنۃ۔** (جو حسین پر رویا یا رلایا یا جس نے رونے پر اپنے آپ کو متوجہ کیا اس کے لئے جنت ہے)

۶۔ انا مدینۃ العلم۔ یہ حدیث سبائیوں اور باطنیوں کی وضع کردہ ہے۔

ابن عربی کے قول کو کہ "بے شک اولیاء انبیاء سے افضل ہیں اور خاتم الاولیاء (حضرت علی) خاتم الانبیاء سے افضل اور سارے ہی انبیاء اللہ کی معرفت خاتم الانبیاء کی مشکاۃ (لفظی معنی طاقچہ) سے حاصل کرتے ہیں"۔ مضبوط بنانے کے لئے اس حدیث وضع کیا گیا۔

ابن جوزی نے اس حدیث کو موضوع قرار دیا۔ امام نووی، امام ذہبی اور امام جزری کا بھی یہی خیال ہے۔ امام یحییٰ بن معین نے اس کو بے اصل کہا ہے۔ ابن دقیق العید نے کہا کہ علمائے حدیث نے اس کا کوئی ثبوت نہیں پایا۔

۷۔ من کنت مولاہ فعلی مولاہ لفظ مولا لغات اضداد سے ہے یعنی آقا اور غلام دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے مولا ان کو کہا جاتا ہے جو غلامی سے آزاد ہو کر بھی آقا کی خدمت کرتے ہیں۔ جیسے حضرت زید بن حارثؓ اور ابو رافع رسول اکرمؐ کے مولا تھے۔ چونکہ حضرت علیؓ بھی بچپن سے رسول اکرمؐ کے زیر پرورش

رہے۔لوگ ان کو رسول اکرمؐ کا مولا سمجھتے تھے۔

اس حدیث کا سبب صدور یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ جب حضرت فاطمہؓ کے لئے حضرت علیؓ سے رشتہ کی بات چلی تو حضرت فاطمہؓ کو اعتراض ہوا کہ حضرت علیؓ نادار اور کریہ المنظر ہیں اور لوگ ان کو رسولؐ کا مولا کہتے ہیں ۔اس پر رسول اکرمؐ نے فرمایا ہرگز نہیں ۔مَنْ کُنْتَ مولاہٗ فعلیٌ مولاہٗ ترجمہ (میں جس کا بندہ ہوں علی بھی اسی کا بندہ ہیں میرے مولا یعنی آزاد کردہ غلام نہیں)

اگر یہ الفاظ واقعی رسول اکرمؐ کے ہیں تو اس صراحت کی روشنی میں ۲ ہجری میں فرمائے گئے نہ کہ ۸ ہجری میں آخری حج سے واپسی کے وقت

"ایرانی انقلاب، امام خمینی اور شیعیت" سے اقتباس)

شیعہ اذان

جن مخالفین اسلام نے زبردست سازش کے ذریعہ مسلمانوں کے ایک طبقہ کو گمراہ کرنے میں کامیابی حاصل کی ان کی یہ کوشش رہی کہ مسلمانوں کے ہر عقیدہ اور ہر عمل میں اختلاف کا بیج بویا جائے اور دین میں انتشار کی کیفیت پیدا کی جائے چنانچہ اللہ تعالیٰ کے تعلق سے بداء کا عقیدہ پیش کیا گیا۔رسالت کی اہمیت کو کم کرنے کے لئے امامت کا نظریہ پیش کیا گیا اور امامت کو رسالت پر فوقیت دی گئی، یہ سلسلہ ہر عبادت اور چھوٹے سے چھوٹے عمل کی حد تک کیا گیا ہے ۔چنانچہ اذاں کے الفاظ بھی بدل دئے گئے۔شیعہ اذاں یوں ہے:

۱۔اللّٰہ اکبر (چار مرتبہ وقفہ وقفہ سے)

۲۔اشھدان لاالہ الااللّٰہ (دو مرتبہ)

۳۔اشھدان محمد رسول اللّٰہ (دو مرتبہ)

۴۔اشھدانّ امیر المؤمنینَ وامامَ المُتقین علیًا ولیّ اللّٰہ وصیُ رسول اللّٰہ وخلیفتہ بلافصل (دو مرتبہ)

۵۔حیّ علی الصلوٰۃ (دو مرتبہ)

۶۔حیّ علی الفلاح (دو مرتبہ)

۷۔حی علی خیر العمل (دو مرتبہ)

۸۔اللّٰہ اکبرُ (دو مرتبہ)

۹۔لاالہ الااللّٰہ (دو مرتبہ)

۱۔مروجہ اسلامی اذاں میں اللہ اکبر چار مرتبہ اس طرح پڑھتے ہیں کہ پہلے اللہ اکبر اللہ اکبر، ملاکر پڑھتے ہیں ۔پھر اللہ اکبر اللہ اکبر ملاکر پڑھتے ہیں ۔اس کے برخلاف شیعہ اللہ اکبر چار مرتبہ علحدہ علحدہ پڑھتے ہیں۔

۲و۳ شیعہ اذاں کے الفاظ مروجہ اسلامی اذاں سے مختلف نہیں۔

۴۔شیعہ اذاں میں الفاظ زائد ہیں ۔حالانکہ ابتدائی دور میں حتیٰ کہ حضرت علی کے دور خلافت میں کبھی یہ الفاظ اذاں کا جزو نہ رہے۔

۵و۶۔شیعہ اذاں کے یہ الفاظ مروجہ اسلامی اذاں سے مختلف نہیں۔

۷۔شیعہ اذاں کے میں یہ الفاظ زائد ہیں

۸۔شیعہ اذاں کے یہ الفاظ مروجہ اسلامی اذاں سے مختلف نہیں۔

۹۔مروجہ اسلامی اذاں میں لاالہ الا اللہ صرف ایک مرتبہ کہا جاتا ہے جب کہ شیعہ اذاں میں دو مرتبہ کہا جاتا ہے۔

اس کے علاوہ مسلمان فجر کی اذاں میں حی علی الصلوٰۃ (دو مرتبہ) اور حی علی الفلاح (دو مرتبہ) کے بعد یہ الفاظ کہتے ہیں ۔"الصلوٰۃ خیرٌ من النَوم" (دو مرتبہ) شیعہ اذان میں یہ الفاظ شامل نہیں۔

حضرت علیؓ نے اپنی خلافت کے زمانہ میں بھی شیعہ اذاں کو رواج نہیں دیا بلکہ اس بات کی سند ملتی ہے کہ حضرت علیؓ نے اذان میں رود بدل کو بدعت قرار دیا۔ چنانچہ امام نووی (وفات ۱۶۷۶) نے لکھا ہے کہ حضرت علیؓ نے ایک شخص کو دیکھا کہ عشاء کی اذان میں تثویب کر رہا ہے ۔یعنی حی علی خیر العمل کہہ رہا ہے، تو انھوں نے یہ سن کر کہا اخرجوا ھذا المبتدع من المسجد (اس بدعتی کو مسجد سے نکال دو) اشھَدانّ مُحمّدَرسُولَ اللّٰہ کے بعد اہل تشیع حضرت علی کا نام شامل کر کے جن الفاظ کا اضافہ کرتے ہیں ان میں بھی یکسانیت نہیں ہے ۔مثلاً ایران میں الفاظ کہے

جاتے ہیں۔

اشھدانّ علیؑ ولی اللہ

اشھدانّ علی حجتہ اللہ

مختصر یہ کہ جب اذان کے تقدس کو متاثر کر کے تحریف کی گئی تو پھر ہر شخص اور ہر گروہ نے اپنی پسند کے مطابق تبدیلیاں کر دیں۔

03 شہنشاہ جلال الدین اکبر (پیدائش ۹۴۹ ہجری وفات ۱۰۱۴ ہجری) نے دین الہٰی رائج کیا تو مسلمانوں کی اذان کے تمسخر کے لئے حیّ علی الصلوۃ اور حی علی الفلاح کے بجائے حی علی یللہ فللہ کے الفاظ کہلوائے۔

شیعوں کا ایمان

قرآن مجید پر ہے نہ ہو سکتا ہے

شیعہ آج تک قرآن کے متعلق کسی ایک فیصلہ پر نہیں پہنچ سکے جس طرح باقی امور میں بھی یہ لوگ مختلف الخیال ہیں۔

۱۔ شیعوں کے چھٹے امام جعفر صادق سے روایت ہے " جو قرآن حضرت جبرئیل رسول اکرمؐ پر لائے تھے وہ ۱۷ ہزار آیات پر مشتمل تھا جبکہ موجودہ قرآن ۶۶۶۶ آیات پر مشتمل ہے " (اصول کافی باب النوادر صفحہ ۶۷)

۲۔ ان ہی سے اور ایک روایت ہے۔ " ہمارے پاس ایک جامعہ ہے وہ قرآن ہے جو ۷۰ گز لمبا ہے "۔

۳۔ (اصول کافی صفحہ ۱۴۶) اسی اصول کافی میں لکھا ہے کہ اس جامعہ کی موٹائی اونٹ کی ران برابر ہے۔ صفحہ ۱۴۷)

۴۔ حضرت جعفر صادق سے روایت ہے " ہمارے ہاں ایک مصحف فاطمہ ہے اور تم جانتے ہو وہ مصحف فاطمہ کیا ہے۔ وہ ایک قرآن ہے جس میں تمہارے قرآن سے سو گنا

زیادتی ہے اور خدا کی قسم اس میں تمہارے قرآن کا ایک لفظ بھی نہیں (اصول کافی صفحہ ۱۴۶)

۵۔ تحریف قرآن پر دلالت کرنے والی روایات متواتر نہیں "۔ (فصل الخطاب صفحہ ۳۰)

۶۔ " یہ قرآن کچھ وہی ہے کچھ بدلا ہوا ہے "۔ (شیعی مفسر کاشانی کا مقدمہ)

۷۔ " قرآن کی آیات سات ہزار ایک سو تھیں۔ اس قرآن کی آیات ۶۶۶۶ ہیں "۔ (صافی)

حالیہ زمانہ میں اہل تشیع زور و شور سے کہہ رہے ہیں کہ وہ تحریف قرآن کے قائل نہیں ہیں بلکہ اس دعویٰ میں وزن پیدا کرنے کے لئے انھوں نے آگے بڑھ کر جارحانہ انداز میں یہاں تک کہا کہ اہل سنت کی روایتوں سے قرآن مجید میں تحریف ثابت ہوتی ہے اور یہ نتیجہ اخذ کیا کہ جس طرح ایسی تمام روایتیں جو اہل سنت کے ہاں تحریف قرآن سے متعلق پائی جاتی ہیں ان کو علمائے اہل سنت درست نہیں مانتے اسی طرح شیعہ کتابوں میں بھی ایسی روایات پائی جاتی ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ شیعوں کے نزدیک ایسی تمام روایتیں صحیح بھی ہوں۔

جہاں تک ان روایات کا تعلق ہے جو اہل سنت کے ہاں موجود ہیں، ان میں سے زیادہ تر تو اختلاف قرات اور نسخ سے متعلق ہیں۔ اختلاف قرات کو کسی طرح تحریف نہیں کہا جا سکتا کیونکہ ایسے تمام اختلافات جزوی ہیں اور ہم ان سے پوری طرح واقف ہیں اور یہ جانتے ہیں کہ کونسی قرات شاذ ہے اور کس قرات کو ترجیح دی جا سکتی ہے۔

اس کے علاوہ اہل تشیع اہل سنت کی بعض روایات کا ذکر کرتے ہیں۔ لیکن اہل سنت کی یہ تمام روایتیں احاد ہیں۔ متواتر نہیں اور ان کے وضعی ہونے میں بھی کلام نہیں۔ اس کے برخلاف قرآن مجید متواتر ہے۔ غیر متواتر بات متواتر کا مقابلہ نہیں کر سکتی اور نہ اعتقاد کی بنیاد بن سکتی ہے اہل سنت کی جن روایتوں کا ذکر اہل تشیع کرتے ہیں ان میں رسول اکرمؐ کا کوئی قول بیان نہیں کیا گیا۔ واقعہ یہ ہے کہ اہل سنت تحریف قرآن کے ہرگز معتقد نہیں اور نہ کبھی رہے۔ وہ تو معتقد تحریف کو قطعی کافر جانتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان روایات کے متعلق علمائے اہل سنت کا موقف یہ ہے کہ وہ تمام روایات کو ضعیف اور وضعی تصور کرتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ

معاندین اسلام نے قرآن مجید کو مشکوک بنانے کے لئے اور تحریف قرآن کو ثابت کرنے کے لئے یہ روایات گھڑی ہیں لیکن جہاں تک اہل تشیع کا تعلق ہے معاملہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ تحریف سے متعلق شیعوں کی روایات متواتر ہیں۔

" اصول کافی "جو مذہب شیعہ کی سب سے زیادہ معتبر کتاب ہے اور اس کے متعلق شیعوں کا یہ عقیدہ ہے کہ یہ کتاب سفیروں کے ذریعہ امام غائب کے پاس غار میں بھیجی گئی اور امام غائب نے اس کو دیکھ کر تصدیق کی اور فرمایا: ۔" یہ کتاب ہمارے شیعوں کے لئے کافی ہے " ۔اس کتاب میں ایک مستقل باب اس بیان میں ہے کہ امامت کے متعلق قرآن میں قطع و برید کی گئی اور اس ضمن میں بے شمار روایتیں موجود ہیں جن سے قرآن مجید میں تحریف ظاہر ہوتی ہے۔

کتاب احتجاج طبرسی شیعہ مذہب کی معتبر کتاب ہے ۔اس میں چودہ صفحات پر مشتمل ایک طویل روایت حضرت علیؓ سے منقول ہے کہ :

ایک زندیق نے قرآن پر اعتراضات کئے تو قریب قریب ہر اعتراض کے جواب میں حضرت علیؓ نے فرمایا کہ: ۔قرآن میں تحریف ہو گئی ہے ۔اس روایت کے بموجب آخر میں حضرت علیؓ نے زندیق سے فرمایا: ۔اگر میں تجھ سے وہ تمام آیتیں بیاں کردں جو قرآن سے نکال دی گئی ہیں تو بہت طول ہو جائے گا اور تقیہ جس چیز سے روکتا ہے ظاہر ہو جائے گا۔

تعجب ہے کہ حضرت علیؓ کو قرآن کو محرف کہنے سے تقیہ نے نہ روکا مگر مقامات تحریف معین کرنے سے (حالانکہ نشان دہی کرنے سے قرآن کارآمد ہوجاتا) تقیہ نے روکا۔

احتجاج طبرسی میں کم و بیش دس (۱۰) روایات تحریف سے متعلق ہیں ۔ اصول کافی اور احتجاج طبرسی کے علاوہ تفسیر قمی ، تفسیر العیاش ، تفسیر صافی ، رجال کشی ، فصل الخطاب سب میں تحریف قران کو ثابت کرنے کی جسارت کی گئی ہے۔

غرض تمام محدثین اور بڑے بڑے اکابر شیعہ تحریف قرآن کے قائل ہیں ۔ اہل تشیع کے پاس بے شمار روایتیں تحریف قرآن سے متعلق ہیں جو حضرت علیؓ اور امام باقرؒ کے نام سے تصنیف کر کے کتابوں میں درج کر دی گئی ہیں ۔زائد از دو ہزار

روایتیں آئمہ کی موجود ہیں جن سے قرآن میں تحریف ثابت ہوتی ہے شیعہ علماء نے ان روایتوں کے متواتر ہونے کا اقرار کیا ہے اور ان روایتوں کی بنیاد پر وہ سب قرآن میں تحریف کے نہ صرف قائل رہے بلکہ ہر دور میں شیعہ علماء کو تحریف پر اصرار رہا۔

شیعوں میں صرف چار آدمی (غالباً از راہ تقیہ) تحریف قرآن کے منکر ہو گئے۔
۱۔شریف مرتضیٰ ۲۔شیخ صدوق ۳۔ابو جعفر طوسی ۴۔شیخ ابو علی طبرسی ۔ مصنف تفسیر مجموعہ البیان.

بعد کے تمام علماء ان چاروں کی سخت مخالفت میں لگ گئے ۔ان کو بے وزن اور ناقابل اعتماد قرار دے کر ہی دم لیا۔ تحریف قرآن کی حد تک ان چار شیعی علماء کے انکار کی کوئی اہمیت نہیں ۔قرآن میں تحریف نہ ہونے کے متعلق شیعہ علما کے بعض شاذ اقوال بھی ہیں لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ ان شاذ اقوال کے خلاف شیعہ زعماء فیصلے کر چکے ہیں اور ان کو رد کر چکے ہیں ، اب اگر چودھویں صدی کے شیعہ صاحبان قرآن مجید میں تحریف کو نہیں مانتے تو پہلے اپنے سابق مجتہدین اور آئمہ کرام کی بقیہ تمام روایات کو بھی رد کریں اور ان کی روایات کے ضعیف ہونے کے معقول وجوہ پیش کریں ورنہ ان کا یہ کہنا قرآن مجید میں تحریف نہیں ہوئی اپنے اکابرین سے بغاوت کے مترادف ہوگا۔ شیعوں کے پاس کوئی ایسی روایت نہیں جس سے ان چار آدمیوں کی تائید ہوتی ہو۔ البتہ حالیہ زمانہ میں بعض شیعہ علماء نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ شیعہ تحریف قرآن کے قائل نہیں ہیں چنانچہ پنجاب کے سید علی حائری نے ایک رسالہ "موعظہ تحریف قرآن" کے نام سے لکھا جس کا نہایت تفصیلی جواب حضرت محمد عبدالشکور فاروقی نے شیعہ اور قرآن: "تنبیہ الحائرین" کے نام سے دیا۔ شیعہ عالم سید علی نقی نے " تحریف قرآن کی حقیقت " کے نام سے ایک کتابچہ شائع کیا۔ شیخ رسول جعفریان نے تحریف قرآن پر مقالہ لکھا، جو جمہوری اسلامی ایرانی کی سرپرستی میں شائع ہونے والے رسالہ توحید میں تین اقساط میں شائع ہوا۔ غرض اب یہ بات نہایت زور سے کہی جارہی ہے کہ شیعہ تحریف قرآن کے قائل نہیں ہیں۔

اگر واقعی ایسا ہوتا تو بڑی اچھی بات تھی لیکن شیعوں کے جو بنیادی عقائد ہیں ، ان کی روشنی میں یہ سوال ابھر کر سامنے آتا ہے کہ آیا شیعوں کا لمان قرآن شریف پر

ہو سکتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ شیعی عقائد کی تائید میں تحریف قرآن کا عقیدہ رائج کیا گیا۔ اگر شیعہ واقعتاً یہ مان لیں کہ قرآن مجید میں تحریف نہیں ہوئی تو لازماً شیعیت کی بنیادیں متزلزل ہو جاتی ہیں۔

قرآن مجید پر شیعوں کا ایمان نہ ہوسکنے کی وجہ صرف ان کا عقیدہ تحریف نہیں بلکہ اور بہت سی وجوہ ہیں جن میں سے صرف تین خاص وجوہ درج ذیل ہیں۔

۱۔ شیعوں کا بنیادی عقیدہ ہے کہ ناقلان قرآن کی پہلی جماعت (یعنی صحابہ کرامؓ) ساری کی ساری جھوٹی تھی۔ شیعوں کے بموجب اس جماعت میں دو گروہ تھے۔ ایک خلفائے ثلاثہ اور ان کے ساتھیوں کا گروہ جس میں لاکھوں صحابہ موجود تھے اور دوسرا حضرت علیؓ کا گروہ جس میں گنتی کے چار پانچ آدمی شامل تھے۔ شیعہ مذہب کی رو سے پہلے گروہ کے جھوٹ کا نام نفاق اور دوسرے گروہ کے جھوٹ کا نام تقیہ تھا۔ فرق یہ تھا کہ دوسرا گروہ اپنی جھوٹ کو بڑی عبادت اور اہم فرض سمجھتا تھا۔ لہذا لازم آتا ہے کہ شیعوں کو قرآن مجید کا بلکہ دین کی کسی اور چیز کا کسی طرح یقین نہیں ہوسکتا کیونکہ قرآن مجید اور دین کی ہر بات صحابہ کرامؓ ہی کی نقل و روایت سے بعد والوں کو ملی۔ ظاہر ہے کہ جھوٹوں کی نقل د روایت پر کسی طرح ایمان نہیں ہوسکتا۔

۲۔ قرآن مجید خلفائے ثلاثہ کے اہتمام سے جمع ہوا اور ان ہی کے ذریعہ پھیلا۔ قرآن کی کوئی قابل وثوق تصدیق شیعوں کے آئمہ کی کتابوں میں منقول نہیں اور خلفائے ثلاثہ کے متعلق شیعوں کا یہ بنیادی عقیدہ ہے کہ معاذاللہ وہ نہ صرف مخالف و دشمن دین تھے بلکہ جھوٹے بھی تھے لہذا قرآن مجید جو دین کے دشمنوں اور جھوٹوں کے ہاتھ سے امت کو ملا جو (معاذاللہ) خائن، کاذب اور تخریب دین کے درپئے تھے اور صاحب اقتدار بھی تھے اور ایسی قوت بھی رکھتے تھے کہ جھوٹ پر سب کو متفق کر لیا تھا اور ان دشمنوں کے سوا کوئی دوسرا ذریعہ بھی قرآن کو ہم تک پہنچانے کا نہ تھا اور نہ کسی دوسرے معتبر (شیعی) ذریعہ سے قرآن کی تصدیق ہوئی تو پھر شیعوں کے لئے قرآن کیسے قابل اعتبار ہوسکتا ہے اور تحریف سے محفوظ رہ سکتا ہے؟

۳۔ شیعوں کی نہایت معتبر کتابوں میں زائد از دو ہزار روایات قرآن مجید میں پانچ قسم

کی تحریف کی موجود ہیں اور یہ سب روایات ایسے ذخیرہ ہائے احادیث میں ہیں جو عندالشیعہ مقبول اور مستند ہیں۔ کسی ایک روایت کو رد کرنا، اس ذخیرہ کی تمام روایات کو رد کرنے کے برابر ہوگا۔

کمی، بیشی، تبدیلی الفاظ، تبدیلی حروف، اور خرابی۔ ترتیب کلمات۔ آیات و سور، ان تمام روایات کی بنا پر علمائے شیعہ نے اقرار بھی کیا ہے اور یہ اصرار بھی کہ قرآن میں تحریف ہوئی ہے اور اس پر بھی زور دیا ہے کہ:۔

۱۔ تحریف کی یہ سب روایات کثیر اور متواتر ہیں:۔

۲۔ یہ روایات تحریف قرآن پر صراحۃً دلالت کر رہی ہیں۔

۳۔ یہ روایات ایسی ہیں جن کی بنا پر شیعہ تحریف قرآن کے قائل ہیں۔

جب چار شیعہ عالموں نے متقدمین کے خلاف روش اختیار کرتے ہوئے تحریف قرآن کا انکار کیا تو بعد کے شیعہ علماء نے ان سے سخت اختلاف کیا اور ان چاروں پر سخت تنقیدیں کیں بلکہ قرآن مجید میں صرفی اور نحوی غلطیاں نکالی گئیں اور دعویٰ کیا گیا کہ موجودہ قرآن چند جہلائے عرب کا گھڑا ہوا ہے۔ مجتہد پنجاب مولوی مرزا احمد علی نے اپنے رسالہ "انصاف" میں قرآن کے صرفی اور نحوی عیوب کی نشاندہی کر کے لکھا کہ "اگر قرآن معجزہ ہے تو اس قسم کی معجز کتاب میں بھی تصنیف کر سکتا ہوں"۔ یہ بھی فتویٰ دیا کہ کسی قرآنی آیت پر اس وقت تک عمل کرنا جائز نہیں جب تک یہ بات شیعہ علماء کی متفق علیہ نہ ہو کہ وہ قرآن کی آیت ہے۔

("شیعہ اور قرآن موسوم بہ تنبیہ الحائرین" سے اقتباس)

الصلوٰۃ السلام التحیت

صلوٰۃ

لفظ صلوٰۃ سہ رخی مادہ صلا۔ سے مشتق ہے۔ قرآن مجید میں صلوٰۃ کی حسب ذیل اشکال کا ذکر ہے۔

۱۔بندوں کی جانب سے معبود کے حضور میں۔
۲۔اللہ کی جانب سے بندوں کے لئے یا رسول اکرم کے لئے۔
۳۔نبی کی جانب سے مومنوں کے لئے۔
۴۔ملائکہ کی جانب سے نبی کے لئے۔
۵۔مسلمانوں کی جانب سے نبی کے لئے۔

۱۔اس صلوۃ کے معنیٰ جو بندوں کی جانب سے معبود کے لئے ہو۔فرض منصبی کی ادائی کے ہیں۔شرح نصاب میں لکھا ہے کہ:۔لفظ صلوۃ صلا۔یعنی سرین سے ماخوذ ہے یعنی کولھوں کو حرکت دینا۔صلوۃ کی اسی شکل کو قرآن مجید میں بطور اصطلاح استعمال کیا گیا ہے یعنی اصطلاح میں صلوۃ مسلمانوں کی مخصوص عبادت کا نام ہے، جو قیام رکوع سجدہ اور قعدہ پر مشتمل ہوتی ہے۔صلوۃ سے معاشرہ میں حرکت پیدا ہوتی ہے ہو سکتا ہے کہ اسی وجہ سے اس عبادت کا نام صلوۃ رکھا گیا ہو۔

صلوۃ مسلمانوں کا ایک جا جمع ہو کر اور صف باندھ کر تمام دنیا جہاں کے حقیقی بادشاہ کے حضور دعا کرنا اور خود کو اس جہاد اکبر کے لئے تیار کرنا ہے جو ہر مومن کا نصب العین ہے۔

صلوۃ اقتضائے عبدیت ہے اور اظہار عبدیت و بیان عجز کے لئے صلوۃ سے بڑھ کر اور کوئی صورت محقق نہیں۔یوروپی زبانوں میں بھی سلام، سجدہ یا تعظیمی بوسہ کے لئے سامی لفظ صلیوت (Salute) ہی کو بنیاد بنایا گیا ہے۔قرآن مجید میں صلوۃ کی جتنی مرتبہ تاکید کی گئی ہے لفظ اقامت کے ساتھ آئی ہے۔مطلق صلوٰۃ ادا کرنے کا ذکر صرف ایک دو جگہ آیا ہے۔

اقامت صلوۃ کی حقیقت کو سمجھنا چاہئے۔اقامت کے معنی قائم و دائم کے ہوتے ہیں۔اقامت صلوۃ میں یہ تصور موجود ہے کہ صلوۃ کو اس کے مقررہ اوقات میں پابندی کے ساتھ اس کے پورے آداب و شرائط کے ساتھ ادا کیا جائے۔نظام صلوۃ کو برپا کیا جائے اور اس نظام کو قائم و دائم رکھا جائے۔اس میں اور "نماز پڑھنے" کے مختلف اور محدود تصور میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔پڑھنے میں "جپنے" کا انداز ہوتا ہے جب کہ صلوٰۃ ایک اجتماعی دعا ہے جو پریڈ کے مشابہ ہے۔

۲۔لفظ صلوۃ اگر اللہ کی جانب سے ہو تو اس کے معنی رحمت و برکت (Blessing) کے ہوتے ہیں۔مومنوں پر اللہ کی صلوۃ نزول رحمت الہیٰ ہے۔اسی طرح رسول اکرمؐ پر اللہ کی صلوۃ تحسین و آفریں ہے۔ان معنوں میں جب بھی صلوۃ کا ذکر ہے تو صلوۃ ایک لفظ تصور ہوگا نہ کہ اصطلاح۔
۳۔مومنوں پر نبی کی صلوۃ کا مطلب ان کی تحسین اور حوصلہ افزائی سورہ توبہ میں ان صلوتک سکن لھم (آیت ۱۰۳) (ان کو دعائے خیر دو کیونکہ تمہاری تحسین ان کے لئے تسکین کا موجب ہے۔) ان معنوں میں بھی صلوۃ کا ذکر ہو تو صلوۃ لفظ ہی سمجھا جائے گا نہ کہ اصطلاح۔
۴۔سورہ احزاب کی آیت (۵۶) کے ابتدائی حصہ میں اللہ کی جانب سے اور ملائکہ کی جانب سے نبی کریمؐ پر صلوۃ کی خبر دی گئی۔ان اللہ وملئکتہ یصلون علی النبی (بلاشبہ اللہ اور اس کے ملائکہ نبی پر صلوٰۃ بھیجتے ہیں۔یہاں ملائکہ کی جانب سے نبی کریمؐ کے لئے صلوۃ کے معنی اللہ کی رحمت (Blessings) کو نبی تک پہنچانے کا فرض ادا کرنا ہے یعنی فرشتے اللہ تعالے کی حمد و تسبیح کرتے ہیں اور رسول اور اس کے مشن کی نصرت کے لئے مستعد رہتے ہیں۔اللہ تعالیٰ نبی اور ان کے مشن کی نصرت غیر مرئی ذرائع سے بھی کرتا ہے۔ملائکہ کی جانب سے صلوٰۃ ان ہی معنوں میں ہے۔
قرآن مجید میں صلوۃ کی اس شکل کا ذکر ہوگا تو صلوہ لفظ ہی سمجھا جائے گا نہ کہ اصطلاح۔
۵۔صلوٰۃ علی النبی بمعنی تعظیم و تکریم کے ہیں۔سورہ احزاب کی آیت (۵۶) کے دوسرے حصہ میں مومنوں کو یوں حکم دیا گیا ہے۔"اے ایمان والو! تم بھی نبی کے لئے (اس کے لائے ہوئے دین کو) تسلیم کرتے ہوئے صلوۃ اور سلام کرو۔امت کی جانب سے رسول اکرمؐ پر صلوۃ کا مطلب رسول کے مشن سے مکمل وابستگی کا اظہار ہے اس میں اظہار تشکر بھی شامل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں رسول اکرمؐ کی امت میں شامل کیا۔

اس آیت کریمہ کے بموجب صرف نبی ہی پر صلوۃ اور سلام کا حکم ہے۔اس صلوۃ و سلام میں کسی غیر نبی کا شمول نہیں ہو سکتا۔کیونکہ یہاں صلوۃ بمعنی اقرار وفا اظہار عقیدت وارادت اطاعت و وابستگی اور دعائے نصرت کے ہیں۔رسول اکرمؐ کے

لائے ہوئے قانون اور ضابطہ۔ حیات کو تسلیم کرتے ہوئے اور اس پر عمل پیرا ہوتے ہوئے اس ضابطہ۔ حیات کو دنیا میں نافذ کرنے والے رہنمائے جلیل سے وابستگی کا علی الاعلان اظہار مومنوں کی جانب سے نبی پر صلوۃ و سلام ہے۔ بقول ابن اثیر اس سے غرض دعوت اسلامی کی تبلیغ اور بقائے شریعت ہے۔

التحیات

مومنوں کی جانب سے صلوۃ علی النبی کو التحیات کا اصطلاحی نام دیا گیا ہے اور اس کو پنج وقتہ صلوۃ کا جزو بنادیا گیا ہے۔ مسلمان احکام قرآنی کی رو سے ہر صلوۃ میں ایک یا ایک سے زائد بار قعدہ میں التحیات میں اس قرآنی حکم کی تعمیل کے مکلف ہیں اس کے علاوہ صلوۃ سے باہر اپنی عملی زندگی میں رسول اکرمؐ کے لائے ہوئے قانون اور ضابطہ۔ حیات سے وابستگی کے برملا اظہار کے بھی مکلف ہیں۔

"نماز" کے بعد حلقہ باندھ کر ترنم کے ساتھ نعتیہ اشعار کا پڑھنا اس کا بدل نہیں ہو سکتا۔ اور نہ ہی ایسی خود ساختہ صلوۃ کا جواز ہو سکتا ہے۔ یہ جو رواج ہے کہ جب خطیب اللہ تعالیٰ کا حکم **صلوا علیہ و سلموا تسلیما** سنائے تو تمام مسلمان **اللھم صلی علیٰ محمد و علیٰ آل محمد** وغیرہ پڑھتے ہیں نامناسب ہے۔ اور باطنیوں نے اس کی ابتداء کی۔ یوں بھی یہ عجیب بات ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کا حکم سنایا جائے تو ہم پلٹ کر اللہ سے کہیں "اے اللہ تو محمدؐ پر صلوۃ بھیج" اور پھر اس میں غیر نبی کو بھی شریک کر دیں۔ پروفیسر زاہد علی نے اس عجیب طرز عمل کی نشاندہی کی ہے۔

نماز اور درود یہ دونوں الفاظ فارسی زبان کے ہیں اور غیر قرآنی ہیں۔" یہ عجمی اسلام" کے طفیل رائج ہوئے۔ اردو میں بھی صلوۃ کو نماز سے تعبیر کرتے ہیں۔ لفظ نماز سنسکرت لفظ نمس سے ماخوذ ہے جس کے معنی جھکنے اور آداب بجالانے کے ہیں۔ اسی سے نمستے یا نمسکار استعمال ہوتا ہے۔ اس لئے صلوۃ کو نماز کہنا درست نہیں جیسے کہ صلوۃ کو پوجا یا Prayer کہنا بھی غیر درست ہے۔

سلام

سلام سہ حرفی مادہ سلم سے مشتق ہے جس کے معنی سلامتی کی راہ اختیار کرنا ہے سلام کے اصطلاحی معنی مسلمانوں کا ایک دوسرے کو "دعا و سلام" کرنا ہے۔

سلام کی یہی ایک شکل اصطلاح ہے۔ سلام علیکم کے معنی ہیں اللہ تم کو سلامت رکھے اللہ کا حکم ہے کہ جب تم ایک دوسرے سے ملو تو پہلے سلام کرو اور سلام کرنے میں پہل کرو اور سنت کے مطابق بہتر سے بہتر سلام کرو۔ رسول کو حکم دیا گیا ہے کہ جب ہمارے مومن بندے آپ کے پاس آئیں تو آپ ان کو سلام کیجئے۔

تحیت

التحیات سہ حرفی مادہ حی سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں زندہ رہنا۔ تحیتہ کے معنی ہیں دعا دینا، سلامتی چاہنا۔

التحیات اصطلاح میں اس دعا کو کہتے ہیں جو صلوۃ فجر کی دوسری، صلوۃ ظہر، عصر اور عشاء کی دوسری اور چوتھی اور صلوۃ مغرب کی دوسری اور تیسری رکعت میں سجدوں کے بعد قعدہ میں پڑھی جائے۔ اس میں کلمہ شہادت بھی شامل ہوتا ہے۔ اس لئے اس کو تشہد بھی کہتے ہیں۔

حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرمؐ نے صلوۃ میں یوں پڑھنے کا حکم دیا **التحیات للہ والصلوۃ والطیبات السلام علیک ایھا النبی ورحمۃ اللہ وبرکاتہ السلام علینا و علی عباداللہ الصالحین اشھدان لا الہ الا اللہ واشھدان محمد عبدہ ورسولہ**

اس میں مروجہ "درود" شامل نہ تھا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود یہ بھی فرماتے ہیں کہ التحیات کے بعد جس کو جو دعا ہو پڑھ لیتا تھا۔ تقریباً ۱۲ اکابر صحابہ کے التحیات (تشہدات) مختلف کتب حدیث میں نقل ہیں۔ حمد الٰہی کے ابتدائی الفاظ میں خفیف سا اختلاف ہے۔ باقی عبارتیں یکساں ہیں۔ ابن مسعودؓ کی مندرجہ التحیات کو امام ابو حنیفہ نے اختیار کیا۔ امام مالکؒ نے حضرت عمرؓ کے تشہد کو اختیار کیا۔ حضرت عمرؓ پہلا جملہ التحیات میں یوں پڑھتے تھے۔

التحیات للہ الزاکیات للہ الطیبات الصلوۃ للہ

باقی عبارت ابن مسعودؓ کی عبارت کی طرح پڑھتے تھے۔ امام شافعی نے ابن عباسؓ کے تشہد کو اختیار کیا۔ اسی طرح دیگر صحابہ کرام ام المومنین حضرت عائشہؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت ابوہریرہؓ حضرت ابو موسیٰ الاشعری کے تشہدات بھی کتب احادیث

میں درج ہیں۔ مروجہ "درود" ان میں سے کسی میں بھی شامل نہیں۔

یہ بات غور طلب ہے کہ اصل "درود" تو خود التحیات ہی کی عبارت میں شامل ہے۔ التحیات خود **صلوا علیہ و سلموا تسلیما** " کے حکم کی صحیح اور پوری پوری تعمیل ہے سرخسی کہتے ہیں کہ تشہد کے پہلے یا بعد میں کچھ اضافہ کرنا اور صلوۃ میں غیر نبی کو شامل کرنا مکروہ ہے۔ جو اضافے کئے گئے ہیں مثلاً

"**اللھم صلی علی محمد و علیٰ ال محمد**" یہ سب ایسے راویوں کے ہیں جو کذاب تھے۔ مثلاً رسول اکرمؐ سے جو یہ ارشاد منسوب ہے کہ

من صلی صلوۃ لم یصل علی فیھا و علیٰ اھل بیت لم تقبل منہ

نماز پڑھنے میں جس نے میرے اور میرے اہل بیت پر درود نہ کہا نماز اس کی قبول نہ ہوگی اس کا راوی جابر بن یزید بن الحارث الجعفی الکوفی ہے۔ ذہبی نے میزان الاعتدال میں بتایا ہے کہ وہ علمائے شیعہ میں سے تھا۔ ابن حیان کہتے ہیں سبائی تھا۔ زائدہ نے اسے رافضی اور صحابہ کا بدگو بتایا ہے۔ دیگر آئمہ حدیث نے بھی دروغ گو لکھا ہے۔

جب اللہ تبارک تعالیٰ کا آیت (۳۳:۵۶) میں صاف و صریح حکم ہے کہ صرف نبی علیہ الصلوۃ والسلام پر صلوۃ و سلام کہو تو پھر یہ تصور کیونکر کیا جا سکتا ہے کہ اللہ کے حکم کے خلاف رسول اکرم نے اپنی امت کو اس کا مکلف کیا ہے کہ آپ کی ذات اقدس پر صلوۃ و سلام کہنے میں آپ کے قرابت داروں، آل، عترت، و ذریت کو بھی شامل کریں

ظہور امام

امام غائب کا ظہور کب ہوگا، اس بارے میں شیعی روایات اور ان کے ائمہ معصومین کے ارشادات جو بیان کئے جاتے ہیں وہ نہایت دلچسپ ہیں۔ (دیکھئے مضمون رجعت)

بارھویں امام کے بارے میں شیعوں کا کہنا ہے کہ

وہ اپنے والد حسن عسکری کی وفات سے دس دن پہلے غائب ہوگئے۔ اس وقت اس غیبت کی مدت حضرت علیؓ کی ایک روایت کے مطابق پہلے چھ دن یا چھ ماہ یا چھ سال مقرر ہوئی تھی۔ اس کے بعد ان کا ظہور ہونا چاہئے تھا۔

جب یہ مدت گذر گئی اور امام نہ چھ دن میں ظاہر ہوئے نہ چھ ماہ میں نہ چھ سال میں تو پھر دوسری مدتیں مقرر کی گئیں۔

اصول کافی میں محمد باقر کی روایت ہے کہ:

"بے شک اللہ تعالیٰ نے امام غائب کے ظہور کے لئے ۷۰ھ کا وقت مقرر کیا تھا پھر جب حضرت حسین قتل کر دیئے گئے تو زمین کے لوگوں پر اللہ کا غصہ بہت بڑھ گیا۔ پس اس نے اس معاملہ کو ۱۴۰ھ تک کے لئے موخر کر دیا۔ تو ہم نے تم (شیعوں) کو بتادیا۔ تم نے اس راز کو فاش کر دیا۔ اب اللہ نے اس امر کے لئے ہم کو کوئی وقت نہیں بتایا ہے۔

احتجاج طبرسی (جو شیعوں کی معتبر کتابوں میں سے ہے) میں شیعوں کے نویں امام محمد تقی سے روایت نقل کی گئی ہے، انھوں نے "القائم" کے بارے میں کہا:

ان کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ان کی ولادت خفیہ ہوگی۔ لوگوں کو پتہ ہی نہ ہوگا۔ ان کی شخصیت لوگوں کی نگاہوں سے غائب رہے گی۔ دنیا کے کناروں سے اہل بدر کی تعداد کے مطابق (۳۱۳) اصحاب اخلاص جب ان کے پاس جمع ہو جائیں گے تو اللہ تعالیٰ ان کے معاملہ کو ظاہر فرما دے گا (یعنی وہ غار سے باہر آکر اپنا کام شروع کر دیں گے)

امام آخر الزماں کا اب تک ظاہر نہ ہونا نویں امام محمد تقی کے قول کے مطابق اس بات کی دلیل ہے کہ گذشتہ ساڑھے گیارہ سو سال کے عرصہ میں امام غائب کا ساتھ دینے والے (۳۱۳) مخلص شیعہ کبھی جمع نہیں ہوئے۔

(کتاب "ایرانی انقلاب، امام خمینی اور شیعیت" سے اقتباس)

رسول اکرمؐ سے نکاح کے وقت

حضرت عائشہؓ کی عمر

حضرت عائشہؓ بعثت سے کم و بیش پانچ سال قبل پیدا ہوئیں - اس لحاظ سے یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ رخصتی کے وقت ان کی عمر انیس (۱۹) سال تھی - یہ امکان ضرور ہے کہ ان کی عمر اس سے کچھ زیادہ ہو لیکن اس سے کم کا سوال ہی نہیں - حضرت عائشہؓ حضرت فاطمہؓ سے دو سال چھوٹی تھیں اور رسول اکرمؐ کی سب سے چھوٹی بیٹی سیدہ ام کلثومؓ کی ہم عمر تھیں -

اس کے برخلاف کتب احادیث میں یہ روایت پائی جاتی ہے کہ جب رسول اکرمؐ نے حضرت عائشہؓ سے نکاح فرمایا تو اس وقت ان کی عمر نو سال تھی - ابن ہشام کی روایت کا بغور مطالعہ کرنے سے اور بخاری، مسلم، ابو داؤد، ترمذی، ابن ماجہ، درامی اور مسند حمیدی کی سندات جمع کرنے کے بعد ایک نئے عقدہ کا انکشاف ہوتا ہے - کچھ راوی تو اسے حضرت عائشہؓ کا یہ قول بیان کر رہے ہیں اور کچھ نے اسے عروہ کا قول بیان کیا ہے - بہر صورت یہ حدیث رسول تو ہرگز نہیں - یہ قول عائشہؓ ہے یا یہ قول عروہ ہے جو تابعی ہیں اور حضرت عائشہؓ کے بھانجے ہیں اگر یہ عروہ کا قول ہے تو اس کی کوئی شرعی حیثیت نہیں - یہ عروہ کا ایک تاریخی قول ہوا - اس سے زیادہ اس کی کوئی حیثیت نہیں عروہ کی اس روایت کو نقل کرنے والا ان کا بیٹا ہشام ہے - اس روایت میں تمام گڑبڑ اسی ہشام کے باعث پیدا ہوئی - علماء تو صرف یہ دیکھتے ہیں کہ بخاری و مسلم کا راوی ہے لہذا معصوم عن الخطاء ہے - لیکن رجال کی چھان بین سے معلوم ہوتا ہے کہ ہشام کے زندگی کے دو دور ہیں ایک مدنی اور دوسرا عراقی - مدنی دور ایک تو ۱۲۱ھ تک قائم رہا - اس دور میں ان کے سب سے اہم شاگرد امام مالکؒ ہیں - امام مالک نے موطا میں ہشام سے متعدد روایات لی ہیں لیکن نکاح والی روایات امام مالک کی کتاب میں دستیاب نہیں - امام ابو حنیفہؒ بھی ہشام کے اسی دور کے شاگرد ہیں اور ابو حنیفہ نے بھی اس روایت کو نقل نہیں کیا - ۱۳۱ھ تک

ہشام بلاشبہ سب کے نزدیک ثقہ تھے - لیکن ۱۳۱ھ میں انھوں نے اپنی بیٹی کی شادی پر ایک لاکھ اس امید پر قرض لے کر خرچ کر ڈالا کہ خلیفہ وقت سے مدد لے کر قرض اتار دونگا بنو امیہ کی حکومت تبدیل ہو گئی اور بنو عباس برسر اقتدار آگئے اور خلیفہ منصور کے سامنے دست سوال دراز کیا - اس نے بمشکل دس ہزار تھما دیا - یہ ان کا پہلا دماغی جھٹکا تھا جو ان کو پہنچا - جس کے نتیجہ میں انھوں نے روایات میں بہکنا شروع کیا - کچھ عرصہ بعد پھر وارد بغداد ہوئے اور ۱۴۶ھ میں بغداد میں انتقال ہوا - ان کی روایات میں جتنی گڑبڑ ہوئی، وہ سب اسی دور کی ہے - چنانچہ یعقوب بن ابی شیبہ کا بیان ہے کہ ہشام کی وہ روایات جو اہل عراق ان سے نقل کریں - ان کا کوئی بھروسہ نہیں - حضرت عائشہؓ کی عمر نکاح کے وقت چھ سال اور رخصتی کے وقت نو سال بیان ہشام سے اہل عراق نے نقل کیا ہے - حضرت عائشہؓ کے گڑیائیں کھیلنے کی کہانیاں ہشام سے اہل عراق نے نقل کی ہیں - حافظ ذہبی لکھتے ہیں کہ آخر عمر میں ہشام کے حافظہ میں تغیر پیدا ہو گیا تھا - حافظ عقیلی نے تو یہاں تک تحریر کیا ہے کہ ہشام آخری عمر میں سٹھیا گئے تھے - ہشام کے شاگرد امام مالکؒ نے بھی ہشام پر عراق والی روایات کے باعث اعتراض کئے ہیں - ابن حجر نے تو یہاں تک بیان کیا ہے کہ عراقی روایات کے باعث تمام اہل مدینہ نے ان پر اعتراضات شروع کر دیئے -

ہشام نے خود اپنی بیوی فاطمہ بنت المنذر کو بھی جو ان سے عمر میں ۱۳ سال بڑی تھیں اور شادی کے وقت ان کی عمر انتیس (۲۹) سال تھی نو سال ظاہر کیا یعنی بیس کو وہاں گرا کر نو کر دیا - بالکل اسی طرح حضرت عائشہؓ کے معاملہ میں دہائی کو گرا کر نو بنا دیا -

حضرت عائشہؓ کی عمر کی روایت ہشام سے نقل کرنے والے تمام راوی کوفہ یا بصرہ کے ہیں - کوئی راوی مکی ہے نہ مدنی - نہ شامی ہے نہ مصری - ہشام ۱۳۱ھ میں عراق پہنچے تو ان کی عمر ۷۱ سال تھی - اس عمر تک اس روایت کو ان سے مدینہ میں کسی نے نقل نہیں کیا اس طرح اس روایت کی حد تک دو قوی امکان ہیں یا تو کوفیوں نے اسے وضع کر کے ہشام کی جانب منسوب کیا یا خود ہشام نے اپنی بیوی کی عمر کی طرح حضرت عائشہؓ کی عمر کو کم کر کے بتلایا - خود ہشام نے اپنی مدنی زندگی میں کہا ہے :-

"جب تم سے کوئی عراقی ایک ہزار احادیث بیان کرے تو (۹۹۰) زمین پر پھینک مارو اور باقی دس میں بھی شک کرتے رہو"۔

بخاری نے ایک اور روایت حضرت عائشہؓ سے بیان کی ہے۔

"جب سورہ قمر (۵۴ کی آیت ۴۶) نازل ہوئی تو میں اس وقت لڑکی تھی اور کھیلتی پھرا کرتی تھی"۔

مفسرین کا اس پر تقریباً اتفاق ہے کہ سورہ قمر ۴ نبوی میں نازل ہوا۔اس روایت کے مطابق ۴ نبوی میں حضرت عائشہؓ کی عمر نو دس سال قرار پاتی ہے یعنی وہ بعثت نبوی سے پانچ سال قبل پیدا ہوئیں۔لیکن ہشام کی روایت کے مطابق یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ ۵ نبوی میں پیدا ہوئیں۔بخاری کی اس روایت کو تسلیم کرنے سے ہشام کی روایت غلط ثابت ہو جاتی ہے۔

صحیح بخاری میں ہجرت کے سلسلہ میں ایک روایت حضرت عائشہ سے مروی ہے۔

"جب مجھے عقل آئی میں نے والدین کو دین اسلام پر پایا۔کوئی دن ایسا نہ تھا جب رسول اکرمؐ صبح و شام ہمارے یہاں تشریف نہ لاتے ہوں"

تمام محدثین کا اس پر اتفاق ہے کہ حضرت عائشہؓ اپنی بڑی بہن حضرت اسماء سے دس سال چھوٹی تھیں اور حضرت اسماء کا انتقال ۷۳ھ میں سو سال کی عمر میں ہوا۔یعنی ہجرت کے وقت حضرت اسماء کی عمر ستائیس سال تھی۔اس طرح حضرت عائشہؓ کی عمر ہجرت کے وقت سترہ یا اٹھارہ سال بنتی ہے۔رخصتی ۱ھ یا ۲ھ میں ہوئی تو اس وقت ان کی عمر انیس یا بیس سال تھی۔

شیعہ مورخ محمد بن جریر طبری نے لکھا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق کو دو بیویوں سے چار اولادیں ہوئیں اور یہ تمام زمانہ جاہلیت میں پیدا ہوئیں۔اب اگر حضرت عائشہؓ ابن جریر کے مطابق بعثت سے چند ماہ قبل بھی پیدا ہوئیں تو رخصتی کے وقت ان کی عمر پندرہ (۱۵) سال بنتی ہے۔

مورخ ابن ہشام نے اپنی سیرت "السابقون الاولون" کی ترتیب وار فہرست پیش کی ہے جس میں چالیس نام ہیں۔حضرت عائشہؓ کا نمبر ۲۰ پر ہے اور حضرت عمر کا

نام چالیسواں ہے۔گویا حضرت عائشہ نے سنہ ۱ نبوت میں اسلام قبول کیا۔ایک روایت ہے کہ: حضرت ابوبکر نے ہجرت حبشہ کا ارادہ کیا تو یہ فکر ہوئی کہ پہلے اپنی بیٹی حضرت عائشہ کا نکاح کر دیں۔مطعم نے اپنے بیٹے جبیر کے لئے حضرت عائشہ کا ہاتھ مانگا۔جب حضرت ابوبکر مطعم کے پاس گئے تو اس کی بیوی نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ تم ہمارے بیٹے کو بھی بے دین (یعنی مسلمان) بنالو گے۔یہ سن کر حضرت ابوبکر وہاں سے چلے آئے۔اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہجرت حبشہ کے وقت یعنی سنہ ۵ نبوی میں حضرت عائشہؓ کی عمر اتنی تھی کہ ان کے والد کو ہجرت حبشہ سے قبل ان کی شادی کی فکر دامن گیر تھی۔

کتب احادیث و تاریخ سے ثابت ہے کہ جب مہاجرین مدینہ آئے تو وہاں کی آب و ہوا انھیں راس نہ آئی۔حضرت ابوبکر صدیقؓ، عامر بن فہیرہ، حضرت بلالؓ وغیرہ کی تیمارداری حضرت عائشہؓ نے کی۔ظاہر ہے کہ اتنی اہم ذمہ داری ایک آٹھ سالہ بچی کے سپرد نہیں کی جا سکتی تھی جب کہ گھر میں بڑی عورتیں موجود ہوں۔

حضرت عائشہؓ عالم اور فقیہ تھیں۔زمانہ جاہلیت کے اشعار سے واقف تھیں۔فصیح البیان تھیں اور علم طب سے بھی واقف تھیں۔شعر و ادب اور انساب سے متعلق ام المومنین حضرت عائشہؓ کے اقوال کتب حدیث تاریخ و کتب ادب میں بھرے پڑے ہیں شادی کے بعد مدینہ میں ان کے مشاغل مختلف تھے۔قرآن مجید کی تعلیم اور دوسرے دینی علوم سے سابقہ تھا۔مسلسل غزوات اور جہاد سے سروکار رہا۔اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عائشہؓ نے جو کچھ قابلیت حاصل کی وہ شادی سے پہلے ہی حاصل کی ہوگی۔

بات دراصل یہ ہے کہ عجمی راویوں نے اسلام کی مخالفت میں حضرت عائشہؓ کی فضلیت کو نظرانداز کرنے اور ان کے علم و فن پر پردہ ڈالنے کے لئے یہ چال چلی کہ ان کے ہاتھوں میں گڑیائیں تھمادیں حتیٰ کہ رسول اکرمؐ غزوہ۔تبوک (۹ھ) سے واپس آئے تو ایک طاق میں گڑیائیں سجی ہوئیں تھیں۔اس وقت حضرت عائشہؓ کو رسول اکرمؐ کی زوجیت میں آئے ہوئے نو سال ہو چکے تھے۔

اس سازش کی ایک اور وجہ ہے۔حضرت فاطمہؓ بھی بعثت سے قبل پیدا

ہوئیں لیکن شیعوں کا دعویٰ ہے کہ حضرت فاطمہؓ نبوت کے پانچ سال بعد پیدا ہوئیں اور نکاح کے وقت ان کی عمر نو سال تھی ۔ حتیٰ کہ تحفۃ العلوم میں جو اردو زبان میں شیعوں کی فقہہ کی کتاب ہے یہ تحریر ہے کہ جب لڑکی کی عمر نو سال ہو جائے تو شادی کر دی جائے ۔ لہذا شیعوں نے اپنی اس فریب کاری پر پردہ ڈلنے کے لئے حضرت عائشہؓ کی عمر کا ہوا کھڑا کر دیا۔

ایک روایت ہے کہ حضرت عائشہؓ کے خود کوئی اولاد نہیں ہوئی تو انھوں نے رسول اکرمؐ سے عرض کیا کہ دوسری بیویوں نے اپنے بیٹیوں کے نام سے کینتیں رکھ لی ہیں میں کس طرح اپنی کنیت رکھوں ۔ رسول اکرمؐ نے فرمایا اپنے بیٹے عبداللہ کے نام پر کنیت رکھ لے ۔ عبداللہ سے مراد عبداللہ بن زبیر ہیں جو حضرت عائشہؓ کے بھانجے تھے ۔ جو ہجرت کے بعد مدینہ میں تولد ہونے والوں میں پہلے تھے ۔

عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ عرب چونکہ گرم ملک ہے اس لئے لڑکیاں جلد بالغ ہو جاتی ہیں لیکن مشاہدہ یہ بتلاتا ہے کہ یہ بات نہ تو عربستان کی حد تک درست ہے نہ ہی ہندوستان و پاکستان کی حد تک جو گرم ملک ہیں ۔ اس کے علاوہ تاریخ عرب پر نظر ڈلنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قبل از اسلام یا بعد از اسلام نو سال میں شادی ہونے کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔

ہر مذہب و معاشرہ میں یہی رواج ہوتا ہے کہ لڑکیوں کی شادی ایسی عمر میں کی جائے کہ ان میں شعور و احساس پیدا ہو گیا ہو. اور بلوغ کی شرعی حد امام ابو حنیفہؒ کی رو سے اٹھارہ سال ہے ۔ چنانچہ رسول اکرمؐ نے اپنی صاحبزادیوں کی شادیاں ان کی پختہ عمر میں فرمائیں ۔

ابن حجر لکھتے ہیں کہ حضرت فاطمہؓ حضرت عائشہؓ سے پانچ سال بڑی تھیں ۔ دوسری جانب وہ اس بات کے زبردست حامی ہیں کہ حضرت عائشہؓ کی رخصتی نو سال کی عمر میں ہوئی ۔ اگر حضرت فاطمہؓ نبوت سے پانچ سال قبل پیدا ہوئیں تو ابن حجر کے مطابق حضرت عائشہؓ کی پیدائش اس سال ہوئی جب آپ مبعوث ہوئے اس طرح ام المومنین کی عمر رخصتی کے وقت پندرہ سال بنتی ہے ۔ شیعہ اس امر کے دعویدار ہیں کہ حضرت عائشہؓ نبوت کے پانچ سال بعد پیدا ہوئیں اور اس طرح ان کی عمر نکاح

کے وقت آٹھ نو سال تھی ۔ جب اہل سنت نے اس بات کو قبول کر لیا تو یہ کہہ کر مذاق اڑانا شروع کیا کہ جس لڑکی نے گڑیائیں کھیل کر وقت گذارا ہو وہ دین کو کیا سمجھے گی۔

ایک روایت میں حضرت عائشہؓ نے سورہ القمر کی آیت ۴۶ کے نزول کے بارے میں کہا ہے کہ اس وقت میں جاریہ تھی آیات کے نزول کا یاد رہنا ایک باشعور لڑکی ہی سے متوقع ہو سکتا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عائشہؓ زمانہ جاہلیت میں پیدا ہو چکیں تھیں ۔ ("عمر عائشہ پر ایک تحقیقی نظر" سے اقتباس) اردو کے مایہ ناز سیرت نگار ضیاء الدین کرمانی لکھتے ہیں : ۔ "رسول اکرمؐ سے نکاح کے وقت ان کی عمر عام طور پر صریحاً کم بتائی گئی ہے ۔ بظاہر انجان بن کر مضحکہ خیز انداز میں کہا جاتا ہے کہ رخصتی کے وقت یہ بہت ہی کم عمر یعنی صرف نو سال کی تھیں اور ۱۸ سال کی عمر میں بیوہ ہو گئیں حالانکہ ان کی مسلمہ ذہنی پختگی اور علم و فضل ، انسانوں کی پرکھ اور معاملات کی سوجھ بوجھ اور دینی اور دینوی امور پر ان کی گرفت اور اصابت رائے ان سب سے ظاہر ہوتا ہے کہ نکاح سے قبل انھوں نے کئی سال تربیت اور تجربہ حاصل کرنے میں گذارے ہیں تاہم خود حضرت عائشہؓ سے منسوب دو تعجب خیز بیانات ایسے ملتے ہیں جو ایک دوسرے سے مطابقت نہیں رکھتے ۔ صحیح مسلم کے مطابق حضرت عائشہ نے فرمایا کہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ و سلم نے ان کے ساتھ شوہر کی حیثیت سے اس وقت رہے جب کہ وہ نو سال کی لڑکی تھی ۔ اب اگر یہ بات مان بھی لی جائے تو دوسرا بیان جسے بخاری اور مسلم دونوں سے محدثین نے نقل کیا ہے کہ:۔

"میں رسول اللہ کے سامنے گڑیاں کھیلا کرتی تھی" قرین قیاس نہیں معلوم ہوتا ۔ یہ بیان ایک نو سال کی لڑکی کے بارے میں اور عرب جیسے ملک کے لحاظ سے بہت کم قابل قبول معلوم ہوتا ہے بالخصوص اس صورت میں جب کہ بخاری ہی کی سند پر ہمیں یہ بتایا گیا ہے کہ ایک ہی سال بعد غزوہ احد ۳ھ میں وہ میدان جنگ میں مشکیزے لے کر لوگوں کو پانی پلاتی اور زخمیوں کی دیکھ بھال کرتی دیکھی گئیں حالانکہ ان سے زیادہ عمر کے لڑکوں تک کو اسلامی فوج کے ساتھ جانے کی اجازت نہیں تھی ۔ ولی الدین محمد بن عبداللہ الخطیب جو منتخبہ احادیث کے مجموعہ "مشکوۃ المصابیح" کی

تدوین کے باعث مشہور ہیں علم الرجال پر اپنے رسالہ "الاکمال فی اسماء الرجال" میں لکھتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ اپنی بہن اسماء (جو ذات النطاقین بھی کہلاتی ہیں) سے دس سال چھوٹی تھیں اور اسماء کی وفات ۷۳ھ میں تقریباً سو سال کی عمر میں ہوئی۔ اس حساب سے حضرت عائشہؓ کا سنہ (۲ھ) میں رسول اکرمؐ سے نکاح کے وقت سترہ سال سے کم ہو ہی نہیں سکتا۔ بہرحال مورخ ابن کثیر (متوفی ۷۷۳ھ) نے بھی ۷۳ھ کے واقعات کے تحت حضرت اسماء کی وفات کا جو ذکر کیا ہے اس سے بھی اس بیان کی تصدیق ہوتی ہے"۔

(ابدی پیغام کے پیغامبر صفحہ ۳۰۹- ۳۶۰ سے اقتباس)

عبداللہ ابن سبا

عہد نبویؐ میں یہودی عرب کے تمام علاقوں میں پھیلے ہوئے تھے۔ لیکن ان کی اکثریت مدینہ میں آباد تھی۔ جس وقت مسلمان ہجرت کر کے مدینہ پہنچے تو وہاں یہودیوں کے تین بڑے قبیلے بنوقینقاع، بنونضیر، اور بنوقریظہ موجود تھے۔ جو زراعت تجارت اور صنعت پر چھائے ہوئے تھے اور ان کو معاشی برتری حاصل تھی۔ انصار کی اکثریت ان کی مقروض تھی۔ ان کو مذہبی اور علمی سرداری بھی حاصل تھی۔ ہجرت کے بعد اسلام پھیلنے لگا تو یہودیوں کا زور خود بخود کم ہونے لگا۔ رسول اکرمؐ نے مدینہ تشریف لانے کے بعد یہودیوں سے معاہدہ کیا۔ لیکن یہودی اسلام دشمن رہے اور اسلام کے خلاف سازشیں کرتے رہے۔ جن کی وجہ سے ان کو مدینہ سے خیبر جلاوطن کیا گیا۔ وہاں بھی انھوں نے اسلام کی مخالفت کو برقرار رکھا۔ رسول اکرمؐ نے خیبر کے قلعوں کو فتح کیا لیکن یہودیوں کی درخواست پر ان کو وہیں رہنے دیا لیکن یہودیوں نے مخالفت کا سلسلہ باقی رکھا۔ جس کی وجہ سے عہد فاروقی میں ان کو خیبر سے بھی جلاوطن کیا گیا۔ اس کے بعد یہودیوں نے سمجھ لیا کہ اب مسلمانوں کے خلاف جنگ نہیں کی جا سکتی لہٰذا انھوں نے اسلام میں داخل ہو کر اسلام کے خلاف سازشیں

شروع کر دیں۔

یمن کا ایک یہودی عبداللہ بن سبا حضرت عثمانؓ کے آخری زمانہ میں مدینہ پہنچا یہ یمن کے ایک شہر صنعا کا باشندہ تھا۔ اس کا باپ سبا نامی یہودی تھا۔ اور ماں ایک حبشن باندی تھی اور اپنے سیاہ رنگ کی وجہ سودا مشہور تھی۔ اسی لئے عبداللہ بن سبا کو ابن سودا بھی کہا جاتا ہے۔ بقول ابن حزم عبداللہ بن سبا نے اس لئے اسلام قبول کیا کہ جن مسلمانوں پر قابو پالے ان کو گمراہ کرے۔ اس نے پروپگنڈہ اس انداز سے شروع کیا کہ بظاہر تو خلافت عثمانؓ کے خلاف تھا لیکن دراصل اسلام اور صحابیت کے خلاف تھا۔ اس نے اپنی سازش ان خطوط پر مرتب کی۔

۱۔ بنوہاشم اور بنوامیہ کے درمیان رقابت پیدا کی اور اس خیال کی اشاعت کی کہ بنوہاشم کے ساتھ جو خلافت کے حقدار اور اہل بیتؓ ہیں ناانصافی ہو رہی ہے۔

۲۔ حضرت عثمانؓ خلافت کے حقدار نہیں اور نہ وہ خلافت کی ذمہ داریوں سے عہدہ بر ہو رہے ہیں اور ان کے عمال انتہائی ناقص ہیں۔

۳۔ عرب اور عجم کے درمیان مخالفت پیدا کی۔

عبداللہ بن سبا نے اپنی سازش کو انتہائی خفیہ طور سے شروع کیا۔ اس نے ایک گروہ بنایا اور محبت اہل بیت اور فضیلت علیؓ کو حربے کے طور پر استعمال کیا۔ اس طرح حضرت علیؓ ہی کی زندگی میں ایک ایسی جماعت پیدا ہو گئی جو ان کو ایسی صفات کا حامل تصور کرتی تھی جو ان میں قطعاً موجود نہ تھیں۔ اس طرح ابن سبا نے نہ صرف یہ کہ اسلامی عقائد میں بگاڑ پیدا کیا بلکہ اس نے اسلام کی مرکزیت کو زبردست نقصان پہنچایا اور خلیفہ وقت کے مقابل حضرت علیؓ کو لا کھڑا کیا۔

عبداللہ بن سبا نے کہا کہ تعجب ہے کہ مسلمان یہ تو مانتے ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام لوٹ کر آئیں گے۔ لیکن یہ نہیں مانتے کہ محمدؐ لوٹ آئیں گے۔ حالانکہ قرآن کے الفاظ یہ ہیں:۔

وہ ذات جس نے تجھ پر قرآن نازل کیا تجھے لوٹا دے گی جو لوٹنے کی جگہ ہے۔

(قرآن ۲۹: ۸۵) حالانکہ اس آیت کے صاف معنی یہ ہیں کہ اے رسولؐ ہم آپ کو مکہ کو واپس لائیں گے جو لوٹنے کی جگہ ہے۔

ابن سبا نے کہا کہ جتنے نبی گزرے ہیں ان میں سے ہر ایک کا ایک وصی ہوا ہے۔ حضرت علیؓ رسول اکرامؐ کے وصی ہیں۔ جس طرح رسول اکرمؐ خاتم الانبیاء ہیں اسی طرح علیؓ خاتم الاوصیا ہیں۔

ابن سبا نے اسلامی شہروں مکہ، مدینہ، کوفہ، شام اور مصر کا سفر کر کے حالات کا گہرا جائزہ لیا اور ایسے لوگوں سے ربط پیدا کیا جو کسی نہ کسی وجہ سے حکام کے طرز عمل کے شاکی تھے یا ان لوگوں سے ربط پیدا کیا جو اگرچہ مسلمان تھے لیکن اسلامی تعلیمات سے پوری طرح واقف نہ تھے۔ عبداللہ بن سبا کو مدینہ اور مکہ میں کامیابی نہ ہوئی۔ اس کی تحریک ان ہی مقامات میں زیادہ کامیاب ہوئی جہاں صحابہ کرام کی تعداد کم تھی۔

ابن سبا نے بصرہ پہنچ کر ایک لٹیرے حکیم بن جبلہ کے ہاں قیام کیا جو نظربندی کی زندگی گذار رہا تھا۔ حکیم بن جبلہ اور اس کے پاس آنے والوں کو اپنا ہمنوا بنالیا۔ والئ بصرہ عبداللہ بن عامر کو خبر ہوئی تو انھوں نے بازپرس کی اور بصرہ سے نکال دیا۔ لیکن بصرہ میں قیام ہی کے دوران اس نے ان لوگوں کو جو حاکم وقت سے ناراض تھے منظم کرلیا۔ اس طرح بصرہ میں شرپسندوں کی ٹولی قائم ہوگئی۔

پھر ابن سبا نے کوفہ کا رخ کیا۔ وہاں ایسے عناصر خاصے تھے جو کسی نہ کسی بہانے حکومت کے خلاف خروج چاہتے تھے۔ ان میں سے ابن سبا نے مالک بن اشتر کا انتخاب کیا اور اس کو قریش اور غیرقریش کو طبقہ واری رقابت پر ابھارا۔ اشتر خود بھی اعلیٰ منصب کا خواہاں تھا۔ وہ ابن سبا کا ہمنوا بن گیا۔ کوفہ میں غیرقریش کافی تعداد میں آباد تھے جو اسلامی جنگوں میں بھی حصہ لے چکے تھے۔ ان سب نے ابن سبا کے خیال کو قبول کیا۔ والئ کوفہ سعید بن العاص کو بدنام کرنے کے لئے اس گروہ نے روز ایک نیا شوشہ چھوڑا۔ اشراف کوفہ نے والئ بصرہ سے اس گروہ کی شکایت کی۔ سعید بن العاص نے حضرت عثمانؓ کو صورت حال سے واقف کیا اور ان کے حکم سے ابن سبا اور اس جماعت کے تقریباً دس سرغنہ افراد کو شام جلاوطن کردیا لیکن یہ اقدام بعدازوقت تھا کیونکہ اس وقت تک ابن سبا نے ایک جماعت تشکیل دے دی تھی جو فتنہ پھیلانے کے لئے کافی تھی۔ جلاوطنی ابن سبا اور اس کے ساتھیوں کے لئے

سودمند ثابت ہوئی اور اس کو مختلف مقامات پر مفسدانہ خیالات پھیلانے کا موقع ملا۔

شام میں حضرت معاویہ نے ان لوگوں کی اصلاح کی کوشش کی لیکن جب ان کو یقین ہوگیا کہ مفسد لوگ ہیں تو حضرت معاویہ نے حضرت عثمانؓ کو لکھا "یہ لوگ امت میں افتراق اور تفریق چاہتے ہیں اور فتنہ وفساد ان کا مقصد ہے۔ اسلام ان پر ایک بار گراں ہے۔ شیطان کا افسون ان کے دلوں میں راسخ ہوچکا ہے انہوں نے کوفہ کے بہت سے لوگوں کو گمراہ کردیا۔ اگر یہ لوگ شام میں رہے تو مجھے خطرہ ہے کہ اہل شام ان کے فریب میں مبتلا ہوجائیں گے لہذا آپ انہیں کہیں اور بھیج دیں چنانچہ ابن سبا اور اس کے ساتھیوں کو شام سے جلاوطن کردیا گیا اور وہ لوگ مصر گئے۔ مصر ابن سبا کی تحریک کے لئے بہت زرخیز ثابت ہوا۔ اس وقت والی مصر عبداللہ بن ابی سرح جہاد میں مصروف تھے اور اس تنظیم کی سرکوبی کی طرف توجہ نہ دے سکے۔ مصر ہی میں ابن سبا نے اپنے مقصد کو تحریک کی شکل دی اور اپنے داعی اور مبلغ مقرر کئے۔ حضرت عثمانؓ کے والیوں کے خلاف الزام تراشی کا سلسلہ شروع ہوا۔ ابن حزم کا قول ہے کہ "لوگوں کو حضرت عثمان پر حملہ کرنے کے لئے آمادہ کرنے کا بانی بھی یہی تھا"۔

ایک شہر کے سپاہی دوسرے شہر کے سپاہیوں کو ایسے خطوط لکھتے جس میں حکام کے فرضی عیوب تحریر کئے جاتے ایک شہر والے دوسرے شہر کے لوگوں پر ظلم وستم کی داستان پڑھتے تو سمجھتے کہ وہ لوگ مصائب میں مبتلا ہیں اور ہم اطمینان کی زندگی بسر کررہے ہیں۔ مدینہ والوں کے پاس ہر طرف سے خطوط پہنچے۔ مدینہ میں رہنے والے حضرت علیؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ اور دوسرے صحابہؓ کی طرف سے دیگر شہروں میں فرضی خطوط بھیجے جاتے جن میں حضرت عثمانؓ کے ظلم وستم کی فرضی داستانیں بیان ہوتیں۔ یہ حربہ بہت کامیاب ہوا۔

"رجال کشی" شیعوں کے یہاں اسماء الرجال کی بڑی معتبر اور مستند کتاب ہے۔ اس میں شیعہ مصنف فاضل استرآبادی لکھتے ہیں۔ "اہل علم نے بیان کیا ہے کہ عبداللہ بن سبا یہودی تھا۔ پھر وہ مسلمان ہوا اور اس نے علی علیہ السلام سے محبت کی

وہ اپنے اسلام کے زمانہ میں رسول خدا کی وفات کے بعد علی علیہ السلام کے متعلق بھی ویسا ہی غلو کرنے لگا۔ ابن سبا پہلا شخص ہے جس نے "امامت علیؑ کے فرض ہونے کو مشہور کیا"۔ ان کے دشمنوں پر تبرا کہا اور ان کے مخالفوں کو کافر کہا۔ اسی وجہ سے جو لوگ مذہب شیعہ کے مخالف ہیں وہ کہتے ہیں کہ شیعیت کی بنیاد یہودیت سے لی گئی ہے"۔ (منج المقال فی تحقیق الرجال)

عبداللہ ابن سبا یہودی تھا اس نے جب اسلام کو پھیلتے دیکھا تب اس نے اسلام دشمنی میں اسلام میں داخل ہو کر اسلام کی بیج کنی کا منصوبہ بنایا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ کسی مذہب کو مسخ کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ دوستی کا لبادہ اوڑھ کر دشمنی کی جائے اپنے مشرف بہ اسلام ہونے کا اعلان کیا اور مدینہ منورہ میں سکونت اختیار کی۔ اس نومسلم کو مسلم معاشرہ میں کوئی مقام حاصل نہ ہو سکا۔ عبداللہ ابن سبا یہودی خبائث کا مجسمہ گرگ باراں دیدہ تھا۔ مسلم معاشرہ میں مقام حاصل کرنے کسی مسلم کلیدی شخصیت کی سرپرستی ضروری تھی۔ عبداللہ ابن سبا نے اس مقصد کے لئے حضرت علی کو چنا اور ان کو اپنا سرپرست منتخب کیا اور حضرت علیؓ سے دوستی پیدا کی۔ اور اپنی دوستی کی خوب تشہیر کی۔ جب دوستی کی شہرت عام ہو گئی تو مدینہ کی سکونت ترک کر کے بصرہ جاکر مقیم ہوا وہاں پہنچ کر اپنے منصوبے کا آغاز کیا۔

پہلے اقتباس میں بیان کیا گیا ہے کہ علیؓ کی امامت کے فرض ہونے کو مشہور کیا مشہور کرنا تو اس حالت میں درست ہو سکتا ہے جب وجود ثابت ہو جائے۔ امامت کے عقیدہ کا وجود قرآن مجید سے ہرگز ثابت نہیں کیا جا سکتا ابن سبا نے علیؓ کی امامت کا فرض ہونا مشہور نہیں کیا بلکہ اس عقیدہ کو پہلے پہل ایجاد کیا۔

علی حیدر طباطبائی جو شیعہ عالم تھے "دکن ریویو" ۱۹۰۸ء میں غالی شیعوں کا ذکر کرتے ہوئے عبداللہ بن سبا کی نسبت امام محمد باقر کا قول بیان کرتے ہیں کہ وہ "حضرت علیؑ کو خدا اور اپنے کو نبی کہتا تھا۔ یہ اس کا افترا تھا۔ امام جعفر صادق فرماتے ہیں۔ "عبداللہ بن سبا پر خدا کی لعنت ہو۔ وہ حضرت امیر پر جان بوجھ کر افترا کرتا تھا۔ کہ وہ خدا ہیں حالانکہ خدا کی قسم حضرت علیؓ خدا کے بندے تھے۔ خدا اس شخص کو ہلاک

کرے جو ہم پر لوئی تہمت لگائے۔"

ساڑھے تیرہ سو برس سے زیادہ ہو چکے ہیں۔ لاکھوں آدمی آج بھی ابن سبا کے مذہب کے پیرو ہیں۔ قرآن کے خلاف عقیدے رکھتے ہیں۔ اللہ اور اللہ کے رسولؐ کے ارشادات سے علانیہ منحرف ہو گئے ہیں لیکن نہیں بھولتے تو ابن سبا کا سبق۔

باطل عقیدہ پر مضبوطی کے ساتھ جما دینا بھی آسان بات نہیں۔ عبداللہ بن سبا کو اپنے فن میں فرد کہنا چاہئے کہ وہ اپنے معتقدوں کے ضعیف دماغوں میں کفر وضلالت کے عقائد کا انجکشن دے کر عقل دینی کو ہمیشہ کے لئے سن کر دیتا تھا۔ عبداللہ بن سبا کا اثر آج تک جاری ہے۔ گروہ کے گروہ آج بھی اس کے مذہب پر ثابت قدمی سے چل رہے ہیں۔ مسئلہ امامت بھی ابن سبا کا تصنیف کردہ ہے۔

فی الواقع ابن سبا کو نہ اہل بیت سے محبت تھی نہ حضرت علیؓ سے عقیدت اس کی تحریک حضرت عثمانؓ سے بغض کا نتیجہ بھی نہ تھی دراصل یہ تحریک اسلام کے خلاف تھی اگر اس میں خلوص کا ذرا سا شائبہ بھی ہوتا تو جعفر صادق اس کے حق میں یہ بدعا نہ کرتے کہ اللہ اس پر لعنت کرے۔ اس نے حضرت علیؓ کا کہا ماننے سے انکار کیا۔ خود اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ منافق تھا۔ اس کی غرض صرف اسلام کی بربادی اور تخریب تھی اور اس کے لئے اس نے یہ چال چلی کہ مسلمانوں میں مستقلاً تفرقہ ڈال دیا۔

یہ بات مشکوک ہے کہ حضرت علیؓ نے اسے جلوا دیا۔ کہتے ہیں کہ ابن عباس نے اس کو قتل کرنے سے منع کیا تو حضرت علیؓ نے اس کو مدائن کی طرف جلاوطن کر دیا۔

ابن سبا نے حضرت علیؓ کی مدح میں حدیثیں وضع کیں۔ اور علیؓ کی افضلیت کا سبق دیتا رہا۔ یہ بات اکثر لوگوں کے دلوں میں راسخ کر دی کہ جناب امیر سب پیغمبروں سے افضل ہیں۔ اس نے حضرت علیؓ کی کرامتیں بیان کرنی شروع کیں۔ ابن سبا پہلا شخص ہے جس نے حضرت علیؓ کو خدا کہا۔ نادان اور وہم پرست لوگوں کی دلچسپی کے لئے اور ان کے عقیدوں کو خراب کرنے کے لئے ابن سبا کے عقیدہ کی بنیاد پر کہانیاں بنالی گئی ہیں۔ شب معراج میں رسول اکرمؐ نے ایک مقام پر ایک شیر دیکھا

اور اپنی انگوٹھی اس کے منہ میں ڈال دی ۔ پھر مقام سدرہ پر ایک ہاتھ خدا کی طرف سے نمایاں ہوا تو وہی انگشتری اس ہاتھ میں تھی ۔ شب معراج کے بعد صبح کو رسول اکرمؐ نے وہی انگشتری حضرت علیؓ کے ہاتھ میں دیکھی ۔ اسی کہانی کی بناء پر حضرت علی کو شیر خدا کہنے لگے ۔ سبائی مذہب میں ایک خاص بات ہے کہ عقیدہ کے معاملہ میں عقل سے کام لینا گناہ سمجھا جاتا ہے ۔

شیر خدا مشکل کشا ہی نہیں حاضر، ناظر بھی مانے جاتے ہیں ۔ قرآن مجید کے صریح خلاف قصوں اور عقیدوں پر ایمان ہے ۔ ایسے قصے گھڑ لئے گئے ہیں کہ علیؓ نے پیدا ہونے کے قبل ہی حضرت نوح اور فلاں فلاں پیغمبروں کو مصیبت کے وقت بچایا حضرت علیؓ سے ذرا ذرا سی بات میں مدد مانگی جاتی ہے اور یا علی کہہ کر پکارا جاتا ہے ۔ اللہ یاد نہیں آتا ۔ لیکن یہ خود ساختہ اللہ یاد آجاتے ہیں ۔

سبائیوں کا عقیدہ ہے کہ حضرت موسیٰ کو جو جلوہ طور پر نظر آیا وہ علی کا نور تھا اور رسول اکرمؐ جب عرش پر پہنچے تو وہاں بھی پس پردہ علی ہی تھے ۔ قرآن مجید میں جہاں جہاں رب کا لفظ آیا ہے بہ معنی علی آیا ہے ۔

ابن سبا نے امامت کے عقیدہ کے ذریعہ دوسرا حملہ نبوت پر کیا ۔ اس نے یہ تعلیم دی کہ ہر نبی کا ایک وزیر ہوتا ہے جو نبوت کا راز دار ہوتا ہے ۔ حضرت موسیٰ کے راز دار حضرت یوشع بن نون تھے ۔ اسی طرح رسول اکرمؐ کے راز دار اور وزیر حضرت علیؓ تھے پھر اس نے تعلیم دی کہ نبی کے بعد امام کی ضرورت ہوتی ہے جو نبی کا قائم مقام ہوتا ہے ۔ رسول اکرمؐ کے بعد علیؓ امام ہیں ۔ اس کے بعد اس نے ایک قدم آگے بڑھایا اور لوگوں کے ذہن نشین کیا کہ راز دار نبوت کا مرتبہ وہی ہے ۔ جو ایک نبی کا ہوتا ہے ۔ اس پر وحی آتی ہے اور وہ انبیاء سابق کے معجزات کا حامل ہوتا ہے ۔ امام نبی کی طرح معصوم ہوتا ہے ۔ اور اس کی اطاعت بھی امت پر اسی طرح فرض ہوتی ہے جس طرح رسالت پر ایمان لانا فرض ہے ۔ اس کے بعد اس نے یہ کہا کہ اللہ پر واجب ہے کہ قیامت تک کبھی دنیا کو امام سے خالی نہ رکھے ۔ بعد میں یہی بات اس عقیدہ کی بنیاد ہے کہ بارھویں امام گیارہ سو برس سے غار میں پوشیدہ ہیں ۔ اماموں کی تعداد بارہ سے زیادہ نہیں ہو سکتی ۔ یہ تعداد اللہ کی مقرر کی ہوئی ہے ۔

توحید اور رسالت کے بعد ابن سبا کا تیسرا حملہ خلافت پر ہوا اس نے کہا کہ سب لوگوں پر خلیفہ کی نہیں بلکہ (خود ساختہ) امام کی اطاعت واجب ہوتی ہے ۔

ابن سبا نے اس پر قناعت نہیں کی اور کہا کہ امام کو گذشتہ اور آئندہ کا علم ہوتا ہے ۔ اسلامی عقیدہ کی رو سے گذشتہ اور آئندہ کا علم تو نبی کو بھی نہیں ہوتا نبی کو غیب کی خبر اتنی ہی ہوتی ہے جتنی اللہ چاہے عالم الغیب تو صرف اللہ ہے ۔ ابن سبا نے امام کے اختیارات یہ بتائے کہ وہ حلال کو حرام، اور حرام کو حلال کر سکتا ہے حالانکہ قرآن مجید کی رو سے یہ اختیار رسول اکرمؐ کو بھی نہ تھا ۔ اس نے یہ عقیدہ بھی عام کیا کہ امام مردوں کو زندہ کر سکتا ہے ۔ بعد میں عقیدہ امامت کی آڑ میں ایسے اقوال گھڑ کر اماموں کی طرف منسوب کئے گئے جو ہرگز ان کے نہیں ہو سکتے ۔

ابن سبا کا چوتھا اور زبردست حملہ صحابیت پر تھا وہ جانتا تھا کہ اسلام کی ترویج میں سب سے بڑا حصہ صحابہؓ کا تھا اور صحابہ کے فضائل قرآن مجید میں بیان ہوئے ہیں چنانچہ اس نے امام کو معصوم اور صحابہ کو غیر معصوم قرار دیا اور صحابہ کرام کی فرضی غلطیوں کی خوب تشہیر کی چنانچہ ابن حجر نے لسان المیزان میں لکھا ہے کہ "صحابیت کے خلاف وہ طوفان عام جن میں حضرات ابو بکرؓ اور عمرؓ کو شریک کیا گیا تھا بلکہ بنیاد ہی اس پر رکھی گئی تھی اس عہد میں شروع ہوئی اور پہلا شخص جس نے اس خیال کو پیش کیا وہ عبداللہ بن سبا تھا ۔"

کچھ عرصہ بعد ابن سبا کو اپنی سازش کو بروئے کار لانے کا موقع ملا ۔ حضرت عثمانؓ کے دور خلافت میں اپنے ایجنٹوں کے ذریعہ مدینہ منورہ میں بیٹھ کر حضرت علیؓ کے نام سے بصرہ، کوفہ اور مصر والوں کے پاس فرضی خطوط بھجوائے ۔ جن میں خود کو حضرت علیؓ کا معتبر کارندہ باور کروایا ۔ غرض ایک تخریبی تحریک چلا کر اپنے تین ہزار آزمودہ کار چیلے ایسے وقت میں جب کہ اہل مدینہ میں سے اکثر حج کے لئے اور جہاد پر گئے ہوئے تھے اور مدینہ تقریباً عرب آبادی سے خالی تھا وہ دار الخلافہ میں گھس آئے اور خلیفہ معصوم کو شہید کر دیا ۔ ابن سبا کی سازش میں بعد میں ابو مسلم خراسانی اور برامکہ بھی شامل ہوگئے اور یہ سازش اندرون خانہ پھیلتی رہی ۔ اس سازش کے تحت وضعی روایتوں کے ذریعہ جو عقائد میں فتنہ پیدا کیا گیا اس کی وجہ سے فرائض کی

جانب سے مسلمانوں کی توجہ ہٹ گئی ۔

سبائیوں نے ہزارہا روایات وضع کر کے جہلا کو دین سے بیزار کر دیا ۔ جس کے نتیجہ میں چلہ کشی، خرقہ پوشی، اور مجاوری وجود میں آئی ۔ یہ تمام امور عجمی سازش کا نتیجہ ہیں جن سے آج تک امت مسلمہ کو چھٹکارا نہیں ملا بلکہ بعض صورتوں میں علماء بھی کچھ نہ کچھ حد تک اس سازش کا شکار ہوئے ۔

اس دور میں ایک نیا نظریہ پیش کیا جا رہا ہے کہ عبداللہ بن سبا کوئی حقیقی شخصیت نہیں بلکہ فرضی کردار ہے شیعی مورخ ڈاکٹر طہ حسین نے اس نظریہ کو پیش کیا لیکن انہوں نے جو دلائل دیئے ہیں وہ ہر اعتبار سے ناکافی اور ناقابل قبول ہیں ۔ مثلاً ڈاکٹر طہ حسین نے اس سلسلہ میں اپنی کتاب فتنۃ الکبریٰ میں لکھا میری رائے میں البلاذری کی کتاب انساب الاشراف اہم ترین ماخذ ہے اس میں حضرت عثمانؓ کے خلاف شورش کے واقعات تفصیل سے بیان ہوئے ہیں ۔ لیکن عبداللہ بن سبا کا کوئی ذکر نہیں ۔" لیکن ڈاکٹر طہ حسین نے خود اسی کتاب کی دوسری جلد میں البلاذری کی یہ روایت تحریر کی ہے کہ " ایک دفعہ عبداللہ بن سبا حضرت علیؓ کے پاس آیا اور حضرت ابو بکرؓ کی خلافت کے بارے میں سوال کیا ۔ حضرت علیؓ نے اسے جھڑکا اور فرمایا تم لوگ ان بحثوں میں الجھے ہوئے ہو اور یہاں یہ حالت ہے کہ مصر پر مخالفوں کا تسلط ہو گیا اور وہ تمام لوگ قتل کر دیئے گئے جو ہمارے مددگار تھے ۔" البلاذری کی اس روایت سے عبداللہ بن سبا کی شخصیت اور خیالات دونوں پر روشنی پڑتی ہے کہ وہ انتہائی نازک موقع پر ایک بے معنی اور لغو سوال کو مسلمانوں کی بقاء سے زیادہ اہم سمجھتا ہے ۔ اس عبارت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ البلاذری ابن سبا کی شخصیت کو فرضی نہیں بلکہ حقیقی سمجھتا تھا ۔

(بے آئین امامت " ماہنامہ الفرقان لکھنو (اکتوبر ۱۹۸۹ء) میں محترمہ ذکیہ سلطانہ کے مقالہ اور سبائی سبز باغ صفحات ۳۳ تا ۴۱ سے اقتباس)

عذاب قبر

قیامت سے پہلے اور قبر کے اندر جزاو سزا کا تصور غیر اسلامی ہے ۔ مرنے کے بعد انسان مردہ ہے اور قیامت تک مردہ رہے گا ۔ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ مردوں کو اٹھائے گا میدان حشر میں جمع کرے گا اور حساب لے گا ۔ پھر فیصلہ ہوگا کہ جنتی ہے یا دوزخی ۔

کافر اس پر ایمان نہ لاتے تھے کہ مرنے کے بعد انسان کو دوبارہ زندگی نصیب ہوگی ۔ وہ دریافت کرتے تھے کہ ان بوسیدہ ہڈیوں کو کون زندہ کرے گا ۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ۔ " جس نے پہلے پیدا کیا تھا وہی دوبارہ پیدا کرے گا " ۔ (۳۶: ۷۹)

اس جواب سے واضح ہو گیا کہ انسان کو دو زندگیاں عطا کی گئی ہیں اور اس سے یہ ثابت ہوا کہ قبر میں کوئی مردہ زندہ نہیں ہوتا ، اگر قبر میں مردہ زندہ ہو اس پر عذاب قبر ہوتا ہے یا قبر میں ثواب و راحت کا یقین کر لیا جائے تو قیامت کے دن زندہ کرنے کا وعدہ غلط ہو جائے گا ۔ پھر حساب و کتاب کس بات کا ہوگا ۔ یہ اللہ تعالیٰ کے انصاف سے بعید ہے کہ قبر میں بغیر حساب کتاب کے عذاب دے ۔

قرآن مجید آیات (سورہ المومنون ۲۳: ۱۵، ۱۶) سے واضح ہے کہ انسان کو دو زندگیاں دی گئی ہیں ۔ دنیا کی زندگی اور آخرت کی زندگی ، پھر قبر کی زندگی کے کیا معنی ؟

ہمارے بزرگ اس بات کو جزو ایمان بنائے ہوئے ہیں اور یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ قبر میں سوال و جواب ہوگا ۔ یعنی منکر نکیر سوال کریں گے کہ تیرا رب کون ہے "تیرا دین کیا ہے "تیرا نبی کون ہے "وغیرہ ۔

یہ عذاب قبر کے قائل ہیں ۔ عذاب قبر میں تخفیف کرنے کے لئے زیارت ، دسواں چالیسواں کیا جاتا ہے اور ایصال ثواب کیا جاتا ہے اور فاتحہ پڑھا جاتا ہے ۔ قبر پر پھول چڑھائے جاتے ہیں ۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے : ۔

اسی مٹی سے ہم نے تمہیں پیدا کیا ، اسی میں ملا دیں گے اور پھر اسی سے تمہیں

اٹھائیں گے (طہ ۲۰:۵۵)

اس سے واضح ہوا کہ مُردے کا مٹی میں مل کر مٹی ہو جانا درست ہے تاکہ قیامت کے دن اللہ تعالےٰ اسے اپنی قدرت کاملہ سے پھر اٹھائے۔ اگر مردہ قبر میں زندہ رہے (جیسا کہ عقیدہ ہے) تو وہ اس دوسری زندگی سے محروم ہو جائے گا جس کا اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے۔

صحیح بخاری میں ہے رسول اکرمؐ کا قبرستان میں سے گذر ہوا۔ آپ دو قبروں پر رک گئے۔ فرمایا:۔ ان پر عذاب ہو رہا ہے۔ ایک چغلی کھانے کا عادی تھی اور دوسرا پیشاب سے پرہیز نہ کرتا تھا۔ رسول اکرمؐ نے ایک سبز ٹہنی دونوں قبروں پر لگا دی۔ اور کہا:۔ "جب تک یہ سبز ہیں عذاب میں تخفیف رہے گی"۔

یہاں چند سوالات ذہن میں پیدا ہوتے ہیں:۔

۱۔ صرف دو قبروں پر عذاب ہو رہا تھا۔ باقی کیوں محفوظ تھیں؟

۲۔ یہ دو قبریں کافروں کی تھیں یا مسلمانوں کی۔؟ پھر رسول اکرمؐ کو عذاب میں تخفیف کرانے کا حق کس نے دیا؟ یعنی اللہ تعالیٰ تو ان پر عذاب کرتا ہے اور رسولؐ معاذاللہ اسے روکتے ہیں۔

۳۔ رسول اکرمؐ کو کیسے معلوم کہ قبر میں عذاب ہو رہا ہے؟ وحی آئی تھی تو قرآن میں کیوں اس اہم بات کا ذکر نہیں؟ بغیر وحی کے معلوم ہوا تو علم غیب ثابت ہوگا مگر قرآن کہتا ہے کہ "کہو اللہ کے سوا آسمانوں اور زمین میں کوئی غیب کا علم نہیں رکھتا" (۲۷:۶۵)

۴۔ رسول اکرمؐ کے اس فعل پر صحابہ نے کیوں عمل نہ کیا؟ اور کیوں قبروں پر سبز ٹہنیاں نہ ڈالیں؟

صحیح بخاری کی ایک اور روایت ہے کہ:

قبر میں فرشتہ صرف رسول کے بارے میں پوچھتا ہے۔ مَنْ رَسُولُکَ دوسری کتابوں میں ہے کہ چار سوال پوچھتا ہے۔ ابن ماجہ میں ہے کہ تین سوال پوچھتا ہے مَنْ رَبُّکَ، مادینک، ماعلمک، اور جب جواب خاطر خواہ نہیں ملتے تو منکر نکیر اسے مارتے ہیں۔ مردہ چلاتا ہے۔ اس کی آواز کو مشرق و مغرب والے سنتے ہیں مگر

انسان اور جن نہیں سنتے۔ سن لیں تو بے ہوش ہو جائیں۔[۹]

پھر روایت ہے کہ مغرب کے وقت رسول اکرمؐ نے آواز سنی تو فرمایا:۔

یہودی پر عذاب کیا جا رہا ہے۔

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ معاذاللہ رسول اکرمؐ انسان تھے یا نہیں؟ اگر انسان تھے تو مردہ کی آواز کیسے سن لی، جب کہ فرمایا ہے کہ انسان اور جن کے علاوہ ہر چیز مردے کی آواز سنتی ہے۔ یا تو حدیث غلط ہے یا معاذاللہ رسول اکرمؐ انسان نہ تھے

پھر یہ بات بھی غور طلب ہے کہ مردے کی آواز انسان سن لے تو بے ہوش ہو جائے مگر جانور سنتے ہیں نہ بے ہوش ہوتے ہیں نہ بھاگتے ہیں۔ اکثر قبرستانوں میں چوپائے چرتے ہیں اور پرندے بھی رہتے ہیں مگر وہ مردوں کے چلانے سے نہیں ڈرتے۔

یہ بھی ایک سوال ہے کہ ڈاکٹری کی تعلیم کے لئے جو مردے ہسپتال میں رکھے جاتے ہیں ان کو منکر نکیر اٹھاتے؟ اور وہ زندہ ہو کر جوابات کیوں نہیں دیتے؟

بخاری کی روایت کے بموجب مردوں کو صبح و شام، جنت و دوزخ (جو بھی صورت ہو) دکھائی جاتی ہے کہ تمہارا ٹھکانہ ہے تو ہسپتال کے مردے کس وقت دیکھتے ہیں؟ پھر یہ بھی سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب حساب کتاب قیامت کے دن ہونا ہے تو پہلے سے جنت و دوزخ دکھانے کا کیا مطلب ہوا؟

معلوم ہوا کہ یہ غیر اسلامی عقائد کسی خاص مصلحت سے اسلامی بتائے گئے ہیں یہ سب دراصل مجوسی اور ہندو عقائد ہیں، جنھیں رسول اکرمؐ سے منسوب کر دیا گیا ہے۔ حالانکہ قرآن اس عقیدہ کی نفی کرتا ہے۔

یہ عقائد کہ مرنے کے بعد قبر میں بعض لوگ زندہ رہتے ہیں یا بعض لوگوں پر قبر میں عذاب ہوتا ہے اور وہ باہر سے سلام و کلام کرنے والوں کی باتیں سنتے ہیں اور جواب دیتے ہیں محض ہندو عقائد ہیں جنھیں عجمی مفسرین و محدثین نے اسلام میں داخل کر دیا اور قرآن مجید کی تکذیب کی۔ اللہ تعالیٰ نے صاف فرما دیا کہ

وَمَا انت بمسمع من فی القبور (الفاطر ۳۵:۲۲)

ترجمہ:۔جو قبروں میں ہیں تم ان کو اپنی باتیں نہیں سنا سکتے۔

وَمَنْ اضل ممن یدعوا من دون اللہ من لا یستجیب له الیٰ یوم القیمة وھم عن دعائھم غفلون (الاحقاف ۴۶:۵)

(ترجمہ) اس سے زیادہ گمراہ کون ہوگا جو اللہ کو چھوڑ کر ان کو پکارتا، (ان سے دعا کرتا یا مانگتا ہے)۔جو اسے قیامت تک جواب نہ دے سکیں گے اور نہیں جانتے کہ یہ کیا مانگ رہے ہیں۔

ظاہر ہے کہ جب قبر میں مردہ سن نہیں سکتا تو اس پر عذاب قبر کا سوال پیدا نہیں ہوتا

(عذاب برزخ۔"ان مٹ باتیں" صفحہ ۸۴ تا ۹۰ اور ماہنامہ الحق مئی تا جولائی ۱۹۸۹ء سے اقتباس)

عزاداری

عزاءداری بھی شیعوں کی ایجاد کردہ ایک جاہلانہ رسم ہے، جس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ پھر لطف یہ ہے کہ شیعوں کے یہاں بھی اس کی مذہبی حیثیت کچھ نہیں کیونکہ ان کی مذہبی بنیادی کتابوں میں اس کا کہیں ذکر نہیں، نہ ہی ان کے اماموں کا کوئی ایسا حکم ہے نہ ان کا عمل ہے۔جس سے عزاداری کو ثابت کیا جا سکے۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ خود شیعہ مذہب میں بھی ان تمام چیزوں کی قطعی ممانعت ہے جو آج عزاداری کے نام سے رواج پا گئی ہیں اور جن کو شیعہ اب اپنا فریضہ ظاہر کرنے پر اصرار کرنے لگے ہیں۔

"اصول کافی" میں باقر بن جعفر صادق سے روایت ہے:۔

"کہا کہ سخت ترین بے صبری چیخنا چلانا، واویلا کرنا، منہ پر تھپڑ مار لینا، سینہ پیٹنا اور سر کے بال نوچنا ہے اور جس شخص نے ... نے رلانے کی مجلس قائم کی، اس نے صبر کو ترک کر کے مخالف ... م کیا اور

جس نے صبر کیا "انا للہ" پڑھا اور اللہ عزوجل کی تعریف کی اور راضی برضائے الٰہی ہوا اور اس کا ثواب اللہ کے ذمہ ہے اور جس نے ایسا نہ کیا تو قضاء تو آکر رہی لیکن وہ گناہ گار ہوا اور اللہ نے اس کا اجر ضائع کر دیا"۔

اسی طرح ایک اور قول ہے۔ابوالحسن (رضا بن موسیٰ کاظم) سے روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں:۔

"مصیبت کے وقت رانوں پر ہاتھ مارنا اپنا اجر ضائع کرنا ہے"۔

خود حضرت حسینؓ کے متعلق شیعہ کتابوں میں منقول ہے کہ اپنی وفات سے قبل انھوں نے اپنی بہن حضرت زینبؓ کو وصیت کی تھی۔

میری وفات کے بعد کسی طرح کا نوحہ و ماتم نہ کرنا اور واویلا مچا کر میرے دشمنوں کو خوش نہ کرنا۔میرے دشمنوں اور قاتلوں کے لئے عذاب ہوگا۔اس لئے رونا تو ان کو چاہئے میرے گھر والوں کو صبر کرنا چاہئے۔(جلاء العیون)

شیعہ "ہشت سامان ماتم" کا ذکر کرتے ہیں لیکن خود ان کے ائمہ نے ان تمام چیزوں کے نام لے لے کر ان کی مخالفت کی ہے۔ان کے ائمہ اور ان کے بہت بعد تک مروجہ عزاداری کا کہیں پتہ نہیں لگتا۔

عزاداری کا آغاز کس طرح ہوا۔اس سلسلہ میں شیعی رسالہ "المعرفت" (حیدرآباد بابت محرم ۱۳۸۹ھ) میں کچھ روشنی پڑتی ہے۔

"جہاں تک عزاداری کا تعلق ہے اس کی ابتداء ایران میں عہد صفوی (نویں صدی ہجری) سے ہوئی۔اس کے بعد ہندوستان میں جب خاندان تغلق کا زوال شروع ہوا اور سلطنت کا شیرازہ منتشر ہوا تو جنوبی ہند میں حسن گنگو نے بہمنی سلطنت کی بنیاد رکھی۔

حسن گنگو چونکہ ایران کے بہمنی خاندان (شیعہ) سے تعلق رکھتا تھا اس لئے اس کی سلطنت بہمنی کہلائی۔اس سلطنت کے سلاطین میں شیعہ اور سنی دونوں عقائد کے بادشاہ گذرے ہیں عزاداری کا آغاز ان سے ہوا۔ سلطنت بہمنی کو زوال ہوا تو عادل شاہی، نظام شاہی بریدشاہی، قطب شاہی اور عمادشاہی، ریاستوں میں اکثر شیعہ،

عقائد کے لوگ گذرے ہیں بالخصوص یوسف عادل شاہ قلی قطب شاہ نے عزاداری کو باقاعدہ طور پر رواج دیا اور ان ریاستوں میں باقاعدگی کے ساتھ یعنی یکم محرم سے دس محرم تک عزاداری ہوتی تھی"۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ عزاداری کی ابتدا۔ بنی عباس کے دور میں معزالدولہ نے ۳۵۲ھ میں کی اور شہادت حسینؓ کا غم منانے کا حکم دیا۔

شیعہ اپنی ضد میں عزاداری کو خلاصہ۔ دین یا صلوٰۃ سے بھی افضل کہتے ہیں۔

لیکن ان کو بھی اس بات کا احساس ہونے لگا ہے کہ عزاداری محض ایک نامناسب رسم ہے جس کو مٹانا چاہئے۔ چنانچہ "تنظیم المکاتب" لکھنو کے جنرل سکریٹری سید غلام عسکری شیعی ماہنامہ "الواعظ" لکھنو بابت اکتوبر ۱۹۸۲ء میں لکھتے ہیں:۔

"زیادہ افسوس کا مقام یہ ہے کہ ہماری عزاداری کو بھی رسموں نے جکڑ لیا ہے جس کے نتیجہ میں قریب ہے کہ عزاداری صرف ایک غمگین تقریب کی حیثیت اختیار کر لے اور واقعہ۔ کربلا سے جو ایمانی، علمی، اخلاقی اور انقلابی سبق ہم کو حاصل کرنا ہے ہم ان سے بالکل محروم ہو جائیں۔ مجلس، جلوس، ماتمی انجمن، ذاکری، تبرک کی تقسیم، دسترخوان، غرض کہ عزاداری سے متعلق تمام باتوں پر رسموں کی گرفت مضبوط ہوتی جاتی ہے اور ہم انقلابی عزادار ہونے کے بجائے رسموں کے پرستار کھوکھلے عزادار ہوتے جاتے ہیں۔ اگر کوئی رسم مباح کی حد تک ہے تو اس کو جائز رسم کا نام دیا جاسکتا ہے لیکن کسی مباح کو بھی لازم کر لینے کے بعد خرابیاں پیدا ہوتی ہیں ان خرابیوں کے بعد اس جائز رسم کو بھی جائز رہنا مشکل ہے، جائز رہے یا ناجائز ہو جائے، یہ طے ہے کہ مذہبی رسوم نام کی کوئی چیز نہیں پائی جاتی اور نہ کسی کو حق ہے کہ کسی غیر مذہبی چیز کو وہ مذہبی قرار دیدے"۔

شیعہ دانشور ہوش بلگرامی اپنی کتاب "ہماری بت پرستیاں" میں لکھتے ہیں:۔

"گریہ وبکا کو ذریعہ نجات خیال کرنا اور اسے اپنے باطن کی اصلاح کا ذریعہ بنانا دراصل توہین ہے اس تعلیم کی جو شہادت کبریٰ کے پردہ میں ہم کو بتائی گئی ہے"۔

سنن ابوداود (باب النوحہ) میں سرور کائنات نے نوحہ گری سے منع فرمایا ہے

اور سنن ابن ماجہ عبداللہ بن ابی اوفیٰ کی روایت میں آپ نے مرثیہ (لکھنے، سننے یا سنانے) پر وعید فرمائی۔ شرعی نقطہ نظر سے قتل حسینؓ کے واقعات کا ذکر ناجائز ہے۔ اس بارے میں احیاء العلوم امام غزالیؒ کا فتویٰ، صواعق محرقہ میں ابن حجر عسقلانی کی بحث بھی موجود ہے ماتم کی محفل برپا کرنا خود جائز نہیں، اس لئے بھی کہ ایسے سب اجتماعات بغض صحابہؓ پر منتج ہوتے ہیں۔

مسلمانوں کا سرکاری نشان (عَلم)

رسول اکرمؐ کے دو عَلم (جھنڈے) تھے۔ ایک ظل تھا اور دوسرا سحاب۔ ظل سیاہ تھا اور سحاب سفید۔ اموی خلفاء کا سرکاری نشان سفید رنگ تھا۔ یہ رنگ رسول اکرمؐ کے سفید علم کی بناء پر اختیار کیا گیا تھا۔ بنی عباس نے ظل کے سیاہ رنگ کو اپنا نشان بنایا۔ علامہ ابن کثیر لکھتے ہیں:۔

بلاشبہ بنی عباس کا سرکاری نشان سیاہ تھا جو اس بناء پر اختیار کیا گیا تھا کہ فتح مکہ کے دن رسول اکرمؐ سیاہ عمامہ زیب سر کئے، مکہ میں داخل ہوئے تھے چنانچہ عباسیوں نے اسی سے اپنا نشان سیاہ رکھا تھا۔

خلیفہ مامون الرشید نے ولی عہد علی الرضا کے لئے سبز رنگ تجویز کیا تھا جو بدھ مت کے معبد بہار (وہار) کے جھنڈے کا رنگ تھا۔ برمکی خاندان (بدھ مت کے نووہار کے پرمکھ) کے مورث اسی معبد کے پجاری تھے۔ قرامطہ، عبیدی، فاطمیوں اور شیعوں کے لباس کا رنگ سفید ہوتا تھا۔ رسول اکرمؐ اکثر سفید و سیاہ لباس زیب تن فرماتے تھے۔ کبھی سرخ و سیاہ رنگ کے تاگوں کا بنا ہوا کپڑا بھی استعمال فرماتے۔ سبز رنگ کبھی استعمال نہیں کیا۔ عمامہ بھی بیشتر سیاہ پہنتے۔ حضرت عباس، ابن عباس اور حضرت علی کا عمامہ بھی اکثر سیاہ ہوتا تھا سرداران قبائل کو حکومت نبویہ کی جانب سے سیاہ رنگ کا جھنڈا عطا ہوتا تھا۔

صحیح النسب علویوں کی جو حکومتیں قائم ہوئیں، کسی نے بھی سبز رنگ اختیار نہیں کیا۔ خلیفہ مامون الرشید کے بعد جنھوں نے ولی عہد علی الرضا کے لئے سبز رنگ

مقرر کیا تھا ان عجمی شیعوں نے سبز رنگ کو رواج دیا۔ عجمی اثرات کے تحت نسلی اور نسبی امتیاز کو اہمیت دی جانے لگی تو سبز رنگ بھی ایک علامت قرار پایا۔

مورخ المسعودی کا بھی قول ہے کہ: ۔ سبز رنگ آتش پرستوں کی نشانی تھا علی الرضا۔ کی ولیعہدی کی مدت تو مختصر رہی مگر علویوں کے عمامہ پر سبز پٹی باندھنے کا رواج عرصہ تک رہا پھر متروک ہوگیا لیکن ۷۷۳ھ میں مملوک خاندان کے سلطان الاشرف شعبان کے حکم سے پھر رواج ہوا۔

چونکہ سیاہ رنگ کو رسول اکرمؐ کے نشان ظل سے نسبت تھی اس لئے شیعوں نے اس کی مخالفت کی۔ شیعہ راویوں نے اپنے امام کی زبانی سیاہ رنگ کے استعمال کو ناجائز قرار دیا۔

"جناب صادق سے کسی نے پوچھا: ۔ سیاہ ٹوپی پہن کر صلوٰۃ ادا کرنا جائز ہے یا نہیں؟ تو فرمایا: ۔ سیاہ ٹوپی پہن کر صلوٰۃ ادا نہ کرو کیونکہ یہ دوزخیوں کا لباس ہے"۔

نیز امیرالمومنین (علیؑ) نے اپنے اصحاب سے کہہ دیا تھا، سیاہ لباس مت پہنو کیونکہ یہ فرعون کا لباس تھا"۔

یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیئے کہ جھنڈے یا علم ہوں یا درباری و سرکاری لباس کا رنگ اور تراش، یہ سب حکومت کے لوازمات ہوتے ہیں۔ غیر حکمران خاندان کا اگر کوئی مخصوص رنگ ہو تو وہ خاندانی اور نسلی امتیاز ہی کی خاطر ہو سکتا ہے۔ اولاد حسینؓ نے جب حکومت حاصل نہ ہو سکی تو مخصوص رنگ کو خاندانی و نسلی امتیاز کا ذریعہ بنایا۔ امامت کا عقیدہ اور شہربانو کا افسانہ وغیرہ بھی نسلی امتیاز ہی کی خاطر وجود میں لائے گئے۔

حضرت علیؓ کو کاندھوں پر اٹھانا

عام طور پر مشہور ہے کہ فتح مکہ کے وقت رسول اکرمؐ خانہ کعبہ میں داخل ہوئے تو جو بت بلندی پر نصب تھے انھیں گرانے کے لئے حضرت علی بن ابو طالب کو اپنے کاندھوں پر اٹھالیا لیکن یہ مذہبی داستان خلاف عقل بھی ہے اور خلاف نقل بھی۔

۱۔ فتح مکہ کے وقت رسول اکرمؐ کی عمر (۶۰) سال سے متجاوز اور حضرت علیؓ کی ہماری تحقیق کے مطابق (۲۶) سال (دیگر لوگوں کے خیال کے مطابق تیس بتیس سال بنتی ہے) ساٹھ سال سے متجاوز عمر کا کوئی شخص ایک چھبیس سال کے جوان کو کاندھوں پر نہیں اٹھا سکتا بلکہ معاملہ برعکس ہوتا ہے کہ ایک جوان ساٹھ سالہ آدمی کو ضرورت کے تحت کاندھوں پر اٹھائے۔ اس طرح عقلاً یہ بات ناممکن ہے۔

۲۔ تمام صحابہ کرام میں حضرت علیؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعود سب سے زیادہ پستہ قد تھے۔ لہٰذا حضرت علیؓ کو کاندھوں پر اٹھانے سے مقصد حاصل نہ ہو سکتا تھا اس لحاظ سے بھی حضرت علیؓ کو کاندھوں پر اٹھانے کی بات خلاف عقل ہے۔

۳۔ رسول اکرمؐ نے وہ بت جو کعبہ کے باہر مسجد حرام میں تھے انھیں اپنی چھڑی سے گرایا۔ پھر آپ خانہ کعبہ میں داخل ہوئے تو حضرت عمر کو حکم دیا کہ ان بتوں کو اٹھا کر باہر پھینک دیا جائے۔ حضرت عمرؓ ان بتوں کو توڑتے جاتے تھے اور باہر پھکواتے جاتے تھے جیسا کہ کتب احادیث میں ہے اور تاریخ و سیرت سے ثابت ہے کہ حضرت عمرؓ طویل القامت تھے۔ جن بتوں کو گرانے کے لئے حضرت عمرؓ کا ہاتھ نہ پہنچ سکا ان کے لئے کسی ایسے شخص کو کاندھوں پر اٹھانا ضروری تھا جو طویل القامت ہو۔

حدیث کی مشہور کتاب سنن ابی داؤد میں ہے **حمل علی بن ابی العاص علی عاتقه** (آپ نے علی بن ابی العاص کو اپنے کاندھے پر اٹھالیا)۔

علی بن ابی العاص بن ربیع رسول اکرمؐ کی سب سے بڑی صاحبزادی حضرت زینب کے صاحبزادہ اور رسول اکرمؐ کے سب سے بڑے نواسہ ہیں۔ حضرت علی بن ابی العاص ہجرت سے سات آٹھ سال قبل پیدا ہوئے تھے۔ ان کی پرورش رسول اکرمؐ نے خود فرمائی تھی۔ بچپن سے جوانی تک آپ کے ساتھ رہے۔ رسول اکرمؐ کو ان سے بہت محبت تھی اور ہر اہم موقع پر انھیں اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ فتح مکہ کے وقت یہ رسول اکرمؐ کے ساتھ آپ کی اونٹنی پر موجود تھے۔ علی بن ابی العاص نے جو فتح مکہ کے دن رسول اکرمؐ کے ردیف تھے (دیکھئے حاشیہ قصیدہ الصداقۃ صفحہ ۳۲ کعبہ کی تصویریں مٹائیں اور بت گرائے تھے۔ اس وقت ان کی عمر لگ بھگ، پندرہ سال تھی۔ (اصابہ جلد ۲) ناموں کی یکسانیت سے بعد کے لوگوں نے علی ابن ابو العاص

کو علی بن ابو طالب سمجھ لیا۔

مجوسی مورخین کا یہ دستور رہا ہے کہ جہاں کسی صحابی کی کوئی فضیلت نظر آئی اس واقعہ کی صورت بدل کر حضرت علیؓ کی جانب منسوب کر دیا۔

حضرت علی بن ابی العاص اپنی والدہ کی نسبت سے علی زینبی کہلاتے ہیں رومن امپائر کو تباہ کرنے والی اس عظیم جنگ میں حصہ لیا جو جنگ یرموک کے نام سے مشہور ہے۔ یہ جنگ حضرت عمر فاروقؓ کے زمانہ میں سنہ ۱۳ ہجری میں ہوئی۔

حضرت علیؓ بن ابی العاص بائیس سال کی عمر میں دونوں عالم کی کامرانیوں کا تاج سر پر رکھ کر شہادت سے سرفراز ہوئے۔

علامہ اقبال نے اپنی نظم "جنگ یرموک کا ایک واقعہ" میں رسول اکرمؐ کے ان ہی نواسہ کو ان الفاظ میں خراج عقیدت پیش کیا ہے:۔

صف بستہ تھے عرب کے جوانان تیغ بند
تھی منتظر حنا کی عروس زمین شام
اک نوجوان صورت سیماب مضطرب
آکر ہوا امیر عساکر سے ہم کلام
اے بو عبیدہ رخصت پیکار دے مجھے
لبریز ہوگیا مرے صبر و سکون کا جام
بے تاب ہورہا ہوں فراق رسول میں
اک دم کی زندگی بھی محبت میں ہے حرام
جاتا ہوں میں حضور رسالت پناہ میں
لے جاؤں گا خوشی سے اگر ہو کوئی پیام
یہ ذوق و شوق دیکھ کے پرنم ہوئی وہ آنکھ
جس کی نگاہ تھی صفت تیغ بے نیام
بولا امیر فوج کہ " وہ نوجواں ہے تو
پیروں پہ تیرے عشق کا واجب ہے احترام

پوری کرے خدائے محمد تری مراد
کتنا بلند تیری محبت کا ہے مقام
پہنچے جو بارگاہ رسول امین میں تو
کرنا یہ عرض میری طرف سے پس از سلام
ہم پر کرم کیا ہے خدائے غیور نے
پورے ہوئے جو وعدے لئے تھے حضور نے "
(بانگ درا)

حضرت علیؓ کی فضیلت

شیعہ عالم ڈاکٹر محمد حسین بہشتی اپنے مقالہ "مرجعت و رہبری" میں کہتے ہیں:۔

"اگر شیعہ کہتے ہیں کہ علی علیہ السلام کو زمام دار امت ہونا چاہیئے تو اس وجہ سے نہیں کہ علی علیہ السلام پیغمبر اسلام کے چچازاد بھائی تھے اور اگر یہی معیار ہوتا تو کیا جعفر بن ابی طالب عقیل بن ابی طالب رسول اکرم کے چچازاد بھائی نہیں تھے۔ اس سے بالاتر کیا خود پیغمبر کے چچا عباس موجود نہیں تھے۔ ان میں سے بعض تو پیغمبر کے بعد تک موجود تھے، تو رہبری کا مسئلہ نسبت اور قرابت کی بنیاد پر نہیں ہے اور نہ ہی پیغمبر کی دامادی رہبری کی بنیاد ہے اور اگر یہی بات ہے تو (امامہ کے قول کے مطابق) کیا عثمان پیغمبر کے داماد نہیں تھے اور وہ بھی دو بیٹیوں کے توسط سے کہ جب ایک کی وفات ہوگئی تو دوسری کے ساتھ عقد کیا۔ تو پتہ چلا کہ دامادی بھی رہبریت کا معیار نہیں ہے۔ پھر علی ہی کو وفات پیغمبر کے بعد رہبر کیوں ہونا چاہیئے۔ اس لئے کہ وہ علی تھے! ان عالی فضیلتوں اور برجستگی کی بنیاد جو علی میں موجود تھیں۔ اور ان صفات حمیدہ کی وجہ سے جس کو حقاً اور انصافاً کائنات بشریت میں کوئی نظیر نہیں"۔ (رسالہ توحید، ستمبر و اکتوبر ۱۹۸۹ء)

حضرات شیعہ اس وقت تک حضرت علیؓ کی فضیلت کے لئے رسول اکرم کے

چچازاد بھائی اور داماد ہونے کو بنیاد بناتے رہے اور خود حضرت علی کی زبان سے ایسی باتیں کہلوائے، جن سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک ان کی فضلیت کی بنیاد رسول اکرمؐ سے رشتہ داریاں تھیں اگر ایسا نہ ہوتا تو رسول اکرمؐ کی وفات کے بعد حضرت فاطمہؓ کو گھر گھر لے جاکر ان کے توسل سے اپنی تائید کی کوشش نہ کرتے۔ حضرت علیؓ کی خود ساختہ فضیلت کو منوانے کے لئے عجیب و غریب روایات وضع کی گئیں۔مولود کعبہ ہونے کو فضلیت کا سبب ظاہر کیا گیا۔

یہ بات تو ابتداء سے اہل سنت کہتے رہے کہ علیؓ، علی تھے۔وہ اپنی شخصیت سے زیادہ ہوسکتے ہیں نہ کم، اب جب کہ اہل تشیع نے یہ بات مان لی ہے تو حضرت علی کی شخصیت کو تاریخی اعتبار ہی سے متعین کرنا پڑے گا۔البتہ اس بات کو ضرور پیش نظر رکھنا پڑے گا کہ وقت بڑا ظالم ہوتا ہے۔اس کی چکی میں نامیوں کے نام پس جاتے ہیں تاریخ عقیدوں اور عقیدت کا لحاظ نہیں کرتی۔

جب ہم حضرت علیؓ کی شخصیت کا تعین تاریخی نقطہ نظر سے اور افراط و تفریط سے بچ کر کرتے ہیں تو ان کی ایسی کمزوریوں کو نظرانداز نہیں کر سکتے مثلاً۔سبائیوں جیسے دشمنان اسلام کی سازش کا شکار بن جانا۔حضرت عثمانؓ کی مظلومانہ شہادت کے بعد قصاص لینے میں لیت و لعل کرنا۔مسلمانوں کو ایسی آپسی جنگوں میں مبتلا کرنا، جس سے مسلمانوں کی ترقی اور فتوحات رک گئیں اور ہزاروں مسلمانوں کا قتل و خون ہوا۔

یہ دعویٰ کہ اپنے اوصاف حمیدہ کی وجہ سے حضرت علیؓ کی حقاً اور انصافاً کائینات بشریت میں کوئی نظیر نہیں ایک ایسا دعویٰ ہے جس کی بنیاد نہ حق پر ہے نہ انصاف پر۔اس کی تصدیق نہ حضرت علیؓ کی سیرت سے ہوتی ہے نہ عقل اس کو تسلیم کر سکتی ہے اس بات کی بنیاد صرف اندھے عقیدہ پر ہے۔

اہلسنت میں جو لوگ حضرت علی کی فضلیت کا عقیدہ رکھتے ہیں ان کے متعلق اکبرالہ آبادی نے کہا ہے:۔

مذکر کے لئے ہی (He) ہے مونث کے لئے شی (She) لیکن
ہمارے حضرت ملا نہ ہیوں میں نہ شیوں میں

مشہد علیؓ

حضرت علیؓ پر عبدالرحمن بن ملجم نے سترہ رمضان ۴۰ھ کو شہر کوفہ میں قاتلانہ حملہ کیا تھا۔وہیں یعنی کوفہ میں آپ کی وفات ہوئی۔تدفین کے متعلق مختلف روایات ہیں مورخ مسلم ابن قتیبہ (وفات ۲۷۶ھ) نے کتاب المعارف میں بیان کیا ہے کہ:۔

"کوفہ کے قصرالامارت کی مسجد جامع کے پاس دفن ہوئے"۔

شیعہ مورخ ابن جریر طبریؒ (وفات ۳۱۰ھ) نے بھی قصرالامارت کوفہ کی جامع مسجد کے قریب حضرت علیؓ کا مدفون ہونا بیان کیا ہے۔

مورخ خطیب بغدادی (وفات ۴۶۳ھ) نے تاریخ بغداد میں کوفہ میں دفن ہونا بیان کیا ہے۔خطیب بغدادی نے چند روایتیں درج کی ہیں۔

اسحٰق بن عبداللہ بن ابی فردا کی روایت نقل کی ہے کہ میں نے ابو جعفر محمد الباقر سے ان کے پردادا حضرت علیؓ کے مقام تدفین کے بارے میں پوچھا تو فرمایا:۔کوفہ میں رات کے وقت دفن ہوئے تھے۔ان کا مدفن چھپادیا گیا تھا۔دوسری روایت ابو مسلم بن احمد بن عبداللہ العجلی نے بیان کی کہ:۔

کوفہ میں دفن ہوئے۔ان کی قبر کس جگہ ہے یہ کسی کو معلوم نہیں۔

عمدۃالطالب کے شیعہ مورخ نے لکھا ہے کہ:۔

حضرت علیؓ کو معلوم ہوگیا تھا کہ ان کے بعد دولتہ بنی امیہ قائم ہوجائے گی، اس لئے انھوں نے وصیت کی تھی کہ میری قبر چھپادی جائے تاکہ بنی امیہ اس کے ساتھ کوئی فعل قبیح نہ کر سکیں۔

"البدایہ والنہایہ" کی ایک روایت میں کہا گیا ہے کہ خارجیوں کے خوف سے انھیں دارالامارت میں دفن کیا گیا تاکہ قبر کھود کر میت کی بے حرمتی کا ارتکاب نہ ہوسکے مگر روایت کے اعتبار سے یہ دونوں روایتیں وضعی اور عجمی ذہنیت کی

ترجمان ہیں۔

ایک روایت یہ ہے کہ حضرت علیؑ کے فرزندوں نے ان کی میت کو تابوت میں رکھ کر عارضی طور پر اس نیت سے سپردخاک کیا تھا کہ مدینہ لے جاکر اپنی والدہ کے پہلو میں دفن کریں گے لیکن دوران سفر بلاد طے میں شب کے وقت اونٹ مع تابوت گم ہوگیا۔ وہاں کے بدوؤں نے یہ سمجھ کر کہ اس میں مال ہے سرقہ کر لیا۔ تابوت مدینہ نہ پہنچ سکا۔ اس لئے ان کا مدفن نہ مدینہ میں ہے اور نہ کوفہ میں۔

خطیب بغدادی نے ایک روایت درج کی ہے جسے ابن کثیر نے یوں نقل کیا ہے خطیب بغدادی نے ابو نعیم الفضل بن دکین کی یہ روایت بیان کی ہے:۔

"حسنؑ و حسینؑ نے حضرت علیؑ کے تابوت کو نکالا اور مدینہ میں قبر فاطمہؑ کے پاس منتقل کر دیا۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ:۔ جب تابوت کو اونٹ پر لے جارہے تھے اونٹ ہی گم ہوگیا۔ قبیلہ طے کے لوگوں نے یہ سمجھ کر کہ مال ہے لے لیا۔ جب دیکھا کہ صندوق میں میت رکھی ہے تو تابوت کو دفن کر دیا مگر کسی کو نہیں معلوم کہ قبر کہاں ہے۔"

خطیب بغدادی اور ابن کثیر کی روایتوں میں حسب ذیل مقامات تدفین بتائے گئے ہیں:۔

۱۔ دارالامارۃ، کوفہ ۲۔ مسجد جامع، کوفہ ۳۔ حجرہ مکان جعدہ بن ہبیر۔ واقع کوفہ ۴۔ نوح کوفہ ۵۔ مقام کناسہ ۶۔ مقام ثوبیہ ۷۔ قبرستان بقیع مدینہ ۸۔ بلاد طے ۹۔ لحذ. حیرہ ۱۰۔ نجف ۱۱۔ بلخ (قریۃ الخیر)

قریۃ الخیر، نزد بلخ میں جسے خواجہ خیران بھی کہتے ہیں۔ دو مختلف زمانوں میں مدفن علی دریافت ہوا۔ پہلے حضرت علیؑ کی وفات کے تقریباً پانچ سو برس بعد سلطان سنجر کے عہد میں ۵۵۱ھ میں دریافت ہوا۔ وہ اس طرح کہ اس قریہ کی جماعت صالحین میں جن کی تعداد مولف تحفۃ الالباب نے چار سو سے زائد بیان کی ہے رسول اکرمؐ کو خواب میں یہ فرماتے سنا کہ:۔ میرے چچا کے بیٹے اس جگہ دفن ہیں صبح کو یہ لوگ حاکم بلخ کے پاس گئے اور خواب بیان کیا۔ وہاں ایک اور عالم موجود تھے۔ انھوں نے کہا حضرت علیؑ کوفہ میں قتل ہوئے ان کی قبر کے بارے میں اختلاف ہے کچھ یہ کہتے ہیں کہ

کوفہ کی مسجد جامع کے مینار کے نیچے دفن ہوئے۔ کچھ کہتے ہیں کہ مقام کر ذاذوہ میں دفن ہوئے اور کچھ کہتے ہیں کہ غدیر (شائد غروبی ہو) میں دفن ہوئے پھر دو ہزار میل سے زیادہ فاصلہ پر ان کی میت یہاں کیسے آسکتی ہے۔ یہ سن کر لوگ واپس گئے مگر آدھی رات کو یہی عالم اپنی اولاد اور احباب کے ساتھ حاکم کے پاس آئے اور آہ وزاری کرتے ہوئے یہ ماجرا سنایا کہ میں اپنے گھر میں سو رہا تھا، خواب میں کیا دیکھتا ہوں کہ علویوں کی ایک جماعت سفید لباس پہنے اور مجھ سے پوچھا تو کیا کہتا ہے امیرالمومنین یہاں موجود نہیں ہے، رسولؐ اللہ کے قول کو جھٹلاتا ہے۔ مجھے گھسیٹ کر قبر پر لے گئے۔ جہاں امیرالمومنین تشریف فرما تھے۔ سر اور داڑھی کے بال سفید تھے۔ پھر سب لوگوں نے مجھے خوب مارا۔ امیرالمومنین نے ان کو اشارہ کیا تو انھوں نے مجھے چھوڑ دیا میں معافی کا خواستگار ہوں۔ یہ ماجرا سن کر حاکم اپنے سپاہیوں کو لے کر اس مقام پر گیا جو رسول اکرمؐ نے خواب میں لوگوں کو بتایا تھا۔ جب زمین کھودی گئی تو قبر برآمد ہوئی۔

امیرالمومنین کی میت اسی طرح تھی جیسے ابھی دفن ہوئی ہو۔ ان کے رخسار تلے سنگ سرخ کی تختی تھی جس پر لکھا تھا۔ **ھذا محب النبی علی کرم اللہ وجہٗ**

حاکم نے قبر از سر نو بنوا کر ایک خوبصورت مشہد تعمیر کرا دیا۔

حضرت علیؑ کے قبر کے اس قریہ میں دریافت ہوجانے کے بعد دور دور سے زائرین جوق در جوق آنے لگے چنگیز خان کے زمانہ میں یہ مشہد مسمار ہوگیا تھا۔ ۸۸۶ھ میں سلطان حسین تیموری کے عہد میں دوبارہ یہ قبر دریافت ہوئی اور اس پر مشہد تعمیر ہوا۔ چند سلاطین ازبک کے قبور بھی اس کے قریب بنتی گئیں۔ ایک شیعہ افغانی گورنر نائب عالم خان نے ۸۸۶ھ اس مقام کو اپنا مستقر قرار دیا۔ اس وقت سے یہ مقام مزار شریف کہلانے لگا۔

بلخی قبر کی "دریافت" بنی بویہ کے زمانہ کے تقریباً پونے دو سو برس بعد ہوئی۔

نجف کی قبر کی "دریافت" عراق کی ایک بستی جو کوفہ سے جانب مغرب ہے ایک مرتفع دمسطح اور بنجر زمین نجف کہلاتی ہے۔

زمانہ ماقبل اسلام میں ریت کی ان پہاڑیوں میں دو قبریں موجود تھیں۔ جنھیں آدم اور نوح سے منسوب کیا جاتا تھا۔ حضرت علیؑ کے وفات کے سواتین سو برس

بعد ۳۶۹ھ میں بنی بویہ کے زمانہ میں یہاں حضرت علیؑ کی قبر دریافت ہوئی۔

قدیم مورخین ابن قتیبہ (وفات ۲۷۶ھ) اور شیعہ مورخ ابن جریر طبری (وفات ۳۱۰ھ) نے حضرت علیؑ کی تدفین کے سلسلہ میں نجف کا اشارہ بھی نہیں کیا۔ دوسرے شیعہ مورخ مسعودی (وفات ۳۴۶ھ) بنی بویہ کے ابتدائی زمانہ میں موجود تھے۔ انھوں نے نجفی قبر کا مطلق ذکر نہیں کیا۔ انھوں نے اپنی تالیف "مروج الذہب" میں حضرت علیؑ کے مدینہ میں دفن ہونے کا صراحت سے ذکر کیا ہے۔ یہی بات اس امر کا قوی ثبوت ہے کہ ۳۶۹ھ سے قبل حضرت علیؑ کی قبر نجف میں ہونے کی روایت یا حکایت موجود نہ تھی۔ بنی بویہ، بنی حمدان جو دونوں غالی شیعہ اور تقریباً ہم زمانہ تھے ان ہی کے زمانہ اقتدار میں نجفی قبر دریافت ہوئی اور وضعی روایتیں اور مہمل حکایتیں مشہور ہونی شروع ہوئیں۔ ان روایتوں اور دیومالائی طرز کی حکایتوں کو مدتوں بعد تک اعتبار کا درجہ حاصل نہ ہوسکا تھا۔ چنانچہ ابن بطوطہ ۷۳۰ھ میں نجف گیا تو حضرت علیؑ کی قبر کے بارے میں شبہ کا اظہار ان الفاظ میں کرتا ہے:۔

"وہ قبر جس کے متعلق لوگ گمان کرتے ہیں کہ حضرت علیؑ کی ہے"۔

حمد اللہ مستوفی قزوینی نے اپنی کتاب نزہتہ القلوب ۷۴۰ھ میں تالیف کی اور عمدۃ الطالب کے شیعہ مولف نے ۸۲۸ھ میں تالیف کیا۔ ہر دو نے حضرت علیؑ کے نجف میں دفن ہونے کی روایتیں لکھی ہیں۔ پھر بنی امیہ کے خوف سے قبر کو مخفی رکھنے اور ہارون رشید کے زمانہ میں حضرت علیؑ کی کرامت سے قبر کے ظاہر ہونے کی حکایتیں بیان کی ہیں۔

مولف نزہتہ القلوب نے یوں لکھا ہے:۔ کوفہ سے بطرف قبلہ دو فرسنگ کے فاصلہ پر مشہد امیرالمومنین ہے۔ اس کو مشہد غروی (عالی مقام) کہتے ہیں۔ جب امیرالمومنین کو کوفہ کی مسجد میں زخم لگا تو انھوں نے یہ وصیت کی کہ بعد وفات ان کے جسد کو ایک اونٹ پر لاد کر اونٹ کو بے محار چھوڑ دیا جائے اس خدمت کی انجام دہی کے لیے اسے موزوں سمجھا جائے جہاں کہیں بیٹھ جائے وہیں دفن کر دیں۔ ایسا ہی کیا گیا۔ اونٹ اس مقام پر جہاں اب مشہد ہے، بیٹھ گیا۔ وہیں دفن کیا گیا۔

اس کے برخلاف عمدۃ الطالب میں لکھا ہے:۔

ان کی قبر کی جگہ کے بارے میں لوگوں میں اختلاف ہے لیکن صحیح یہی ہے کہ قبر اسی جگہ ہے جو آج زیارت گاہ ہے۔ روایت ہے کہ[۹] حضرت عبداللہ بن جعفر سے جب دریافت کیا گیا کہ آپ لوگوں نے امیرالمومنین کو کہاں دفن کیا تھا تو انھوں نے کہا ہم ان کا جنازہ لے کر چلے۔ حتیٰ کہ بیاباں نجف کے سرے تک گئے اور وہیں دفن کر دیا۔

نزہتہ القلوب کے مولف فرماتے ہیں:۔

ہارون الرشید ۱۷۵ھ میں اس علاقہ میں شکار کر رہے تھے۔ شکاری جانور ان کے (ہارون الرشید) کے خوف سے اس زمین میں پناہ لیتے تھے۔ ہرچند ہارون الرشید نے کوشش کی مگر ان کا گھوڑا زمین پر چلتا نہ تھا۔ اس کی وجہ سے ان کے دل میں اس زمین کی عظمت کا خیال پیدا ہوا۔ اس علاقہ کے لوگوں سے دریافت کیا تو انھوں نے وہاں امیرالمومنین کی قبر بتائی۔ حکم دیا کہ اس زمین کو کھودو۔ چنانچہ حضرت کو خفتہ اور زخم رسیدہ پایا۔ مقبرہ آپ کا ظاہر کر دیا گیا اور لوگ اس جگہ مجاور ہو گئے۔

عمدۃ الطالب میں یوں رنگ آمیزی کی گئی ہے:۔

حضرت علیؑ کی قبر مخفی رہی حتیٰ کہ ہارون الرشید کا زمانہ آیا۔ یہ ایک دن نواح کوفہ میں شکار کھیلنے نکلے۔ وہاں سرخ رنگ کے پرند اور آہو بچگان موجود تھے۔ ہارون الرشید نے باز اور کتے ان پر چھوڑے۔ وہ جانور ریت کے ٹیلے پر پناہ لیتے۔ باز اور کتے اس ٹیلہ پر نہ جاتے اور واپس آجاتے۔ ہارون الرشید حیران ہوئے کوفہ لوٹ آئے۔ جن لوگوں کو اس بارے میں معلومات تھیں طلب کیا۔

بعض عمر رسیدہ لوگوں نے انھیں بتایا کہ وہاں امیرالمومنین کی قبر ہے۔ خلیفہ ہارون الرشید رات کے وقت اس مقام پر گئے۔ ان کے ساتھ علی بن عیسیٰ بھی تھے ہارون الرشید نے مصاحبوں کو دور رکھا پھر ریت کے ٹیلہ کے پاس کھڑے ہو کر نماز پڑھی روتے جاتے تھے اور کہتے تھے۔ واللہ! ابن عم میں آپ کے حق کو جانتا ہوں۔ آپ کے فضل سے منکر نہیں۔ لیکن آپ کی اولاد خروج کرتی ہے اور میرے قتل کا قصد کرتی ہے فجر تک یہی کرتے رہے۔ فجر کا وقت ہوا تو علی بن عیسیٰ کو جو سو رہے تھے جگایا کہ اٹھو اور اپنے ابن عم کی قبر کے پاس نماز پڑھو۔ علی بن عیسیٰ نے پوچھا کون ابن عم۔ کہا امیرالمومنین علی بن ابی طالب۔ علی بن عیسیٰ نے قبر کے پاس نماز پڑھی۔ پھر

ہارون الرشید نے حکم دیا۔ قبر پر قبہ بنایا گیا اور لوگوں کو اس قبر کی زیارت کرنے اور اپنے مردوں کو اس کے گرد دفن کرنے کی تاکید کی گئی۔

ملا باقر مجلسی جو اواخر عہد صفوی میں امامیہ کے بڑے مجتہد تھے۔ ان وضعی روایات کو نوک پلک درست کر کے یوں بیان کیا ہے:۔

ایک دن ہارون الرشید شکار کے لئے کتوں اور بازوں کے ساتھ صحرائے نجف کی جانب نکل گئے۔ جب قریب پہنچے تو کتوں اور بازوں کو چند ہرنوں پر چھوڑا۔ کچھ دیر تک وہ ہرنوں پر جھپٹتے رہے۔ پھر ہرن ریت کے ٹیلہ پر چڑھ گئے۔ کتے اور باز واپس آئے۔ ہرن پھر اس ٹیلہ سے نیچے اترآئے تو شکاری جانور ان کے پیچھے دوڑے۔ ہرن پھر ٹیلہ پر چڑھ گئے۔ کتے اور باز واپس لوٹ گئے۔ جب تین مرتبہ یہی واقعہ پیش آیا تو ہارون الرشید کو بہت تعجب ہوا۔ قبیلہ بنی اسد کے ایک بوڑھے آدمی سے پوچھا کہ اس ٹیلے کے بارے میں تم کیا جانتے ہو۔ اس نے کہا مجھے امان دیجئے تو بتاؤں۔ ہارون الرشید نے کہا، میں نے امان دی۔

اس شخص نے کہا ٹیلہ پر حضرت علیؓ کی قبر ہے۔ اسی وجہ سے یہ درندے جانور جرات نہیں کرتے کہ ٹیلہ پر جائیں۔ پس ہارون نے وضو کیا ٹیلہ پر جا کر نماز پڑھی۔ دعائیں مانگیں اور لوٹ گئے۔

خطیب بغدادی نے جو بنی بویہ کے قریب العہد مورخ تھے نام نہاد مشہد علیؓ کے بارے میں صاف لکھا ہے کہ:۔ یہ حضرت علیؓ کی قبر نہیں ہے۔

علامہ ابن کثیر نے ان کے قول کو نقل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

نادان رافضیوں میں سے جو اس کے معتقد ہیں کہ مشہد نجف میں علیؓ کی قبر ہے تو اس کی نہ کوئی دلیل ہے اور نہ کچھ اصلیت۔ بلکہ لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ قبر بلاشبہ مغیرہ بن شعبہ کی ہے چنانچہ خطیب بغدادی نے حافظ ابو نعیم سے انھوں نے ابو بکر الطلحی سے، انھوں نے حافظ محمد بن عبداللہ الحضرمی سے انھوں نے مطر سے روایت کی ہے کہ شیعوں کو اگر معلوم ہو جائے کہ نجف کی یہ قبر جس کی وہ تعظیم کرتے ہیں کس کی ہے تو اس پر الٹی سنگ باری کریں کیونکہ یہ قبر تو مغیرہ بن شعبہ کی ہے۔

ملا باقر مجلسی نے "جلاء العیون" کی فصل چہارم میں حضرت علیؓ کے غسل و کفن دفن کی کوئی بیس روایتیں لکھی ہیں جو اگرچہ سب کی سب دیو مالائی طرز کی ہیں حد درجہ مہمل اور لچر ہیں، تاہم بعض میں صراحتہ بیان ہوا ہے کہ حضرت علیؓ کی میت غائب ہو گئی اور قبر بھی "ناپید شد"۔

بنی بویہ کو اپنی سیاسی مصلحتوں کے پیش نظر ضروری تھا کہ عراق میں شیعی دنیا کے دو متبرک مقام اور مشہد قائم کریں۔ مشہد کربلا کے علاوہ ۳۶۱ھ میں یعنی حضرت علیؓ کے وفات کے سوا تین سو برس بعد ان کی مفروضہ قبر پر مشہد نجف تعمیر کروایا۔ اس کا بانی عضد الدولہ تھا، جو بہ وصیت خود وہیں دفن ہوا اور اس کے اکثر اہل خاندان وہیں مدفون ہوئے۔

معز الدولہ کی قبر نجفی مشہد میں نہیں ہے۔ کیونکہ وہ ۳۰۸ھ میں یعنی تعمیر مشہد سے گیارہ سال پہلے فوت ہوا تھا۔ اس وقت تک نجفی ریگستان میں حضرت علیؓ کی قبر دریافت نہیں ہوئی تھی۔

عمدۃ الطالب کے شیعہ مولف (وفات ۸۲۸ھ) فرماتے ہیں:۔

مشہد علی کی جو عمارت عضد الدولہ نے بنوائی تھی، اب اس کا ایک چھوٹا سا جز ہی باقی رہ گیا ہے۔ کیونکہ آگ لگ جانے سے یہ کل عمارت جل گئی تھی۔ دیواروں پر جو منقش چوکھٹے لکڑی کے آویزاں تھے، ان میں آگ لگ گئی تھی۔ بعد میں عمارت کی تجدید کرلی گئی اور وہی عمارت اب تک (مولف کے زمانہ تک) باقی ہے۔

انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے مقالہ نگار کا بیان ہے کہ:

۴۴۳ھ میں بغداد کے شیعہ سنیوں میں فساد ہوا تو مشہد علیؓ کو جلادیا گیا۔ کچھ عرصہ بعد دوبارہ تعمیر کروایا گیا۔

ابن کثیر نے ۴۴۳ھ میں روافض اور اہل سنت کے باہمی فساد کا ذکر کیا ہے جو تقریباً دو ہفتہ تک جاری رہا۔ اکابرین کے مقبرے بھی جلائے گئے۔ اس فساد کی وجہ یہ تھی کہ رافضیوں نے ایک مینارہ نصب کیا اور اس پر سونے سے لکھا کہ:۔

"محمدؐ اور علیؓ دونوں کو جو خیر البشر مانے وہ مستحق رحمت اور جو نہ مانے وہ مرتکب کفر ہے"۔ اہل سنت الجماعت کی جانب سے مشہد نجف کو جلانے سے یہ واضح

ہے کہ وہ اس کو حضرت علیؓ کا اصلی مدفن نہیں سمجھتے تھے ورنہ اہل سنت کو جو عقیدت حضرت علیؓ سے ہے اس کے پیش نظر وہ حضرت علیؓ کے مشہد کو نہیں جلاسکتے تھے۔ جلانے کا واقعہ تعمیر مشہد سے چوہتر (۷۴) برس بعد کا ہے۔ اس وقت تک ایسے لوگ موجود تھے جنھیں معلوم تھا کہ بنی بویہ نے نجف کی ایک مفروضہ قبر پر یہ مشہد اپنی سیاسی مصلحتوں کی وجہ سے تعمیر کروایا تھا۔ دوبارہ تعمیر کے بعد سے اصلی مدفن سمجھا جانے لگا اور رفتہ رفتہ شیعی دنیا کے متبرک اور مرکزی مقام کی حیثیت حاصل ہوگئی۔

("تحقیق سید و سادات" اور سبائی سبز باغ صفحات ۱۶۶ تا ۱۷۳ سے اقتباس)

کوفی شیعانِ علیؓ

مسلمان عام طور پر نہ سمجھ سکے کہ کوفی شیعان علی اور شامی عربوں میں کیا فرق ہے۔ وہ سب کو مسلمان سمجھتے ہیں اس لئے کوفہ اور اہل کوفہ کے بارے میں وضاحت ضروری ہے۔

کوفہ کو حضرت عمرؓ نے ۱۷ھ میں آباد کیا، عراق میں یہ مقام حجاز، شام اور ایران کی سرحدوں کو قابو میں رکھنے کے لئے بے حد اہم تھا۔ اس لئے کوفہ کو اسلامی فوجوں کی چھاؤنی بنادیا گیا۔ فوجوں کی وجہ سے کاروباری لوگ بھی آکر وہاں آباد ہوگئے۔ جن میں عراقی، ایرانی اور خراسانی لوگ زیادہ تھے۔ جو ماوریٰ النہری کہلاتے تھے۔ یہ لوگ آتش پرست تھے۔ سورج اور شیر کو پوجتے تھے۔ مجبوراً اسلام قبول کیا تاکہ جزیہ نہ دینا پڑے۔ مگر چند برس بعد عبداللہ بن سبا یہودی نے وہاں شیعیت کی تبلیغ کی تو ساری آبادی شیعان علی بن گئی۔

چنانچہ شیعی مورخ لکھتا ہے:۔ "چھتیس (۳۶) ہجری میں جناب امیر سیاسی مصالح کے تحت کوفہ کو اپنا صدر مقام بنایا تو کوفہ اپنے حقیقی اور کچھ نام نہاد شیعان اہل بیت سے چھلک رہا تھا"۔

جنگ جمل اور صفین میں اہل کوفہ پیش پیش تھے۔ پھر معاویہ نے زیاد بن سمیعہ کو مسلط کردیا جس نے ان کو مظالم کا تختہ مشق بنایا۔ تو یہ لوگ کوفہ اور اطراف کوفہ میں گمنامی کی زندگی بسر کرنے لگے مگر معاویہ کا انتقال ہوا تو پھر یہ سرگرم عمل ہوگئے۔

خطبات امام زین العابدین میں جو شیعہ کتب میں محفوظ ہیں یہ شکایت پھر سنائی دیتی ہے "کیا تم نہیں جانتے کہ تم نے میرے باپ کو خط لکھ کر بلایا اور تم نے ان سے عہد و پیمان کئے پھر تم نے ان کو چھوڑ دیا۔ پس تمہارے لئے ہلاکت ہے۔ تمہاری رائے بری تھی۔ تم رسول خدا سے کیسے آنکھ ملاؤ گے جب وہ پوچھیں گے کہ تم نے میری عترت کو قتل کیا اور میری بے حرمتی کی۔ پس تم میری امت میں نہیں"۔

جب زین العابدین نے اس طرح خطاب کیا تو ہر طرف سے لوگوں کے رونے کی آوازیں بلند ہوئیں اور سب نے کہا ہم ہلاک ہوگئے۔ ہم نے برا کیا۔ یہ توابین دراصل وہی مجوسی نژاد آریا تھے جو مسلمانوں سے اپنی شکست کا بدلہ لینے کے لئے اسلام کا لبادہ پہن کر کوفہ میں جمع ہوگئے تھے اور خود کو شیعان علی ظاہر کرتے تھے۔ دراصل ان کا مقصد مسلمانوں کو آپس میں لڑا کر اسلام کا زور توڑنا تھا۔ افسوس کہ حضرت علیؓ ان کے دھوکہ میں آگئے اور بیس سال بعد ان کے بیٹے حضرت حسینؓ نے دھوکہ کھایا اور مسلمانوں کے ساتھ اپنا نقصان کرلیا۔ مجوسیوں کو ان سے کوئی ہمدردی نہ تھی اور مجوسیوں کے پیروؤں کو آج بھی نہیں ہے۔

غدیر خم

مکہ سے مدینہ کی راہ میں جحفہ سے تین میل کے فاصلہ پر ایک مقام ہے، جہاں ایک غدیر تھا۔ غدیر عربی زبان میں چھوٹے تالاب (جوہڑ، تلیا یا پانی کے ڈربے) کو کہتے ہیں۔ جہاں بارش کا پانی اکٹھا ہوجائے۔ مکہ سے مدینہ کے راستہ سے کچھ دور ہٹی ہوئی جھیل تھی جو خم کہلاتی تھی۔ اس جھیل کی مناسبت سے اس مقام کو غدیر خم کہتے ہیں۔

سبائیوں کا کہنا ہے جس کو عقیدہ بنالیا ہے کہ اس مقام پر رسول اکرمؐ نے آخری حج سے واپسی کے دوران ۱۸/ ذی الحجہ ۱۰ھ کو قیام فرمایا تھا اور حضرت علیؓ کا ہاتھ پکڑ کر یہ اعلان فرمایا:

مَن کُنتَ مولاہ فعلی مولاہ"

(جس کا میں مولا ہوں علی اس کا مولا ہے۔) سبائیوں کا یہ عقیدہ ہے کہ اس موقع پر رسول اکرمؐ نے حضرت علیؓ کو اپنا جانشین یا ولی عہد بنایا۔ اگر ان الفاظ کو جو رسول اکرمؐ سے منسوب کئے گئے ہیں دیکھیں تو مولیٰ کے معنی غلط لئے گئے ہیں۔ ان الفاظ سے سبائیوں کی یہ مراد ہے کہ "میں جس کا آقا ہوں علی اس کے آقا ہیں"۔ لفظ مولیٰ اگر اللہ کے لئے استعمال کیا جائے تو آقا اور مالک کے ہوتے ہیں۔ اگر انسان کے لئے استعمال کئے جائیں تو مولیٰ کے معنی غلام کے ہوتے ہیں۔ اگر ایک انسان اور دوسرے انسان کے درمیان لفظ مولا کا استعمال کیا جائے تو اس کے معنی حلیف یا دوست کے ہوتے ہیں اسی سے موالات بھی ماخوذ ہے۔

اگر رسول اکرمؐ نے اس موقع پر یہ فقرہ کہا تھا تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ میں جس کا مولا (یعنی بندہ یا غلام) ہوں، علی بھی اس کا بندہ یا غلام ہے۔ یعنی اگر علی کے تعلق سے مسلمانوں میں یا خود حضرت علیؓ کے دل میں ایسا احساس پیدا ہو رہا تھا کہ وہ رسول اکرمؐ سے رشتہ داری کی بنا پر کسی رتبہ کے حامل ہیں تو اس کی نفی کرنے کے لئے رسول اکرمؐ نے ایسا فرمایا ہوگا اور اس طرح حضرت علیؓ کی حیثیت کا تعین فرمایا ہوگا۔

اگر مولا کے معنی آقا کے لئے جائیں جیسا کہ سبائی لیتے ہیں تو یہ علانیہ کلمہ شرک ہوگا کیونکہ مولا بمعنی آقا سوائے اللہ تعالیٰ کے کوئی اور نہیں۔ قرآن مجید میں ہے:۔

اے نبی (کافروں سے کہو) "مسلمانوں کا مولا تو صرف اللہ ہے اور وہ کیسا اچھا مولا ہے اور کتنا اچھا مددگار و مشکل کشا ہے۔ (۸: ۴۰)

رسول اکرمؐ نے فرمایا: "تم کسی کو اپنا غلام یا اپنی باندی نہ کہو۔ سب اللہ کے غلام (بندے) ہو۔ اسی طرح کوئی غلام اپنے مالک کو میرا مولا نہ کہے۔ کیونکہ تم

سب کا مولا تو صرف اللہ ہے"۔

روایت سے قطع نظر درایت کے اصول سے بھی **مَن کنت مولاہ فعلی مولاہ** والی حدیث کی صحت قطعاً مشتبہ ہے کیونکہ بیان کیا جاتا ہے کہ رسول اکرمؐ نے یہ اعلان حجۃ الوداع کے موقعہ پر غدیر خم کے مقام پر کیا۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ رسول اکرمؐ اور صحابہ غدیر خم کیونکر پہنچ گئے۔ جو مکہ اور مدینہ کے راستے سے ہٹ کر کافی الگ ایک مقام ہے۔

سبائی روایات میں محمد باقر اور ان کے بیٹے جعفر صادق کی طرف نسبت کر کے حضرت ابو بکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ کے بارے میں انتہائی نازیبا اور ناشائستہ باتیں نقل کی گئی ہیں۔ ان تمام وضعی روایات کو قطعاً تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔ سب محمد باقر اور جعفر صادق پر افترا ہیں۔ پھر یہ بات بھی غور طلب ہے کہ حضرت علیؓ نے کبھی بھی "غدیر خم" کا حوالہ دے کر اپنی امامت یا خلافت کا دعویٰ نہیں کیا۔

غدیر خم کی حدیث کو بخاری، ابو داؤد، ابراہیم حربی اور ان کے علاوہ بہت سے ائمہ حدیث نے ضعیف قرار دیا ہے۔ ابن حزم نے اس روایت کو صحت سے خارج قرار دیا ترمذی نے اسے حسن غریب قرار دیا۔ کچھ محدثین اسے صحیح بھی قرار دیں تو بھی صحت کا وہ معیاری اعتبار اس سے ساقط ہوگیا جس سے کسی خالص اعتقادی مسئلہ کا ثبوت ہوسکے۔

اصل واقعہ یہ تھا کہ حجۃ الوداع سے ۷، ۸ مہینے قبل رسول اکرمؐ نے حضرت علیؓ کو قریباً تین سو افراد کی جمعیت کے ساتھ بھیجا تھا اور حضرت علیؓ حجۃ الوداع میں یمن ہی سے آکر رسول اکرمؐ سے ملے تھے۔ یمن کے زمانہ قیام میں حضرت علیؓ کے بعض قریبی ساتھیوں کو حضرت علیؓ کے بعض اقدامات سے اختلاف ہوا۔ وہ لوگ بھی حج میں شرکت کے لئے حضرت علیؓ کے ساتھ آئے تھے۔ ان لوگوں نے حضرت علیؓ کے ان اقدامات کا ذکر شکایتاً رسول اکرمؐ سے کیا۔ رسول اکرمؐ نے معاملہ کی دریافت (ENQUIRY) فرمائی، اور شکایت کرنے والوں کو متنبہ کرتے ہوئے دعائیہ الفاظ فرمائے۔ چونکہ حضرت علیؓ کو بری کیا تو ہوسکتا ہے کہ یہ الفاظ فرمائے ہوں جس سے ان کی حیثیت کا تعین ہوجائے

رسول اکرمؐ کے ان ارشادات کا مسئلہ امامت و خلافت سے کوئی تعلق نہیں۔
لیکن اس مفروضہ اعلان کی خوشی میں ساڑھے تین سو برس کے بعد بنی بویہ کے زمانہ اقتدار میں پہلی مرتبہ بغداد میں عید غدیر منائی گئی۔ جس کا حال علامہ ابن کثیر نے یوں لکھا ہے:۔

"اسی سال (۳۵۲ھ) کی اٹھارویں ذی الحجہ کو معزالدولہ بن بویہ نے حکم دیا کہ "عید غدیر" کی خوشی میں بغداد میں زینت و آرائش کی جائے۔ چراغاں کا اہتمام ہو۔ رات میں بازار اسی طرح کھلے رہیں جس طرح عیدین میں کھلے رہتے ہیں۔ ڈھول اور نقارے بجائے جائیں۔ امراء کے یہاں اور چھاؤنی میں آتش بازی کا اہتمام ہو۔

سبائیوں نے ۱۸/ ذی الحجہ ۳۵ھ میں پردہ ڈالنے کے لئے غدیر کی روایت کو (اس کے اصل پس منظر سے ہٹاکر اور روایت میں تحریف کرکے) پیش کیا اور اس کے لئے بھی ۱۸/ ذی الحجہ تجویز کی۔ اور حجتہ الوداع کے واقعہ سے اس کو مربوط کردیا۔ چونکہ ۱۸/ ذی الحجہ ۳۵ھ کو حضرت علیؓ کو خلافت ملی اور سبائیوں کی سازش پوری ہوئی اس لئے انھوں نے اس دن کو ایک بڑی عید قرار دیا اور اس کے بارے میں عجیب و غریب باتیں مشہور کیں۔

شیعوں کے امام رضا سے منقول ہے کہ حق تعالیٰ اعمال لکھنے والے فرشتوں کو حکم دیتا ہے کہ شیعان علی اور محبان اہل بیت کے چھوٹے گناہ تین روز تک نہ لکھو یعنی ۱۸/ سے ۲۰/ ذی الحجہ تک۔ اس طرح اس عید کے پردے میں عقائد باطلہ کے حامل ایسی ایسی رنگ رلیاں مناتے ہیں جن سے مزدکیوں کی اور بابل و نینوا کی شرمناک رسومات کا اعادہ ہوتا ہے۔

شیعوں کے بموجب حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ "رسول اللہ کی جانب سے "جانشینی" کے اعلان کے بعد میں نے دیکھا کہ ایک خوبصورت نوجوان جو میرے پہلو میں کھڑا ہوا تھا مجھ سے کہنے لگا:۔ اے عمرؓ خدا کی قسم میں نے آج تک نہیں دیکھا کہ رسول خدا نے اس قدر تاکید کے ساتھ اپنے ابن عم کی ولایت اور خلافت کے لئے ایسی گرہ لگائی ہو جس کو سوائے اس کے جو خدا و رسول سے کفر اختیار کیا ہو کوئی نہیں کھول سکتا۔ دیکھو تم اس کے کھولنے سے باز رہنا۔ اس کے بعد جب میں نے رسالت

مآب سے یہ واقعہ بیان کیا تو حضرت نے فرمایا: ۔ وہ جبرئیل تھے۔ میرے اعلان کی تاکید کے لئے آئے تھے۔" جبرئیل ایسے فرشتہ ہیں جو اللہ کی جانب سے رسولوں کے پاس آتے ہیں اور صرف رسولوں سے ہی بات کرتے ہیں۔ بعض احادیث میں ذکر آتا ہے کہ حضرت جبرئیل کو رسول اکرمؐ کے اصحاب نے انسانی شکل میں دیکھا۔ جبرئیل کے نظر آنے کا ذکر تو آتا ہے لیکن بات کرنے کا ذکر نہیں آتا۔ اس وضعی حدیث میں شیعوں نے بلاسوچے حضرت عمرؓ کو رسول کا درجہ دے دیا کہ جبرئیل نے حضرت عمرؓ سے بات بھی یعنی اللہ کی جانب سے حضرت عمرؓ پر وحی آئی۔

("ان مٹ باتیں" صفحہ ۹۳ سے اقتباس)

غیبت

فرقہ اثنا عشریہ نے ایک فرضی شخصیت کو آخری امام قرار دیا اور ان کا نام محمد اور ان کو کئی القاب سے نوازا۔ ان کو مہدی صاحب العصر، امام عصر، صاحب الزماں، حجۃ اللہ وغیرہ وغیرہ کہا گیا۔ شیعوں کا عقیدہ ہے کہ اس وقت جب کہ وہ کم سن تھے تو لوگوں کی نگاہ سے غائب ہوگئے مگر سرمن رائے کے غار میں زندہ ہیں۔ قیامت کے قریب ظاہر ہوں گے اور دنیا کو ایک بار پھر عدل و انصاف سے بھردیں گے۔

شیعوں کے گیارھویں امام حسن عسکری ہیں جو اصول کافی کے مطابق ۲۳۲ھ میں پیدا ہوئے اور صرف (۲۸) سال کی عمر پاکر ۲۶۰ھ میں وفات پائی۔ ان کے حقیقی بھائی جعفر بن علی اور خاندان کے دوسرے لوگوں کا بیان ہے کہ حسن عسکری لاولد فوت ہوئے۔ چونکہ ائمہ (اور ان سے زیادہ شرپسند عناصر جو ائمہ کا استحصال کرتے تھے) مسلمانوں کی مرکزی حکومت کے لئے ایک مستقل مسئلہ بنے ہوئے تھے۔ اس لئے امام حسن عسکری کا لاولد ہونا اہمیت کی بات تھی۔ چنانچہ حکومت کے ذمہ داروں نے بھی تحقیق و تفتیش کی۔ اور یہی ثابت ہوا کہ حسن عسکری نے کوئی اولاد نہیں چھوڑی۔

اثناعشریہ کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ تیسرے امام حضرت حسینؓ کے بعد امام کا بیٹا امام ہوتا ہے ۔ اصول کافی میں بھی متعدد روایات اس سلسلہ میں ہیں اور سب کا حاصل یہی ہے کہ امام کا بیٹا ہی امام ہوتا ہے کوئی دوسرا عزیز قریب بھی امام نہیں ہوسکتا۔ان ہی روایات پر عقیدہ امامت کی بنیاد ہے ۔

اس عقیدہ کی وجہ سے اثناعشریہ کو یہ مشکل پیش آئی کہ گیارھویں امام حسن عسکری کے بعد امامت کا سلسلہ کیسے چلے اور بارھویں اور آخری امام کس کو قرار دیا جائے ۔اس مشکل کو حل کرنے کے لئے یہ دعویٰ کیا گیا اور مشہور کیا گیا کہ امام حسن عسکری کی وفات سے چار پانچ سال پہلے ان کی ایک کنیز کے بطن سے ایک لڑکا پیدا ہوا تھا جس کو عام نظروں سے چھپا کر رکھا جاتا تھا۔اس لئے کوئی اس کو دیکھ نہیں سکتا تھا ۔ یہ لڑکا اپنے والد امام حسن عسکری کی وفات سے صرف دس دن پہلے غائب ہو گیا اور قدیم چیزیں اور سارے تبرکات (مثلاً حضرت علی کا جمع کیا ہوا کامل قرآن، تمام آسمانی کتابیں، مصحف فاطمہ، الجفر اور الجامعہ، عصائے موسیٰ، قمیص آدمؑ حضرت سلیمان علیہ السلام کی انگشتری وغیرہ) جو حضرت علیؓ سے منتقل ہو کر ہر امام کے پاس رہتے تھے اور آخر میں حسن عسکری کے پاس تھے ۔تن تنہا اپنے ساتھ لے کر اپنے ہی شہر سر من رائے کے ایک غار میں روپوش ہو گیا۔

شیعوں کے عقیدہ کے مطابق اس لڑکے پر امامت کا سلسلہ ختم ہو گیا اور چونکہ یہ ضروری ہے کہ جب تک دنیا قائم رہے اس وقت تک امامت بھی قائم رہے ۔ اس لئے یہ عقیدہ وضع کر لیا گیا کہ یہ صاحبزادہ قیامت تک زندہ رہیں گے اور اسی طرح غائب و روپوش رہیں گے ۔قیامت سے پہلے وہ غار سے برآمد ہوں گے اور پھر ساری دنیا پر ان ہی کی حکومت ہوگی اور یہ ہوگا اور وہ ہوگا۔اس بارہ میں ہر اس شخص کا تاثر جس کو اللہ تعالیٰ نے بصیرت و فراست کی نعمت کا رمق برابر حصہ بھی عطا فرمایا ہے یہی ہوگا کہ بات بنائی گئی ہے لیکن اچھی نہیں بنائی جا سکی ۔

شیعہ اثنا عشریہ کا عقیدہ بجائے خود عجیب و غریب اور ہر تبصرہ سے بالاتر ہے

بقول مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

" امامت وائمہ کے بارے میں ان غالیانہ خیالات و عقائد کی جو ان کو مشارکت

فی النبوت پھر مشارکت فی الالوہیت کی حد تک پہنچا دیتے ہیں اور ان کو مافوق البشر ہستی قرار دیتے ہیں آخری حد (Climax) فرقہ اثناعشریہ کے امام غائب کا عقیدہ ہے جو بارھویں امام (قرار دیئے جاتے) ہیں ۔ان کی پیدائش و غیبت اس وقت تک ان کی حیات اور ہدایت و رہنمائی کا عقیدہ عقل و قیاس اور اللہ کے قانون تکوینی و تشریعی سے بے نیاز ہے ۔(دین اسلام اور اولین مسلمانوں کی متضاد تصویریں صفحہ ۸۷)

باقر مجلسی نے بارھویں امام (امام غائب) کی والدہ محترمہ کی انتہائی حیرت انگیز داستان بیان کی ہے ۔جو مذہبی داستانوں میں اپنی نظیر آپ ہے ۔اس روایت کے مطابق ان کا نام نرگس تھا اور وہ شاہ روم کی پوتی تھیں اور ایک زر خرید کنیزہ کی حیثیت سے حسن عسکری کے حرم میں داخل ہوئیں ۔

شیعہ امام غایب کے ظہور کا انتظار کرتے رہے ہیں ۔اور بولنے اور لکھنے میں ان کے ذکر کے ساتھ "عجل اللہ فرجۃ" (اللہ تعالیٰ جلدی ان کو باہر لے آئے) ۔ لازمی طور پر کہتے اور لکھتے ہیں ۔

صورت حال یہ ہے کہ ان کے غایب ہونے پر ساڑھے گیارہ سو سال کی مدت گذر چکی ہے ۔

غیبت صغریٰ

امام غایب کی غیبت کے بعد عیار لوگوں نے (جو اس گروہ سے تعلق رکھتے تھے جو ہمیشہ اماموں کی عقیدت کا استحصال کرتے تھے) عوام کو باور کرایا کہ امام غایب کے پاس رازدارانہ طور پر ان کی آمد و رفت ہے اور وہ گویا ان کے خصوصی ایجنٹ ہیں چنانچہ چار حضرات نے ایسا دعویٰ کیا ان میں آخری علی بن محمد سمیری تھے جن کا انتقال ۳۲۹ ھ میں ہوا ۔ سادہ لوح شیعہ امام غایب تک پہنچانے کے لئے ان حضرات کو درخواستیں اور قیمتی تحفے دیتے تھے اور یہ لوگ امام غایب کی طرف سے جوابات لاکر دیتے تھے جن پر امام صاحب کی مہر ہوتی تھی اور ان چالاک لوگوں کا یہ سارا کاروبار انتہائی رازداری سے ہوتا تھا ۔لیکن شیعہ علماء و مجتہدین نے ان خطوط کو جو چالاک لوگ امام صاحب کی طرف سے لاکر معتقدین کو دیتے تھے امام غایب کے ارشادات

کے حیثیت سے کتب حدیث و روایات میں جمع کر دیا ۔ ان کا خاصہ ذخیرہ "احتجاج طبرسی" کے آخری صفحات میں موجود ہے یہ سفارتی کاروبار اس وقت ختم ہوا جب حکومت وقت کی طرف سے تحقیق شروع ہوئی کہ یہ کون لوگ ہیں جو اس طرح کا فریب دے کر سادہ لوح عوام کو دھوکہ دے رہے ہیں اور لوٹ رہے ہیں ۔ اس کے بعد یہ سلسلہ بند ہو گیا اور مشہور کر دیا گیا کہ اب غیبت صغریٰ کا دور ختم ہو کر غیبت کبریٰ کا دور شروع ہو گیا اور اب امام غایب کے ظہور تک کسی کا ان سے رابطہ نہ ہو سکے گا اور ان تک کسی کی رسائی نہ ہو سکے گی ۔ اب بس ان کے ظہور کا انتظار کیا جائے ۔

(سبائی سبز باغ صفحات ۱۸۳ تا ۱۹۰ سے اقتباس)

مصحف فاطمہ

ابو بصیر کی روایت کے مطابق امام جعفر صادق نے اس سوال کے جواب میں کہ مصحف فاطمہ کیا ہے ۔ فرمایا :۔

اللہ نے جب اپنے نبی کو اس دنیا سے اٹھایا تو فاطمہؓ کو ایسا صدمہ ہوا جس کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا تو اللہ نے ایک فرشتہ تعزیت ادا کرنے کے لئے ان کے پاس بھیجا کہ ان کے غم میں ان کو تسلی دے اور ان سے باتیں کیا کرے ۔ جبرئیل آتے تھے اور ان کو تعزیت ادا کرتے تھے اور حضرت فاطمہؓ کے بعد ان کی ذریت پر جو گذرنے والی تھی اسے بیان کرتے تھے ۔

حضرت فاطمہؓ نے امیر المومنین کو یہ بات بتلائی تو انھوں نے فرمایا کہ :۔

"جب تم کو اس فرشتہ کی آمد کا احساس ہو اور اس کی آواز سنو تو مجھ کو بتادو" ۔ حضرت فاطمہؓ نے بتایا تو امیر المومنین جو کچھ اس فرشتے سے سنتے اس کو لکھتے جاتے یہاں تک کہ انھوں نے ایک مصحف تیار کر لیا ۔ یہی مصحف فاطمہ ہے" ۔ (اصول کافی)

ابو بصیر ہی سے (جو شیعی روایات کے مطابق امام جعفر صادق کے خاص

محرم راز شیعوں میں سے تھے) روایت ہے ۔

ایک دن میں امام جعفر صادق کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا مجھے خاص بات دریافت کرنی ہے یہاں کوئی غیر تو نہیں ۔ امام صاحب نے کہا اس وقت یہاں کوئی نہیں جو چاہو پوچھ سکتے ہو میں نے سوال کیا جس کا تعلق حضرت علیؓ اور ائمہ کے علم سے تھا ۔ امام جعفر صادق نے تفصیل سے جواب دیا اس کا آخری حصہ یہ ہے ۔ امام نے فرمایا :۔

ہمارے پاس مصحف فاطمہ ہے اس میں تمہارے اس قرآن سے تین گنا ہے ۔
اور اللہ کی قسم، اس میں تمہارے قرآن کا ایک حرف بھی نہیں ہے ۔

اس روایت میں قرآن مجید کو دو دفعہ "تمہارا قرآن" کہا گیا ہے ۔ ظاہر ہے کہ یہ جھوٹی روایت ہے لیکن اگر اس کو درست مانا جائے تو اس سے ظاہر ہوگا کہ امام جعفر صادق قرآن مجید کو اپنا قرآن نہیں مانتے تھے ۔

ابو بصیر اور زرارہ وغیرہ کوفہ میں رہتے تھے اور امام جعفر صادق مدینہ منورہ میں ۔ یہ لوگ کوفہ سے کبھی کبھی مدینہ منورہ آتے اور واپس جاکر کوفہ میں اپنے خاص حلقے میں ائمہ کی طرف منسوب کر کے اس طرح کی خرافات بیان کرتے ۔ ان ہی روایات پر سبائی مذہب کی بنیاد ہے ۔ ابو بصیر، زرارہ وغیرہ ان لوگوں میں سے ہیں جو فی الحقیقت شیعہ مذہب کے مصنف ہیں ۔

مصحف فاطمہ کے علاوہ شیعوں کے پاس ان کے ائمہ کی تعلیم کردہ وہ دعائیں "قرآن صاعد" کے نام سے موسوم ہیں ۔ اسی طرح ان کے ائمہ مناجات "شیعانیہ" کہلاتی ہیں ۔ حسین ابن علی کی دعا عرفات اسی طرح ایک کتاب "زبور آل محمد" اور ایک کتاب صحیفۂ سجادیہ ہے ۔

روح اللہ خمینی نے اپنے وصیت نامہ میں ان کا ذکر کیا ہے ۔

فاطمیین

فاطمیین کو عبیدین بھی کہتے ہیں ۔ اس تحریک کا بانی ایرانی نژاد معالج چشم میمون القداح کا بیٹا عبیداللہ تھا۔ عبیداللہ بن میمون القداح نے اس وقت کی مرکزی قوت یعنی خلافت کے خلاف سیاسی تحریک کا آغاز کیا جس کی کامیابی کے لئے اسے مذہبی اور عقائدی رنگ دیا۔ ابتداء میں تحریک خفیہ طور پر چلائی گئی۔ عبیداللہ نے اسماعیلی مذہب کی بنیاد اس اصول پر رکھی کہ رسول اکرمؐ نے ظاہری شریعت کی تبلیغ کی باطنی شریعت کے لئے آپ نے حضرت علیؓ کو قائم کیا ۔ رسول اکرمؐ اور حضرت علیؓ کے بعد چھ امام گذرے (ملت اسلامیہ کی تاریخ حصہ دوم صفحہ ۵۴ اور ۵۵) انھوں نے باطنی شریعت کو مکمل کیا۔ ساتویں امام محمد بن اسماعیل نے ۱۳ھ سے یعنی اپنے والد اسماعیل بن جعفر کی وفات کے بعد سے شریعت محمدیؐ کے ظاہر کو معطل کرکے باطنی شریعت جاری کی۔ گویا ان کے زمانہ سے ظاہری اعمال یعنی صلوٰۃ وغیرہ کے ادا کرنے اور شرعی محرمات (حرام باتوں) سے بچنے کی ضرورت نہیں رہی ۔ ان کی تاویل کی معرفت کافی ہے۔

بقول ابن قیمؒ اسلام دشمن فرقے قرامطہ، نصیریہ، وغیرہ کی طرح اسماعیلیہ (فاطمیین) نے بھی تاویلات باطلہ ہی کے چور دروازہ سے ملت اسلامیہ میں داخل ہونے کی جسارت کی۔

تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں وضعی احادیث کے ذریعہ یہ پروپیگنڈہ شدت اختیار کر گیا کہ جلد ہی مہدی کا ظہور ہونے والا ہے۔ جو فاطمہ بنت رسولؐ کی نسل سے ہوں گے اور دنیا کو عدل و انصاف سے بھر دیں گے۔

عبیداللہ اور اس کے جانشینوں نے اول تو مقام سلمیہ سے اپنے خفیہ داعی اسلامی علاقوں اور شہروں میں بھیجنا شروع کئے۔ یہ داعی اپنی بات ایک خاص ترتیب سے کرتے کہ ہونے والے مرید کے دل میں ابتداً دین کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا کرتے پھر اس شخص کو یہ باور کراتے کہ جلد ہی مہدی موعود کا ظہور

ہونے والا ہے عربوں اور ایرانی نو مسلموں کے درمیان خلیج پیدا کرتے اور جذبات نفرت و عناد دیکھتے تو ان کو خوب ابھارتے۔ عبیداللہ نے ایسا منصوبہ بنایا کہ فاتح اور مفتوح دونوں ہی کو اس خفیہ تحریک سے منسلک کر دیا۔ اس تحریک میں داخلہ کے مختلف مدارج تھے۔

۲۹۱ھ میں عبیداللہ کو ایک سرگرم مرید حمدان قرمط ہاتھ لگ گیا جس نے بعد میں علیحدہ تحریک قرامطہ چلائی۔ عبیداللہ نے اپنے مخصوص پروپیگنڈہ کے ذریعہ مغربی افریقہ کے نیم وحشی بربری قبیلہ کتاما میں اپنے متبعین کی کثیر تعداد فراہم کی اور ۳۰۲ھ میں مصر کو فتح کرنے کے لئے زبردست مہم بھیجی مگر خلافت عباسیہ کے عامل (مصر کے لشکر) کے مقابلہ میں ہزیمت اٹھائی۔

چوتھی اور پانچویں صدی ہجری میں عبیدیوں اور ان کی دشمن اسلام تحریک کو توہم پرست عوام میں مہدویت اور فاطمیت کے پروپیگنڈہ کی بدولت کامیابیاں حاصل ہوئیں اسی زمانہ میں اہل سنت کے اکابر علما نے عبیدیوں کے ادعا کا پول کھولا اور ان کے ملحدانہ عقیدہ کا پردہ فاش کیا۔ علامہ ابن کثیر کے مطابق بغداد کے علماء نے مصر کے عبیدی حکمرانوں کے دعویٰ کی کہ فاطمی نسب سے ہیں تردید کی اور متفقہ طور پر محضر تیار کیا جس میں ثابت کیا گیا کہ عبیدیوں کا کوئی واسطہ حضرت علیؓ کی اولاد کے کسی گھرانہ سے نہیں اور نہ ہاشمیوں، علویوں کا کوئی گھرانہ فاطمیین کو پہچانتا ہے۔

عبیدیوں کے فاطمی نسب سے ہونے کا انکار عباسی خلفاء نے اور قرطبہ (اندلس) کے بنی امیہ نے یکساں طور پر کیا۔ حالانکہ عباسیوں نے ان علوی مدعیوں کے نسب کا انکار نہیں کیا جو ان کے خلاف علم بغاوت بلند کرتے رہتے تھے۔ یعنی علوی صحیح النسب ہونے کی وجہ سے محض سیاسی اسباب کی بناء پر عباسیوں نے علویوں کے نسب کا انکار نہیں کیا۔

دعوت عبیدیہ کا ایک پرجوش داعی ابو عبداللہ الشیعی تھا وہ یمن میں قرامطہ کے استیصال سے کچھ پہلے اپنے بھائی ابوالعباس کے ساتھ ۲۸۰ھ میں شمال مغربی افریقہ جاکر وہاں کے بربری قبائل میں اپنا کام شروع کیا اور پندرہ سال کی مسلسل کوشش کے بعد سیاسی اقتدار حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ ۲۹۶ھ میں اس نے میمون القدح

کے پوتے کو ملک شام میں بلاکر عبیداللہ المہدی کی حیثیت سے ظاہر کیا۔ کچھ ہی عرصہ میں ابو عبداللہ الشیعی اس سے منحرف ہوگئے۔ لیکن ان کی بغاوت ناکام ہوئی عبداللہ المہدی نے دونوں بھائیوں کو اور ان کے بعض ساتھیوں کو قتل کرواکر اپنے سیاسی اقتدار کو ابتداً شمالی مغربی افریقہ اور پھر مصر میں مستحکم کیا۔ اس طرح فاطمیین کی حکومت اور "دعوت فاطمیہ" کا آغاز ہوا جو اسلامی خلافت کے حریف تھے۔

صحیح النسب فاطمیوں سے اس خلافت کو کوئی تعلق نہ تھا۔ قرامطہ کی طرح اسماعیلیہ کے بیشتر قائد ایرانی مجوسی تھے لیکن ان میں سے متعدد نے فاطمی نسب کا دعویٰ کیا اور خود کو مہدی کہا۔ یحییٰ بن ذکرویہ بن مہرویہ نے خود کو محمد بن عبداللہ بن اسماعیل بن جعفر الصادق بتایا۔ چنانچہ وہ اور اس کے متبعین فاطمی کہلانے لگے۔ اظہار نسب کے لئے فاطمیت کی یہ اصطلاح ان ہی اشخاص نے اختیار کی جن کا کوئی تعلق علیؓ و فاطمہؓ کی اولاد سے نہ تھا۔ اسی طرح عبیداللہ بن میمون القداح کی اولاد نے اپنے کو عبداللہ (جعفرصادق بن محمد الباقر کے فرزند) سے منسوب کیا۔

دولت عبیدین ۲۷۰ سال تک قائم رہی۔ ابتداً افریقہ میں حکومت قائم ہوئی پھر مصر پر قابض ہوکر انھوں نے قاہرہ کو دارالسلطنت بنایا۔ عبیدین کی حکومت شیعی (اسماعیلی) حکومت تھی لیکن نسباً وہ علوی حکومت نہ تھی۔ ان ہی کو باطنیہ بھی کہتے ہیں ان کی ایک شاخ فارس کی وہ حکومت تھی جو حسن بن صباح نے قائم کی تھی۔ جس کا دارالحکومت قلعہ الموت تھا۔ حسن بن صباح کی حکومت کو فدائیوں کی حکومت بھی کہتے ہیں۔ وہ بھی علوی نہ تھے۔

عبیدین کی حکومت میں ہزارہا مسلمان اس لئے قتل ہوئے کہ وہ صحابہ کرام کو برا نہ کہتے تھے۔ عبیدین نے اسلام کو اور اسلام کی مرکزی قوت کو کافی نقصان پہنچایا ان کا کوئی کارنامہ ایسا نہیں ہے جس کو پسندیدہ کہا جاسکے۔ بعض علما نے عبیدین کو خارج از اسلام اور مرتد قرار دیا۔ عزیز عبیدی نے عالم الغیب ہونے کا دعویٰ کیا۔ یہ لوگ شراب خوری کو جائز سمجھتے تھے۔ اسی قسم کی بہت سی باتیں ان کے عہد میں پائی جاتی تھیں۔

جب ۷۰ھ میں عمادالدین زنگی نے عیسائیوں پر حملہ کیا اور صلاح الدین کو جو

اس وقت مصر میں موجود تھا لکھا کہ تم مصر سے فوج لے کر دشمن پر پشت سے حملہ کرو۔ عین اس وقت جب صلاح الدین نے کوچ کا ارادہ کیا فاطمیوں نے عیسائیوں سے ساز باز کرلی۔ صلاح الدین کو فاطمیین کا اصل رنگ معلوم ہوگیا۔ اس کے نتیجہ میں صلاح الدین نے فاطمیین کی حکومت کو ختم کیا۔ جس کے بعد ہی ۵۸۰ھ میں بیت المقدس پر صلاح الدین کا قبضہ ہوسکا۔

(کتاب "تحقیق سید و سادات" سے اقتباس)

فدک

فدک ہجرت کے ساتویں سال رسول اکرمؐ کو صلح کے ذریعہ بطور فئے ملا تھا۔ یہ خیبر میں ایک گاؤں ہے جو مدینہ سے دو روز کی راہ پر اور خیبر سے ایک منزل پر ہے۔ یہاں کے باشندے یہودی تھے۔ جب خیبر فتح ہوا تو ان لوگوں نے رسول اکرمؐ کے پاس کہلا بھیجا کہ آپ ہمیں امان دیں ہم شہر چھوڑ کر چلے جائیں گے۔ اس بات کو رسول اکرمؐ نے قبول کیا۔ اس طرح یہود کا نصف علاقہ بغیر لڑائی کے رسول کرمؐ کے قبضہ میں آیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ بغیر جہاد کے کفار کا علاقہ مع اموال مسلمانوں کے قبضہ میں آیا۔ جب اس کی تقسیم کا سوال پیدا ہوا تو اس پر اللہ تعالی نے سورہ انفال کی پہلی آیت حکم دیا کہ تم سے انفال کے متعلق پوچھتے ہیں۔ کہو یہ انفال تو اللہ اور اس کے رسول کے ہیں۔

انفال جمع ہے نفل کی۔ نفل اس کو کہتے ہیں جو واجب یا حق سے زائد ہو۔ جب یہ بندے کی طرف سے ہو تو اضافت ہوتی ہے اور اللہ کی طرف سے ہو تو ایسا انعام ہے جو اللہ اپنے بندے کو اس کے حق میں زائد دیتا ہے۔ اس کو انفال قرار دینے کا یہ مطلب لیا جاتا ہے کہ اس کا نصف حصہ اللہ کے لئے اور نصف رسول کے لئے ہے درست نہیں۔ بلکہ یہ مطلب ہے کہ وہ اللہ کا مال ہے اور رسول اس کے امین ہیں۔ چنانچہ فدک کی پیداوار سے رسول اکرمؐ بہ حیثیت سربراہ اپنا معمولی خرچ نکالتے اور

باقی سب ہتھیاروں اور مسلمانوں کی دوسری اجتماعی ضروریات پر خرچ کرتے اس طرح فدک مسلمانوں کی سرکاری ملک تھی ۔ جسے مسلمانوں میں تقسیم کرنے کے بجائے رسول اکرمؐ کی امانت میں دیا گیا تھا۔

فئے اس غنیمت اور خراج کو کہتے ہیں جو مسلمانوں کو کفار کے اموال سے بغیر جہاد کے حاصل ہوئی ہو ۔ اصل میں فئے کے معنیٰ رجوع یا واپسی کے ہیں ۔ گویا مال اصل میں مسلمانوں کا ہی تھا ان ہی کی طرف لوٹ آیا۔ غرض فئے رسول اکرمؐ کی ملک ان معنوں میں نہ تھا جن معنوں میں ایام جاہلیت یا دنیوی حکمرانوں کے نزدیک خانگی ملک کا تصور ہوتا ہے ۔ فدک کسی طرح رسول اکرمؐ کا ذاتی متروکہ یا میراث نہ تھی ۔ اگر اس کو میراث تصور کیا جائے تو رسول اکرمؐ کا طریقہ اور دوسرے دنیوی حکمرانوں کے طریقہ میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ اسی لئے رسول اکرمؐ کے بعد ایسے تمام اموال کے ساتھ فدک بھی خلیفہ یا امیر المومنین کی امانت یا تولیت میں گیا۔

بعض دور اندیش شیعوں نے حضرت فاطمہؓ کے مبینہ دعویٰ فدک کو میراث پر محدود رکھنا مناسب نہ جان کر بیان کیا ہے کہ یہ فاطمہؓ کے نام پر ہبہ کیا گیا تھا حالانکہ فدک پر رسول اکرمؐ کا قبضہ متولیانہ تھا نہ کہ مالکانہ ۔ ہبہ بغیر قبضہ مالکانہ کے ممکن نہیں ۔ اس طرح ہبہ کا دعویٰ بھی باطل ہو جاتا ہے ۔

فدک کے سلسلہ میں شیعوں کے مطابق حضرت فاطمہؓ نے دو دعویٰ کئے تھے ۔ اول یہ کہ رسول اکرمؐ نے فدک انہیں ہبہ کر دیا تھا اور وہ اس پر قابض و متصرف تھیں ۔ جب حضرت ابو بکرؓ خلیفہ ہوئے تو انہوں نے حضرت فاطمہؓ کے کارندے کو موقوف کر کے اس کی جگہ اپنا کارندہ مقرر کیا۔ اس پر فاطمہؓ حضرت ابو بکرؓ کے پاس آئیں اور دعویٰ کیا کہ فدک مجھے ہبہ کیا گیا تھا اور میں اس پر قابض تھی ۔ تم نے کیوں میرا قبضہ اٹھا دیا۔ اس پر حضرت ابو بکر صدیقؓ نے ان سے شہادت طلب کی ۔ حضرت فاطمہؓ نے حضرت علیؓ، حسینؓ اور ام ایمن کو شہادت میں پیش کیا۔ سب نے دعویٰ کی تائید میں شہادت دی ۔ لیکن ان کی شہادت کو رد کر دیا گیا اور فدک انہیں واپس نہ کیا۔ اس پر وہ خفا ہو گئیں اور میراث کا دعویٰ کیا۔

یہاں تصفیہ طلب امر یہ ہے کہ ہبہ اور میراث میں کونسا دعویٰ مقدم تھا۔

شیعی عالم مولانا دلدار علی نے اس ضمن میں بحث کی ہے اور لکھا ہے کہ :۔

اہل سنت کے بموجب ہبہ کا دعوی میراث کے بعد پیش کیا گیا اور امامیہ کہتے ہیں کہ پہلے ہبہ کا دعوی کیا گیا پھر میراث کا حالانکہ اہل سنت کے نزدیک کسی معتبر روایت سے ہبہ ثابت ہی نہیں اور نہ اہل سنت اس بات کو مانتے ہیں کہ حضرت فاطمہؓ نے ہبہ کا دعویٰ کیا تھا۔

سبائی اس بات کے مدعی ہیں کہ فدک حضرت فاطمہؓ کو ہبہ کیا گیا تھا۔ اس لئے بار ثبوت ان کے ذمہ ہے کہ وہ اہل سنت کی معتبر روایتوں سے اپنے دعویٰ کو ثابت کریں ۔ پھر ہمارے ذمہ ہے کہ جو کچھ اعتراضات حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ پر لگائے ہیں ان کا جواب دیں۔

شیعوں کی جتنی مشہور کتابیں اس بحث سے متعلق چوتھی صدی سے تیرہویں صدی تک لکھی گئیں ان میں کوئی ایسی بات نہیں جو عقلاً یا نقلاً شہادت میں پیش کرنے کے لائق ہو جو روایتیں بیان کی گئیں ہیں ان تمام کا سلسلہ ابو سعید پر ختم ہوتا ہے جو نہ صرف غیر معتبر و غیر ثقہ تھا بلکہ کاذب تھا۔ ابو سعید کے نام سے ایک عجیب دھوکہ دیا گیا ہے ۔ عام طور پر یہ شبہ ہوتا ہے کہ یہ ابو سعید ابو سعید خدری ہیں جو صحابی تھے ۔ حالانکہ یہ شخص ابو سعید کلبی ہے ۔ اس کے مختلف نام اور متعدد لقب (کنیتیں) ہیں ۔ کہیں حماد بن صائب کہلاتا ہے اور اس کی روایات ہرگز قابل لحاظ نہیں۔

تعجب ہے کہ شیعہ باغ فدک کے ہبہ کئے جانے کی بحث میں بڑے بڑے دعوے کئے لیکن ایک صحیح روایت بھی اہل سنت کی کتابوں سے پیش نہ کر سکے ۔ شیعوں کے پاس جو روائیتیں فدک کے ہبہ کئے جانے سے متعلق ہیں ان میں باہمی تناقص اور اختلاف ہے ۔ سبائی ۔ سورہ بنی اسرائیل کی آیت ۲۶ اور سورہ روم کی آیت ۳۸ وَاٰتِ ذَالْقُرْبیٰ حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْن ..... کے حوالہ سے کہتے ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اکرمؐ نے حضرت فاطمہ کو بلایا اور کہا فدک ایسی جائداد ہے جس پر لشکر نے چڑھائی نہیں کی اور خاص میرا ہے ۔ مسلمانوں کا اس میں کوئی حق نہیں ۔ میں اللہ کے حکم سے یہ

جائیداد تمہیں دیتا ہوں تم اپنے اور اپنی اولاد کے لئے لے لو۔ یہ آیت قرآن میں دو جگہ آئی ہے اور دونوں سورے مکی ہیں۔ فدک تو (۷) ہجری میں رسول اکرم کے قبضہ میں آیا اس طرح ان آیتوں کو فدک سے جوڑ دینا درست نہیں۔ دوسرے یہ کہ ان آیتوں کا سیاق و سباق صاف بتلا رہا ہے کہ یہ خطاب (اگرچہ صیغہ واحد میں ہے) تمام امت سے عام ہے صرف رسول کی ذات سے مخصوص نہیں۔ اگر اس کو رسول اکرم کے ساتھ مخصوص کیا جائے تو سارا کلام مہمل اور بے معنی ہو جاتا ہے۔ تیسرے یہ کہ اگر ان آیتوں میں القربیٰ سے مراد فاطمہؓ اور حقہ سے مراد فدک لیا جائے جیسا کہ سبائی لیتے ہیں تو ثابت ہوتا ہے کہ رسول اکرم نے اس حکم کی پوری تعمیل نہیں کی کیونکہ ذوالقربیٰ کے ساتھ مساکین، اور ابن سبیل کا بھی ذکر ہے۔ پھر ذالقربیٰ کا لفظ قرآن میں ۱۶ مرتبہ آیا ہے صرف ان ہی دو آیتوں میں فاطمہؓ کیوں مراد لیا جائے؟

یہ بات بھی ہرگز قرین قیاس نہیں کہ رسول اکرمؐ نے فدک جس کی آمدنی چوبیس ہزار بتائی جاتی ہے حضرت فاطمہ کو دے دی ہو۔ اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ فدک حضرت فاطمہ کے قبضہ میں تھا۔

سبائی روایتوں کا زیادہ تر مضمون یہ ہے کہ حضرت فاطمہ فدک کے دعویٰ میں حق پر تھیں اور ان کا مانع اور شہادت کا طلب کرنے والا خطا پر مگر کوئی صحیح روایت پیش نہیں کی گئی جس سے یہ ثابت ہو کہ حضرت فاطمہؓ نے فدک کے ہبہ کا دعویٰ کیا اور اس پر شہادت طلب کی گئی۔ البتہ دو بے سروپا روایتیں کی گئی ہیں اور ان کی نسبت یہ بھی نہیں لکھا کہ وہ کس کتاب سے لی گئی ہیں۔

پہلی روایت یہ ہے کہ جب حضرت علیؓ نے حضرت فاطمہؓ کی طرف سے گواہی دی تو حضرت ابو بکرؓ نے ان کو فدک دینے کو لکھ دیا لیکن حضرت عمرؓ نے اس پر اعتراض کر کے حکم کو چاک کر دیا۔

جب عمر بن عبدالعزیز خلیفہ ہوئے تو انہوں نے فدک آل فاطمہؓ کو لوٹا دیا اور والیٔ مدینہ کو لکھ بھیجا کہ فدک کو اولاد فاطمہؓ و علیؓ پر تقسیم کر دے، بنوامیہ نے شور مچایا اور کہا کہ تم نے شیخین کے فعل کی حقارت کی تو عمر بن عبدالعزیز نے کہا تم لوگ کچھ نہیں جانتے اور میں جانتا ہوں۔ مجھ سے ابو بکر محمد بن عمر بن حزوم یہ روایت

بیان کی کہ رسول اکرم نے فرمایا کہ:

فاطمہ میری جگر پارہ ہے۔ جس سے اس کو رنج پہنچے اس سے مجھ کو رنج پہنچتا ہے۔

پھر عمر بن عبدالعزیز نے کہا فدک ابو بکر و عمرؓ کے زمانہ میں کسی کا نہ تھا پھر مروان اس کا مالک ہوا۔ اس نے میرے باپ عبدالعزیز کو ہبہ کر دیا۔ اس کے وارث میں اور میرے بھائی ہوئے۔ میرے بھائیوں میں سے بعض نے اپنا حصہ مجھے فروخت کر دیا اور بعض نے مجھے ہبہ کر دیا۔ میں کل کا مالک ہو گیا۔ میں نے بہتری اسی میں دیکھی کہ اس کو اولاد فاطمہ پر لوٹا دوں۔ لوگوں نے مشورہ دیا کہ اصل اپنے قبضہ میں رہنے دو اور پیداوار کو تقسیم کرا دو۔ عمر بن عبدالعزیز نے ایسا ہی کیا۔ ان روایتوں کی کوئی سند نہیں۔ اس لئے قابل قبول نہیں۔

شیعوں کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ شہادت کے رد ہونے کے بعد حضرت علی چالیس دن تک حضرت فاطمہؓ کو مہاجرین و انصار کے یہاں لئے لئے پھرے کوئی اور دوسری کارروائی نہیں کی۔ جب فاطمہ معاذ بن جبل سے گفتگو کر کے اور ان سے خفا ہو کر چلی آئیں تب حضرت علی نے انہیں حضرت ابو بکرؓ کے پاس بھیجا۔ وہاں حضرت عمر نے حضرت ابو بکر کا لکھا ہوا حکم چاک کر دیا اور حضرت فاطمہ کے شکم پر نعوذ باللہ لات ماری جس سے محسن کا حمل ساقط ہوا۔ اس کے بعد (۷۵) دن تک حضرت فاطمہ بیمار رہیں اور ان کی وفات ہوئی۔

یہاں یہ بات بالکل سمجھ میں نہیں آتی کہ شیر خدا نے جو ذرا سی بات پر ایسے غضبناک ہو جائیں کہ سر اڑانے میں بھی دریغ نہ کریں کیوں سکوت اختیار کیا۔ اس سلسلہ میں جو روایتیں بیان ہوئی ہیں ان میں آپس میں کافی تضاد ہے۔ ایک روایت میں حضرت فاطمہؓ کے مشہور خطبہ کا ذکر ہے کہ جب حضرت فاطمہ حضرت ابو بکر کے پاس لوٹیں اپنے گھر پہنچیں تو وہاں حضرت علیؓ ان کا انتظار کر رہے تھے۔ حضرت فاطمہ نے ان پر غصہ کرنا شروع کیا اور نہایت غضب آمیز الفاظ میں فرمایا:

"پیٹ کے بچے کی طرح تم پردہ نشین ہو گئے ہو اور مایوس ڈرپوکوں کے مانند گھر میں بھاگ آئے ہو۔ دنیا کے بہادروں کو تم خاک پر سلا چکے ہو لیکن اب نامردوں

سے مرعوب ہوگئے ہو۔ابو قحافہ کا بیٹا میرے بچوں کی معیشت زد کئے ہوئے ہے اور تم ٹس سے مس نہیں ہوتے وغیرہ وغیرہ۔

یہ خطبہ دو جزو سے کم نہیں اور فصاحت اور بلاغت میں شیعوں کے نزدیک قرآن مجید کے ہم پلہ کہا گیا ہے صحابہ کے ظلم و ستم کا گویا پورا نقشہ ہے۔لیکن تعجب ہے کہ اس خطبہ میں حضرت فاطمہؓ نے سب سے زیادہ ضروری بات یعنی ہبہ کا ذکر نہ کیا۔ شیعوں کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت فاطمہ تین مرتبہ حضرت ابو بکرؓ کے پاس گئیں پہلی مرتبہ تو یہ خبر پاکر کہ ان کا کارندہ فدک سے نکال دیا گیا۔دوسری مرتبہ حضرت علیؓ کے کہنے پر اور تیسری مرتبہ حضرت علیؓ کے یہ کہنے پر کہ جب ابو بکر تنہا ہوں تب جاؤ کہ وہ دوسرے کی نسبت زیادہ رحم دل ہیں۔

حضرت فاطمہؓ کے خطبہ میں جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے اس سے نہ صرف فدک کے دعویٰ پر اثر پڑتا ہے بلکہ حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہ کی عصمت کے دعویٰ پر بھی اثر پڑتا ہے اس خطبہ سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ جن روایتوں میں بیان کیا گیا ہے کہ حضرت علیؓ فدک کے معاملہ میں شیخین کے پاس گئے اور ان سے تلخ بات چیت ہوئی وہ سب جھوٹی ہیں۔

سبائیوں نے شیخین (یعنی حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ) کی مخالفت کے لئے یہ افسانہ گھڑا ہے کہ انہوں نے حضرت فاطمہ کا حق غصب کیا اور باغ فدک جس کی وہ وارث تھیں ان کو نہیں دیا۔اگر یہ سب باتیں جو اہل تشیع حقوق اہل بیت کے غصب کے متعلق بیان کرتے ہیں صحیح سمجھی جائیں تو تمام مہاجرین و انصار یعنی کل اصحاب نبوی کا اسلام، اخلاق، بلکہ انسانی صفت سے بے بہرہ ہونا ثابت ہوتا ہے۔کیوں کہ اگر وہ تمام شیخین کو غصب حقوق سے باز رکھتے اور ان کے شریک و معین نہ ہوتے تو صرف یہ دو حضرات یا ان کے چند ساتھی ایسی جرات کیوں کر کر سکتے تھے۔لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس افسانہ کے پس پردہ مقصد ہی صحابہ کرامؓ پر سخت ترین الزام عائد کرنا ہے۔

فدک کے سلسلہ میں یہ بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت عمر نے حضرت فاطمہؓ کو جسمانی ایذائیں پہنچائیں۔انہیں طمانچے لگائے، لاتیں ماریں اور محسن کو شہید کیا۔یہ

باتیں جو شیعہ بیان کرتے ہیں اگر درست مان لی جائیں تو ان پر حضرت علیؓ کا سکوت کرنا جائز نہ تھا۔اس کا جواب شیعہ یہ دیتے ہیں کہ حضرت علی کے لئے اللہ کا حکم ہی تھا لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ایک روایت کے بموجب جب حضرت ابو بکرؓ نے فدک سے حضرت فاطمہ کے کارندے کو موقوف کرکے اس کی جگہ اشجاع کو مقرر کیا اور اس شخص نے رعایا کو ستایا اور حضرت علی کے پاس اس کی فریاد ہوئی تو حضرت علی کو ایسا غصہ آیا کہ چند عزیزوں کے ہمراہ وہاں گئے اور اس کو بلاکر قتل کرا دیا اور اس موقع پر خالد بن ولید سے ایسی گفتگو کہ ان کے بدن پر لرزا آگیا اور انہوں نے منت سماجت کرکے پیچھا چھڑایا۔حضرت علی کی زندگی میں ایسے بہت سے واقعات ہیں جہاں انہوں نے اللہ تعالیٰ کے مبینہ حکم کی تعمیل نہ کی یعنی ان مواقع پر جہاں شرعاً و عقلاً غضب ظاہر کرنے کی ضرورت تھی انہوں نے ایسا تحمل فرمایا کہ جو انسانی طاقت سے باہر ہے مگر دوسرے موقعوں پر جو نسبتاً معمولی تھے انہوں نے ایسی اسداللہی دکھائی کہ زمین و آسمان لرز گئے۔ان واقعات کی توجیہ سوائے اس کے کچھ نہیں کہ جو مختلف روایتیں سبائیوں کے یہاں پائی جاتیں ہیں محض بے بنیاد ہیں اور ہر موقع اور محل کے مناسب بنائی گئی ہیں جو الف لیلیٰ کی کہانیوں سے کچھ کم نہیں۔

(ماہنامہ الحق جنوری و فبروری ۱۹۸۸ء اور روایت فدک کا تجزیہ سے اقتباس)

فرضی نمازیں

صوفیا نے ہر ہر دن کے لئے علحدہ علحدہ نمازیں وضع کی ہیں۔جنہیں السبوعی یعنی ہفتہ واری نمازیں کہا جاتا ہے۔اسی طرح ہر ماہ کی نمازیں جداگانہ ہیں اور حولی یعنی سالانہ نمازیں ہیں جو مخصوص راتوں کے لئے علحدہ علحدہ وضع ہوئی ہیں۔ان کی تفصیل غنیۃ الطالبین اور تصوف کی دیگر کتابوں میں موجود ہے۔ان کی بنیاد ابو طالب مکی، غزالی، اور عبدالقادر جیلانی جیسے حضرات نے ڈالی یا کم از کم ان کے ناموں کو استعمال کیا گیا۔ان نمازوں کو سنت رسول بتایا گیا اور کہا گیا کہ رسول اکرمؐ نے رجب و شعبان میں صلوۃ الالفیہ ادا کی۔ان نمازوں سے متعلق ساری

حدیثیں اور روایتیں وضعی ہیں ۔ جو کوفی اور عجمی اختراع سے زیادہ نہیں ۔ جو ان نمازوں کو غیر مشروع جان کر بھی پڑھے وہ مشرک اور بدعتی ہے اس طرح نمازوں کے تعداد پانچ کی بجائے سینکڑوں میں تبدیل ہو گئی ۔ گویا یہ صوفیہ اللہ تعالیٰ کے اس فیصلہ پر راضی نہیں کہ نمازوں کی تعداد پچاس سے کم کر کے پانچ کیوں کی گئی ۔

غزالی اور شیخ عبدالقادر جیلانی کے نام درمیان میں آنے سے عام مسلمانوں کو یہ غلط فہمی پیدا ہو گئی کہ یہ نماز میں مستحب ہیں ۔ اس بدعت کو سب سے پہلے ابن ابی الحمراء نے ۴۴۸ھ میں جاری کیا ۔ یہ شخص نابلس کا رہنے والا تھا ۔ اس نے اولاً یہ نماز تنہا پڑھی ۔ پھر دوسرے اس کی اقتدا کرنے لگے ۔ شیخ عبدالقادر جیلانی (وفات ۵۶۱ھ لکھتے ہیں :۔

وہ نماز جو نصف شعبان میں وارد ہے وہ سو رکعت نماز ہے ۔ جس میں ایک ہزار بار سورہ اخلاص پڑھی جائے گی ہر رکعت میں دس مرتبہ ۔ اس نماز کو "صلوۃ الخیر" کہتے ہیں ۔ اس کی برکات پھیلی ہوئی ہیں ۔ اور سلف صالح اس نماز کو جماعت کے ساتھ پڑھتے اور اس کے لئے جمع ہوتے ۔ اس میں بہت بڑی فضیلت اور بہت بڑا ثواب ہے ۔"

امام ابن الجوزی (وفات ۵۹۷ھ) نے "موضوعات کبیر" میں ایک نماز کا ذکر کر کے اس پر جرح کی ہے ۔ رسول اکرمؐ نے حضرت علیؓ سے فرمایا :۔

اے علیؓ جس نے نصف شعبان کی شب میں سو رکعت نماز پڑھی اور ہر رکعت میں سورہ فاتحہ اور سورہ اخلاص دس بار پڑھی ، اللہ اس کی ہر وہ حاجت پوری فرماتا ہے ، جو وہ اس رات کو طلب کرتا ہے ۔ پوچھا گیا ۔ یارسول اللہ اگر اللہ تعالیٰ نے اس انسان کو بدبخت بنایا ہو تو اسے نیک بخت بنا دے گا ۔ آپ نے ارشاد فرمایا :۔ قسم ہے اس ذات کی جس نے مجھے حق کے ساتھ نبی بنا کر بھیجا ۔ اے علیؓ لوح محفوظ میں لکھا ہے کہ فلاں فلاں بدبخت پیدا کیا گیا ۔ اللہ تعالیٰ اسے مٹا کر نیک بخت لکھ دیتا ہے ۔ اللہ تعالیٰ اس کے پاس ستر ہزار فرشتے بھیجتا ہے جو اس کے لئے نیکیاں لکھتے ، برائیاں مٹاتے اور اس کے درجات بلند کرتے ہیں ۔ آئندہ سال تک یہی ہوتا رہتا ہے وغیرہ وغیرہ

امام جوزی فرماتے ہیں :۔ اس حدیث کے موضوع ہونے میں کوئی شک نہیں ۔ اس کے تمام روایات مجہول ہیں اور چند ضعیف ہیں اور یہ حدیث محال قطعی ہے اکثر نماز پڑھنے والوں کو دیکھا گیا ہے ، جو اس کی تعداد پوری کرنا چاہتے ہیں تو صبح ہو جاتی ہے ۔ (۱) ۔ اور صلوۃ فجر فوت ہو جاتی ہے اور صبح کو ان لوگوں پر سستی چھا جاتی ہے ۔ مساجد کے جاہل اماموں نے یہ نماز صلوۃ الرغائب اور اس قسم کے دوسری نمازوں کو عوام کے پھانسنے کا ایک جال بنا رکھا ہے اور اپنے اقتدار کو قائم کرنے کی خواہش اس قسم کی باتوں سے پوری کرتے ہیں ۔

شعبان کی پندرھویں شب کو شام و عراق کے باشندے صلوۃ الالفیہ یعنی ہزارہ نماز پڑھتے تھے ۔ یہ سو رکعت کی نماز تھی ۔ ہر دو رکعت پر سلام پھیرا جاتا اور ہر رکعت میں سورہ فاتحہ کے بعد سورہ اخلاص دس مرتبہ پڑھی جاتی ۔ بعض لوگ سو رکعت کے بجائے صرف دس رکعت پڑھتے اور ہر رکعت میں سو مرتبہ سورہ اخلاص پڑھتے ۔

امام غزالی نے "احیاء العلوم" میں لکھا ہے کہ رسول اکرم یہ نماز جماعت کے ساتھ پڑھا کرتے تھے اور اسے صلوۃ الخیر کہتے تھے ۔ پھر حسن بصری سے یہ غلط روایت بیان کی ہے انہوں نے کہا ہے کہ مجھ سے تیس سے زائد اصحاب رسول نے بیان کیا جو کوئی یہ نماز پڑھے اللہ تعالیٰ اس کی طرف ستر مرتبہ نظر ڈالتا ہے ۔ اور ہر نظر میں اس کی ستر حاجتیں پوری کرتا ہے ۔ جس میں سے ایک ادنیٰ حاجت مغفرت ہے ۔

تعجب تو غزالی پر ہے کہ وہ فقہ شافعیہ کے پیرو ہیں ۔ ان کو بھی ان نمازوں میں کوئی فقہی نقص نظر نہیں آیا ۔ حالانکہ چاروں آئمہ کے مسلک میں جماعت کے ساتھ نوافل ادا کرنا جائز نہیں ۔ اسی قسم کی ایک نماز صلوۃ الاوابین ہے ۔ جس کی صوفیہ پابندی کرتے ہیں ۔ یہ بعد مغرب بیس رکعت ہیں ۔ اور ان سب سے زیادہ مشرکانہ وہ نماز ہے جو شیخ عبدالقادر جیلانی کی نیت سے پڑھی جاتی ہے جس کو صلوۃ الغوثیہ کہتے ہیں ۔

صلوۃ الرغائب ایسی نماز ہے جو صوفیا کی اکثر کتابوں میں پائی جاتی ہے ۔ اس کا واضع علی بن عبداللہ بن جہضم ہے جو ایک مشہور صوفی تھا ۔ یہ "بہجتہ الاسرار" کا مصنف ہے جو تصوف کی اہم کتاب سمجھی جاتی ہے ۔ شیخ عبدالقادر جیلانی نے اسی سے ایک

روایت نقل کی ہے۔رسول اکرمؐ نے فرمایا:۔

رجب اللہ کا مہینہ، شعبان میرا مہینہ اور رمضان میری امت کا مہینہ ہے۔

دریافت کیا گیا اللہ کے مہینے سے کیا مراد ہے۔فرمایا:۔یہ مہینہ مغفرت کے ساتھ مخصوص ہے۔اس میں خونوں کا بدلہ لیا جاتا ہے۔اسی ماہ میں اللہ تعالیٰ نے انبیاء کی توبہ قبول کی اور اپنے اولیاء کو دشمنوں سے بچایا(یہاں لفظ نقص لکھا ہے جس کے معنی بچانے کے نہیں توڑنے کے ہیں۔اولیاء سے مراد شیعہ ہیں اور دشمنوں سے مراد امیر معاویہؓ ہیں جن کا انتقال ماہ رجب میں ہوا۔) جس شخص نے رجب کے روزے رکھے اس کے لئے اللہ تعالیٰ پر تین چیزیں لازم ہوں گی۔گذشتہ گناہوں کی مغفرت، باقی عمر گناہوں سے عصمت اور روز حساب پیاس سے محفوظ رکھنا۔

ایک کمزور بوڑھے نے عرض کیا۔میں تمام ماہ کے روزے رکھنے سے عاجز ہوں آپ نے فرمایا:۔یکم، پندرہ اور آخری دن کا روزہ رکھو۔پورے ماہ کے روزوں کا اجر ملے گا لیکن رجب کے پہلے جمعہ کی شب سے غافل نہ رہو۔فرشتوں نے اس کا نام رغائب رکھا ہے۔جب تہائی رات گذر جاتی ہے زمین اور آسمان کے فرشتے کعبہ میں یا اس کے ارد گرد جمع ہوتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان پر طلوع فرماتا ہے اور کہتا ہے تم جو چاہو مجھ سے سوال کرو۔وہ عرض کرتے ہیں۔اے پروردگار! رجب کے روزے رکھنے والے کی مغفرت فرما دیجئے۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔میں نے ان کی مغفرت کی۔

پھر رسول اکرم نے فرمایا:۔جو شخص رجب کی پہلی جمعرات کا روزہ رکھے اور جمعہ کی شب میں مغرب وعشاء کے درمیان بارہ رکعت نماز پڑھے۔ہر رکعت میں سورہ فاتحہ ایک بار سورہ قدر تیرہ بار اور سورہ اخلاص بارہ بار پڑھے اور ہر رکعت پر سلام پھیرے اور نماز سے فارغ ہو کر مجھ پر ستر مرتبہ درود پڑھے، پھر سجدہ کرے اور سجدہ میں ستر مرتبہ سبوح، قدوس، رب الملائکۃ والروح پڑھے۔پھر اپنا سر اٹھا کر یہ دعا پڑھے:۔

اے رب مغفرت فرما اور رحم فرما اور ان گناہوں سے در گذر فرما جنہیں آپ جانتے ہیں۔پھر دوسرا سجدہ کرے۔پھر دوسرے سجدے میں بھی اسی طرح دعا کہے۔پھر سجدہ میں اللہ تعالیٰ سے اپنی حاجت کا سوال کرے تو وہ سوال پورا کیا جاتا ہے۔

ان فرضی نمازوں کی معنوی حیثیت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دراصل اس قسم کی روایات اسلام کا مذاق اڑانے کے لئے وضع کی گئی ہیں۔مثلاً:۔

۱۔شب برات میں سو رکعت نفل ادا کرنے سے بدبخت انسان سعادت مند ہو جاتا ہے حالانکہ سعادت عمل صالح پر موقوف ہے اور یہ بھی شرط ہے کہ مرتے دم تک عمل صالح پر قائم رہے۔اس کے بعد بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت پر موقوف ہے یعنی عمل صالح سے ایک ظن غالب تو ضرور پیدا ہوتا ہے لیکن اسے یقینی اور لازمی ذریعہ تصور نہیں کیا جاتا۔محض ایک رات کی نوافل سے ہمیشہ کی سعادت کیسے حاصل ہوگی۔

اس نماز کو ادا کرنے والے کے لئے ستر ہزار فرشتے نیکیاں لکھتے رہتے ہیں۔برائیاں مٹاتے رہتے ہیں اور درجات بلند کرتے رہتے ہیں اور یہ سلسلہ آئندہ شب برات تک جاری رہتا ہے۔اس کا یہی مطلب ہوا کہ اگر کوئی شخص پورے سال بھی گناہ کرتا رہے، تب بھی اس کا فائدہ ہی فائدہ ہے۔حالانکہ برائیاں مٹانا اور درجات بلند کرنا فرشتوں کا نہیں اللہ تعالیٰ کا فعل ہے۔ونیز اعمال لکھنے والے فرشتے صرف دو بیان کئے جاتے ہیں "یعنی کراماً کاتبین" (سورہ المطففین)

جب ہم موضوعات پر غور کرتے ہیں تو بکثرت روایات میں ستر کا عدد نظر آتا ہے۔جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان روایات کا وضع کرنے والے کسی خاص نقطہ نظر سے تعلق رکھتے ہیں اور یہ بھی ظاہر ہوتا ہے یہ اول درجہ کے زندیق ہیں جن کا مقصود اسلام کی بیخ کنی ہے۔

فرائض کا درجہ نوافل سے بڑھ کر ہے۔جب کسی فرض کے بارے میں رسول اکرم نے اس قسم کا کوئی ارشاد نہیں فرمایا تو نوافل پر اتنا اجر کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔"نوافل" میں سب سے اعلیٰ مقام شب قدر کی نوافل، تراویح اور تہجد کا ہے لیکن ان میں سے کسی کے بارے میں رسول اکرمؐ نے اس قسم کی کوئی بات نہیں فرمائی۔

"شب قدر" کی عبادت کے سلسلہ میں صرف اتنا فرمایا:۔

"جس نے رمضان میں ایمان لاتے ہوئے ثواب کی نیت سے قیام کیا۔اس کے گذشتہ گناہ معاف کر دئے جاتے ہیں۔"

جس شب کی فضیلت قرآن نے بیان کی اس کے متعلق رسول اکرمؐ نے صرف ایک جملہ پر اکتفا فرمایا لیکن جس رات کی فضیلت کا کوئی ثبوت ہی نہیں اس کے لئے کیسی کیسی خرافات وضع کی گئیں۔

اگر کوئی فرض ترک ہو جائے تو اس کا گناہ بندے کے ذمہ ساقط نہیں ہوتا۔ چہ جائیکہ خود ساختہ فرضی نفلوں سے سال بھر کی نیکیاں لکھی جانا اور گناہوں کا مٹایا جانا یہ خلاف عقل ہے۔

وضعی روایات میں کہا گیا ہے کہ اس فرضی شب میں ان فرضی نمازوں کے پڑھنے سے سو شہیدوں کا اجر ملتا ہے۔ ابتدائی دور میں مسلمانوں کے تمام رعب اور دبدبہ کا دارومدار جہاد پر تھا۔ ان فرضی نمازوں کے ذریعہ جہاد کی جڑیں کاٹی گئیں۔ یہ فرضی نمازیں مثلاً **صلوۃالخیر** ، **صلوۃالرغائب** ، **صلوۃالاوابین** ، اور **صلوۃالغوثیہ** وغیرہ جیسا کہ محدثین نے بیان کیا ہے ۴۴۸ھ میں بیت المقدس میں وضع کی گئیں۔ اس طرح فرضی نمازوں اور چلہ کشی کا درس دے کر فریضہ جہاد سے غافل کیا گیا جس کے نتیجہ میں ۴۹۰ھ میں "بیت المقدس" پر عیسائیوں کا قبضہ ہو گیا۔ جو ان کا آخری قبضہ تھا ورنہ صلیبی جنگ کی ابتدا۔ تو اس سے پیشتر ہو چکی تھی۔

قادیانی ہی کافر کیوں

تصوف میں غیر اسلامی اثرات اتنے واضح ہیں کہ اہل علم اس سے انکار نہیں کر سکتے۔ اہل تصوف نے بعض ایسی موشگافیاں کی ہیں جو خطرناک مضمرات کی حامل ہیں۔ انھوں نے یونانی فلسفہ، عجمی نظریات، مشرکانہ عقائد کے زیر اثر بعض ایسے غیر اسلامی تصورات پیش کئے جو عہد رسالت، عہد صحابہ اور عہد تابعین میں مسلمانوں میں نہیں تھے۔ مولانا حافظ سید محمد علی حسینی (مولوی کامل جامعہ نظامیہ) نے اپنی مایہ ناز کتاب "قادیانی ہی کافر کیوں ؟" (مکان 16-7-43/123 B Class اعظم پورہ حیدرآباد ۲۴) میں بعض اہم باتوں کی نشاندہی کی ہے۔ اس کتاب کے چند اقتباسات درج ذیل ہے۔

شیخ محی الدین ابن عربی اور ان کے متبع عبدالوہاب شعرانی نے نبوت کی دو اقسام بتائی ہیں۔ تشریعی نبوت اور غیر تشریعی نبوت۔ ابن عربی نے نبوت کی تشریعی اور غیر تشریعی تقسیم کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو صرف تشریعی نبوت کا خاتم قرار دیا اور مزعومہ غیر تشریعی نبوت کو قیامت تک جاری و ساری بتایا۔ شعرانی نے ہر زمانے میں ایک زندہ و مجسم رسول کا وجود مانا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آنے والے اپنے مفروضہ رسولوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عین قرار دیا۔ ان دونوں کی اس وضاحت نے غلام احمد قادیانی کو یہ گنجائش فراہم کر دی کہ ایک طرف تو وہ کھل کر اپنے نبی و رسول ہونے کا دعویٰ کرتا ہے اور دوسری طرف عقیدہ خاتم النبیین پر اپنے اتنے رسوخ کا اظہار کرتا ہے کہ اس یقین و معرفت کا لاکھواں حصہ بھی دوسروں کو نہیں ملا۔

نبوت کی یہ تقسیم (تشریعی و غیر تشریعی) ابن عربی اور ان کے متبع عبدالوہاب

شعرانی کے دماغ کی اپج ہے ۔ "خاتم النبیین" والی آیت کے نزول کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایسا کوئی ارشاد نہیں ملتا جس میں آپ نے یہ واضح فرمایا ہو کہ یہاں تشریعی نبوت کا ختم مراد ہے اور غیر تشریعی نبوت تاقیامت باقی رہے گی ۔ اس آیت کے منکرین نے اپنے طور پر "خاتم النبیین" کے معنی متعین کرلیئے اور نبوت کی تشریعی اور غیر تشریعی تقسیم کرکے ایک طرف عقیدہ ختم نبوت پر اپنے رسوخ کا پرجوش اظہار کیا اور دوسری طرف اجراء نبوت کی راہ بھی نکال دی ۔

اس سے فائدہ اٹھاکر غلام احمد قادیانی نے خاتم الانبیاء کی صراحت کی کہ "حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی تشریعی نبی نہیں آئے گا ۔ غیر تشریعی نبی جو پہلے سے امتی ہو آسکتا ہے ۔ اس بناء پر میں امتی بھی ہوں اور نبی بھی" ۔ یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ ابن عربی اور شعرانی نے تو بے شمار اشخاص کی نبوت کی گنجائش نکالی ہے ۔ یہ اور بات ہے کہ غلام احمد قادیانی کے علاوہ اور کسی نے ایسا دعویٰ نہیں کیا ۔

بروز

اہل تصوف نے جو مشرکانہ عقائد و اعمال اور غیر اسلامی تصورات مسلمانوں میں رائج کئے ان ہی میں ایک اصطلاح "بروز" بھی ہے بروز کے معنی ذیلی یا زیر اثر کے ہیں اکثر بڑوں کی صورت، شکل، سیرت اور مزاج کا چھوٹوں پر اثر ہوتا ہے ۔

مولانا عبدالقدیر صدیقی نے "بروز" کے تعلق سے لکھا ہے :

"بروز کی تحقیق یہ ہے کہ اولیاء میں سے بعض کی فطرت کسی خاص نبی کی فطرت سے مشابہ ہوتی ہے ہرچند کہ اولیاء کرام کو انبیاء عظام کے کمالات کی سیر کرائی جاتی ہے اور اولیاء انبیاء کے رنگ میں رنگے جاتے ہیں یا یوں کہو کہ انبیاء کے کمالات کا پرتو ان پر پڑتا ہے یا یوں کہو کہ انبیاء کے صفات خاصہ ان میں ظہور و بروز کرتی ہیں مگر تکمیل سیر کے بعد ہر ایک اپنی فطری مناسبت کے اصلی مقام پر رہتا ہے

مثلاً حمیت دین والا ولی نوحی المشرب یا تحت قدم نوح یا مظہر نوح یا بروز نوح کہلاتا ہے ۔ رضا و تسلیم والا ابراہیمی المشرب، عشق و محبت والا موسوی المشرب، وحدت و فنائیت والا عیسوی المشرب اور عبدیت والا جو سب کو جامع ہے محمدی المشرب کہلاتا ہے ۔ بعض دفعہ کہہ دیتے ہیں کہ فلاں ولی میں فلاں نبی کا بروز ہوا ہے جیسے قمر میں شمس کا بروز ہوتا ہے الغرض نبی اصل اور ولی اس کی نقل ہوتا ہے" ۔

یہیں سے مدعی نبوت کو اپنا دعوئے نبوت منوانے کے لیے مواد فراہم ہوا ۔ غلام احمد قادیانی نے یہ جسارت کی : "دنیا میں کوئی نبی نہیں گزرا جس کا نام مجھے نہیں دیا گیا ۔ سو جیسا کہ براہین احمدیہ میں خدا نے فرمایا ہے میں آدم ہوں، میں نوح ہوں، میں ابراہیم ہوں، میں اسحاق ہوں، میں یعقوب ہوں، میں اسمعیل ہوں، میں موسیٰ ہوں، میں داؤد ہوں، میں عیسیٰ ابن مریم ہوں، میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہوں یعنی بروزی طور پر" ۔ (تتمہ حقیقت الوحی صفحہ ۸۴)

ظل

بروز کے ساتھ ایک چیز ظل بھی ہے ۔ ظل کے معنی سایہ اور عکس کے ہیں ۔ کوئی شخص آئینہ کے سامنے کھڑا ہو یا صاف پانی کے چشمے پر کھڑا ہو تو اس کا عکس آئینہ اور پانی میں نظر آتا ہے جو دیکھنے میں اپنی شکل، شباہت اور رنگت اور نقشہ کے لحاظ سے عین شخص ہوتا ہے ۔ اور واقعہ کے اعتبار سے غیر شخص ۔ صوفیاء کے نزدیک ظل کی صورت یہ ہے کہ خاص خاص اولیاء خاص خاص انبیاء کے رنگ میں رنگے جاتے ہیں اور انبیاء کے کمالات ان اولیاء میں جذب ہوجاتے ہیں ۔ جس کی بناء پر یہ اولیاء ان انبیاء کے تحت قدم، یا ان کے مظہر اور بروز ہوجاتے ہیں ۔ اس طرح ان میں شخص اور عکس، شئے اور ظل، اصل اور نقل کی صورت پیدا ہوجاتی ہے ۔ ظل اور بروز درحقیقت ایک ہی چیز ہے لیکن ان میں ایک خفیف سا فرق بھی ہے ۔ ولی کا نبی کے

رنگ میں رنگا جانا ظل ہے اور ولی سے نبی کے کمالات کا ظہور ہونا بروز ہے۔

جب صوفیاء کے نزدیک یہ ثابت ہے کہ اولیاء، انبیاء کے رنگ میں رنگے جاتے ہیں اور ان کے کمالات پوری طرح اپنے اندر جذب کر لیتے ہیں اور ان میں صرف شخص و عکس، اصل اور نقل کا فرق رہ جاتا ہے تو اس نظریہ کی روشنی میں غلام احمد قادیانی کے ذیل کے بیانات دیکھئے:۔

"میرا نام جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے نبی رکھا گیا ہے تو یہ ظلی امر ہے جو آپ کی متابعت کی برکات سے ہے"۔(ضمیمہ حقیقت الوحی)

"کوئی مرتبہ شرف و کمال کا اور کوئی مقام عزت اور قرب کا بجز سچی اور کامل متابعت اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم ہرگز حاصل نہیں کر سکتے ہمیں جو کچھ ملتا ہے ظلی اور طفیلی طور پر ملتا ہے"۔(ازالہ اوہام ۱۳۸)

"میں نبی اور رسول نہیں ہوں باعتبار نئے دعوے اور نئے نام کے اور میں نبی اور رسول ہوں یعنی باعتبار ظلیت کاملہ کے، وہ آئینہ ہوں جس میں محمدی شکل اور محمدی نبوت کا کامل انعکاس ہے"۔(نزول المسیح) "میں ظلی طور پر محمد ہوں"۔

غلام احمد قادیانی کے ان اقوال سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ صوفیاء کے نظریہ بروز و ظل ہی کی روشنی میں کہے گئے ہیں۔انھوں نے ایسا کوئی دعویٰ نہیں کیا جو صوفیاء کے نظریوں سے ہٹ کر یا مخالف ہو۔

جب صوفیاء نے ایک دروازہ کھول دیا ہے اور مسلمانوں نے اس کو برداشت کر لیا تو اب وہ اس پر قادر نہیں کہ اس میں صرف ان کی مرضی کے لوگ داخل ہوں۔دروازہ کھلے گا تو سب کے لیے کھلے گا اور بند ہوگا تو سب کے لیے بند ہوگا۔

قادیانی مبلغ حمید الدین شمس کا یہ کہنا کہ "(صوفیاء کے) ان تمام دعاوی کا جو جواب آپ دیں گے وہی جواب ہماری طرف سے حضرت مرزا صاحب کے لیے ہوگا"۔اپنی جگہ معقول ہی تو ہے۔

یہی حال غلام احمد قادیانی کے ان دعوؤں کا ہے جو مسیح موعود اور مہدی موعود ہونے کے تعلق سے ہیں۔شیعی نقطہ نظر کے حامل عبدالرزاق کاشانی نے تمام انبیاء کو اپنے مزعومہ "مہدی" کے تابع کہہ کر انبیاء سے افضل قرار دیا۔شیعہ اپنے بارہ اماموں کو بھی انبیاء سے افضل قرار دیتے ہیں۔ان ہی کے اقوال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے قادیانی بھی غلام احمد قادیانی کو نبی اور رسول قرار دیتے ہیں۔اہل سنت جماعت کا یہ حال ہے کہ انھوں نے قادیانیوں کو تو کافر قرار دیا ہے لیکن بارہ اماموں کے ناموں کے ساتھ "امام" اور "علیہ السلام" کہہ کر وہ شیعوں کے ہمنوا ہیں۔صوفیاء اور خاص طور پر ابن عربی اور عبدالوہاب شعرانی کے آگے ان کے سربصد عقیدت جھکے ہوئے ہیں۔

("قادیانی ہی کافر کیوں؟" سے اقتباس)

قبر پرستی

مسلمانوں نے دنیا میں توحید پرستی کو کامیابی سے اور قابل لحاظ حد تک نافذ کیا، لیکن یہ ایک ستم ظریفی ہے کہ خود مسلمانوں میں ایسی مشرکانہ رسومات آگئی ہیں جن سے توحید کی نفی ہوتی ہے۔ مسلمان بت پرستی تو نہیں کرتے لیکن عجیب عجیب تاویلات کی آڑ لے کر قبر پرستی کرتے ہیں جو بت پرستی ہی کی ایک بدترین شکل ہے۔

قبر پرستی کی کئی شکلیں ہیں۔ مزاروں پر سجدے کئے جاتے ہیں اور ان کو سجدہ تعظیمی کہہ کر اس کا جواز پیدا کیا جاتا ہے۔ قبروں کے اطراف طواف کیا جاتا ہے۔ اور ان کی طرف پشت نہیں کی جاتی۔ اہل قبور سے مرادیں مانگی جاتی ہیں اور یہ کہہ کر دل کو بہلایا جاتا ہے کہ دینے والا تو اللہ تعالیٰ ہے اہل قبور کا تو صرف توسط اختیار کیا جارہا ہے۔ قبروں پر درخواستیں لکھ کر آویزاں کی جاتی ہیں۔ اہل قبور کے نام سے منتیں مانی جاتی ہیں کہ اگر مراد حاصل ہوئی تو اہل قبور کے نام سے نیازیں کی جائیں گی اور قبور پر نذرانے چڑھائے جائیں گے۔ اہل قبور کے نام سے جانور ذبح کئے جاتے ہیں۔ کعبہ کے مماثلت میں قبور پر غلاف اور چادریں چڑھائی جاتی ہیں۔ قبور پر صندل لگایا جاتا ہے۔ پھول چڑھائے جاتے ہیں۔ اہل قبر کی برسی عرس کے نام سے منائی جاتی ہے۔ جس میں شرع کی خلاف ورزیاں کی جاتی ہیں۔ قبور پر گنبدیں تعمیر کی جاتی ہیں۔

ان تمام رسموں میں غیر مسلموں خصوصاً ہندوؤں کے طریقوں سے جو مماثلت ہے۔ اور شیعیت کا جو اثر ہے وہ صاف ظاہر ہے۔

جو مسلمان پیر پرستی میں غلو کرتے ہیں اور قبر پرستی اور مردہ پرستی کو اپنا شعار بنائے ہوئے ہیں ان کے تعلق سے اردو کے مایہ ناز رباعی گو شاعر حضرت احمد حسین امجد حیدرآبادی نے کیا خوب کہا ہے:۔

درگاہوں پر رکوع و سجدہ دیکھا   قبروں کا نشاں عرش سے اونچا دیکھا
مردہ بدست زندہ سنتے تھے مگر   زندوں کو بھی بدست مردہ دیکھا

ابن عساکر (وفات ۵۷۱ ہجری) نے حضرت ابی بن کعب سے ایک طویل

روایت کی ہے۔ جس میں یہ بھی ہے کہ رسول اکرم قبرستان کی جانب تشریف لے گئے آپ سجدہ میں فرمارہے تھے۔

"میں آپ کے عفو کے واسطہ سے آپ کی سزا سے، آپ کی رضا کے ذریعہ آپ کی ناراضگی سے اور آپ کے ذریعہ آپ کی ذات سے پناہ مانگتا ہوں۔ آپ کی تعریف بہت بڑی ہے۔ میں آپ کی ثنا نہیں کرسکتا وغیرہ"

یہ روایت بالکل فرضی ہے۔ حالانکہ رسول اکرم کا ارشاد ہے۔

"اللہ یہود و نصاریٰ پر لعنت بھیجے کہ انھوں نے اپنے انبیاء اور بزرگوں کی قبروں کو سجدہ گاہ بنالیا۔ میں تمہیں اس سے منع کرتا ہوں" (بخاری، مسلم، نسائی)

رسول اکرم کے احکام کو حالی نے مسدس مدوجزر اسلام میں یوں نظم کیا ہے

بنانا نہ تربت کو میری صنم تم   نہ کرنا مری قبر پر سر کو خم تم

ایک اور حدیث ہے:۔

"مقبرہ اور حمام کے علاوہ تمام زمین سجدہ گاہ ہے" (ترمذی، مشکوٰۃ، ابو داود)

ایک اور حدیث ہے:۔

"رسول اکرم نے سات مقامات پر صلوۃ ادا کرنے کی ممانعت فرمائی۔(۱) وہ جگہ جہاں کیچڑ ہو یا (۲) کچرا وغیرہ ڈالا جاتا ہے۔(۳) قبرستان (۴) درمیان راہ (۵) حمام (۶) اونٹ (جانور) باندھنے کی جگہ اور (۷) بیت اللہ کی چھت" (مشکوٰۃ)

ان صریح احکام کے باوجود اول الذکر روایت میں بیان کیا گیا ہے کہ رسول اکرم نے قبرستان میں سجدہ ادا فرمایا۔ اگر صرف سجدہ ادا فرمایا تو یہ سجدہ خود آپ کی حدیث کی رو سے ناجائز ہوا۔ اگر پوری صلوٰۃ ادا فرمائی تھی تو وہ خود رسول اکرم کے واضح فرماں کے مطابق ادا نہیں ہوئی۔ کیوں کہ متذکرہ احادیث کے باعث چاروں ائمہ فقہ کا متفقہ فتویٰ ہے کہ قبرستان میں سجدہ اور صلوٰۃ حرام ہے۔ حتیٰ کہ اس مسجد میں صلواۃ جائز نہیں جس میں قبر بنی ہوئی ہو۔ بجز اس صورت کے کہ قبر پیچھے ہو۔ یعنی قبر ہو تو اس کی جانب پشت کر کے صلوٰۃ ادا کی جاسکتی ہے۔ ورنہ قبر کا یا مسجد کا توڑنا لازم آئے گا۔ اگر اول الذکر روایت کو درست مانا جائے تو نعوذ باللہ رسول اکرم کے قول و فعل میں تضاد نظر آئے گا۔

قبلہ وکعبہ کی بے حرمتی

مسلمانوں کو کلمہ طیبہ کے ذریعہ سارے جھوٹے اور فانی معبودوں کی پرستش سے روک دیا گیا۔ چنانچہ مسلمانوں نے جب وہ حقیقی مسلمان تھے نہ رسول کی پوجا کی، نہ کسی ولی اللہ اور امام کو مانا۔ نہ قیصرو کسریٰ کے سامنے جھکے، نہ مقبرہ اور مزار کی پرستش کی۔

مسلمانوں کو صرف ایک دنیوی چیز کا احترام کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔ اور وہ "خانہ کعبہ" ہے جس کے سامنے جھکنا جس کی زیارت کے لئے خرچ کرکے دور دراز سے آنا اس کے غلاف کو پکڑ کر دعا کرنا، توبہ کرنا، گڑگڑانا اور اس کی جانب رخ کرکے (اللہ تعالی کو) کو سجدہ کرنا جائز کر دیا گیا ہے عجمی نہ خود وہاں جانا چاہتے تھے نہ ان کو اپنے اصلی رنگ وروپ میں وہاں جانے کی اجازت تھی۔

ہمارے قبلہ وکعبہ کی اہمیت کو ختم کرنے کے لئے "مجازی" رنگ چڑھا کر ان الفاظ کا استعمال اس درجہ عام کر دیا گیا کہ ہر کس وناکس کو "قبلہ وکعبہ" کے الفاظ سے یاد کرنے لگے۔ یعنی انسان کا مرتبہ بڑھا کر "قبلہ وکعبہ" کے برابر کر دیا تاکہ جمہور مسلمانوں کی نظر میں اصلی "قبلہ وکعبہ" کی عظمت کا احساس باقی نہ رہے اس کا نتیجہ وہی نکلا جو وہ چاہتے تھے۔ "قبلہ وکعبہ" ہر گلی کوچہ میں پھرنے لگے۔ جب چاہو ان سے ملاقات کرلو اور اصلی "قبلہ وکعبہ" کی طرف رخ نہ کرو۔

چاہئے تو یہ تھا کہ سبائی اپنے بزرگوں کو اپنے متبرک مقامات کے نام سے پکارتے جیسے نجم الحسن نجف اشرف مدظلہ یا کفایت حسین، کوفہ شریف، اور بشیر صاحب کربلائے معلی وغیرہ اور قبلہ وکعبہ مسلمانوں کے لئے قابل احترام رہنے دیتے۔ مگر افسوس تو ان سنی علما پر ہے جو خود بھی ایک دوسرے کو قبلہ وکعبہ یا قبلہ گاہی لکھتے ہیں اور عربی دانی کا زعم بھی رکھتے ہیں۔

قرامطہ

قرامطہ کی تحریک ارتداد کی تحریک تھی۔ عبیدین اور قرامطہ کا ظہور قریبی زمانہ میں ہوا۔ دونوں شیعہ اسماعیلیہ تھے۔ اور بظاہر یکساں عقائد واعمال کے حامل تھے۔ ابتدائی زمانہ میں قرامطہ نے عبیدین کا ساتھ دیا۔ وضعی احادیث اور آمد مہدی کے پروپگنڈے نے دوسرے فتنوں کے ساتھ ساتھ قرامطہ کو بھی ابھارا۔ قرامطہ کے فتنہ کا آغاز خلیفہ معتمد (۸۶۹ء تا ۸۹۲ء) کے عہد میں ہوا۔ عبیدی (فاطمیین) تحریک کے بانی عبیداللہ نے بصرہ چھوڑنے سے پہلے اپنے ایک کارگزار داعی حمدان بن اشعت کو چھوڑ گیا اس تحریک کا بانی حمدان بن اشعت قرامطہ قید سے فرار ہوکر شام چلا گیا تھا۔ حمدان قرمط اپنے لقب سے ایسا مشہور ہوا کہ اس جماعت کا نام ہی قرامطہ پڑ گیا۔ حمدان قرمط اور اس کے ساتھی اصلاً عبیداللہ کی تحریک کے داعی تھے۔ بعض مورخوں کو یہ دھوکا ہوا کہ اسماعیلی قرامطہ سے نکلے۔ واقعہ یہ ہے کہ اسماعیلیوں کی کئی شاخیں ہیں جن میں پہلی اور اہم شاخ قرامطہ ہے۔

قرامطہ کی تحریک مخفی طور پر کام کرتی رہی۔ جاہل عوام اور تخریب پسند عناصر اس میں شامل ہوتے رہے۔ بحرین اور اس کے نواح میں قرامطہ تحریک کی اشاعت ہوئی ۲۷۸ ہجری کوفہ میں ایک شخص حمدان بن اشعث عرف قرمطہ جو ایک غالی شیعہ اسماعیلی تھا، اس نئے مذہب کا بانی ہوا۔ حمدان نسلاً قبطی تھا۔ اس کا عقیدہ تھا کہ امام

۱۔ حسین بن علی ۲۔ علی زین العابدین

۳۔ باقر ۴۔ امام جعفر

۵۔ اسماعیل بن جعفر ۶۔ محمد بن اسماعیل

۷۔ عبیداللہ بن محمد۔ یعنی جملہ سات ہیں

حمدان خود کو عبیداللہ (یحییٰ) بن محمد کا نائب کہتا تھا (حالانکہ محمد بن اسماعیل کا کوئی بیٹا عبیداللہ نامی نہ تھا) محمد بن حنفیہ کو وہ رسول کہتا تھا۔ چنانچہ اذاں میں یہ الفاظ بڑھا دیئے تھے۔ "اشھد ان محمد بن الحنفیہ رسول اللہ"

وہ کہتا تھا کہ بعض سورتیں محمد بن حنفیہ پر نازل ہوئی ہیں ۔ بیت المقدس کو قبلہ قرار دیا، اور دن رات میں صرف دو نمازیں رکھیں ۔ دو شنبہ کو بابرکت سمجھتا تھا اور اس دن کوئی کام نہ کرتا تھا ۔ روزے بھی رمضان کے علاوہ دوسرے مہینوں میں فرض مقرر کئے ۔ نبیز کو حرام اور شراب کو حلال سمجھتا تھا ۔ غسل جنابت کو غیر ضروری سمجھتا تھا ۔ صرف وضو کافی تھا ۔ جو شخص قرامطہ کا مخالف ہو اس کا قتل واجب ٹھیرایا ۔

۲۶۸ھ کے بعد حمدان نے سلیمیہ کے تعلق کو ختم کر کے اپنی الگ دعوت ۔ دعوت قرامطہ کا آغاز کیا اور کوفہ سے عرب اور قبطی قبیلے کثرت سے اس کی دعوت میں داخل ہونے لگے اپنا لقب "قائم بالحق" رکھا ۔ زنگیوں کے سرداروں کو اس نے اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش کی جو کامیاب نہ ہو سکی ۔ اس نے کوفہ میں اپنے عقائد کی اشاعت شروع کی ۔ عوام اس کے معتقد ہونے لگے تو کوفہ کے عامل نے قید کر دیا ۔ محافظوں کی غفلت سے قرامطہ فرار ہو گیا تو اس کے ماننے والوں نے اس فراری کو معجزہ سمجھا ۔ رفتہ رفتہ اس تحریک نے زور پکڑا لیکن بالآخر احمد بن محمد طائی والی کوفہ نے قرامطہ کی جمعیت کو منتشر کر دیا ۔

۲۸۱ھ میں قرمط کے معتقدین میں ایک شخص یحییٰ بن مہدی نامی نے (بحرین کے مضافات میں) قطیف میں وارد ہو کر علی بن معلی حمدان کے مکان میں قیام کیا اور اعلان کیا کہ مجھ کو مہدی امام زماں (قرامطہ عبید اللہ مہدی کو اس کے دعویٰ کے موافق اسماعیل بن جعفر صادق کی اولاد میں سمجھ کر اس کی تکریم کرتے ہیں) نے بھیجا ہے اور وہ بھی عنقریب خروج (مرکزی حکومت کے خلاف بغاوت) کرنے والے ہیں ۔

علی بن معلی حمدان شیعہ تھا ۔ اس نے تمام شیعوں کو فراہم کیا اور "امام الزماں کا خط جو یحییٰ نے پیش کیا تھا پڑھ کر سنایا ۔ شیعوں نے بوقت ظہور مہدی خروج میں ان کا ساتھ دینے کا وعدہ کیا یحییٰ کچھ عرصہ کے لئے غائب ہو گیا اور پھر آکر امام زماں کا دوسرا خط پیش کیا جس میں لکھا تھا کہ ہر شخص یحییٰ کو ۳۶، ۳۶ دینار نذر کرے ۔ شیعوں نے اس حکم کی فوراً تعمیل کی ۔ چند روز بعد یحییٰ پھر آیا اور تیسرا خط لایا، جس میں لکھا تھا کہ تم لوگ اپنے مال کا پانچواں حصہ امام زماں کے لئے

یحییٰ کے حوالے کرو ۔

یحییٰ بن مہدی ایک مرتبہ ابو سعید جنابی کے گھر بھی آیا ۔ سب نے مل کر کھانا کھایا ۔ یحییٰ بن مہدی کی مزد کی تعلیمات نے اثر دکھایا ۔ ابو سعید جنابی نے اپنی بیوی سے کہا کہ وہ خود کو یحییٰ بن مہدی کے سپرد کر دے ۔ اس شرمناک واقعہ کی اطلاع حاکم قطیف کو ہوئی تو انہوں نے یحییٰ کو سزا دی ۔ ابو سعید جنابی فرار ہو گیا ۔ ۲۸۶ ہجری میں ابو سعید حسن بن بہرام جنابی نے بحرین میں قرامطہ کی جانب سے علانیہ دعوت دی اور لوگوں کو امام زماں کا منتظر بنایا ۔ اس نواح میں جو لوگ پہلے خفیہ طور پر یحییٰ قرامطہ کی تحریک میں شامل ہوئے تھے، اب وہ علانیہ ساتھ دینے لگے ۔ ابو سعید نے سب کو لے کر ایک باقاعدہ فوج ترتیب دی ۔ قطیف میں قیام کر کے ساز و سامان درست کیا اور بصرہ کی جانب روانہ ہوا ۔

جب بحرین کے یہ تمام حالات خلیفہ معتضد (وفات ۲۸۹ھ) کو معلوم ہوئے تو انھوں نے بصرہ کے عامل احمد بن محمد یحییٰ کو لکھ کر چودہ ہزار دینار کے صرفہ سے بصرہ کی شہر پناہ تعمیر کروائی (کاش وہ یہ جانتے کہ شہر پناہوں کے ذریعہ شرپسند عناصر سے بچاؤ ممکن نہیں) بحرین میں احساء قرامطہ کا مرکز تھا ۔

جس وقت ابو سعید بصرہ پہنچا تو مرکز کی لاپروائی فارس عباس بن عمر غنوی دو ہزار سواروں کے ساتھ بصرہ کی حفاظت کے لئے آپہنچے ۔ بصرہ سے باہر ہی عباس اور ابو سعید کی لڑائی ہوئی ۔ دو روز کی لڑائی کے بعد ابو سعید نے عباس کو گرفتار کر لیا ۔ اور جس قدر آدمی عباس کے ہمراہیوں میں گرفتار ہوئے سب کو ابو سعید نے آگ میں جلا دیا ۔ یہ واقعہ ماہ شعبان ۲۸۷ ہجری کا ہے ۔ اس واقعہ سے ابو سعید کا حوصلہ بڑھ گیا ۔

ابو سعید قرمطی نے اس فتح کے بعد بصرہ کو چھوڑ کر ہجر کا قصد کیا ۔ اہل ہجر کو امان دیکر ہجر پر قبضہ کر لیا ۔ پھر بصرہ کی طرف آیا ۔ اہل بصرہ پر بہت خوف طاری ہوا مگر بصرہ کے عامل احمد بن محمد واثقی نے عوام کو اطمینان دلایا ۔ ابو سعید اس مرتبہ بھی بصرہ کو چھوڑ کر اور عباس کو قید سے آزاد کر کے مضافات بحرین کی طرف چلا گیا ۔

ابو سعید نے اپنی حکومت قائم کر کے اپنے بیٹے سعید کو اپنا ولی عہد مقرر کیا۔

یہ بات ابو سعید کے چھوٹے بھائی ابو طاہر کو ناگوار گذری۔اس طرح ۲۸۶ھ میں صوبہ بحرین خلافت عباسیہ سے جدا ہو گیا اور قرامطہ نے اپنی خود مختار حکومت قائم کر لی۔ اور اپنے ظالمانہ طرز عمل سے عوام کو بے حد پریشان کیا۔قرامطہ اطراف واکناف کے علاقوں پر حملے کرتے تھے۔عوام نے ان کی تعلیمات کو قبول کر کے نہیں بلکہ خوف سے ان کا ساتھ دیا۔بحرین میں قرامطہ کی حکومت ۳۶۴ھ تک رہی۔اس وقت تک قرامطہ حاجیوں کے قافلوں کو لوٹتے تھے اب انھوں نے ایک قدم اور بڑھایا اور ۳۱۷ھ میں ابو سعید نے اپنے بیٹے سعید کو جانشین کیا تھا لیکن اس کا دوسرا بیٹا ابو طاہر اس کا جانشین ہوا۔ابو طاہر نے مکہ معظمہ پر چڑھائی کی۔حاجیوں کو قتل کیا اور مکہ کو خوب لوٹا۔میزاب اور خانہ کعبہ کے دروازہ کو اکھیڑ دیا۔غلاف کعبہ اتار کر اپنے لشکر میں تقسیم کر دیا۔حجر اسود کو نکال کر اپنے ساتھ ہجر کی طرف لے گیا اور چلتے ہوئے اعلان کر گیا کہ آئندہ سے حج ہمارے ہاں ہوا کرے گا۔حجر اسود کو واپس کرنے کے لئے کافی نمائندگیاں ہوئیں۔بغداد کے ترکی امیر الامراء نے پچاس ہزار دینار کا پیش کش بھی کیا ابو طاہر نے کہا کہ جب تک وہی ہم کو حکم نہ دیں گے جن کے حکم سے ہم لے گئے ہیں اسے واپس نہ کریں گے۔(اشارہ فاطمیین کی طرف تھا)

جب قرامطہ کے دو گروہوں (ابو طاہر کے بڑے بھائی ابو المنصور احمد اور ابو طاہر کے بیٹے سابور) میں اختلاف ہوا تو تصفیہ کے لئے قرامطہ نے ابو لقاسم عبیدی کو حکم بنا کر افریقہ کو ایلچی روانہ کئے۔ابو القاسم عبیدی نے اپنا فیصلہ ابو المنصور احمد کے حق میں دیا۔

۳۲۴ھ میں ابو القاسم عبیدی فوت ہوا اور اسماعیل عبیدی قیروان میں اس کا جانشین ہوا۔اس کے اصرار پر ۳۳۹ھ میں ابو المنصور احمد قرمطی نے حجر اسود کو واپس کیا (اکیس برس تک ہجر میں قرامطہ کے پاس رہا) قرائن بتلاتے ہیں کہ قرامطہ نے عبیدوں ہی کے اشارے پر مکہ معظمہ پر چڑھائی اور سب مخالف اسلام حرکات کا ارتکاب کیا تھا۔

یحییٰ کے بعد اس کے بھائی حسین نے مہدی امیر المومنین کا لقب اختیار کر کے

لوگوں کو فراہم کیا اور بادیہ نشین عربوں کی جمعیت بنا کر دمشق وشام کے مضافات میں لوٹ مار کا بازار گرم کر دیا خلافت عباسیہ کی جانب سے سردار ان کی سرکوبی پر مامور ہوئے۔

۲۸۸ھ میں حسین کا بیٹا ابو القاسم یحییٰ کوفہ گیا۔وہاں کا ایک قبیلہ قرامطہ کی جانب مائل ہو گیا۔رفتہ رفتہ ان کی تعداد بڑھنے لگی تو شبلی نامی ایک سردار نے ان پر حملہ کیا۔اس لڑائی میں قرامطہ کا سردار "مہدی امیر المومنین" گرفتار ہوا۔اس کو شبلی نے خلیفہ معتضد کے پاس بھیج دیا اور معتضد نے اسے قتل کر دیا۔ابو القاسم اور باقی قرامطہ دمشق کی جانب بھاگ گئے اور لوگوں کو اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش کی۔اس وقت دمشق کا حاکم بلخ تھا۔اس نے قرامطہ کا مقابلہ کیا۔بیشتر لڑائیوں میں قرامطہ نے فتح پائی۔لیکن بالآخر بلخ نے اس جماعت کو منتشر کر دیا۔

قرامطہ اور عبیدی ابتدا عقاید کے لحاظ سے بھی ایک دوسرے سے قریب تھے اور سیاسی اعتبار سے بھی، لیکن رفتہ رفتہ سیاسی اغراض کے تحت انھوں نے ایسا رویہ اختیار کیا کہ کبھی خلافت سے ملکر عبیدین کی مخالفت کرتے اور کبھی عبیدین سے مل کر خلافت کے خلاف ان کو اپنا آلہ کار بناتے۔

قرامطہ نے رفتہ رفتہ ہندوستان میں بھی اپنی جڑیں مضبوط کیں۔سندھ بلوچستان اور سلسلہ کوہ سلیمان کے قبائل میں اپنا اثر پیدا کیا۔قرامطہ نے ہندوؤں کی ہمدردی حاصل کی اور حضرت علی کو وشنو کا دسواں اوتار بتا کر اور بقیہ نواوتاروں کو مان کر اپنے آپ کو اس سنگھٹن میں شامل کر لیا جو ہندوستان میں محمود کے خلاف قائم ہوا تھا (اس سے قبل قرامطہ کو شام وایشیاء کوچک میں مسلمانوں کے خلاف عیسائیوں کو شامل کرنے کی ضرورت پیش آئی تو حضرت علی کو فارقلیط کا مظہر بیان کر چکے تھے) یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ چوتھی صدی ہجری میں سندھ اور ملتان میں قرامطہ کا اثر بڑھ گیا تھا۔سندھ کے پایہ تخت منصورہ میں تو ایک قریشی حاکم کی حکومت تھی جہاں عباسی خلیفہ کا خطبہ پڑھا جاتا تھا۔ملتان میں قرامطہ (اسماعیلیہ باطنیہ) کو اقتدار حاصل تھا جو مصر کے عبیدی فاطمی کا خطبہ پڑھتے تھے۔

خلیفہ القادر باللہ (وفات ۴۲۲ھ) نے جو عالم تھے۔اعتزال رفض وغیرہ کی

مخالفت کی ۔ انھوں نے محمود غزنوی کو فرمان بھیجا کہ روافض ، اسماعیلیہ باطنیہ ، قرامطہ ، وجہمیہ وغیرہ تحریکات کا قلع قمع کریں ۔ محمود غزنوی نے مرکزی خلافت کی خدمت سمجھ کر اور خود اپنی سلطنت کو محفوظ رکھنے کے لئے قرامطہ کے استیصال کی پوری پوری کوشش کی ۔ جب ۴۰۳ھ میں عبیدی سلطنت کا سفیر دوستی کا پیغام لے کر محمود غزنوی کے پاس غزنی آیا تو محض اس لئے کہ یہ سفیر قرامطی عقیدہ کا حامل تھا ۔ محمود نے حکم دیا کہ اس کو نہایت ذلت کے ساتھ تشہیر کر کے اور زیر حراست رکھ کر حدود سلطنت سے باہر کیا جائے ۔ اس سے قبل ۳۹۵ھ میں محمود نے بیجے رائے کے پاس پیغام بھیجا کہ تم ہمارے دشمنوں یعنی قرامطہ کو اپنے یہاں جگہ نہ دو ۔ جب بیجے رائے نے انکار کیا تو محمود اس پر حملہ آور ہوئے بیجے رائے نے ڈٹ کر مقابلہ کیا ۔ تین دن تک لڑائی ہوتی رہی ۔ آخر بیجے رائے مقابلہ سے بھاگا اور گرفتار ہو کر خودکشی کر لی

اس کی فوج میں جس قدر قرامطہ تھے ان میں سے کچھ تو مارے گئے ، باقی ملتان پہنچے ۔ محمود غزنوی کو معلوم ہوا کہ قرامطہ ملتان میں جمع ہو رہے ہیں اور وہاں کا حاکم داؤد بن نصر (جو خود کو اب تک محمود غزنوی کا مطیع ظاہر کرتا تھا) قرمطی ہو گیا ہے ۔ چنانچہ محمود نے اس وقت تو چشم پوشی کی لیکن دوسرے سال درہ خیبر کی راہ سے پنجاب میں داخل ہو کر دوسری جانب سے ملتان پر حملہ کرنا چاہا ۔ انند پال نے (محمود کا باجگذار ہونے کے باوجود) مزاحمت کی ۔ اور داؤد بن نصر کو بھی خطرہ سے آگاہ کر دیا ۔ کیونکہ داود بن نصر قرمطی مسلک اختیار کر کے دائرہ اسلام سے خارج اور سنگھٹن میں شامل ہو چکا تھا ۔ یہ خلاف توقع جنگ محمود کو ناپسند تھی کیونکہ وہ آنند پال سے لڑنا نہیں چاہتا تھا ۔ آنند پال کی فوجیں شکست کھا کر بھاگ گئیں ۔ آنند پال بھاگ کر لاہور پہنچا ، پھر کشمیر کی طرف بھاگا ۔ دوسرے راجاؤں سے مدد بھی طلب نہ کر سکا ۔ محمود واپس ہو کر ملتان کی جانب روانہ ہوئے اگر ان کو لوٹ مار کرنا ہندوؤں کو زبردستی مسلمان بنانا یا مندروں کو ڈھانے کا شوق ہوتا تو وہ لاہور کو لوٹے بغیر نہ چھوڑتے ۔ یا کم از کم وہاں اپنی حکومت ہی قائم کر لیتے ۔ لیکن انھوں نے ایسا کوئی کام نہ کیا ۔ ان کا اصل مقصد قرامطہ کے فساد انگیز گروہ کو سزا دینا تھا ۔ آنند پال کی فراری کی اطلاع ملنے پر داؤد کی ہمت پست ہو گئی اور وہ اپنا خزانہ اونٹوں پر لاد کر دکن کی جانب فرار ہونے

کی تیاری کر رہا تھا کہ محمود کی فوج ملتان کے سامنے نمودار ہوئی ۔ داؤد نے محصور ہو کر مقابلہ کی تیاری کی ۔ محمود نے ملتان کا محاصرہ کر لیا ۔ سات روز تک محاصرہ جاری رہا ۔ بالآخر داؤد نے عاجزانہ التجا کی کہ میں مذہب قرامطہ سے توبہ کرتا ہوں ۔ آئندہ قرامطہ سے کوئی تعلق نہ رکھوں گا ۔ اور بیس ہزار درہم سالانہ خراج غزنی کو روانہ کرتا رہوں گا ۔ محمود نے داؤد کی التجا قبول کر لی اور سکھپال (جو جےپال کا نواسہ تھا اور جس نے اسلام قبول کر کے نواسہ شاہ کا لقب اختیار کیا تھا) کو داؤد بن نصر کے افعال و حرکات کا نگران مقرر کر کے غزنی کی جانب روانہ ہو گیا ۔ ایک سال تک محمود دوسرے مہمات میں مصروف رہ کر جب غزنی پہنچے تو معلوم ہوا کہ سکھپال اپنے ماموں انند پال کی ترغیب سے مرتد ہو کر باغی ہو گیا ہے ۔ اور داؤد بن نصر پر نظر رکھنے کی بجائے قرامطہ کو خود اپنے گرد فراہم کر رہا ہے ۔ محمود یہ سنتے ہی سکھپال کے سر پر یکایک یوں پہنچے کہ وہ ہاتھ پاؤں نہ ہلا سکا ۔ اور اس کو گرفتار کر کے غزنی لے گئے ۔

جب محمود کو یہ خبر پہنچی کہ آنند پال کی سپہ سالاری میں ایک بڑی فوج پشاور کی جانب روانہ ہوئی ہے تو محمود بلا تامل فوج لے کر روانہ ہوئے ۔ جب اس بڑے لشکر کو اور اپنی قلیل فوج کو دیکھا تو بجائے حملہ آور ہونے کے اپنی حفاظت کی ترکیبیں سوچنے لگے ۔ محمود نے اپنی طرف سے کوئی حملہ نہیں کیا اور اپنی حفاظت میں ہی مصروف رہے ۔ دونوں لشکر چالیس روز تک ایک دوسرے کے مقابل رہے جب محمود نے دیکھا کہ انند پال کی فوج میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے تو انھوں نے مزید انتظار کرنا مناسب نہ سمجھا ۔ چنانچہ دونوں فوجیں متصادم ہو گئیں ابتداء آنند پال کو اپنی فتح مندی کا یقین تھا لیکن شام تک ہندوستانی افواج کا کیمپ سنسان ہو گیا اور آنند پال فرار ہو گیا ۔ یہ لڑائی ہندوستان کی مجموعی طاقت کا ایک زبردست مظاہرہ تھا محمود نے انند پال کا تعاقب شروع کیا ، لیکن انند پال نگر کوٹ پھر پہاڑی راستوں سے کھسک کر دور دراز مقامات پر پہنچ گیا ۔

محمود غزنوی نے ۴۰۰ھ سے اپنے لشکر میں ہندوؤں کو بھی شامل کرنا شروع کیا تاکہ اس نفرت کو جو ہندوؤں کے دلوں میں سلطنت غزنی کی طرف سے ڈالی گئی ہے دور کیا جائے ۔

جب محمود غزنی واپس ہوئے تو اطلاع ملی کہ غور وہرات کے علاقہ میں قرامطہ نے شورش برپا کر دی ہے اور وہاں کا حاکم محمد بن نوری قرمطی ہو گیا ہے۔

مصر کے فرماں روا حاکم بن عزیز عبیدی کو انند پال کی تیاری اور حملہ کا بخوبی علم تھا، یہی وجہ تھی کہ ملک کی تمام فوجیں تو پشاور کے معرکہ میں شریک تھیں مگر کسی قرمطی نے اس میں شرکت نہیں کی تھی۔ قرامطہ نے اپنے لئے میدان تجویز کر لیا تھا جس کا علم انند پال کو تھا۔ قرامطہ مصر سے امدادی فوج اور جہاز لے کر دیبل کی بندر گاہ پر آئے۔ داؤد بن نصر والی ملتان کے پاس حاکم بن عبیدی کے سفیر پہنچے اور اپنے حاکم کی بیعت پر آمادہ کیا۔ مصری فوج ملتان پہنچی ٹھیک اس زمانہ میں پشاور کے میدان میں محمود اور انند پال میں جنگ ہو رہی تھی۔ قرامطہ نے ملتان اور غور میں بیک وقت علم بغاوت بلند کیا۔ محمود نے غور پر حملہ کیا۔ محمد بن ثوری گرفتار ہوا اور خود کشی کر لی۔ پھر محمود نے ملتان پر فوج کشی کی۔ داؤد بن نصر شکست کھا کر گرفتار ہوا۔ غور و ملتان کی شورشوں اور انند پال کی چڑھائی کا بیک وقت ہونا صاف بتا رہا ہے کہ قرامطہ اور ہندوستانی راجاؤں کے درمیان کیسی سازش تھی۔ اگر محمود غزنوی کو پشاور کے میدان میں شکست ہوتی تو سندھ سے لے کر آذر بائجان اور بخارا تک قرامطہ یا عبیدین کی حکومت قائم ہو جاتا اور خلافت عباسیہ کا خاتمہ یقینی تھا۔

انند پال کی سرکردگی میں آئی ہوئی متحدہ افواج کو شکست دینے کے بعد سلطان محمود کو کوئی خطرہ نہیں تھا لیکن اصلی دشمن قرامطہ ابھی تک موجود تھے۔ اب محمود پر یہ بات واضح ہوئی کہ ہندوستان کے برہمن جو عوام پر بڑا اثر رکھتے ہیں وہ بھی قرامطہ کے ہمنوا ہیں۔ انند پال کی شکست اور ملتان پر باقاعدہ تسلط کے بعد سلطان نے اس بات کا سراغ لگایا کہ تھانیسر، قنوج، انھلواڑہ (گجرات) اور اجین کی ریاستیں، مہابن کے راجہ انند پال کو بغاوت پر آمادہ کر سکتی ہیں اور ملتان کے صوبہ کو نقصان پہنچا سکتی ہیں اور یہی مقامات مذہبی مراکز بھی ہیں اور یہاں کے بت خانوں میں سازشیں ہوتی ہیں۔ چنانچہ محمود نے تھانیسر سے ابتداء کی تھانیسر کا راجہ شہر چھوڑ کر بھاگ گیا۔ محمود نے مندر کو توڑ کر سوم جگ کا بت بجنسہ اپنے ساتھ لے گیا اس کے بعد متھرا، مہابن اور تھانیسر کے برہمنوں نے اپنے دوسرے مرکز سومنات (گجرات) میں پناہ لی۔ سومنات

کی بابت سجان رائے لکھتے ہیں:۔

"کہتے ہیں کہ پیغمبر کے زمانہ میں اس بت کو خانہ کعبہ سے لا کر وہاں رکھ دیا گیا تھا" اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ منات کا بت تھا جو قرامطہ کے ذریعہ ہندوستان پہنچا تھا۔ تھانیسر اور سومنات دونوں کے بتوں یا بت خانوں کے نام میں لفظ سوم موجود ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ یہ مندر چاند سے منسوب تھے۔ چاند گرہن کے موقع پر دونوں مندروں میں یکساں پرستش ہوتی تھی۔ ملک عرب کے تمام مشرکوں میں چاند کے بت کو عام طور پر فضیلت حاصل تھی قرامطہ بحرین کی رعایت بھی ان مندروں میں مدنظر رکھی گئی تھی۔

تمام ملک میں اس بات کو شہرت دی گئی تھی کہ سومنات کا بت تمام بتوں کا بادشاہ ہے اگر محمود نے ادھر کا رخ کیا تو سومنات چشم زدن میں اس کا کام تمام کر دے گا۔ سمندر مقررہ اوقات میں سومنات کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے (سومنات، گجرات کے جنوبی ساحل پر سمندر کے کنارے واقع تھا۔ جوار بھاٹے یعنی مدوجزر کے وقت سمندر کا پانی کبھی مندر کے قریب آتا اور کبھی فاصلہ پر چلا جاتا) شمالی ہند کے رہنے والوں کو قمری مقررہ تاریخوں میں سمندر کے اس طرح عبادت کے لئے آنے کا تماشہ دکھا کر معتقد بنایا گیا۔ اس طرح یک لخت تمام ملک میں سومنات کی شہرت ہو گئی۔ اور سومنات کو محمود سے انتقام لینے والا ظاہر کر کے اس سازش مردہ کو جسے محمود نے ختم کر دیا تھا از سرنو جان ڈالنے کی کوشش کی گئی اور سومنات کی نسبت عجیب وغریب عقیدے تراشے گئے۔

غرض سومنات کی جدید شہرت اور سازشی مرکز ہونے کا حال سن کر سلطان محمود نے شعبان ۴۱۵ھ میں غزنی سے کوچ کیا اور نہرواله (گجرات) پہنچے۔ گجرات کا راجہ شہر چھوڑ کر بھاگ گیا۔ محمود نہ شہر میں قیام کیا نہ اس کو لوٹنے کا خیال کیا۔ بلکہ سومنات کی طرف روانہ ہوئے۔ وہاں دس ہزار سے زیادہ راجپوتوں کی فوج تھی۔ سومنات کے تین طرف سمندر اور ایک سمت خشکی تھی۔ اسی خشکی کی جانب سے محمود حملہ آور ہوئے تھے اور ساحل سمندر پر جس قدر کشتیاں دستیاب ہوئیں ان پر فوج بٹھا کر حکم دیا کہ سمندر کی جانب سے شہر کا محاصرہ کریں۔ کوئی بحری امداد شہر

والوں کو نہ پہنچنے دیں کیونکہ محمود غزنوی کو خلیج فارس اور بحر عمان سے قرامطہ کی امداد کا اندیشہ تھا۔ دو دن سومنات والوں نے مقابلہ کیا۔ تیسرے دن نہروالہ کے راجہ پرم دیو اور دوسرے دابشلیم نے اپنی فوجیں سومنات کی مدد کے لئے بھیجیں۔ تیس چالیس ہزار کی فوج نے محمود پر پیچھے سے حملہ کیا۔ محمود نے فوج کے دو حصہ کرکے دو طرفہ لڑائی جاری رکھی۔ کچھ ہی عرصہ میں پرم دیو اور دابشلیم کی فوج کو بھگادیا۔ سومنات کی فوج نے بھی ہمت ہار دی۔ محمود اس فتح کے بعد گجرات میں رہ کر قرامطہ بحرین کا مکمل استیصال کرنا چاہتے تھے لیکن ان کے ساتھیوں نے غزنی واپس جانے کے لئے اصرار کیا۔ محمود واپس ہو کر امیر طوس کی عرض داشت کی بناء پر کہ ترکمانوں کا فتنہ آپ کے آئے بغیر فرد نہ ہوگا، طوس گئے اور وہاں سے فارغ ہو کر رے پہنچے اور قرامطہ کی بیخ کنی کی۔

("تاریخ اسلام" حصہ دوم از اکبر شاہ خاں نجیب آبادی اور ملت اسلامیہ کی تاریخ حصہ دوم صفحات ۱۲۸ تا ۱۴۶ سے اقتباس)

کتمان

مذہب شیعہ کی اصولی تعلیمات میں تقیہ کے علاوہ کتمان بھی ہے۔ کتمان کا مطلب ہے اپنے اصل عقیدہ اور مذہب و مسلک کو چھپانا اور دوسروں پر ظاہر نہ کرنا تقیہ کی طرح کتمان بھی عقیدہ امامت کے لوازم میں سے ہے۔ اسی لئے یہ شیعہ مذہب کی خصوصیات میں سے ہے۔ دنیا کے کسی دوسرے مذہب میں کتمان اور تقیہ کی تعلیم نہیں دی گئی۔

کتمان کی تصنیف کی ضرورت پر حضرت علیؓ سے لے کر شیعوں کے گیارھویں امام حسن عسکری تک کسی بھی امام نے مسلمانوں کے کسی بڑے اجتماع میں نہ کبھی حج کے موقع پر نہ کبھی عیدین یا جمعہ کے اجتماع میں، امامت کا وہ مسئلہ بیان کیا جو شیعہ مذہب میں عقیدہ توحید و رسالت ہی کی طرح دین کی بنیاد اور شرط نجات بنا ہوا

ہے۔ ان میں سے کسی نے کبھی اپنی امامت کا دعویٰ بھی نہیں کیا اور نہ ہی عام مسلمانوں کو اس کے قبول کرنے اور بیعت کرنے کی دعوت دی بلکہ حضرت علی کا طرز عمل خلفائے ثلاثہ کے چوبیس (۲۴) سالہ دور خلافت میں یہ رہا کہ تمام مسلمانوں کی طرح وہ بھی خلفائے ثلاثہ کی امامت میں صلواۃ ادا کرتے رہے۔ ان کی بیعت بھی کی وہ اخلاص اور سچائی کے ساتھ تینوں خلفا کے ساتھ تعاون کرتے رہے۔ حضرت علی کے بعد حضرت حسن اور حضرت حسین نے حضرت معاویہ کے دور خلافت میں کبھی کسی مجمع میں اپنی امامت کا دعویٰ اور اعلان نہیں کیا۔ خود ان کی امامت میں اور ان کے مقرر کئے ہوئے ائمہ کی امامت میں صلواۃ ادا کرتے رہے یہی رویہ باقی تمام ائمہ کا رہا۔ تنہا یہی بات اور ائمہ کا یہ مسلسل طرز عمل مذہب اثناء عشری کی اساس و بنیادی مسئلہ امامت کے باطل اور بے اصل ہونے کی ایسی روشن دلیل اور شہادت ہے کہ اس سے زیادہ روشن دلیل اور شہادت کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔

عبداللہ بن سبا کے فیض یافتہ کوفہ کے جن لوگوں نے پہلی صدی ہجری کے اواخر اور دوسری صدی کے نصف اول میں (یعنی امام باقر اور امام جعفر صادق کے زمانہ میں) اثناء عشری مذہب کی بنیاد ڈالی۔ انھوں نے اس ناقابل تردید دلیل اور شہادت کی زد سے عقیدہ امامت اور شیعہ مذہب کو بچانے کے لئے یہ دو عقیدے تصنیف کئے۔

کتمان کا مطلب یہ تھا کہ ان ائمہ کو خود اللہ اور رسول کا یہ حکم تھا کہ عقیدہ امامت کا اظہار نہ کریں اس کو چھپائیں اس لئے انھوں نے امامت کا عقیدہ عام مسلمانوں کے سامنے علی الاعلان بیان نہیں فرمایا۔ بہرحال عقیدہ امامت کو تمام ائمہ کے اس مسلسل طرز عمل کی زد سے بچانے کی ضرورت سے یہ دونوں عقیدے تراشے گئے۔

اصول کافی میں "باب الکتمان" ایک مستقل باب ہے۔ اس میں امام جعفر صادق نے فرمایا کہ "اے سلیمان تم ایسے دین پر ہو کہ جو شخص اس کو چھپائے گا اس کو اللہ تعالی کی طرف سے عزت عطا ہوگی اور جو اس کو ظاہر اور شائع کرے گا اس کو اللہ ذلیل اور رسوا کرے گا"

اسی کتاب کے اگلے صفحہ پر امام جعفر صادق کے والد باقر کا یہ ارشاد روایت کیا گیا ہے "مجھے اپنے اصحاب میں (شاگردوں اور مریدوں میں) وہ شخص زیادہ پیارا ہے جو زیادہ پرہیزگار ہو، دین کو زیادہ سمجھنے والا ہو اور ہماری باتوں کو زیادہ چھپانے والا اور راز میں رکھنے والا ہو"۔

اصول کافی میں امام جعفر صادق کا مندرجہ ذیل واقعہ بیان کیا گیا ہے جو کتمان کی بھی مثال ہے اور تقیہ کی بھی۔ سعید السمان سے روایت ہے کہ ایک دن میں امام جعفر صادق کی خدمت میں حاضر تھا کہ فرقہ زیدیہ کے دو آدمی آئے اور انھوں نے جناب امام سے پوچھا کہ کیا آپ لوگوں میں کوئی (اللہ کی طرف سے مقرر کیا ہوا) امام ہے۔ جس کی اطاعت فرض ہو تو امام جعفر صادق نے فرمایا کہ نہیں۔ تو ان دونوں نے کہا کہ ہم کو آپ کے بارے میں ایسے لوگوں نے بتایا ہے جو ثقہ اور قابل اعتماد ہیں کہ آپ ایسا کہتے ہیں اور اس کا اقرار کرتے ہیں اور اس کا فتویٰ دیتے ہیں (یعنی اللہ کی طرف سے مقرر کئے ہوئے امام جن کی اطاعت فرض ہو) ہم آپ کو ان کا نام بتلاتے ہیں وہ فلاں اور فلاں ہیں۔ وہ پرہیزگار اور سنجیدہ لوگ ہیں اور جھوٹ بولنے والوں میں نہیں ہیں۔ ان کی یہ بات سن کر (امام جعفر صادق) غضبناک ہو گئے اور فرمایا کہ میں نے تو ان لوگوں کو ایسا نہیں کہا تھا"

اس واقعہ میں امام جعفر صادق نے کتمان پر بھی عمل کیا کہ اپنی امامت کے مسئلہ کو چھپایا اور تقیہ سے بھی کام لیا کہ صاف فرمادیا ہم میں کوئی امام نہیں جس کی اطاعت فرض ہو۔ حالانکہ اس موقعہ پر اس اخفا اور غلط بیانی کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ یہ دونوں آدمی جو فرقہ زیدیہ سے تعلق رکھتے تھے پردیسی تھے۔ کوفہ سے آئے تھے اور امام جعفر صادق اپنے گھر پر مدینہ منورہ میں تھے۔ اگر ان دو آدمیوں کے سامنے سچ بات ظاہر کر دی جاتی تو کوئی خطرہ نہ تھا۔

ایک دوسری جگہ جسے "اساس الاصول" میں روایت کیا گیا ہے۔ وہ کہتے ہیں "ابی عبداللہ (جعفر صادق) سے روایت ہے کہ انھوں نے کہا میں ستر (۷۰) پہلو رکھ کر بات کرتا ہوں جن میں سے ایک میں میرے بچاؤ کا پہلو رہتا ہے"

(آیات بینات سے اقتباس)

واقعات کربلا

علم تاریخ کو دنیا میں پہلی مرتبہ مسلمانوں نے مدون کیا لیکن یہ ایک ستم ظریفی ہے کہ کچھ عرصہ بعد ایسے دشمنان اسلام آئے جن کی نیت تخریبی تھی۔ تجربہ نے انھیں بتادیا کہ خلاف واقعہ روایت بیان کر کے اور انھیں اعتبار کا قالب دیکر اگر کامیابی حاصل کی گئی تو بڑی حد تک اسلام کو مسخ کر کے اور تفریق و انتشار پھیلاکر امت کے سیل رواں کو بیکراں ہونے سے روکا جاسکے گا۔

حضرت امام حسین کی ولادت ۸ ہجری کے آخر یا ۹ ہجری کے شروع میں ہوئی۔ ان کی زندگی کے چھ دور قرار پاتے ہیں۔

(۱) پیدائش سے رسول اکرم اور پھر حضرت فاطمہ کی وفات تک۔ اڑھائی تین سال کے اس دور میں حضرت حسین نے اپنے شفیق نانا اور اپنی والدہ کی گود میں کھیلتے گذارا۔

(۲) بچپن کا دور۔ حضرت زینب بنت رسول اکرم کی دختر حضرت امامہ نے پرورش کی جن سے حضرت فاطمہ کی وصیت کے مطابق حضرت علی نے نکاح کیا تھا۔

(۳) حضرت عمر اور حضرت عثمان کی خلافتوں کے عہد میں حضرت حسین خراسان کے جہاد (۲۳ اور ۲۵ ہجری) میں اور عبداللہ بن سرح کی سالاری میں افریقہ کے جہاد میں شامل ہوئے۔ حضرت عثمان کی شہادت کے وقت حضرت حسین کی عمر کم و بیش ۲۷ سال تھی۔

(۴) حضرت علی کی خلافت کا دور۔ اس دور میں حضرت حسین اپنے والد ماجد کی مشکلات میں برابر کے شریک رہے۔ حضرت علی کی شہادت کے وقت حضرت حسین کی عمر ۳۲ سال تھی۔

۵) حضرت علی کی شہادت کے بعد جب حضرت حسن خلیفہ ہوئے اور خلافت حضرت معاویہ کے سپرد کی تو حضرت حسین نے حضرت معاویہ کے ہاتھ پر بیعت کی اور حضرت معاویہ کے انتقال تک ان کی بیعت پر قائم رہے اور حضرت معاویہ ہی کی زندگی میں کوفیوں نے حضرت حسین کو بہکانا شروع کیا تو انھوں نے فرمایا ہم بیعت

کر چکے ہیں اور قول دے چکے ہیں اب بیعت توڑی نہیں جاسکتی (اخبار الطول اردو جلد ۲ صفحہ ۲۹۸ اور مقتل حسین اردو صفحہ ۷۶)

(۶) حضرت معاویہ کے بعد حضرت امیر یزید خلیفہ ہوئے تو حضرت حسین نے جو امیر یزید کی ولیعہدی کی بیعت کر چکے تھے امیر یزید کی بیعت خلافت سے گریز کیا اور مدینہ کے گورنر کی طلبی پر یہ کہکر رخصت ہوئے کہ مجمع عام میں بیعت کروں گا مگر رات کو مکہ کے لئے روانہ ہوئے۔ شیعہ مورخ ابو الفرج اصفہانی (وفات ۲۵۶ ہجری) نے لکھا ہے۔

"کوفہ کا وفد مکہ میں حضرت حسین کے پاس پہنچا۔ انھوں نے (یعنی ارکان وفد) یزید کی بیعت توڑ دی تھی۔ ابو عبداللہ وفد کا قائد تھا۔ یہ وفد شیت بن ربیع، سلیمان بن صرد اور مسیب نے بھیجا تھا۔ اراکین وفد نے کہا کہ ہم نے یزید کی بیعت توڑ دی ہے اور حسین کو ان کی بیعت کے لئے بلایا"

شیعہ مورخ کے اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت حسین ایسے لوگوں کے ساتھ مکہ سے روانہ ہوئے جو امیر یزید کی بیعت توڑ چکے تھے۔

حضرت حسن حضرت معاویہ کے حق میں خلافت سے دست بردار ہوئے تھے یعنی انھوں نے حضرت معاویہ کو اپنا جانشین مقرر کیا تھا۔ اس طرح حضرت معاویہ خلیفہ برحق تھے۔ حضرت معاویہ اپنی زندگی میں حضرت یزید کو اپنا جانشین مقرر کر چکے تھے۔ ۲۲ رجب ۶۰ھ کو امیر المومنین حضرت معاویہ کی وفات ہوئی۔ ان کے بیس سالہ دور خلافت میں عراقی شیعان علی دبے بیٹھے رہے۔ ان کے بعد ان مفسدوں نے ریشہ دوانیاں شروع کیں۔ اور حضرت حسین کو حصول خلافت پر آمادہ کرنے کے لئے ان کے پاس عراق کے علاقہ سے کثرت سے مسلسل وفود اور خطوط بھیجے اور خوب سبز باغ دکھائے۔ ان خطوط میں ان کو اپنے پاس چلے آنے کی دعوت دی گئی اور اصرار کیا گیا کہ اگر وہ آئیں تو یزید کے بجائے ان سے یعنی حضرت حسین سے بیعت کر لیں گے۔ ان خطوط میں حضرت معاویہ کی موت پر خوشی کا اظہار کیا گیا تھا۔ پھر حج کے بہانے ۶۰، ۷۰ کوفیوں کو بھیجا گیا جو حضرت حسین کو ورغلانے میں کامیاب ہوئے ان مفسدوں کو حضرت حسین سے ہمدردی تھی نہ عقیدت، ان کو مخالفت تھی تو اسلام سے اور وہ حضرت حسین کو اپنا آلہ کار بنا کر اسلام کی مرکزی قوت کو کمزور کرنا

چاہتے تھے۔ حضرت حسین نے خروج کیا۔ حضرت عبداللہ ابن جعفر طیار نے شروع سے ہی کوشش کی کہ حضرت حسین کوفیوں سے علیحدہ رہیں اور ان کے دھوکہ میں نہ آئیں۔ حضرت حسین کے قریبی حلقہ میں ہر ایک نے خروج کی مخالفت کی۔ لیکن حضرت حسین نے عراق کا قصد کیا اور فریضہ حج بھی ترک کر کے مکہ سے دس ذی الحج کو سفر کوفہ پر روانہ ہوگئے۔ اپنے اہل بیت کو بھی ساتھ لیتے گئے۔ کوفہ سے چند منزل پہلے ان کو پتہ چلا کہ حاکم کوفہ بدل گیا ہے۔ اور نئے حاکم کو اس سازش کا پتہ چل گیا ہے۔ چند کو اس نئے حاکم نے سزا دیدی ہے اور باقی کا منتظر ہے۔

روانگی کی تاریخ ۸ ذی الحج تو مسلمہ ہے راویوں نے اس مقصد کے تحت ۱۰ محرم ۶۱ھ سے پہلے حضرت حسین کو کربلا پہنچنا بیان کیا اور ایک منزل کے بجائے دو منزلوں کی مسافت ایک دن میں طے کرنا بتایا ہے۔ مکہ مکرمہ سے کربلا کا فاصلہ اس راستہ سے جو حسینی قافلے نے کوفہ جاتے ہوئے قادسیہ سے کچھ آگے بڑھ کر اور پھر واپس ہونے کے بعد براہ العزیب وقنسر مقاتل اختیار کیا تھا۔ تقریباً ۹۵۰ میل ہوتا ہے تیرہ سو پچاس برس کی مدت میں اس راستے اور اس کی منازل میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ اونٹ کی رفتار (خصوصاً جبکہ ایک سو سے زائد اونٹوں کا قافلہ ہو) بھی متعین ہے۔ اس لحاظ سے کم از کم دو ماہ کی مدت سفر ہونی چاہئے۔ اس سے کم دنوں میں یہ فاصلہ طے ہونا محالات سے ہے۔ چونکہ شیعی مورخ طبری کے بموجب کربلا کا واقعہ ۲۲ صفر کو پیش آیا وثوق سے کہا جاسکتا ہے کے حضرت حسین ماہ صفر ہی میں کربلا پہنچے۔ اس سے پہلے نہیں۔ اس طرح تمام روایات جن میں یکم تا ۱۰ محرم کے قصے بتائے گئے ہیں۔ سب وضعی قرار پاتی ہیں

شیخ الاسلام ابن تیمیہ لکھتے ہیں: ۔جب راستہ میں اس کی خبر ملی جو کچھ ان کے چچازاد بھائی مسلم بن عقیل کے ساتھ ہوا تو انھوں نے (حسین نے) طلب خلافت کا ارادہ ترک کر دیا۔ صرف اسی بات سے ثابت ہوتا ہے کہ معاملہ دین نہ تھا ورنہ ارادہ ترک نہ کرتے۔ حسین نے لوٹ جانے کا ارادہ کیا تو فرزندان عقیل مانع ہوئے۔

"حضرت حسین مسلم بن عقیل کے قتل کی خبر سن کر اولاد عقیل کی طرف متوجہ ہوئے۔ انھوں نے کہا بخدا ہم واپس نہ جائیں گے جب تک ان ظالموں سے

مسلم بن عقیل کا بدلہ نہ لیں" (جلاء العیون جلد اول صفحہ ۶۳، ۶۴)

(۲) "راستہ میں جب مسلم بن عقیل کے قتل کی خبر ملی تو حضرت حسین نے واپسی کا ارادہ کر لیا لیکن عقیل کی اولاد مانع ہوئی چنانچہ آگے چل پڑے یہاں تک کہ کوفہ کے قریب پہنچ گئے" (عمدۃ الطالبین صفحہ ۱۷۹)

(۳) حسین نے واپسی کا ارادہ کر لیا مگر اولاد عقیل نے کہا کہ خدا کی قسم ہم واپس نہیں ہونگے یا تو اپنے مقصد میں کامیاب ہونگے یا ہم سب قتل ہو جائیں گے" (مقاتل الطالبین صفحہ ۴۰)

حضرت حسین نے یہ دیکھ کر کہ اب ساری امت امیر یزید کی بیعت میں داخل ہے اور خود کوفہ والے بھی ان سے منحرف ہو کر حکومت کے طرفدار ہیں تو انھوں نے اپنے موقف سے رجوع کرتے ہوئے افسران حکومت سے معاملہ فہمی کے لئے تین شرطیں طے کرانی چاہی یعنی ۱۔مدینے کو واپسی ۲۔کسی سرحدی مقام پر روانگی۔
۳۔امیر یزید کے پاس جا کر اپنے معاملہ کی ان کو حوالگی۔

امیر معاویہ کے زمانہ خلافت میں اسلامی سلطنت کی حدیں وسیع ہو گئی تھیں۔ اور سرحدوں کو محفوظ کر دیا گیا تھا۔ امیر معاویہ کے بعد اس بات کا اندیشہ تھا کہ سرحدوں پر مخالف حکومتوں کا دباؤ بڑھ جائے گا۔ حضرت حسین کے اقدام پر منجملہ اور اعتراضات کے یہ اعتراض بھی کیا گیا تھا کہ ان کی وجہ سے سرحدیں غیر محفوظ ہو جائیں گی۔ اس کے جواب میں حضرت حسین نے شرط پیش کی تھی۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت حسین اپنے موقف سے رجوع کر چکے تھے۔ شیعہ مورخ ابوالفرج اصفہانی نے حضرت حسین کے رجوع پر الگ الگ باب باندھا ہے اور اپنی کتاب "مقاتل طالبین" صفحہ ۱۱۳ پر لکھا ہے "حسین نے عمر بن سعد سے مخاطب ہو کر پوچھا تم اس سے کیا چاہتے ہو؟ میں تمہیں اختیار دیتا ہوں یہ کہ مجھے چھوڑ دو تاکہ میں یزید کے پاس جاؤں یا مجھے واپس جانے دو یا مسلمانوں کی بعض سرحدات کی طرف نکل جانے دو" اسی قسم کے الفاظ شیعہ مورخ مرزا سپہر کاشانی نے بھی اپنی کتاب "تاریخ التواریخ" کتاب دوم جلد ۶ صفحہ ۲۱۹ پر لکھے ہیں۔ یہی بات مصنف نہج البلاغہ شیعہ عالم شریف المرتضیٰ نے اپنی کتاب الشافی میں بیان کی ہے۔

یہ شرائط اس وقت پیش ہوئے جب حضرت حسین کربلا میں تھے اور کربلا اس راستہ پر ہے جو عراق سے دمشق جاتا ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ حضرت حسین خلیفہ کے پاس جو ان کے قریبی رشتہ دار تھے، جانے اور بیعت کرنے کی غرض سے قادسیہ سے اپنے قافلہ کا رخ بدل دیا اور شمال کی طرف بڑھنے کے بجائے مغرب کی طرف دمشق کے راستہ پر چل پڑے تھے کوفی اشرار جو ان کے قافلہ کے ساتھ تھے گھبرائے اور اصرار شروع کیا کہ دمشق نہ جائیں بلکہ یہاں سے قریب دو پہاڑ آجا اور سلمی ہیں، ان کے اس پار چلیں وہاں ہمارے گاؤں ہیں، وہاں بیس ہزار مسلح جوان آپ کی مدد کے لئے فراہم کر لیں گے۔

کوفیوں نے حر بن یزید الریاحی کو آزمودہ کار سپاہیوں کے ایک دستہ کے ساتھ روانہ کیا۔ حر نے قافلہ حسین کو کربلا میں جا لیا اور واپسی پر اصرار کرنے لگا۔ حضرت حسین ان مجوسی زادوں کے طریقہ کو پہلے دیکھ چکے تھے کہ عین وقت پر دھوکا دینا اور بھاگ کھڑے ہونا ان کا شیوہ تھا۔ چنانچہ حضرت حسین ان کے ساتھ جانے راضی نہ ہوئے حر اور اس کے ساتھیوں نے دیکھا کہ حضرت حسین ساتھ چلنے تیار نہیں تو اس نے کہا آپ دمشق جاتے ہیں تو جائیے مگر وہ خطوط جو اہل کوفہ نے آپ کو لکھے تھے دیتے جائیے۔ کیونکہ ان خطوط کا امیر یزید کے ہاتھوں میں پڑنا ان کے لئے پروانہ موت بن جائے گا۔ حضرت حسین نے خطوط دینے سے انکار کیا۔

افسران حکومت کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو راستہ روک کر مطالبہ کیا کہ قافلہ کے پاس جو ہتھیار ہیں ہمارے حوالہ کر دیے جائیں تاکہ کوفیوں کو مزید فتنہ وفساد کا موقع نہ مل سکے۔ ابھی گفتگو ناتمام تھی کہ کوفیوں نے جو حسین کے دمشق جانے سے خائف تھے کہ وہ سزا سے نہ بچ سکیں گے انھوں نے یکایک حملہ کر دیا۔

ساٹھ کوفی جو حضرت حسین کو مکہ سے گھیر کر لائے تھے اب مخالف کیمپ میں تھے۔ یہ جنگ تھوڑی دیر میں ختم ہو گئی۔ کوفی دو باتوں کا اطمینان کرنا چاہتے تھے۔ پہلی یہ کہ حسینی قافلہ میں کوئی مرد زندہ نہ بچے، دوسری یہ کہ خطوط نہ مل سکیں تو مستورات کے خیمہ میں آگ لگا دی تاکہ جہاں بھی ہوں جلکر راکھ ہو جائیں۔ غرض دونوں طرف سے تلوار چل پڑی۔ حضرت عمر بن سعد بن ابی وقاص نے جو فوجی دستہ

کے افسر تھے روکنے کی کوشش کی لیکن تلوار نہ رکی، تھوڑی دیر میں فریقین کے کوئی ڈیڑھ سو قیمتی جانیں تلف ہوئیں ۔ فریقین کلمہ گو تھے ۔ معاملہ بھی دین کا نہ تھا بلکہ کوفیوں کی سازش کے نتیجہ میں یہ ناخوشگوار واقعہ پیش آیا ۔ لیکن ایک فرقہ نے ابو مخنف جیسے جھوٹے شخص کی وضع کردہ داستانیں مشتہر کرکے واقعہ کربلا کو حد درجہ مسخ کرکے پیش کیا ہے ۔

حضرت حسین کو خطوط بھیج کر بلانے والے اور ان کو قتل کرنے والے کوفہ کے شیعہ تھے ۔ ان اہل کوفہ نے خود اقرار کیا کہ ہم نے حسین کو بلایا پھر ہم نے ان پر تلوار چلائی اور جو مصائب ان پر آئے وہ ہمارے سبب سے آئے ۔ اب ہم کو توبہ کرنی چاہیئے ۔

چنانچہ قاضی نور اللہ شوستری "مجالس المومنین" میں لکھتے ہیں: ۔

سلیمان بن صرد خزاعی کوفہ کے رہنے والے تھے ۔ بنی امیہ سے ان کی بغاوت کا سبب یہ ہوا کہ جب کوفیوں کے ایک گروہ نے مسلم کے ہاتھ پر بیعت نہ کرکے ، نقض عہد کیا ، اور حسین کی شہادت کی نوبت پہنچائی ، تو سلیمان چند ماہ بعد متنبہ ہوئے اور انگشت حسرت دانتوں میں دبا کر اپنے اوپر نفریں کرتے تھے کہ دنیا و آخرت کا خسارہ ہم کو حاصل ہوا ہم نے حسین کو بلایا اور اس کے بعد ان پر تلوار کھینچی ۔ ہماری بے وفائی سے ان پر مصیبت آئی ۔

اس جماعت کے سردار بشمول سلیمان بن صرد خزاعی پانچ آدمی تھے ۔ پھر ان کا ارادہ حسین کے خون کے طلب کرنے کا ہوا ۔ جب ارادہ اس بارے میں مضبوط ہو گیا تو ایک بڑی جماعت سلیمان بن صرد کے مکان میں جمع ہوئی ۔ اور سب نے کہا: ۔

اللہ نے ہم کو درازی عمر میں مبتلا کر دیا اور ہم فتنوں میں پڑے ، اب ہم برے کاموں پر نادم ہو کر چاہتے ہیں کہ توبہ کریں ۔ شاید کہ اللہ ہماری توبہ قبول کرکے ہم پر مہربانی کرے ۔

سلیمان صرد نے کہا: ۔ اب کوئی علاج نہیں سوائے اس کے کہ ہم خود کو تلواروں کے میدان میں لائیں ۔ یہ کہہ کر سب شیعہ استغفار کرنے لگے اور کہنے لگے کہ: ۔

مصلحت یہی ہے کہ تلواروں کو میان سے باہر کریں اور دنیا کو آل محمد کے

دشمنوں سے پاک کریں ۔

ہمعصر امت واقعہ کربلا کو ایک افسوس ناک لیکن مختصر سا واقعہ سمجھتی تھی ۔ اس واقعہ کو مبالغہ آرائی کے ساتھ ویسی اہمیت نہیں دی گئی تھی جیسی کہ آج دی جاتی ہے ۔ ان کے پاس جھوٹی روایات کا پلندہ نہ تھا جو بعد کو وضع کی گئیں ۔ اس واقعہ کے چار برس بعد تک امت میں کامل امن اور سکون رہا ۔ ۶۴ ہجری میں جب حضرت عبداللہ بن زبیر نے اپنی خلافت کے لئے خلیفہ وقت یزید کے خلاف پروپگنڈہ شروع کرایا تو اس میں حادثہ کربلا کا ذکر کیا گیا نہ اس تعلق سے خلیفہ یزید کے خلاف کوئی بات کہی گئی ۔ بنو ہاشم اصل صورت حال سے واقف تھے اور جانتے تھے کہ اس سانحہ کی ذمہ داری نہ یزید پر ہے نہ ان کے کسی کارکن پر ۔ چنانچہ سب بنو ہاشم پوری استقامت کے ساتھ بیعت خلافت پر قائم رہے ۔

بنی امیہ کے آخری عہد میں دعوت عباسیہ کو فروغ ہوا تو سبائیوں نے اموی خلافت کے خلاف حضرت حسین کے خروج کو سیاسی اہمیت دے کر اس سے اپنا مطلب حاصل کرنا چاہا ۔

ابو مخنف لوط بن یحییٰ (وفات ۱۵۷ یا ۱۷۰ ہجری) نے جو ائمہ حدیث کے نزدیک ضعیف الحدیث تھا ۔ مقتل کے نام سے نو کتابچے ، مقتل عثمان ، مقتل علی ، مقتل حسن ، مقتل حسین وغیرہ لکھے ۔ مقتل حسین میں حادثہ کربلا کے تقریباً ایک سو برس بعد ابو مخنف نے سماعی باتیں افسانوی انداز میں لکھیں ۔ پھر لطف یہ کہ اس کی تصنیف کا کوئی قلمی نسخہ آج موجود نہیں ۔

ابو مخنف کی وفات کے کوئی ڈیڑھ سو برس بعد ابن جریر طبری (وفات ۳۱۰ھ) نے ابو مخنف کے مقتل حسین کا کامل مواد "قال ابو مخنف" کی تکرار سے اپنی تاریخ میں درج کر دیا ۔ اب یہ نقل شدہ مواد ہی ابو مخنف کے مقتل حسین کا قدیم ترین ماخذ ہے اس وقت ابو مخنف کے مقتل کے متعدد نسخے پائے جاتے ہیں ، جو ایک دوسرے سے مختلف البیان ہیں اور سارے افسانوی اور سرے سے غلط ہیں بعض مشکوک ہیں بعض مبالغہ آمیز اور بعض من گھڑت ہیں ۔

ابو مخنف نے خود کو مورخ کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک غالی شیعہ کی حیثیت

سے پیش کیا ہے ۔ مقتل حسین کا حال یہ ہے کہ جن ہستیوں سے مسلمانوں کو عقیدت ہے اور جن کو مسلمان قابل احترام سمجھتے ہیں' ان پر مصنف نے بے محابا لعنت کی ہے اور ان پر صریح جھوٹ بولے ہیں ۔ ان کے اسمائے گرامی پر لعنۃ کا نشان بنایا ہے اور کہیں کھل کر لعنت کے الفاظ بھی لکھ دیئے ہیں مثلاً زیاد کو حضرت حسین کی زبان سے حرامی اور حرام زادہ تک کہلوادیا ہے. اسی طرح حضرات معاویہ ویزید کو بھی حرامی کہلوادیا ہے اس کتابچہ "مقتل حسین کو پڑھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس سے ابو مخنف کا مقصد تاریخ کو مسخ کرنا اور واقعات کو لغو انداز میں بیان کرنا ہے تاکہ امت مسلمہ ان افسانونی خرافات میں گم ہوکر اپنی تاریخ سے نایوبس ہوجائے اور اسلاف کی عزت دلوں میں باقی نہ رہے مختصر یہ کہ ابو مخنف کی بیان کی ہوئیں داستان غیر مربوط، متضاد بیانات پر مشتمل اور خرافات کا مجموعہ ہے۔

ابن جریر طبری بظاہر شافعی المذہب بنے ہوئے تھے اور اہل سنت سے ہونے کا دعویٰ تھا مگر اہل تحقیق نے طبری کے اس دعویٰ کو تسلیم نہیں کیا۔ طبری بعض امور میں شیعی نقطہ نظر سے اس درجہ ہم آہنگ نظر آتے ہیں کہ ان پر رافضی ہونے کا الزام بھی لگایا گیا۔

ابن خلکان نے صاف لکھ دیا کہ "طبری امامیہ کے اماموں میں سے ایک امام ہے" ہمعصر امت طبری سے اس درجہ ناراض تھی کہ اسے مسلمانوں کے قبرستان میں تک دفن نہ ہونے دیا۔ اور وہ اپنے گھر ہی میں دفن ہوا۔

تاریخ اسلام کو مسخ کرنے میں طبری کا بڑا حصہ ہے۔ یہ امت مسلمہ کی بدقسمتی ہے کہ طبری کے مسلک کو نظرانداز کرکے ان کی تاریخ کو اہمیت دے دی گئی اور واقعہ کربلا کو انتہائی رنگ آمیزی کے ساتھ پیش کیا گیا۔ دیگر علوم کی بہ نسبت طبری نے ایک نئے فقہی مکتب کی بنیاد رکھی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ابن ندیم نے ان کو فقہا کی فہرست میں رکھا ہے اور تاریخ سے متعلق حصہ میں ان کا ذکر تک نہیں کیا۔

کربلا کی صورت حال سے واقفیت کے بعد یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ حضرت حسین سرکاری لشکر کے ہاتھوں قتل نہیں ہوئے ۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ خروج

کرنے والے قرار پاتے حالانکہ وہ اپنے اقدام سے رجوع کرچکے تھے۔

یہ بات بالکل واضح اور صاف ہے کہ جب ان کوفی سبائیوں اور شیعان علی کو جو حضرت حسین کو کوفہ لے جانے کے لئے آئے تھے اور حضرت حسین کو ساتھ لے جارہے تھے یقین ہوگیا کہ حضرت حسین حالات کا جائزہ لے کر اپنا ارادہ بدل چکے ہیں اور دمشق جانے کا قصد کرچکے ہیں تو انھیں صاف نظر آنے لگا کہ اب ہمارا زندہ بچنا مشکل ہے ۔ یہ لوگ حضرت حسین کے عزم دمشق کے سخت مخالف تھے ۔ حضرت حسین کے دمشق کا رخ کرنے سے ان مفسدوں کو اپنے مقصد کی ناکامی کے علاوہ باغیانہ سرگرمیوں کی پاداش میں اب خود اپنی جانوں کا خوف دامن گیر تھا۔ بچاؤ کی صرف ایک ہی صورت تھی کہ جو خطوط حضرت حسین کے پاس تھے وہ ان سے حاصل کرلئے جائیں ۔ حضرت حسین نے خطوط حوالہ کرنے سے انکار کردیا۔ یہ لوگ تعداد میں ساٹھ پینسٹھ تھے ان کے کچھ ساتھی بھی کوفہ سے پہنچ چکے تھے ۔ معاملہ چھینا جھپٹی سے جدال وقتال تک پہنچ گیا۔ حضرت حسین کے اہل بیت گنتی کے بیس پچیس نوجوان تھے ۔ کوفیوں نے چند لمحات میں اسی طرح جس طرح بعد میں جمل وصفین کے معرکوں میں آتش جنگ بھڑکاکر ہزاروں مسلمانوں کے قتل کا ڈرامہ رچایا تھا۔ حضرت حسین اور ان کے اہل بیت کو قتل کردیا۔ اس ہڑبونگ کی آواز جب سرکاری لشکر کے کانوں میں پہنچی تو اس وقت تک کھیل ختم ہوچکا تھا۔ کوفی غداروں نے نواسہ رسول کا خون بہاکر اس المیہ کی بنیاد رکھی جو تاریخ میں ایک جاں گداز حادثہ بن گیا۔

تاریخی طور پر یہ امر تسلیم شدہ ہے کہ حضرت حسین کو شہید کرنے والے کوفی تھے ۔ حضرت زین العابدین، حضرت محمد بن علی (حنفیہ)، حضرت زینب بنت علی ۔ حضرت ام کلثوم بنت علی زوجہ سید ناعمر کی، روایتیں احتجاج طبرسی، کشف الغمہ، حیات القلوب میں ملتی ہیں، جن سے اس حقیقت کی تصدیق ہوتی ہے ۔ واقعہ کربلا کی جو تفصیل محرم کے مہینے میں سنائی جاتی ہے وہ ابی مخنف اور واقدی کی روایتوں پر مبنی ہے جو سب کی سب موضوع ہیں ۔ مراثی، انیس و دبیر نے ان موضوعات میں اضافے کرکے ہندوستان، پاکستان میں اس افسانہ کو وہ رنگ دیدیا جو دیکھنے میں آتا ہے ۔

("خلافت معاویہ یزید" اور "تحقیق سید وسادات" "تحفہ کربلا" اور "مقتل حسین" سے اقتباس۔)

مولود کعبہ

جلاء العیون میں باقر مجلسی نے حضرت علی کے خانہ کعبہ میں پیدا ہونے کی کہانی بیان کی ہے۔یہ داستان کافی طویل ہے۔مختصراً اس کے کچھ حصے پیش ہیں۔ملا باقر مجلسی لکھتے ہیں کہ:۔

"والدہ علی کو وضع حمل کے وقت خانہ کعبہ میں پہنچا دیا گیا انھوں نے دیوار کعبہ سے اپنا شکم ملنا شروع کیا تو دیوار شق ہو گئی اور اس میں ایک دروازہ نمودار ہوا جس میں سے آواز آئی اے مادر افضل اوصیا (وصی کی جمع) اندر آجاؤ اور بچہ جنو"

الغرض یہ تین روز تک کعبہ میں پوشیدہ رہیں اور تین روز بعد نومولود کو لے کر گھر پہنچیں۔کعبہ کے اندر جانے باہر آنے اور گھر پہنچنے کے بعد کیا کیا معجزات علی اور ان کی والدہ کے ظاہر ہوئے اور کن کن امور کی حضرت فاطمہ (حضرت علی کی والدہ اور حضرت علی پر وحی کی گئی۔(یہ تفصیلی داستان جلاء العیون میں موجود ہے)

(۱) فاطمہ بنت اسد جب کعبہ کے سامنے پہنچیں تو اولاً اللہ پر ایمان لائیں اور اپنے مشکل کے حل ہونے کے لئے اپنے بیٹے کا واسطہ دیا۔دیوار کعبہ شق ہو گئی اور فاطمہ اندر داخل ہو گئیں۔لوگوں نے کعبہ کا دروازہ کھولنا چاہا اور بہت زور لگایا لیکن سب ناکام ہو گئے۔

(۲) بقول باقر مجلسی فا . اسد رسول اکرم کی نبوت سے قبل ہی اللہ پر ایمان لے آئی تھیں۔قبول اسلام کا شرف تو فاطمہ بنت اسد کو فتح مکہ کے بعد نصیب ہوا اور اگر ملا باقر مجلسی کی یہی مراد ہے کہ انھوں نے اس وقت نبوت پر ایمان نہ لایا تھا بلکہ صرف توحید پر ایمان لایا تھا تو یہ بات قرآن سے ثابت ہے کہ تمام اہل مکہ اللہ ہی کو مانتے تھے۔

دوسرے یہ کہ فاطمہ بنت اسد نے اللہ کو کسی نبی کا واسطہ نہیں دیا بلکہ ہونے والے بیٹے کا واسطہ دیا۔اسی طرح حضرت علی نے سب سے پہلے اپنی والدہ کی حاجت

براری فرمائی۔

ملا باقر مجلسی مزید کہتے ہیں چوتھے دن دوبارہ کعبہ کی دیوار شق ہوئی فاطمہ باہر نکلیں اور لوگوں کے سامنے ایک خطبہ دیا۔جس کا ماحصل یہ ہے کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوق پر فضیلت دی ہے اور جتنی عورتیں مجھ سے پہلے گذری ہیں حتیٰ کہ آسیہ امرأت فرعون و مریم بنت عمران پر بھی اور اس کی دلیل یہ ہے کہ میرا بچہ کعبہ میں پیدا ہوا اور میں تین روز تک بہشت کے میوے کھاتی رہی۔ہاتف غیب نے مجھ سے کہا کہ اس کا نام علی رکھنا کیوں کہ میں خداوند علی الاعلیٰ ہوں۔میں نے اسے اپنی قدرت و جلال سے پیدا کیا۔اس کا نام اپنے نام پر رکھا۔اپنی عدالت کا کل حصہ اسے بخش دیا۔اسے اپنے آداب تعلیم دیئے اور اپنے تمام احکام اس کے سپرد کر دیئے۔اس پر اپنے تمام مخفی علوم ظاہر کر دیئے یہ سب سے پہلا شخص ہوگا جو کعبہ میں اذاں دے گا۔بتوں کو توڑے گا۔میرے پیغمبر کے بعد امام اور وصی ہوگا۔

امام باقر مجلسی نے تو اپنے خود ساختہ عقیدہ کا اظہار کیا ہے۔لیکن ان کے بیان سے یہ نتائج بھی اخذ ہوتے ہیں۔

(۱) فاطمہ بنت اسد کو تمام مخلوق پر فضیلت دی گئی ہے۔اس لئے وہی سیدۃ النساء اہل الجنہ ہیں نہ کہ فاطمہ بنت محمد (۲) اللہ تعالیٰ نے اپنے نام پر فاطمہ کے بیٹے کو علی کا نام دیا اور اپنے تمام کام اور احکام ان کے سپرد کر دیئے۔ان کے وجود میں آنے کے بعد اللہ تعالیٰ کے ذمہ کوئی کام باقی نہیں رہا۔اب سب کام حضرت علی انجام دیتے ہیں۔اس طرح دو خدا ہوئے۔ایک خدائے معطل اور دوسرے خدا برسر اقتدار (۳) اللہ تعالیٰ نے حضرت علی کو اپنا نام دیا تھا لیکن خود حضرت علی نے یہ اقرار کیا ہے کہ میری ماں نے میرا نام حیدر رکھا ہے۔

(۴) حقیقت تو یہ ہے کہ کعبہ میں سب سے پہلے اذان حضرت بلال نے دی۔پھر رسول اکرم نے حضرت ابو محذورہ کو حرم کعبہ کا موذن متعین فرمایا۔کعبہ کے اندر سے جو بت رسول اکرم کے حکم سے حضرت عمر نے باہر پھینکے اور جو بت اونچائی پر تھے ان کو نکالنے کے لئے رسول اکرم کے دوش مبارک پر کھڑے رہنے والے حضرت علی (نواسہ رسول) تھے۔(۵) جب حضرت علی کو خدائیت کا رتبہ حاصل

ہو گیا تو پیغمبر کے بعد امام اور وصی بنانے کی ضرورت نہ تھی۔ مزید برآں پچیس سال تک دیگر صحابہ واقعتاً امام بنتے رہے اور جب امامت ملی تو کوئی ان کی امامت تسلیم کرنے کے تیار نہ ہوا۔ جو کچھ بھی رہ گئی تھی وہ ان کے صاحبزادہ حسن نے بنو امیہ کے سپرد کر دی۔ پھر چونکہ ہر امام اس کا حق رکھتا ہے کہ وہ کسی کو بھی اپنا وصی مقرر کر دے۔ خواہ زندگی میں یا مرتے وقت اس لحاظ سے تیسرے امام اور وصی امیر معاویہ ہوئے۔ انھوں نے اپنا یہ حق استعمال کرتے ہوئے یزید کو اپنا وصی اور امام متعین کیا۔ (۶) اللہ تعالیٰ سوائے نبیوں کے کسی سے کلام نہیں کرتا۔ فاطمہ بنت اسد کو جو ندا آئی وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں ہو سکتی۔ (۷) مولود کعبہ ہونا موجب افتخار نہیں۔ مزید برآں اس وقت کعبہ بت پرستی کا مرکز تھا اور اس میں (۳۶۰) بت تھے۔

یہ سب سبائی داستانیں ہیں۔ خانہ کعبہ میں دراصل صرف ایک شخص پیدا ہوئے تھے اور ان کا نام حکیم بن حزام ہے۔ یہ حضور سے عمر میں دو سال بڑے تھے اور زید بن عمرو بن نفیل سے متاثر تھے۔ اس لئے بچپن سے بت پرستی سے متنفر تھے۔ کتاب المجر کا مصنف جو خود شیعہ تھا خانہ کعبہ میں صرف حکیم کی پیدائش کا ذکر کرتا ہے

امام نووی شرح مسلم میں فرماتے ہیں حکیم بن حزام صحابی ہیں۔ ان کے مناقب میں یہ بھی ہے کہ وہ کعبہ میں پیدا ہوئے۔ بعض علماء کہتے ہیں کہ اس فضیلت میں ان کا کوئی اور شریک نہیں۔ حکیم بن حزام حضرت خدیجہ کے چچازاد بھائی تھے اور رسول اکرم کے بچپن کے دوستوں میں سے تھے مجوسی طبقہ نے جہاں حضرت علی اور ان کی اولاد کے بارے میں بے شمار احادیث وضع کیں (بقول امام حماد بن زید (ان احادیث کی تعداد تین لاکھ ہے) وہیں یہ کام بھی انجام دیا کہ کسی روایت میں کسی صحابی کی فضیلت نظر آئی اُسے حضرت علی کی جانب منسوب کر کے شہرت دیدی۔ اللہ اور اس کے رسول نے حضرت ابو بکر کو صدیق کا خطاب عطا کیا لیکن اس طبقہ نے حضرت علی کی جانب یہ قول منسوب کیا" میں صدیق اکبر ہوں میرے علاوہ جو اس کا دعویٰ کرے وہ کافر ہے"

(ملت اسلامیہ کی تاریخ تحفہ کربلا اور عترت رسول سے اقتباس)

مباہلہ

مباہلہ کے لغوی معنی ہیں ایک دوسرے کو نفریں کرنا۔ ایک دوسرے کے حق میں بددعا کرنا۔ قرآن مجید میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر کرتے ہوئے یہ بتایا گیا ہے کہ یہ آیات اور حکمت سے لبریز تذکرے جو ہم تمہیں سنا رہے ہیں یہ اصل حقیقت ہے جو تمہارے رب کی طرف سے بتائی جارہی ہے تم ان لوگوں میں شامل نہ ہونا جو اس میں شک کرتے ہیں۔ (خلاصہ آیات ۵۸ تا ۶۰۔ سورہ آل عمران) اس کے بعد یہ آیت ہے۔

فمن حاجک فیه من بعد ماجاءک من العلم فقل تعالوا ندع ابناءنا وابناءکم ونساءنا ونساءکم وانفسنا وانفسکم قف ثم نبتهل فنجعل لعنت الله علی الکذبین (قرآن ۳:۶۱) یہ علم آجانے کے بعد اب جو کوئی اس معاملہ تم سے جھگڑا کرے تو اے نبی اس سے کہو "آؤ ہم اور تم خود بھی آجائیں اور اپنے بال بچوں کو بھی لے آئیں اور اللہ سے دعا کریں جو جھوٹا ہو اس پر اللہ کی لعنت ہو

اس آیت کو آیت مباہلہ کہا جاتا ہے اور اس آیت کی شان نزول کے لئے وضعی روایات کا سہارا لیا گیا ہے۔ روایات کا خلاصہ یہ ہے کہ ۸ ہجری کے آخر یا ۹ ہجری کی ابتدا میں نجران کے چند نصرانی (عیسائی) رسول اکرمؐ کے پاس آئے اور آپ سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں کہا کہ وہ اللہ کے بیٹے تھے۔ ان کا کوئی باپ نہ تھا بلکہ وہ خود خدا تھے۔ مردے زندہ کیا کرتے تھے۔ غیب کی باتیں بیان کرتے۔ اندھوں اور کوڑھیوں کو اچھا کرتے اور مٹی کے پرند بنا کر ان میں روح پھونک دیتے۔

انھوں نے کہا: ۔ وہ اس وقت تک راضی نہ ہوں گے۔ جب تک آپ یہ نہ کہیں کہ حضرت عیسیٰ خدا تھے۔ اگر آپ صادق ہیں تو کوئی ایسا بندہ دکھا دیں جو مردہ کو زندہ یا اندھے یا کوڑھی کو تندرست کر دے اور مٹی کے جانور بنا کر ان میں روح

پھونکے ۔رسول اکرم خاموش ہوگئے۔تب وحی نازل ہوئی کہ جو لوگ حضرت عیسیٰ کو خدا کہتے ہیں وہ بلاشبہ کافر ہیں ۔ساتھ ہی یہ ارشاد ہوا جس کی تفصیل آیت (۶۱) میں بیان ہوئی ہے۔

چنانچہ رسول اکرمؐ نے عیسائیوں کے گروہ سے ارشاد فرمایا:۔

اگر تم اسلام کو نہیں مانتے تو اللہ نے تم سے مباہلہ کرنے کا حکم دیا ہے اور اپنی چادر حضرت علی، حضرت فاطمہ، حضرت حسن اور حضرت حسین کو اڑھا کر لائے۔ ان شخصیتوں کو دیکھ کر عیسائیوں نے علحدہ ہو کر بات چیت کی اور طے کر لیا کہ جزیہ دینا قبول کر لیں گے اور مباہلہ کے لئے نہیں آئے۔یہ روایت الفاظ کی کمی بیشی اور تغیر وتبدل کے ساتھ مختلف مجموعہ ہائے احادیث اور کتب تفاسیر میں منقول ہے۔ ہماری اکثر تفاسیر سدی (اسمعیل بن عبدالرحمن) کلبی (محمد بن السائب) رافضی کی تفاسیر کا چربہ ہیں ۔ان روایات کو تسلیم کرنے سے آیت قرآنی کا مفہوم ہی بدل جاتا ہے۔اور حسب ذیل اشکال سامنے آتے ہیں:۔

۱۔عیسائیوں کے زن وفرزند ساتھ ہی نہ تھے اس لئے مباہلہ کو قبول کرنے کا سوال ہی نہ تھا

۲۔حضرت حسینؓ ۸ ہجری کے آخر یا ۹ ہجری کی ابتدا میں پیدا ہوئے یعنی آیت مباہلہ کے نزول ہی کے زمانہ میں ان کی پیدائش ہے۔اگر وہ پیدا بھی ہوگئے تھے تو زیادہ سے زیادہ ان کی عمر دو تین ماہ ہوگی اور حضرت حسن اس وقت زیادہ سے زیادہ ۲ سال کے ہوں گے ۔اس طرح دونوں گود میں اٹھانے کے لائق ہونگے لیکن اس وقت زنیب بنت رسول کے فرزند علی بن ابن العاصؓ حضرت رقیہ بنت رسول کے فرزند عبدالرحمن بن عثمان اور حضرت ام کلثوم بنت رسول کے فرزند عبداللہ بن عثمان حیات تھے۔ان تینوں نواسوں کو رسول اکرم مباہلہ کے لئے کیوں نہیں لے گئے۔ ظاہر ہے کہ ان کے اموی ہونے کی وجہ سے واضعان روایات نے ان تینوں نواسوں کو شریک نہیں کیا۔

۳۔واضعان روایات نے نواسیوں میں حضرت امامہ بنت زنیب، زنیب بنت فاطمہ اور ام کلثوم بنت فاطمہ کو بھی شریک نہیں کیا۔پنجتن کے نظریہ کو پیش نظر رکھا جائے

تو یہ واضح ہو جائے گا کہ پنجتن میں ایک عورت تو شامل ہو سکتی ہے بقیہ عورتوں کو اس سے خارج رکھنا لازمی تھا اس لئے خود حضرت فاطمہ کی دختران کو بھی شامل نہیں رکھا گیا۔

(۴) بالفرض اگر رسول اکرم مباہلہ کے لئے تشریف لے گئے تھے تو ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ آپ کے ساتھ کم از کم دو افراد دعوت دینے والے ہوتے اور یہ تینوں حضرات اپنے اپنے بیٹوں کو لے کر آتے اور ان کے ساتھ ان کی بیویاں بھی ہوتی اور وہ کچھ اور مزید افراد کو بھی ساتھ لاتے ۔قرآن مجید کے نقطہ نظر سے یہ حکم عام ہے۔اس کو صرف رسول کے خاندان کے بھی صرف مخصوص افراد سے متعلق کرنا درست نہیں۔

سبائی ذہن نے قرآنی آیت کی صورت ہی بگاڑ دی۔حقیقت یہ ہے کہ قرآن کی اس دعوت مباہلہ کو عیسائیوں نے قبول نہیں کیا۔ان کے لئے اس کو قبول کرنا ممکن ہی نہ تھا۔

رسول اکرم کسی کو عبا یا کمبل میں چھپا کر نہیں لائے تھے۔جس نظریہ کو مسلمانوں کے ذہنوں پر مسلط کرنے کے لئے قرآن کی صورت بگاڑی جا رہی ہے۔ (یعنی پانچ مخصوص اشخاص کے مجموعہ کی پرستش) اس کو دیگر اقوام کی طرح اسلام میں بھی پیدا کیا گیا۔

جب ایک بار اسلامی پنجتن وجود میں آگئے تو اسے اتنی بار دہرایا گیا کہ ہر فرد کے ذہن میں یہ بات بس جائے اور دماغ اس کے خلاف سوچ بھی نہ سکے۔

آیت مباہلہ میں انفسنا سے اہل قرابت اور اپنی جماعت کے افراد مراد ہیں جیسا کہ آیات **وَلَا تخرجون انفسکم مّن دیارکم** (۲:۸۴) **یا ثم انتم ھٰؤلاء تقتلون انفسکم** (۲:۸۵) اور **وَلا تلمزوا انفسکم** (۴۹:۱۱) سے ظاہر ہے۔ ان آیات میں انفس سے قریبی افراد یعنی اپنی جماعت کے لوگ مراد ہیں۔آیت مباہلہ کے لفظ انفسنا سے شیعوں نے صرف حضرت علی کی ذات مراد لی ہے اور انھیں نفس رسول قرار دیا، اور رسول اکرم کی جمیع صفات نبوت میں حضرت علی کے لئے مساوات کا عقیدہ تراشا ہے۔آیت مباہلہ میں یہ سب باتیں قطعاً نہیں ہیں۔اگر ان باتوں کو تسلیم کیا جائے تو حضرت علی کو نبوت رسالت۔ختم نبوت اور بعثت الی

فتہ الخلق وغیرہ صفات میں رسول اکرم کے بالکل برابر تسلیم کرنا پڑے گا۔ ظاہر ہے کہ یہ باتیں محض من گھڑت اور دین کے بنیادی عقائد کے خلاف ہیں۔

روایتوں کے بموجب رسول اکرم کی اس دعوت مباہلہ پر عیسائی آپس میں مشورہ کرنے کے بعد، مباہلہ کے لئے تیار نہ ہوئے۔ اس لئے عملاً مباہلہ نہیں ہوا۔ عیسائیوں نے جزیہ دینا قبول کرلیا اور واپس چلے گئے۔

روایات میں موجود ہے کہ رسول اکرم جب مباہلہ کے لئے تیار ہونے لگے تو کچھ افراد کو اپنے ساتھ لیا۔ کن افراد کو ساتھ لیا، اس میں اختلاف ہے۔

ایک روایت کے بموجب رسول اکرم نے حضرات حسنین، حضرت فاطمہ اور حضرت علی کو بلالیا تھا۔ قرآنی آیت میں عورتوں کے لئے نساءنا اور بیٹوں کے لئے ابناءنا کے الفاظ موجود ہیں۔ بیٹیوں کے لئے بنات کا لفظ مذکور ہی نہیں۔ اگر کسی روایت میں حضرت فاطمہ کو بلانے کا ذکر موجود ہو تو وہ استدلال بالروایتہ متصور ہوگا استدلال بالآیتہ نہ ہوگا۔ یہ روایت اس لئے زیادہ قابل اعتنا نہیں کہ رسول اکرم صرف ایک بیٹی کو کیسے لے جاتے اور دوسری خواتین کو شریک نہ کرتے جب کہ آیت مباہلہ میں نساءنا کا حکم ہے۔ اب رہا یہ مسئلہ کہ روایت میں (اگر وہ صحیح ہو) صرف ایک بیٹی حضرت فاطمہ کا ذکر کیوں ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ واقعہ مباہلہ کے وقت آپ کی چار صاحبزادیوں میں صرف ایک فاطمہ ہی بقید حیات تھیں۔ آیت مباہلہ کے سلسلہ میں متعدد روایات موجود ہیں۔ دیانت داری کا تقاضہ ہے کہ سب کو ملحوظ رکھا جائے۔

ایک روایت حضرت جعفر صادق سے ہے کہ انھوں نے اپنے والد محمد باقر کے حوالہ سے کہا کہ رسول اکرم حضرت ابوبکر صدیق کو ان کی اولاد سمیت حضرت عمر فاروق کو ان کی اولاد سمیت، حضرت عثمان غنی کو ان کی اولاد سمیت اور حضرت علی کو ان کی اولاد سمیت مباہلہ کے موقع پر بلاکر ساتھ لائے۔

اس سے واضح ہوا کہ اس موقع پر رسول اکرم نے انفسنا اور انفسکم کی تعمیل میں (جمع کا صیغہ ملحوظ رہے) حضرت علی کے علاوہ اور بھی "اپنوں" کو معہ ان کی اولاد کے بلایا تھا۔ اور مباہلہ کی تیاری میں یہ سب حضرات مدعو تھے۔

ایک اور روایت یہ ہے کہ ایک دفعہ حضرت عمر نے رسول اکرم سے دریافت فرمایا کہ اگر نجران والوں کے ساتھ مباہلہ کی نوبت آتی تو آپ کن کن لوگوں کا ہاتھ پکڑ کر مباہلہ کی بددعا فرماتے؟

رسول اکرم نے ارشاد فرمایا:

فاطمہ، علی، حسن، حسین، عائشہ اور حفصہ کے ہاتھ پکڑ کر مباہلہ کرتا۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس موقع پر خواتین میں حضرت فاطمہ کے علاوہ حضرت عائشہ اور حضرت حفصہ کو بھی شامل کیا جانا منظور خاطر تھا۔ اس روایت سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ مباہلہ کا عملی اقدام نہ ہوا تھا۔

متعہ

متعہ یہ ہے کہ مرد کسی عورت کو کچھ معاوضہ دے کر متعین عرصہ کے لئے اس سے جنسی تعلقات قائم کرے جب وہ مدت گذر جائے تو وہ عورت بغیر طلاق کے مرد سے الگ ہوجاتی ہے۔ شیعہ حضرات سورہ النساء آیت ۲۴ سے یہ استدلال کرتے ہیں کہ اس میں **فما استمتعتم بہ منھن** سے مراد متعہ ہے۔ حالانکہ اس آیت میں استمتعتم سے مراد تمتع یا استفادہ کرنا ہے۔ اس کو متعہ کے اصطلاحی معنوں میں سمجھنا ہرگز درست نہیں۔

قرآن مجید نے زر مہر کو نکاح کے لئے لازمی قرار دیا اور اس حکم کو استقدامی اثر دیتے ہوئے یہ کہا کہ جن عورتوں سے تم نے تمتع کیا (ازدواجی زندگی کا لطف اٹھایا) اس کے بدلے ان کے مہر بطور قرض کے ادا کردو۔ اہل تشیع استمتعتم سے متعہ مراد لیتے ہیں اور یہ معنی لیتے ہیں کہ کسی عورت سے متعہ کرو تو اس کا مہر فوری ادا کرو۔ استمتع کا لفظ سورہ الانعام آیت ۱۲۸ میں بھی استعمال ہوا ہے۔ جہاں اس کے معنی استفادہ کرنے کے ہیں۔

راغب اصفہانی "مفردات القرآن" میں متع کے تمام مشتقات مثلاً متعنھم

(۱۰ : ۹۸) **نمتعھم** (۳۱ : ۲۴) وغیرہ کے معنی تمتع فائدہ اٹھانے یا نفع حاصل کرنے کے بتائے ہیں لیکن شیعوں کے بموجب ایک مقررہ مدت کے لئے جو ایک شب بھی ہو سکتی ہے یا ایک گھنٹہ بھی) عورت اور مرد کا مجامعت کے لئے یکجا ہونا متعہ ہے اس کے لئے اعلان کی بھی ضرورت نہیں جیسی کہ کسی بھی عورت سے نکاح کے لیے ہے ۔ سورہ المومنوں آیت ۳ تا ۷ سے متعہ کا حرام ہونا صاف ظاہر ہے ۔ اللہ تعالیٰ نے مجامعت کی اجازت صرف دو قسم کی عورتوں سے دی ہے ۔ زوجہ منکوحہ یا لونڈی ۔ اور صاف طور پر فرمایا: ۔ جو اسکے علاوہ طلب گار ہوں تو وہی لوگ حد سے باہر نکلے ہوئے ہیں" ۔ وہ مباشرت جسے قرآن مجید حرام قرار دیتا ہے ۔ ہمیشہ حرام رہے گی چاہے اس کو کیسا ہی خوش نما نام دیا جائے ۔ اسلام نے زمانہ جاہلیت کے کئی مناسب رسوم کو باقی رکھا اور نامناسب رسوم کو منسوخ کیا ۔ متعہ بھی ایسا ہی ایک مذموم رواج تھا جس کو قرآن نے منسوخ کر دیا ۔

شیعوں کا یہ کہنا کہ حضرت عمر نے متعہ کو حرام کیا درست نہیں ہے ۔ حضرت عمر امتناعی حکم کے موجد نہیں تھے بلکہ اسے صرف نافذ کرنے والے تھے ۔ قرآن مجید کا یہ حکم چونکہ رسول اکرم کی زندگی کے آخری زمانہ میں نازل ہوا تھا اور بعض لوگوں میں حضرت عمر کے عہد خلافت تک بھی یہ مذموم رواج جاری تھا اس لئے انھوں نے سختی سے متعہ کو منع کیا ۔ اور قرآنی احکام کو موثر طریقہ پر نافذ کیا ۔

ایک مرتبہ عباسی خلیفہ مامون الرشید نے منادی کروائی کہ متعہ جائز ہے تو قاضی یحییٰ نے خلیفہ مامون سے ایک مختصر و لاجواب گفتگو کی ۔

قاضی یحییٰ : اسلام میں ایک نیا رخنہ پڑا ۔

مامون : وہ کیا ؟

یحییٰ : زنا حلال کر دیا گیا ۔

مامون : کیونکر ؟

یحییٰ : متعہ زنا ہی تو ہے ۔

مامون : کس دلیل سے ؟

یحییٰ : سورہ المومنون کی آیات ۳ تا ۷ کے بموجب صرف دو قسم کی عورتوں

سے تمتع جائز ہے ۔ بیوی اور لونڈی ۔ کیا ممتوعہ عورت لونڈی ہے ؟

مامون : نہیں

یحییٰ : پھر کیا وہ زوجہ شرعی ہے ؟ کیا اس کو میراث مل سکتی ہے ؟ (نہ اس کے لئے میراث ہے نہ عدت نہ طلاق نہ نفقہ)

اس گفتگو کے بعد مامون نے اپنا حکم منسوخ کر دیا ۔

جس طرح جاہلیت کے زمانہ میں یہ مذموم رواج موجود تھا ۔ اسی طرح ایران میں جہاں زرتشتی اور مانی مذہب رائج تھے ایسے رواج موجود تھے ۔ مانی مذہب میں تو مائیں اور بہنیں تک حلال تھیں ۔ جب ایرانی حکومت کو زوال آیا تو مجوسیوں نے اسلام کا لبادہ اوڑھ کر اسلام کے خلاف تخریب کاری کی بنیاد رکھی ۔ حتیٰ کہ بدکاری کو بھی اسلام کا لبادہ اوڑھا دیا گیا اور اس کا اسلامی نام متعہ تجویز کیا گیا اور متعہ سے متعلق تمام روایات اور خرافات حضرت علی اور ان کی اولاد کی جانب منسوب کر دی گئیں ۔ اسی متعہ کے سلسلہ میں چند شیعی روایات درج ذیل ہیں ۔

۱ ۔ زرارہ کہتا ہے کہ امام جعفر سے ، ایک ایسے شخص کے متعلق سوال کیا گیا جو گواہوں کے بغیر عورت سے نکاح کرے ۔ امام نے فرمایا: ۔

" کوئی حرج نہیں ۔ اللہ کے نزدیک یہ نکاح صحیح ہے ۔ نکاح کے گواہ تو صرف اولاد کے لئے ہوتے ہیں ۔ اگر نکاح میں اولاد مقصود نہ ہو تو کوئی حرج نہیں ۔"

یعنی امام جعفر صادق کے نزدیک مرد اور عورت تنہائی میں جب چاہیں گواہوں کے بغیر نکاح کر کے اپنے سفلی جذبات کی تسکین کر سکتے ہیں اور یہ فعل قطعاً حلال ہو گا ۔ ۲ ۔ مسلم بن بشیر نے ابو عبداللہ یعنی جعفر سے اس شخص کے متعلق سوال کیا جو بغیر گواہوں کے کسی عورت سے نکاح کرے ۔ انھوں نے فرمایا:

" اس میں کیا حرج ہے ۔ اللہ خود گواہ ہے ۔ اس کے بعد کسی گواہ کی ضرورت نہیں لیکن اگر کسی ظالم حاکم نے پکڑ لیا تو سزا دے گا "

یعنی جو حکومت اس بدکاری پر سزا دے تو وہ ظالم حکومت ہے ۔

۳ ۔ ایک وضعی روایت ہے کہ ایک عورت " عمر کے پاس آئی اور کہنے لگی ۔ میں نے زنا کیا ہے مجھے پاک کر دیجئے ۔ عمر نے رجم کا حکم دیا ۔ امیر المومنین صلوات اللہ علیہ کو

اطلاع ہوئی تو انھوں نے عورت سے تفصیل پوچھی۔اس نے کہا۔

میں جنگل سے گذر رہی تھی مجھے سخت پیاس لگی۔میں نے ایک اعرابی سے پانی مانگا۔اس نے اس شرط پر پانی دینا منظور کیا کہ میں اسے اپنے وجود پر قدرت دے دوں مجھے جان کا خطرہ ہوا تو میں راضی ہوئی اور اعرابی نے مجھے پانی پلایا۔امیرالمومنینؓ نے یہ سن کر فرمایا:۔

"رب کعبہ کی قسم یہ تو نکاح ہے" (فروع کافی)

محاورہ "چلو بھر پانی میں ڈوب مرنا" کی اصل یہی ہے۔اعرابی اس فعل کا بانی مبانی تھا اور اس پر فرد جرم عائد ہونی چاہیئے تھی۔روایت میں اس کا کوئی ذکر نہیں۔حضرت عمر جو اس وقت امیرالمومنین تھے ان کو صرف عمر لکھا گیا ہے اور حضرت علی کو نہ صرف امیرالمومینن لکھا گیا بلکہ ان کے ساتھ وہ الفاظ لکھے گئے جو انبیاء کرام کے ساتھ مخصوص ہیں۔

۴۔ابو جعفر (امام باقر) سے اس شخص کے بارے میں دریافت کیا گیا جس کے پاس بیوی موجود ہو۔پھر وہ بیوی کی ماں بیٹی یا بہن سے زنا کرے۔انھوں نے فرمایا:۔

"کوئی حرام فعل حلال کو حرام نہیں کرتا"

یعنی یہ زنا اس کی بیوی کو اس پر حرام نہیں کرتا۔

دوسری روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ نکاح کی طرح جہاں چار کی تحدید ہے۔متعہ کی کوئی حد متعین نہیں ستر (۷۰) بار یا ایک ہزار بھی ہو سکتا ہے کیونکہ وہ تو اجرت کی چیزیں ہیں اسی طرح متعہ ایک مٹھی گندم یا ایک لکڑی کے عوض بھی جائز ہے۔

مذہب تشیع میں شادی شدہ عورتوں سے متعہ جائز نہیں۔اس کے لئے کنواریاں مخصوص ہیں لیکن یہ اصول رکھا گیا ہے کہ اس سلسلہ میں کسی تحقیق کی ضرورت نہیں۔

کسی نے امام جعفر سے پوچھا:۔"میں نے ایک عورت سے متعہ کیا۔میرے دل میں گمان پیدا ہوا کہ وہ شادی شدہ ہے۔میں نے تفتیش کی تو مجھے اس کا

خاوند ملا۔

امام نے فرمایا:۔تو نے اس بات کی تفتیش کیوں کی۔

اہل تشیع کا عقیدہ ہے کہ جو متعہ نہ کرے وہ قیامت کے دن نکٹا اٹھے گا۔متعہ کا درجہ عبادت کا ہے۔اگر کوئی ایک مرتبہ متعہ کرے تو اسے امام حسین کا مرتبہ ملے گا۔دو مرتبہ متعہ کرے تو حضرت امام حسن کا،تین مرتبہ متعہ کرے تو حضرت علی کا۔چار مرتبہ متعہ کرے تو حضرت محمد کا رتبہ ملے گا۔لیکن یہ بات بھی قابل غور ہے کہ:۔

"اماموں میں سے کسی نے بھی متعہ نہیں کیا"۔

جب متعہ ایک عبادت ہے اور متعہ کنواری لڑکی سے ہو سکتا ہے تو ظاہر ہے کہ کنواری لڑکی کا خود کو متعہ کے لئے پیش کرنا بھی عبادت ہوگا۔

مختصر طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ متعہ اپنے ہر شعبہ میں زنا ہے اور زنا اپنے ہر شعبہ میں متعہ ہے۔امام احمد نے اور شعب الایمان میں بیہقی سے روایت کی ہے کہ:

ایک شخص نے رسول اکرم سے عرض کیا کہ اسے زنا کی اجازت مل جائے۔لوگ سنتے ہی اسے دیکھنے اور جھڑکنے لگے۔رسول اکرم نے اس سے فرمایا:۔قریب آؤ اور بیٹھ جاؤ۔وہ قریب ہو کر بیٹھ گیا۔رسول اکرم نے پوچھا کیا تو اپنی ماں کے لئے یہ بات پسند کرتا ہے۔وہ بولا نہیں آپ نے فرمایا۔ہاں کوئی بھی شخص اپنی ماں کے لئے یہ بات پسند نہیں کرتا۔پھر رسول اکرم نے یکے بعد دیگرے اس سے اس کی اپنی بیٹی، بہن، پھوپی، خالہ سب کے تعلق سے پوچھا کہ کیا وہ ان کے لئے یہ بات پسند کرتا ہے اور ہر مرتبہ اس نے جواب دیا کہ نہیں۔رسول اکرم نے دست مبارک اس پر رکھا اور دعا کی "الٰہی اس کا گناہ دور کر دے۔اس کا دل پاک کر دے اور اس کا ستر محفوظ کر دے" اس دعا کے بعد اس نوجوان نے کبھی ایسی بات کا خیال بھی نہ کیا۔

رسول اکرم نے اس شخص سے سوالات کر کے اس کو یہ سمجھا دیا کہ اگر زنا کی اجازت دی جائے تو زانیہ بہرحال کسی نہ کسی کی بیٹی، بہن، ماں، خالہ یا پھوپی ہوگی۔یہ رشتے ایسے ہیں کہ کوئی شخص فطرتاً پسند نہیں کرتا کہ ان سے زنا کرے۔جواز زنا کی درخواست ایک غیور انسان کی فطرت کے خلاف ہے۔

ت کو مضبوط کرنے کے لئے اسے قرآن مجید نے ساء سبیلا (۱۷: ۳۲)
، نہ پھٹکو وہ بہت برا فعل ہے اور بڑا ہی برا راستہ " یعنی جو کوئی زنا
ھر تک زنا کے لئے ایک راستہ تیار کرتا ہے وہ جس راہ سے دوسرے
ے سر ،، اسی راہ سے دوسرے اس کے گھر آسکتے ہیں۔

بالکل یہی حال متعہ کا ہے۔ متعہ کو تو کار ثواب سمجھا جاتا ہے لیکن جس سے متعہ کیا جائے تو وہ ضرور کسی کی بیٹی، بہن، ماں، خالہ یا پھوپی ہوگی۔ کیا کوئی غیور شخص اس بات کو پسند کرے گا کہ کوئی شخص اس کی بیٹی، بہن، ماں پھوپی یا خالہ سے متعہ کرے۔ یعنی عارضی طور پر اس سے جنسی تعلقات قائم کرے؟ اس طرح جو شخص متعہ کرے لازم ہے کہ اسی متعہ کی راہ سے دوسرا بھی اس کے گھر میں داخل ہوگا۔

(سبائی سبز باغ صفحات ۲۶۷ تا ۲۸۶ "کیا متعہ حلال ہے؟" سے اقتباس)

مہدی کی آمد کے متعلق روایتیں

مختلف مذاہب میں یہ تصورات اور عقائد رہے ہیں کہ آئندہ زمانہ میں کسی شخصیت کا ظہور ہوگا جو دنیا کو ظلم اور برائیوں سے پاک کرے گا اور مثالی معاشرہ قائم کرے گا۔ جب کبھی کوئی شخصیت نمودار ہوتی ہے اور اپنی آواز اٹھاتی ہے اور کسی نہ کسی وجہ سے ناکام ہوجاتی ہے اور اس کو ختم کر دیا جاتا ہے تو عوام میں یہ خیالات پرورش پاتے ہیں کہ دوبارہ اس کا ظہور ہوگا۔ چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے تعلق سے اسی قسم کے عقائد موجود ہیں۔ خواہ اس قسم کے خیالات کسی عظیم شخصیت کے دوبارہ آنے سے متعلق ہوں یا کسی غیر اہم شخصیت کے لیکن واپس آنے کا خیال بنیادی طور پر باطل اور فاسد ہے۔

دشمنان اسلام نے "آل محمد" کا استحصال کر کے اسلام کے مقابلہ میں ایک متوازی قوت کو ابھارنے کی کوشش کی، جس میں ان کو ناکامی ہوئی تو یہ بات مشہور کر دی کہ آخری زمانہ میں خاندان اہل بیت میں سے ایک شخص کا ظہور ہوگا جو اپنی حکومت قائم کرے گا اور سب مسلمان اس کے تابع ہوجائیں گے اور وہ تمام اسلامی

ممالک پر غالب آجائے گا۔ مخصوص فرقے اسے مہدی کہتے ہیں۔ مہدی کے بعد دجال کا اور قیامت کی دیگر شرطوں کا ظہور ہوگا۔ مہدی کے بعد عیسیٰ آسمان سے اتریں گے اور صلوٰۃ میں مہدی کی اقتدار کریں گے۔ اور دجال کو قتل کر دیں گے۔

جو لوگ مہدی کے ظہور کے قائل ہیں احادیث سے استدلال کرتے ہیں لیکن جو ظہور مہدی کے قائل نہیں، انھوں نے ان احادیث پر جرح کی ہے۔ وہ حدیث حضرت انس سے استدلال کرتے ہیں کہ رسول کرم نے فرمایا: ۔ " مہدی عیسیٰ ابن مریم ہی ہیں"۔ ظہور مہدی کے متعلق جو روایتیں ہیں وہ درج ذیل ہیں۔

۱۔ مہدی کا منکر کافر ہے اور دجال کا انکار کرنے والا جھوٹا ہے (مالک بن انس)

۲۔ دنیا کا اگر ایک ہی دن باقی رہے تو اللہ تعالیٰ اس کو طویل کر دے گا حتیٰ کہ اس میں مجھ سے یا میرے اہل بیت سے ایک شخص بھیجے گا جس کا نام میرے نام پر اور اس کے باپ کا نام میرے باپ کے نام پر ہوگا۔ (ترمذی، ابو داؤد)

۳۔ اگر زمانہ کا ایک دن بھی رہ جائے تو حق تعالیٰ میرے اہل بیت میں سے ایک شخص کو بھیجے گا جو دنیا کو انصاف سے بھر دے گا۔ جس طرح وہ تشدد سے بھری ہوئی تھی۔ (ابو داؤد)

۴۔ عنقریب اس (حسن) کی پشت سے ایک ایسا شخص پیدا ہوگا جو نبی کا ہمنام ہوگا اور عادتوں میں آپ سے مشابہ ہوگا۔ شکل و صورت میں نہیں اور دنیا کو انصاف سے بھر دے گا۔ (ابو داؤد)

۵۔ مہدی فاطمہ کی اولاد سے ہوگا۔ (ابو داؤد)

۶۔ ایک خلیفہ کی وفات کے وقت خلیفہ کے بارے میں اختلاف ہوگا تو ایک مدنی بھاگ کر مکہ معظمہ پہنچے گا اس کے پاس مکہ والے آئیں گے اور اسے خلافت کے لئے اٹھائیں گے۔ حالانکہ وہ اسے مکروہ سمجھ رہا ہوگا۔ لوگ حجر اسود اور مقام ابراہیم کے درمیان اس سے بیعت کریں گے وغیرہ وغیرہ۔ اور یہ شخص رسول اکرم کی سنتوں پر عمل پیرا ہوگا اور لوگوں سے بھی عمل کرائے گا۔ اسلام کا غلبہ ہوگا جو سات یا نو سال تک رہے گا۔ (ابو داؤد)

۷۔ مہدی مجھ سے ہوں گے جن کی پیشانی روشن اور ناک بلند ہوگی۔ وہ دنیا کو عدل

وانصاف سے بھر دیں گے جس طرح وہ ظلم وجور سے بھری ہوئی تھی اور سات سال تک حکومت کریں گے۔

۸۔ میری امت میں مہدی پیدا ہوں گے اور پانچ یا سات یا نو سال تک حکومت کریں گے۔ پھر ان کے پاس ایک شخص آکر کہے گا کہ اے مہدی مجھے کچھ دیجئے۔آپ اس کے کپڑے میں اس قدر لپ بھر بھر کر ڈالیں گے کہ وہ اٹھا نہ سکے گا۔(ترمذی، ابن ماجہ، حاکم)

11

۹۔ بنی ہاشم کے کچھ جوان آئے انھیں دیکھ کر رسول اکرم کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔آپ کا رنگ بدل گیا۔وجہ دریافت کرنے پر فرمایا:۔

ہم اہل بیت کے لئے اللہ نے دنیا پر آخرت کو پسند فرمایا ہے۔میرے بعد میرے اہل بیت مصائب سے دوچار ہوں گے۔انھیں وطن سے بے وطن کر دیا جائے گا حتیٰ کہ مشرق سے ایک قوم سیاہ جھنڈیوں کے ساتھ نمودار ہوگی۔ان سے جنگ ہوگی اور ان پر فتح ہوگی اور پھر وہ امن چاہے گی لیکن یہ قبول نہیں کریں گے۔ حتیٰ کہ حکومت میرے اہل بیت سے ایک شخص کو دیدی جائے گی اور وہ دنیا کو انصاف سے بھر دے گا۔ تم میں سے جو شخص ایسا زمانہ پائے اسے ان کے پاس آجانا چاہیئے، چاہے برف پر گھسیٹ کر آنا پڑے۔(ابن ماجہ)

۱۰۔ مہدی ہم اہل بیت میں سے ہیں۔اللہ تعالیٰ اس کے ذریعہ ایک ہی رات میں اصلاح فرمادے گا۔(ابن ماجہ)

۱۱۔ مہدی ہم میں سے ہوں گے اللہ تعالیٰ نے ہم ہی سے دین کی ابتدا کی تھی اور ہم ہی پر اس کی انتہا فرمائے گا۔ہمارے ہی وجہ سے لوگ شرک سے بچیں گے اور ظاہری عداوت کے بعد ان کے دلوں میں محبت پیدا فرمادے گا۔جیسا کہ شرک کی عداوت کے بعد ان کے دلوں میں محبت پیدا کر دی تھی۔وہ لوگ فتنوں میں پھنسے ہوئے کافر ہوں گے۔(طبرانی)

۱۲۔آخری زمانہ میں ایک فتنہ سر اٹھائے گا جس میں لوگ گھل مل جائیں گے جیسے کان میں سونا مٹی سے ملا جلا ہوتا ہے۔میرے اہل بیت میں سے ایک شخص تین جھنڈوں (فوجوں) کے ساتھ کھڑا ہوگا۔ان کی تعداد بارہ تا پندرہ ہزار ہوگی، ان کا امتیازی نشان

امت امت ہوگا۔ان کا سات جھنڈوں والی فوج سے مقابلہ ہوگا۔اللہ تعالیٰ ان سب کو قتل کر ڈالے گا۔اور مسلمانوں کو ان کا انس ومحبت ان کی نعمتیں اور ان کی سمجھ بوجھ عطا فرمائے گا۔

۱۳۔ تمہارے (ثوبان کے) بڑھاپے کے وقت تین آدمی قتل ہوں گے اور تینوں خلیفہ کے بیٹے ہوں گے۔ پھر ملک ان کی اولاد میں سے کسی کو بھی نہ ملے گا۔ پھر مشرق سے سیاہ جھنڈوں والی ایک قوم نمودار ہوگی اور وہ دشمنوں کو خوب قتل کرے گا۔اگر تم اسے پاؤ تو اس کے ہاتھ پر بیعت کر لو۔اگرچہ تمہیں برف پر گھسیٹ کر آنا پڑے۔ کیونکہ وہ اللہ کے خلیفہ مہدی ہیں۔(ابن ماجہ)

۱۴۔ کچھ لوگ مشرق سے نکلیں گے اور مہدی کے لئے اقتدار کا فرش بچھائیں گے (ابن ماجہ)

۱۵۔ میری امت میں مہدی ہوں گے۔ان کی حکومت ۷، ۸ یا ۹ سال ہوگی۔اور زمین پیداوار سب اگل دے گی۔ایک شخص کھڑا ہو کر مہدی سے کہے گا۔ مجھے کچھ دیجئے۔ آپ فرمائیں گے، لے لو۔(طبرانی)

۱۶۔ دنیا ظلم وتشدد سے بھر جائے گی۔اللہ تعالیٰ میری امت میں سے میرے ہم نام شخص کو اٹھائے گا۔جس کا باپ میرے باپ کا ہم نام ہوگا۔وہ دنیا کو عدل وانصاف سے بھر دے گا۔نہ آسمان بارش روکے گا نہ زمین پیداوار۔وہ تم میں ۷، ۸ یا ۹ سال رہے گا۔(مسند بزار وطبری)

۱۷۔رسول اکرم نے حضرت عباس وحضرت علی کے ہاتھ تھام کر فرمایا:۔

عنقریب ان کی نسل میں ایک ایسے شخص کا ظہور ہوگا جو دنیا کو جور وتشدد سے بھر دے گا۔اور ان کی نسل سے ایک شخص کا بھی ظہور ہوگا جو دنیا کو عدل وانصاف سے۔اگر تم وہ وقت پاؤ تو تمیمی جوان کو چمٹ جانا۔وہ مشرق کی جانب سے آئے گا۔اور وہی مہدی کا علمبردار ہوگا۔(طبرانی)

۱۸۔ عنقریب ایک ایسا فتنہ سر اٹھائے گا جو کسی مقام پر دبا دیا جائے تو دوسرے مقام پر سر اٹھائے گا۔ حتیٰ کہ آسمان سے اعلان کرنے والا اعلان کرے گا کہ تمہارا امیر فلاں ہے (طبرانی)

ان تمام روایتوں پر غور کیا جائے گا تو معلوم ہوگا کہ یہ سب ضعیف ہیں اور ان میں باہمی تناقص اور تضاد ہے ۔ صحیح بخاری ۔ صحیح مسلم اور موطا، امام مالک جیسی مستند کتابوں میں کسی ایسی روایت کا وجود نظر نہیں آتا ۔ بلکہ یہ روایات نسبتاً کم درجہ کی کتابوں میں نظر آتی ہیں، جیسے سنن، ابی داؤد، ترمذی، ابن ماجہ وغیرہ ۔ یہ تینوں کتابیں صحیح بخاری، صحیح مسلم، موطا، امام مالک بلکہ سنن، نسائی کے بھی ہم پلہ نہیں ۔ کیونکہ ان میں ضعیف، منکر، منقطع اور مرسل، ہمہ قسم کی روایات پائی جاتی ہیں ۔ ان پر صحت کا حکم اکثریت کے لحاظ سے لگایا گیا ہے ۔ متذکرہ تمام روایات کا تجزیہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مہدی کا کوئی وجود نہیں ۔ البتہ رسول اکرم کی وہ دعا یاد رکھنے کے قابل ہے جو آپ نے امیر معاویہ کے لئے فرمائی تھی ۔ "اے اللہ! اسے ہادی اور مہدی بنادیجئے" (ترمذی) اس حدیث کے تمام راوی ثقہ ہیں اور بہ لحاظ سند یہ حدیث متذکرہ تمام روایات سے ہزار درجہ بہتر ہے ۔ اگر کوئی مہدی ہے تو وہ حضرت امیر معاویہ ہیں اور ان کے بعد اب کوئی آنے والا مہدی باقی نہیں رہا ۔ اس حدیث میں بھی مہدی ایک لفظ ہے ۔ اصطلاح نہیں ۔

اسلام سے قبل یہود و نصاری اس بات کے مدعی تھے کہ ایک آنے والا آئے گا اگرچہ اس آنے والے سے مراد رسول اکرم کی ذات تھی جو آچکی ۔ لیکن چونکہ یہود و نصاری نے رسول اکرم کی نبوت کا انکار کیا اس لئے وہ آج تک ایک آنے والے کی منتظر ہیں ۔ ان کی اتباع میں سب سے پہلے سبائی فرقہ اس کا قائل ہوا کہ حضرت علی دوبارہ دنیا میں تشریف لائیں گے ۔

فرقہ کیسانیہ اس کا قائل ہے کہ "محمد بن حنیفہ آسمان پر اٹھا لئے گئے ہیں ۔ وہ دوبارہ دنیا میں آئیں گے ۔ ایک گروہ کا خیال ہے کہ آنے والا اولاد عباس سے ہوگا ۔ ایک گروہ اس کا قائل ہے کہ آنے والا اولاد حسن سے ہوگا ۔ ایک اور گروہ اسے اولاد حسین سے بیان کرتا ہے ۔ ایک جماعت اس کی قائل ہے کہ صرف حضرت عیسیٰ تشریف لائیں گے ۔

لفظ مہدی، لغوی معنوں میں اس شخص کو کہتے ہیں جو سیدھا راستہ دکھلایا ہوا ہو ۔ قرآن مجید میں ہادی اور مہدی اصطلاح کے طور پر استعمال نہیں ہوئے بلکہ

لغوی معنوں میں استعمال ہوئے ہیں ۔ کسی مخصوص شخص کا لقب نہیں اور نہ مہدویت رسالت اور نبوت کے مانند کوئی منصب ہے جس پر کوئی فائز ہو ۔ مہدی ہدایت یافتہ کو کہتے ہیں ۔ اسلام کے مختلف فرقوں نے اس لفظ کو اصطلاح قرار دے کر اس کے معنی اپنے عقائد کے مطابق گھڑ لئے مثلاً جو لوگ سید محمد مہدی جونپوری کو "مہدی" مانتے ہیں ان کے بموجب مہدی کے اصطلاحی معنی یہ ہیں ۔ "مہدی ایسا کامل انسان ہے جو محمد رسول اللہ کے قدم بقدم بے خطا شریعت اور روش رسول پر چل کر منزل مقصود کو پالیا ہو ۔ یعنی خدا کی ذات میں واصل ہو کر مقام خاص "عبداللہ" میں جو مقام خاتم الرسل ہے شریک ہو کر مساوات حاصل کر لیا ہوا مقام خاص مراتب عروج کی تکمیل کے بعد اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ کے اس تابع تام کو اپنا خلیفہ مقرر کر کے اس نبی ہی کی نبوت کے باطن یعنی ولایت کے احکام کی تبلیغ اور امت محمد کو ہلاکت سے محفوظ رکھنے کے لئے مراد الہیٰ شان کے مطابق اپنے ہی نبی کی صورت اور سیرت پر اس کا ہم نام و نشان بنا کر اس نبی کی آل ہی میں مبعوث کیا ہو تا کہ وہ مہدی کی حقیقی ہدایت یعنی خدا کے دیدار اور اس کی معرفت کی طرف خدا کے بندوں کو دعوت کرے ۔ اس مقام کا حامل "مہدی" چونکہ ولایت محمدیہ کا خاتم اور خدا کا خلیفہ ہوتا ہے ۔ اس لئے خدا تعالیٰ اور اس عبداللہ، فانی فی اللہ، باقی باللہ، خلیفتہ اللہ کے درمیان کوئی دوسرا واسطہ نہیں ہوتا بلکہ اس کو خداوند عالم بلاواسطہ جبریل خود تعلیم فرماتا ہے ۔"

اسی طرح مدعیان مہدیت کو ماننے والوں نے "مہدی" کی اصطلاح کے معنی الگ الگ وضع کر لئے ہیں اور نتیجہ اخذ کیا ہے کہ یہ اصطلاح اس خاص شخص کا لقب ہے جس کو مہدی مانتے ہیں حالانکہ قرآن مجید اور احادیث میں رسول اکرمؐ نے اس لفظ کو لغوی معنوی ہی میں استعمال فرمایا ۔

مہدی سے مراد لغوی معنوں میں ہدایت پایا ہوا لیں تو ہزارہا ہدایت پائی ہوئی ہستیاں گذر چکی ہیں اور آئندہ بھی برابر آتی رہیں گی ۔ مہدی کے منتظرین کے مقابلہ میں ہر زمانہ میں حق پرستوں کی ایک جماعت رہی ہے ۔ جو رسول اکرمؐ کی سنت کے احیا کو اپنا نصب العین بناتی ہے اور برائیوں کو مٹانے کی کوشش کرتی ہے جو

لوگ اس سے وابستہ ہوتے ہیں نہ خود کو مہدی بتاتے ہیں نہ کوئی اس قسم کا دعویٰ کرتے ہیں اور نہ دعویٰ کرنے والے کا ساتھ دیتے ہیں ۔ ایسے ہدایت پائے ہوئے نفوس ایک وقت میں سینکڑوں ہوسکتے ہیں خواہ ان کا نام کچھ ہی ہو صرف ان کی آمد سے امت مشکلات سے عہد برآ نہیں ہو سکتی ۔ مشکلات کا واحد علاج پکے مومن بننا اور باہم متحد ہونا ہے ۔ ورنہ فرضی اصطلاح میں مہدی ظاہر ہوں گے تو امت کے کچھ افراد انھیں قبول کریں گے اور کچھ قبول نہ کریں گے جیسا کہ اب تک ہوا ہے اور اس طرح نئے فتنوں کا دروازہ کھلے گا ۔ ایسی صورت میں بہتر یہ ہے کہ اگر اصطلاحی معنوں کے مہدی ، پیدا نہیں ہوئے ہیں تو اپنے ظہور کا ارادہ نہ فرمائیں ۔ اور اگر ابھی عالم وجود میں نہیں آئے ہیں تو ہماری دعا ہے کہ وہ کبھی تشریف نہ لائیں تاکہ امت مزید فتنوں سے دوچار نہ ہو ۔

خلیفۃ المہدی (وفات ۱۶۹ھ ہجری) کے عہد میں واپسی امام مہدی پر کثرت سے احادیث وضع ہوئیں حتیٰ کہ خلیفہ کو ایک محکمہ "صاحب الزنادقہ" قائم کرنا پڑا ۔

ظہور مہدی کی فرضی اور وضعی روایتوں نے اسلام کی مرکزی قوت کو بہت نقصان پہنچایا اور بے شمار مفسدانہ سیاسی تحریکات نے ان وضعی روایات کی آڑ لے کر کمزور عقیدہ رکھنے والوں کا استحصال کیا اگر مہدویت سے متعلق احادیث صحیح ہیں اور حقیقتاً عقیدہ سے اس کا کچھ تعلق ہے اور فی الوقع آنے والے مہدی کا نام محمد اور باپ کا نام عبداللہ ہے تو کسی مدعی مہدویت کو گمراہ اور مرتد قرار دینے کی کیا دلیل ہے ؟ ۔

اہل تشیع اثنا عشری بارہویں امام کو مہدی سمجھتے ہیں گیارہ سو سال سے ان کے ظہور کا انتظار کر رہے ہیں ۔ اسماعیلی شیعہ کہتے ہیں کہ ساتواں دور محمد اسماعیل اور ان کے خلفا کا ہوگا جن کا ساتواں مہدی ہوگا ۔

مہدویت کا ڈھونگ رچاکر ہر زمانہ میں کسی نے کسی نے مہدی ہونے کا دعویٰ کیا ۔ ان میں سے بہت سے مارے گئے اور بہت سوں نے سادہ لوح عوام کو گمراہ کیا ۔ ایسے مدعیان مہدی کی تعداد ۶۰، ۷۰ تک پہنچی ہے ۔ جن میں مہدی سوڈانی سید محمد مہدی جونپوری وغیرہ شامل ہیں ۔

قادیانیت کی بنیاد بھی اسی عقیدہ پر ہے ۔ غلام احمد قادیانی (وفات ۱۹۰۸ء) نے

عیسیٰ علیہ السلام کے ظہور اور مہدی کے ظہور کو ملا کر اپنے مسیح موعود ہونے کا دعویٰ کیا ۔

مسئلہ انتظار مہدی مسلمانوں کی تاریخ کے مختلف ادوار میں ہمیشہ ایک نئے فتنہ کی صورت میں سامنے آیا ۔ اس سلسلہ میں بیسیوں مدعیان مہدویت کے نام پیش کئے جاسکتے ہیں اور فیصلہ کرنا بہت آسان ہوجاتا ہے کہ ظہور مہدی کا بانی کونسا فرقہ اور اس کے پس پشت کونسی سازش کارفرما ہی ۔

آج تک جن جن لوگوں نے مہدویت کا دعویٰ کیا ان کی فہرست طویل ہے ۔ ان میں سے جن کو عالمگیر شہرت حاصل ہوئی ان کی تعداد بھی ۵۰، ۶۰ سے کم نہیں ۔ ان میں سے بیشتر رافضی تھے ۔ ان سے میں یہ بات مشترک ملے گی کہ سب نے اہل سنت کا قتل عام کیا اور سب نے اسلام میں ایسے نئے شگوفے چھوڑے کہ آج اصل اسلام عوام کے پاس موجود نہیں ان ہی عقائدی فتنوں کا نتیجہ ہے کہ جب ایک عام مسلمان اسلام کی بات کرتا ہے تو وہ اسلام ہرگز مراد نہیں ہوتا جو قرآن مجید نے ہم کو دیا ہے ۔

("مہدویت نے اسلام کو کیا دیا" اور انتظار مہدی و مسیح سے اقتباس)

میلاد

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ چھ سو سال تک امت میلاد کی محفلوں سے ناآشنا رہی ان چھ صدیوں میں مسلمانوں نے کبھی میلادالنبی کے نام سے کوئی جلسہ یا کوئی محفل نہیں سجائی ۔ محفل میلاد کا آغاز سب سے پہلے ۶۰۴ھ میں سلطان ابو سعید مظفر شاہ اربل نے کیا اور ابوالخطاب ابن وحیہ نے ۱۲/ ربیع الاول کو رسول اکرم کی پیدائش کا دن قرار دیا ۔ جس میں تین چیزیں بطور خاص ملحوظ تھیں ۔

۱ ۔ بارہ ربیع الاول کی تاریخ کا تعین ۲ ۔ علماء کا اجتماع ۳ ۔ ختم محفل پر تناول طعام کا اہتمام اور اس کے ذریعہ رسول اکرم کی روح پر ایصال ثواب ۔

جب یہ نئی رسم میلاد نکلی تو علماء امت کے درمیان اس کے جواز اور عدم جواز کی بحث چلی ۔ علامہ فاکھانی اور ان کے ساتھیوں نے ان خودساختہ قیود کی بناء پر

ان محفلوں میں شرکت سے عذر کیا اور اسے "بدعت" قرار دیا۔ دیگر علما نے سلطان کی ہم نوائی کی اور ان محفلوں کے جواز کا فتویٰ دیا۔

جب ایک بار یہ رسم چل نکلی تو یہ صرف علما کے اجتماع تک محدود نہ رہی بلکہ عوام کے دائرہ میں آکر نئی نئی اختراعات کی جانے لگیں۔ آج ہمارے سامنے عید میلادالنبی کی "ترقی یافتہ" شکل موجود ہے۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اس میں مزید کتنی ترقی مقدر ہے۔

قابل غور بات تو یہ ہے جو فعل صحابہ و تابعین کے زمانہ میں کبھی نہیں ہوا، بلکہ جس کے وجود سے اسلام کی چھ صدیاں خالی گذریں وہ آج "اسلام کا شعار" بن گیا اس شعار اسلام کو منانے والے "عاشقان رسول" کہلاتے ہیں اور جو اس نو ایجاد شعار اسلام کو نامناسب سمجھتے ہیں انھیں دشمنان رسول تصور کیا جاتا ہے۔ کاش ایسا تصور کرنے والے کبھی تو یہ سوچ ہوتے کہ جو مسلمان چھ صدیوں تک اس شعار اسلام سے محروم رہے ان کے بارے میں کیا کہا جائے گا۔ کیا وہ سب نعوذ باللہ دشمنان رسول تھے؟ ایسا تصور کرنے والے نے شاید اس بات پر بھی غور نہیں کیا کہ اسلام کی تکمیل کا اعلان تو "حجۃ الوداع" میں عرفہ کے دن ہو گیا تھا اس کے بعد کس نے ان محفلوں کی شعار اسلام بنا دیا۔

دراصل اسلام سے پہلے کی قوموں میں اپنے بزرگوں اور بانیان مذاہب کی برسی منانے کا معمول ہے جیسا کہ عیسائیوں میں عید میلاد مسیح منائی جاتی ہے۔ اسلام نے برسی منانے کی رسم کو ختم کر دیا۔ برسی یا سالگرہ کے موقع پر خوشی کا اظہار جن طریقوں سے کیا جاتا ہے، ان کو اسلام کی دعوت اور اسلامی مزاج سے کوئی مناسبت نہیں۔ اسلام اس نمود و نمائش، نعرہ بازی اور شور و شغف کا قائل نہیں۔ اسلام اپنی دعوت کا آغاز دلوں کی تبدیلی سے کرتا ہے۔ اسلام کی نظر میں یہ ظاہری تماشے کوئی قیمت نہیں رکھتے۔ جن کے بارے میں کہا گیا ہے۔

جگمگاتے ہیں در و دیوار دل بے نور ہے

دوسری اہم بات یہ ہے کہ اسلام دیگر مذاہب کی طرح کسی خاص موسم یا تاریخ پر برگ و بار نہیں لاتا۔ وہ تو ایسا سدا بہار شجر ہے جس کا پھل اور سایہ قائم

و دائم ہے اس کی دعوت اور اس کا پیغام کسی خاص تاریخ کا مرہون منت نہیں بلکہ آفاقی اور ابدی ہے۔

اور پھر دوسری قوموں کے پاس تو دو چار ہستیاں ہوں گی، جن کی سالگرہ مناکر وہ فارغ ہوجاتی ہیں۔ اس کے برعکس اسلام کے دامن میں لاکھوں قدآور ہستیاں موجود ہیں۔ اسلام کے پاس تقریباً سوا لاکھ کی تعداد تو انبیاء کی ہے۔ صحابہ کرام کی تعداد بھی سوا لاکھ ہی کے لگ بھگ ہے۔ پھر ان کے بعد ہر صدی کے اکابر اولیاء اللہ ہیں جو اپنے اپنے وقت میں رشد و ہدایت کے مینارہ نور تھے اب اگر اسلام شخصیتوں کی سالگرہ منانے کا دروازہ کھول دیتا تو ان کو منانا عملاً بھی ممکن نہ تھا۔

اسلامی تاریخ میں چھٹی صدی ہجری وہ زمانہ ہے جس میں فرزندان تثلیث نے صلیبی جنگیں لڑیں اور عالم اسلام کو روند ڈالا۔ ادھر مسلمانوں کا اسلامی مزاج داخلی فتنوں کی مسلسل یلغار سے کمزور پڑ گیا تھا۔ ادھر مصیبت کے اس عالم میں اسلام پر فاتحانہ حملہ ہوا اور مسلمانوں میں پہلی مرتبہ احساس کمتری پیدا ہوا۔ اس لئے عیسائیوں کی تقلید میں مسلمانوں نے بھی مقدس نبی کے یوم ولادت کا جشن منانے کی ابتداء کی۔ یہ قوم کے کمزور اعصاب کی تسکین کا ذریعہ تھا جسے امت کے مجموعی مزاج نے قبول نہیں کیا بلکہ ساتویں صدی کے آغاز سے لے کر آج تک علماء امت نے اسے بدعت قرار دیا۔

اگرچہ کہ میلاد کی رسم ساتویں صدی ہجری کے آغاز سے شروع ہوچکی تھی اور لوگوں نے اس میں بہت سے اضافے بھی کئے لیکن کسی کو یہ جرات نہیں ہوئی تھی کہ اسے عید کا نام دیتا کیوں کہ رسول اللہ کی واضح تعلیمات اس کے خلاف ہیں، مگر اب چند سالوں سے اس سالگرہ کو "عید میلادالنبی" بھی کہا جارہا ہے۔

رسول اکرمؐ نے عید کے دو دن مقرر کئے۔ "عیدالفطر" اور "عیدالضحیٰ" اگر رسول اکرمؐ کے یوم ولادت کو بھی عید کہنا درست ہوتا اور یہ بات اسلام کے مزاج سے مناسبت رکھتی ہے تو رسول اکرمؐ اس کو بھی عید قرار دے سکتے تھے، یا خلفائے راشدین ہی آپ کی یوم ولادت کو عید قرار دیتے مگر ایسا نہیں کیا گیا۔ اس سے دو ہی

نتیجے نکل سکتے ہیں یا تو ہم اس عید کو عید کہنے میں غلطی پر ہیں یا یہ کہ نعوذ باللہ صرف ہم کو رسول اکرمؐ کے یوم ولادت کی خوشی ہے مگر صحابہ کرام اور خلفائے راشدین کو کوئی خوشی نہ تھی۔

پھر یہ بھی ایک ستم ہے کہ رسول اکرمؐ کی تاریخ ولادت میں تو اختلاف ہے۔ بعض ۸ ربیع الاول بتاتے ہیں، بعض ۹، اور مشہور ۱۲ ربیع الاول ہے لیکن اس میں کسی کا اختلاف نہیں کہ رسول اکرم کی وفات ۱۲ ربیع الاول کو ہوئی گویا ہم نے "عید" کا دن بھی تجویز کیا تو وہ جب کہ رسول اکرمؐ نے وفات پائی۔

بہرحال عید اسلامی اصطلاح ہے اور اسلامی اصطلاحات کو غیر منقول جگہوں پر خود رائی سے استعمال کرنا دین میں تحریف ہے۔ پھر طرفہ یہ کہ میلاد کے موقع پر نعتیں پڑھی جاتی ہیں جن میں ایسا مبالغہ ہوتا ہے جس میں اسلامی عقائد کو ملحوظ نہیں رکھا جاتا اور موضوع اور من گھڑت قصے کہانیاں بیان کی جاتی ہیں جن کا حدیث و سیرت کی کتاب میں کوئی جواز نہیں۔

اگر تاریخ کی تخصیص کے بغیر رسول اکرم کی سیرت کو بیان کرنے کے لئے جلسے منعقد کئے جائیں جو شور و شغف، چراغاں، جلوس اور دوسری بدعات سے پاک ہوں جن میں اسلام کی سادگی کو ملحوظ رکھا جائے تو بہت مناسب ہوگا۔

("اختلاف امت اور صراط مستقیم" اور "میلاد کی حقیقت" سے اقتباس)

ناد علی

ناد علی ایک وضعی دعا ہے۔ جس کے متعلق شیعوں کا عقیدہ ہے کہ یہ احد یا فتح خیبر کے موقع پر نازل ہوئی تھی۔ دعا یہ ہے:۔

نادِ علیاً مظھر العجائب ، تجدہ عوناً لک فی النوائب
کلّ ھمٍ و غمٍ سینجلی ، بنبوتک یا محمد بولایتک یا علی

اے محمدؐ تم علی کو پکارو کہ وہ "مظہر العجائب" (تعجب میں ڈالنے والی چیزوں کا

ظاہر کرنے والا) ہیں تم ان کو مصیبتوں کے وقت اپنا ناصر و غمگسار پاؤ گے۔ قریب ہے کہ ہر مصیبت و غم زائل ہو جائے یہ بہ سبب تمہاری نبوت کے اے محمد اور یہ بہ سبب تمہاری ولایت کے اے علی

یہ دراصل اشعار ہیں جو کسی رافضی کے موزوں کئے ہوئے ہیں۔ اس کو اللہ کی جانب سے نازل کی ہوئی دعا سمجھنا محض نادانی ہے۔ کوئی دعا اشعار کی شکل میں نازل نہیں ہوئی۔ یہ بھی غور طلب ہے کہ جو کچھ اللہ کی جانب سے نازل ہوا وہ قرآن مجید میں موجود ہے ایسی کوئی دعا قرآن مجید میں موجود نہیں۔ رسول اکرم کو یہ حکم دینا کہ تم علی کو پکارو مضحکہ خیز ہے۔ رسول اکرم نے تو خود کو پکارنے کا بھی کوئی حکم نہیں دیا۔ اسلامی تعلیمات کی رو سے مصیبت کے وقت صرف اللہ کو پکارنے کا حکم دیا گیا ہے۔ حضرت علی کے تعلق سے ایسا عقیدہ رکھنا کہ وہ تعجب میں ڈالنے والی چیزوں کے ظاہر کرنے والے ہیں دینی عقائد کے خلاف ہے۔

سبائیوں کا عقیدہ ہے کہ اس دعا کے پڑھنے سے خوف دور ہو جاتا ہے اور آفتوں سے نجات ملتی ہے۔ ناد علی کی وضعی دعا کے مقابلہ میں جو اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے صحیح العقیدہ مسلمانوں نے حسب ذیل دعا وضع کی ہے جو اسلامی تعلیمات کے عین موافق ہے:۔

نادالقوی جلّ جلاله

نادِ قویاً بدیعَ الخَلائق
تجدہٗ عوناً لکَ فی الشدائد
کلّ همّ و غم سینجلی
بقوتک یا قوی یا قوی

اللہ قوی کو پکارو جس نے تمام مخلوق کو انوکھے طریق پر پیدا کیا۔ تم تمام سختیوں اور مصیبتوں میں اللہ قوی کو اپنا مددگار پاؤ گے۔

تیری قوت سے تمام رنج اور تمام غم مٹ جائیں گے۔ اے اللہ قوی جل جلالہ، اے اللہ قوی جل جلالہٗ اے اللہ قوی جل جلالہٗ

نہج البلاغہ

شیعہ حضرات نہج البلاغہ کو حضرت علی کے خطبات کا مجموعہ مانتے ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ چند فصحائے شیعہ کے مقالات کا مجموعہ ہے جسے حضرت علی سے منسوب کر دیا گیا اور حضرت علی کے فرمودات میں سے بعض کلمات کو مسخ کر کے مقالات میں پیش کر دیا گیا البتہ جزو قلیل خطبات و مراسلات میں حضرت علی کے فرمودات بھی شامل ہیں جو دوسری کتب میں بھی پائے جاتے ہیں۔

نہج البلاغہ کے مصنف کا صحیح طور پر تعین نہیں "عمدۃ الطالب" کے شیعہ مولف نے ابو الحسن محمد بن حسین موسوی لقب شریف الرضی (وفات ۴۰۶ھ) کو اس کتاب کا مصنف بتایا ہے

بعض مورخین نے شریف الرضی کے بڑے بھائی علی بن علی حسین موسوی لقب شریف المرتضیٰ (وفات ۱۴۳۶) کو بھی اس کتاب کی تصنیف میں شریک بتایا ہے۔ دوسرے مصنفین مثلاً ابن خلکان، ابن کثیر وغیرہ نے شریف المرتضیٰ کو نہج البلاغہ کا مصنف کہا ہے۔ شریف المرتضیٰ بھی اپنے چھوٹے بھائی کی طرح عربی کے بلند پایہ ادیب تھے۔ دونوں بھائی غالی شیعہ اور کٹر رافضی تھے۔ شیعہ مذہب کے اصول و فروع پر شریف المرتضیٰ کی تصانیف تھیں

بعض محققین کے بموجب شریف الرضیٰ اور شریف المرتضیٰ ہی اس کتاب کے مصنف نہیں بلکہ یہ مختلف شیعہ مصنفین کے مقالات کا مجموعہ ہے۔

علامہ الذہبی نے "میزان الاعتدال فی نقد الرجال" میں شریف المرتضیٰ کا تعارف "المتکلم الرافضی المعتزلی" کے الفاظ سے کرواتے ہوئے لکھا ہے کہ :۔ "نہج البلاغہ انھوں نے ہی وضع کی تھی" مقالات کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

"ان کی (شریف المرتضیٰ) کتاب نہج البلاغہ کا جو کوئی مطالعہ کرے وہ یہ نتیجہ اخذ کئے بغیر نہ رہے گا یہ سب حضرت علی پر جھوٹ اور بہتان ہے کیونکہ اس میں حضرت ابو بکر، عمر جیسی محترم ہستیوں کی صریح بدگوئی اور تنقیص ہے، اور اس میں بعض

رکیک باتیں اور عبارتیں ایسی ہیں جن کو پڑھ کر ہر اس شخص سے جسے صحابہ کے اور ان کے بعد کے متاع دین (یعنی تابعین) کے افکار و ذہنیت سے واقفیت ہو گی وہ اسی نتیجہ پر پہنچے گا کہ اس کتاب کا بیشتر حصہ باطل ہے"

نہج بلاغہ چوتھی صدی ہجری کے اواخر کی تصنیف ہونے کا ایک ثبوت یہ ہے اس زمانہ میں عبیدیوں کو قوت حاصل ہو گئی چنانچہ نہج البلاغہ کے مصنف نے حضرت علی کی زبان سے عبیدیوں کے فاطمی نسب ہونے کے ثبوت میں یہ الفاظ ادا کروائے۔

" پھر قیروان کا حاکم ظاہر ہوگا جو نو خیز، نازک اندام، سچے نسب والا ہوگا اور وہ اعلیٰ خاندان والے چادر سے ڈھکے ہوئے کی اولاد سے ہوگا"

ابن ابی الحدید نے نہج البلاغہ کے ان فقرات کی تشریح میں لکھا ہے کہ "چادر سے ڈھکے ہوئے" سے مراد اسماعیل سے ہے جو حضرت علی کی وفات سے تقریبا ایک صدی بعد اپنے والد جعفری کی زندگی میں مرگئے تھے"

وضعی روایت میں کہا گیا ہے کہ ان کو ایک چادر سے ڈھانپ کر شیعوں کو دکھایا جاتا تھا۔ عبید اللہ نے اسماعیل کے فرزند محمد کی اولاد میں ہونے کا دعویٰ کیا تھا عبید اللہ ہی نے حضرت علی کی وفات کے تقریباً ڈھائی سو سال بعد قیروان پر قبضہ کر لیا تھا۔ قیروان کا کوئی وجود حضرت علی کے زمانہ میں نہ تھا۔

حضرت علی کے اس وضعی قول کی جعلسازی ثابت ہو گئی کیونکہ مسلمانوں میں سے کسی نے عبیدیوں کے دعوے کو قبول نہیں کیا۔ اسی طرح "منہاج السنت النبویہ" کے مصنف نے نہج بلاغہ پر تفصیل سے گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے۔

" صاحب نہج البلاغہ نے جو خطبے درج کئے ہیں وہ اکثر و بیشتر حضرت علی پر بہتان میں حضرت علی کی ذات اس سے ارفع و اعلیٰ ہے کہ وہ اس قسم کا کلام کرتے جو اس کتاب میں ہے لیکن ان لوگوں نے جو جھوٹی باتیں وضع کر دیں اور سمجھا کہ یہ علی کی مدح ہے حالانکہ نہ یہ باتیں سچ ہیں اور نہ مدح۔

نہج البلاغہ کے خطبوں اور تقریروں کے علاوہ مراسلات اور اقوال کا بیشتر حصہ بھی وضعی اور جعلی ہے خصوصاً حکم کے اقوال دوسروں کی جیب سے نکال کر اپنے

ممدوح یعنی حضرت علی کے جیب میں ڈال دیئے ہیں ۔ بغداد کے روافض کی جماعت نے جن میں شریف الرضی اور شریف المرتضیٰ کو امتیاز حاصل تھا بنی بویہ کی سرپرستی میں یہ کتاب تصنیف کی جو حقیقت اور اصلیت کے اعتبار سے فضلائے روافض کے مقالات کا مجموعہ ہے جن میں انھوں نے اپنے مخصوص عقائد و افکار کو حضرت علی کی زبان سے ادا کیا ہے تاکہ حضرت علی سے منسوب ہوکر ان خیالات کو اعتبار کا درجہ حاصل ہو۔

نہج البلاغہ کی بے شمار اندرونی شہادتیں، خطبات کی زبان، اسلوب بیان اور ایسے معرب الفاظ کو جو لغت میں مولدۃ کہلاتے ہیں اور جو تیسری چوتھی صدی ہجری میں یونانی اور دوسری زبانوں کی کتابوں سے تراجم کی ضرورت سے وضع ہوئے تھے، ایسی موجود ہیں جو اس بات کا بین اور مسکت ثبوت ہیں کہ یہ کتاب بنی بویہ کے اقتدار کے زمانہ میں تصنیف ہوئی اور اس کی زبان حضرت علی کی زبان سے بالکل مختلف ہے

نہج البلاغہ میں وقتاً فوقتاً بعد میں بھی کچھ اضافے ہوتے رہے ۔ نہج ابلاغہ کی شہرت زمانہ تصنیف سے تقریبا دو سو برس بعد اس وقت سے ہوئی جب آخری خلیفۂ عباسی کے رافضی وزیر ابو طالب علقمی نے ابن ابی الحدید سے نہج البلاغہ کی شرح لکھوائی۔

جنگ صفین کے بعد حضرت علی کوفہ گئے اور اس کو دارالخلافہ قرار دیا۔ کوفہ حضرت عمر کے زمانہ سے فوجی چھاؤنی تھا۔ تحکیم سے وفات تک حضرت علی نے تقریبا ساڑھے تین سال کوفہ میں گذارے۔ اس عرصہ میں انھوں نے اپنی فوج کے سپاہیوں سے خطاب کیا جو شیعان علی تھے۔ حضرت علی کے فیصلے ان کی فوج کو درپیش مسائل سے متعلق تھے ۔ حضرت عمر کے فیصلے اس لئے مشہور ہوئے کہ انھوں نے ہر مسئلہ کو جو ان سے دریافت کیا گیا رسول اکرم کے اصحاب کے سامنے پیش کیا، حالانکہ وہ خود سب سے بہتر فیصلہ کر سکتے تھے۔ جب سب کے خیالات معلوم ہوجاتے اور سب ایک امر پر متفق ہوجاتے تو حضرت عمر فیصلہ دیتے۔ ان فیصلوں کے مطابق ہر صوبہ کو احکام جاری کئے جاتے تاکہ ان فیصلوں کی عام اشاعت ہوجائے۔ اس کے برخلاف حضرت علی کے فیصلے زیادہ تر ان کی فوج کو درپیش مسائل سے متعلق تھے۔ اس لئے

ان فیصلوں کی عام اشاعت نہیں ہوئی۔

شیعوں کا دعویٰ ہے کہ حضرت علی کے خطبات کی یادداشتیں لکھی گئیں جو ان کی اولاد میں منتقل ہوتی رہیں۔ شیعوں کے بموجب: ۔ جعفر صادق (وفات ۱۴۸ھ) نے حضرت علی کی وفات کے کم و بیش ستر سال بعد ان یادداشتوں کی مدد سے (۵۰۰) سے زیادہ خطبے تصنیف کئے۔ بعد میں شریف الرضی اور شریف المرتضیٰ دونوں بھائیوں نے ان الگ الگ خطبات کو ایک کتاب میں اکھٹا کردیا۔ اس طرح شیعوں کا کہنا ہے کہ نہج البلاغہ حضرت علی کے خطبات ہیں شیعوں کا عقیدہ ہے کہ: ۔ نہج البلاغہ "تحت کلام الخالق اور فوق کلام المخلوق" ہے گویا اس کا درجہ نعوذ باللہ احادیث نبوی سے بڑھ کر ہے۔

اگر نہج ابلاغہ کے خطبات کو حضرت علی کے خطبات تسلیم کیا جائے تو ان سے غلط تاثر پیدا ہوتا ہے رسول اکرم کے تربیت یافتہ صحابہ ویسے عقائد کے حامل نہیں ہوسکتے جو نہج ابلاغہ کے خطبات میں پائے جاتے ہیں۔

صحیح مسلم کے دیباچہ میں درج ہے کہ حضرت علی کی حدیثیں جو حضرت عبداللہ بن مسعود کے شاگردوں نے ان سے سن کر بیان کیں وہ سب مان لی گئیں لیکن وہ تمام احادیث جو حضرت علی کی فوج میں شامل لوگوں نے بیان کیں، کسی نے ان کو صحیح یا درست نہ مانا۔

بنو ہاشم اور بنو امیہ

عہد جاہلیت میں قبیلہ قریش نے خانہ کعبہ کو بت خانہ بنا رکھا تھا۔ اس میں ہبل، لات منات کے ساتھ ابراہیم و اسماعیل کے بت بھی نصب تھے۔ اس بت کدہ کی تولیت اور اس کی آمدنی سے فیض حاصل کرنے کے لئے عام خانقاہوں، مزاروں، درگاہوں اور مندروں کی طرح گدی نشینی کے لئے کبھی کبھی اختلافات ہوجاتے جو خاندانی معاملات تھے۔

ہاشم رسول اکرم کے تیسری پشت کے جد اعلیٰ تھے۔ تولیت کعبہ کے ساتھ قوم کی سرداری بھی ان ہی کے پاس تھی۔ ان کے مرتے وقت وراثت کی تقسیم پر کچھ اختلاف پیدا ہوا۔ ان کے بھتیجہ امیہ نے دعویٰ کیا کہ مذہبی اور دنیوی معاملات کو الگ الگ ہونا چاہیے۔ یعنی تولیت کعبہ عبدالمطلب کو ملے تو قوم کی سرداری ان کے تفویض کی جائے۔ یہ بات تسلیم کر لی گئی اور ذمہ داریاں تقسیم ہو گئیں، جو کچھ اس طرح تھیں۔

عبدالمطلب کے پاس حسب ذیل مذہبی شعبے رہیں:۔

۱۔ تولیت کعبہ، پوجاپاٹ کے مراسم، نذر و نیاز، اور قربانیوں کی وصولی۔ کفن دفن کے خدمات، اور دعا فاتحہ وغیرہ۔ ۲۔ سقایہ۔ یعنی حاجیوں کو پانی پلانے کی ذمہ داری۔ ۳۔ عمارہ۔ یعنی خانہ کعبہ کی مرمت، روشنی وغیرہ۔ ۴۔ رفادہ۔ یعنی حاجیوں کے قیام وطعام کا انتظام۔

امیہ کے پاس دنیوی اور سیاسی امور کے حسب ذیل شعبے رہیں۔

۱۔ قیادہ۔ یعنی قومی فوج کی کمان، بھرتی اور تربیت کی ذمہ داری۔ سواریاں اور ہتھیاروں کی فراہمی۔ اور قومی دفاع کی ذمہ داریاں۔

۲۔ لوایہ۔ یعنی علم برداری، قومی علم کی حفاظت۔

رسول اکرم کے زمانہ میں تولیت کعبہ حضرات زبیر، عبدالمناف (ابو طالب) پھر ابولہب کو ملی قوم کی سرداری حضرت ابوسفیان کو ملی۔ جب رسول اکرم نے دین کی اشاعت کی تو اس کی پہلی زد بنو ہاشم کے کاروبار پر پڑی۔ جو مذہبی ٹھیکہ داری سے کما کھا رہے تھے۔ اس لئے یہی رسول اکرم اور اسلام کے سخت مخالف ہو گئے۔ ابولہب ان مخالفت کرنے والے ہاشمیوں میں سب سے پیش پیش تھا۔

بنو امیہ کی طرف سے ایسی مخالفت نہ ہوئی۔ ان کو مذہبی امور سے کوئی تعلق نہ تھا۔ رسول اکرم کی تعلیم نے ابتداً کوئی سیاسی مسئلہ پیدا نہ کیا تھا۔ چنانچہ حالت کفر میں بھی حضرت ابوسفیان نے ہرقل کے دربار میں اپنے بھائی محمد کی دیانت داری، صداقت اور صلح جوئی کا اعتراف کیا۔ اور بعد میں جب مسلمان ہوئے تو اپنے سارے خاندان کے ساتھ رسول اکرم اور ان کے مشن کو کامیاب بنانے میں تن من دھن

سے لگ گئے۔ وہ سپاہی اور خاندانی سردار تھے۔ ان میں خانقاہی اور متولیانہ طبیعت اور شیخی نام کو نہ تھی۔ جب رسول اکرم کی صداقت و سچائی آنکھوں سے دیکھ لی تو ان کی اطاعت قبول کر لی اور اسلام کی خدمت میں مصروف ہو گئے۔

رسول اکرم نے بھی حضرت ابوسفیان پر اور ان کے خاندان پر اعتماد کیا۔ ان کو مراتب عطا فرمائے۔ فتح مکہ کے موقع پر ان کے مکان کو خانہ کعبہ کے بعد دوسرا مقام امن قرار دیا۔ ان کی بیٹی ام المومنین ام حبیبہ سے عقد نکاح فرمایا تو اس شان سے کہ شاہ حبشہ نے دربار خاص میں ان کا نکاح پڑھوایا اور زر مہر اپنی جیب خاص سے دیا۔

فتح مکہ کے بعد رسول اکرم نے حضرت ابوسفیان کو سرداری پر برقرار رکھا۔ بلکہ بعض اور علاقے بھی ان کے ماتحت کر دیئے۔ ان کے بیٹوں یزید اور معاویہ کو بھی اہم مناصب عطا فرمائے حضرت معاویہ سے کتابت وحی کا بھی کام لیا۔

بنو ہاشم اسلام لانے کے بعد بھی کوئی مناصب حاصل نہ کر سکے۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ عباس، عقیل، جعفر، اور علی اپنی متولیانہ اور مشائخانہ تربیت کی وجہ سے انتظامی امور کے اہل نہ تھے اور جو کام وہ جانتے تھے، اس کی نئے دین میں گنجائش نہ تھی۔ یہ حضرات زندگی بھر وظیفے پاتے رہے جو خلفائے راشدین نے بھی جاری رکھے۔

جب اسلام نے تمام نسلی، نسبی امتیازات کو ختم کر کے کالے گورے عجمی عربی، سب کو بھائی بھائی بنا دیا۔ خاندانی عصبیتوں کو ختم کر دیا۔ اور غلاموں کو آقاؤں کے برابر کھڑا کر دیا تو پھر ہاشمی قیادت کا سوال کیسے اٹھا۔ اور کس نے اٹھایا؟

تاریخ کے مطالعہ سے یہ افسوس ناک حقیقت سامنے آتا ہے کہ ایک یمنی یہودی عبداللہ بن سبا مدینے آیا اور حضرت علی کا ہمدرد بن گیا۔ حضرت علی اس کی مکاری کو نہ سمجھ سکے۔ اسی نے عربوں کی قبائلی عصبیت کو ہوا دینا شروع کیا۔ قبائلی عصبیت جسے اسلام نے ختم کر دیا تھا، پھر جاگ اٹھی اور اخوت اسلامی میں رخنے پڑ گئے۔

حضرت علی کی ہاشمیت کا نام روشن ہو گیا۔ عجمی مجوسیوں نے ان کو پوجنا شروع کیا ان کو شیر خدا، حیدر کرار، صفدر جرار، قوت پروردگار، ولی وصی رسول اللہ، بلا فصل، مشکل کشا، اور مولائے کائنات کے القاب سے نوازا۔ بنو ہاشم نے ان

خطابات کو وراثت پدری سمجھ کر قبول کر لیا، لیکن یہ ورثہ مہنگا پڑا ۔ جانوں کے ساتھ عزت وناموس بھی گئی اور اسلام کو سخت نقصان پہنچا ۔ چند سال بعد عباسیوں نے شیعان علی کے اسی نسلی حربہ ہاشمیت سے عجمیوں کو ساتھ لے کر بنوامیہ کے ساتھ آل ابو طالب کے خواب خلافت کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے پراگندہ کر دیا ۔

بعد کو آنے والی نسلوں نے سمجھا کہ بنوہاشم ہونا کوئی اعزاز ہے ۔ اس لئے رسول اکرم کو بھی ہاشمی و مطلبی، کہنے لگے ۔ جو نہایت نامناسب نسبت ہے ۔ یہ نسبت رسول اللہ کی تعلیم کے خلاف اور اسلام کے لئے باعث رسوائی ہے ۔ اسلام نے نسلی تفاخر کی جڑ کاٹ دی تھی رسول اکرم کو ہاشم مطلب یا ابو طالب، جیسے عہد جاہلیت کے سرداروں سے کونسی فضیلت ہوئی تھی؟

رسول اکرم کا تو یہ عمل تھا کہ زید بن حارث و بلال حبشی آپ کے پاس جعفر عقیل سے زیادہ محبوب تھے ۔ ہاں اگر حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل سے نسبت دی جائے تو درست ہے کہ وہ آپ کے مورث اعلیٰ بھی تھے ۔ اور نبی بھی تھے ۔

اہل تصوف نے ہاشمیت کو وجہ فضیلت قرار دیا ہے ۔ چنانچہ خواجہ سید محمد گیو دراز نے کہا" بعض کہتے ہیں ابو بکر خیر الصحابہ ہیں اور حضرت علی افضل الصحابہ، خیر اور چیز ہے اور افضلیت اور چیز ہے ۔ جیسا کہ ایک آزاد ہاشمی حبشی غلام سے افضل ہے ممکن ہے کہ حبشی غلام اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور لوگوں کو فائدہ پہنچانے میں بہت اچھا ہو تو ہاشمی کے لئے فضیلت اس شخص کے ذاتی وصف کی بناپر ہے" (جوامع الکلم مجلس ۲۷ شعبان ۸۰۲ھ)"

فضیلت کا یہ معیار قرآن مجید کے مقرر کردہ معیار کے خلاف ہے ۔ قرآن کے بموجب: ۔" اے لوگو ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہارے خاندان اور قبیلے بنائے تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو ۔ بے شک اللہ کے پاس تم سب میں مکرم وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے" (سورہ الحجرات ۱۳)

نری ہاشمیت وجہ فضیلت نہیں ۔ اگر ہاشمیت کوئی چیز ہوتی تو دوسرے دشمنان اسلام کو چھوڑ کر قرآن مجید میں ابولہب ہی کے بارے میں جو ہاشمی خاندان کے ممتاز فرد تھے غیض وغضب سے بھرپور سورہ نازل نہ ہوتا ۔ ہاشمیوں کو سبقت فی

الاسلام کی توفیق نہیں ہوئی ۔ ہاشمیوں میں حضرت علی، حضرت ابو عبیدہ بن حارث اور حضرت حمزہ تین ہی سبقت فی الاسلام سے مشرف ہیں جن میں سے حضرت علی کی عمر بعثت اسلام کے وقت بمشکل دس سال تھی ۔ (مستند دلائل سے تو یہ ثابت ہے کہ ان کی عمر بعثت کے وقت صرف چھ سال تھی) اور وہ رسول اکرم کے پروردہ تھے ۔ اس کے مقابلہ میں بعثت کے دوسرے سال تک یعنی حضرت حمزہ کے اسلام لانے تک بنوامیہ کے تقریباً بیس افراد نے اسلام قبول کر لیا تھا ۔

ازواج مطہرات میں جیسا کہ بیان کیا گیا ہے، ایک خاتون ام حبیبہ اموی ہیں جو امیر یزید کی پھوپی تھیں ۔ کسی ہاشمی خاتون کو ام المومنین ہونے کا شرف حاصل نہیں ہوا ۔ آپ کے نکاح میں آنے کے لئے از روئے قرآن مجید مہاجر ہونا شرط تھا **الا ھا جرن معک** (قرآن ۳۳: ۵۰) جنھوں نے آپ کے ساتھ ہجرت کی ہو ۔ کوئی ہاشمی عورت مہاجرہ نہ تھی ۔ اس لحاظ سے کوئی ہاشمی عورت آپ کے نکاح میں نہ آسکی رسول اکرم کی چار صاحبزادیوں میں تین بنوامیہ میں بیاہی گئیں اور ایک ہاشمی کو ۔ رسول اکرم نے فرمایا: ۔ میرے رب کی جانب سے اس بات کا پکا معاہدہ ہے کہ میں کسی خاندان میں نکاح کروں یا اپنی بیٹیوں کو کسی کے ہاں (نکاح میں) دوں تو وہ لازماً جنت میں میرے رفیق ہوں گے ۔ (علامہ ابن حجر مکی)

اسلام کی راہ میں جان قربان کرنے والوں میں امویوں کی تعداد ہاشمیوں سے زیادہ رہی ۔ امیوں کے مقابلہ میں ہاشمیوں کو فضیلت دینے کے مذموم طریقہ کی ابتدا سبائیوں نے کی ۔ اس نقطہ نظر کو غلط اور خلاف اسلام ثابت کرنے کے لئے چند حقائق کا اظہار کرنا پڑا ورنہ مسلمان کسی خاندان کو کسی خاندان پر فضیلت دینے کے قائل نہیں ۔

اس تاریخی حقیقت کو بھی پیش نظر رکھنا چاہئے کہ ہاشمیوں نے حضرت علی اور اولاد علی کی خلافت کے قیام کی کبھی کوشش نہ کی اور نہ ہی علویوں کی کسی سیاسی کوشش کی حمایت کی ۔ مکہ اور مدینہ میں حضرت حسین بن علی کے سب رشتہ دار موجود تھے ۔ کسی نے حضرت حسین کے خروج میں ان کا ساتھ نہ دیا اور نہ ہی حضرت حسین کے قتل کے بعد ان کے خون کا کسی سے قصاص طلب کیا ۔ ہاشمیوں کی

بجائے عراق اور ایران کے غیر عرب (سبائی) خون حسین کا بدلہ لینے میدان میں اتر پڑے ۔اسی طرح امیر المومنین حضرت عثمان کی شہادت کے بعد سبائی مفسدین کے منتخب امیر حضرت علی کی ہنگامی خلافت کو ہاشمیوں نے تسلیم نہ کیا۔

اہل عجم اسلامی مملکت کو کمزور کر کے سیاسی غلبہ حاصل کرنا چاہتے تھے ۔ انھوں نے یہ حربہ استعمال کیا کہ خود پس پردہ رہے اور علویوں کو آلہ کار بنا کر عربوں اور مسلمانوں کے خلاف تحریک چلائی ۔ عرب سادہ ذہنیت کے حامل تھے ۔ ایرانی ارباب سیاست کی مفسدانہ ریشہ دوانیوں اور عیارانہ سیاسی تدابیر کا مقابلہ نہ کر سکے ۔ اس لئے سیاسی میدان میں مات کھا گئے چونکہ اسلام میں دین اور سیاست ایک ہی ہے اس لیے اس کشمکش میں دین متاثر ہو گیا۔

ولایت

ولی کے لغوی معنی ہیں نزدیک تر ہونا خواہ قربت مکانی کی حیثیت سے ہو یا ہم خیالی کی وجہ سے ۔ولی کے معنی مددگار یا سہارا کے بھی ہیں ۔ان معنوں میں یہ لفظ اللہ تعالیٰ کے لئے مخصوص ہے ۔ کیوں کہ اس کے سوا کوئی اور مدد کرنے پر قادر نہیں ۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَاللہ ولی المومنین (ال عمران ۶۸) یعنی مومنوں کا ولی تو صرف اللہ ہے سیا وما لکم من دون اللہ من ولی ولا نصیر (الشوریٰ ۳۱) اللہ کے سوا تمہارا ولی اور مددگار کون ہو سکتا ہے ؟

قرآن مجید میں جہاں جہاں کسی اور ولی کے ہونے کی نفی کی گئی ہے وہاں ولی کے معنی مددگار ہی ہیں ولایۃ کے معنی ہیں نصرت، مدد یا کارسازی ۔

ولی بمعنی دوست اللہ کے نیک بندوں کے لئے استعمال ہوتا ہے ۔ ولا کے معنی محبت عقیدت یا پرورش اور سرپرستی کے ہیں ۔

لفظ مولا ولا سے مشتق ہے اور لغات اضداد سے ہے ۔ یعنی لفظ مولا آقا اور غلام دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے ۔مولا ان کو کہا جاتا ہے جو غلامی سے آزاد ہو کر بھی آقا

کی خدمت کرتے ہیں ۔ جیسے حضرت زید بن حارث اور حضرت ابو رافع رسول اکرم کے مولا تھے اسلام نے مساوات اور مسلک انسانیت کا پرچار کیا تو غلاموں کو حکم دیا گیا کہ "اپنے سردار کو اے میرے مولیٰ کہہ کر مخاطب نہ کرو بلکہ یا سیدی کہو ۔اس حکم سے اسی اسلامی تخیل کا اظہار ہوتا ہے کہ مولیٰ صرف اللہ تعالیٰ ہے۔

جاہلیت میں مالک اپنے غلام کو کمتر خیال کرتے تھے اور غلام کو یا عبدی کہہ کر پکارتے تھے ۔رسول اکرم نے مالکین کو حکم دیا کہ وہ غلاموں کو مولیٰ کہیں ۔

ولایت ولی سے مشتق ہے ۔جو لوگ ایمان اور تقویٰ میں خاص مقام رکھتے ہیں وہی اور وہ سب اولیا اللہ کہلانے کے مستحق ہیں ۔قرآن مجید کی رو سے ہر مومن متقی اللہ کا ولی (دوست) ہے ۔ولی اور اولیاء کا ذکر قرآن مجید میں بابار آیا ہے مگر معلوم ہوتا ہے کہ ولی کئی قسم کے ہوتے ہیں قرآن مجید میں ایک جگہ یوں ہے کہ کمزور اور مظلوم مسلمان اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں ۔

وَاجعل لنا من لدنک ولیا وجعل لنا من لدنک نصیرا (النساء ۷۵)

اے اللہ اپنی طرف سے ہمیں کوئی ولی عطا فرما جو ہماری مدد کرے

ایک جگہ یوں ہے:

وَمَا كَانَ لَهُمْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَاءَ يُضٰعَفُ لَهُمُ الْعَذَابُ (۱۱ : ۲۰)

اور جو کوئی اللہ کے سوا کسی کو اپنے اولیا بنائے گا اس کا عذاب بڑھا دیا جائے گا۔

نیز فرمایا : ۔ اَفَحَسِبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اَنْ يَّتَّخِذُوْا عِبَادِيْ مِنْ دُوْنِيْٓ اَوْلِيَاۗءَ ۭ اِنَّآ اَعْتَدْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ نُزُلًا (الکہف ۱۰۲)

کیا یہ کافر سمجھتے ہیں کہ ہمارے بندوں کو اپنے اولیا بنالیں گے تو ہم خفا نہ ہوں گے ؟ ہم نے ایسے ہی کافروں کے لئے جہنم تیار کر رکھی ہے ۔ ایک جگہ مزید وضاحت فرمادی : ۔ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ فَقَاتِلُوْٓا اَوْلِيَاۗءَ الشَّيْطٰنِ (النساء ۷۶)

جو کافر ہیں اپنے معبودان باطل کے لئے لڑتے ہیں پس تم ان شیطان کے اولیاء کو قتل کر دو

ولی کے معنی وکیل یا مختار کے بھی ہیں (البقر: ۸۵ : ۲۸)

اگر مولی علیہ مومنین ہوں تو ولی امیر المومنین ہوگا۔ واقعہ یہ ہے کہ بے شمار مسائل ایسے ہیں جن میں افراد اور معاشرہ کو ولی یا سرپرست کی ضرورت ہوتی ہے ۱۹۲۴ء میں مصطفیٰ کمال پاشاہ نے خلافت کو ختم کر دیا تو امت مسلمہ کا کوئی ولی یا سرپرست باقی نہ رہا اور یہ سوال پیدا ہوا کہ آئندہ اگر خلافت کا احیاء ہو تو خلیفہ کا انتخاب کن اصولوں پر ہوگا۔

اہل تشیع کے لئے یہ سوال اور زیادہ مشکل تھا۔ بارہویں امام کی غیبت کبریٰ کے دوران مسلمانوں کا امیر کون ہو اور اس کا انتخاب کس طرح ہو۔

ایران کے رہبر انقلاب آیتہ اللہ روح اللہ خمینی نے ولایت فقیہہ کا تصور پیش کیا کہ بارہویں امام کی غیبت کبریٰ کے دور میں فقیہہ کا انتخاب کیا جاسکتا ہے جس میں قیادت کی صلاحیت ہو اور وہی ولی ہوگا۔

اس طرح جس ولی فقیہہ کا انتخاب ہوگا وہ اصطلاحی معنوں میں ولی نہ ہوگا بلکہ ایسا سربراہ مملکت ہوگا جس کا انتخاب مسلمانوں نے کیا ہے۔ اس طرح ولایت فقیہہ کا تصور مسلمانوں کے تصور خلافت سے قریب ہے۔

اہل ایران آیتہ اللہ روح اللہ خمینی کو امام کہتے ہیں تو ان کو اصطلاحی معنوں میں امام نہیں کہتے ہیں بلکہ لغوی معنوں میں کہتے ہیں بالکل ویسے ہی جیسا کہ اہلسنت لفظ امام کو لغوی معنوں ہی میں استعمال کرتے ہیں۔

قرآن مجید میں دو جگہ لفظ ولایۃ استعمال ہوا ہے۔

مالکم من ولایتھم من شیء (۸ : ۷۲) اور **ھنالک الولایۃ للہ الحق** (۱۸: ۴۴)

ان آیتوں میں بلکہ پورے قرآن مجید میں ولایت مزعومہ و مفروضہ کا قطعاً ذکر نہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ جس طرح قرآنی اصطلاحات کو غلطی سے الفاظ سمجھ لینے سے مفہوم بدل جاتا ہے اسی طرح قرآنی الفاظ کو اصطلاحات سمجھ لینے سے بھی قرآن کے معانی بدل جاتے ہیں۔ قرآن مجید نے ولایت کو بطور لفظ استعمال کیا ہے لیکن سبائیوں نے اس لفظ کو اصطلاح بنادیا اور ولایت کو ایک عہدہ یا منصب قرار دے کر رسالت کے مقابلہ میں کھڑا کر دیا گیا لیکن ایسا کرنے کا کوئی جواز قرآن مجید سے

نہیں ملتا۔ سبائیوں نے حضرت علی سے ولایت کو منسوب کر کے انھیں رسول سے بھی بڑھا دیا قرآن مجید کی آیت (۱۸: ۴۴) میں اللہ تعالیٰ نے دو آدمیوں کی مثال بیان کی ہے۔ جن میں سے ایک کو اللہ نے باغ اور دولت دی جس پر اس نے تکبر کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ نے اسے نعمتوں سے محروم کر دیا اس نے کہا یلیتنی لم اشرک بربی احدا پھر آگے کی آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کوئی جماعت اسے مدد نہ دے سکی اور نہ وہ خود بدلہ لے سکا۔ اس کے بعد آیت زیر بحث ہے یعنی ھنالک الولایۃ للہ الحق یعنی حقیقت یہ ہے کہ حکمرانی کارسازی اور نصرت یہ صرف اللہ تعالیٰ کے لئے، ثابت ہیں جو حق ہے۔

وَلایت کے برخلاف قرآن مجید نے لفظ ولایت (واؤ کے نیچے زیر) کہیں استعمال نہیں کیا۔ ولایت کے معنی ہیں حکومت یا غلبہ۔ اقتدار یا ملک۔

قرآن مجید میں ولایت علی کا کہیں ذکر نہیں۔ آیت (۱۸: ۴۴) کو سبائیوں کی مفروضہ اور موہومہ ولایت سے کوئی تعلق نہیں۔ اس فرقہ نے باطنی مفہوم نکالنے کے لئے پہلے تاویل کا دروازہ کھولا اور قرآن کو بازیچہ اطفال بنادیا۔ سبائیوں نے الولایت افضل من النبوت کی وضعی روایت کے ذریعہ نہ صرف اس لفظ کو ایک اصطلاح بنادیا۔ بلکہ حضرت علی کا درجہ نبیوں سے افضل قرار دینے کے لئے اس روایت کو سند بنادیا۔ خود حضرت علی نے کبھی بھی خود کے ولی ہونے کا ادعا نہیں کیا۔

اولیاء وہی ہیں جو دین کے خادم۔ اللہ کے ولی ہوسکتے ہیں اور اولیاء کے زمرہ میں انھیں شامل کیا جاسکتا ہے۔ لیکن ولایت کو ایک منصب اور پھر نبوت سے افضل منصب قرار دے کر اس پر حضرت علی کو بلاشرکت احدے فائز سمجھنے کا تصور غیر اسلامی جہاد کے بدلے تعویذ، منتر سکھانے والے ہرگز اولیا نہیں کہلائے جاسکتے۔

مولوی۔ حضرت علی کو عجمی ماحول میں مولا کا خطاب دیا گیا تھا اس لئے ان کے حمایتی یعنی شیعان علی مولائی کہلائے۔ اسی نسبت سے اسمٰعیلی شیعہ آج بھی مولائی کہلاتے ہیں۔ اسی سے لفظ مولوی بنا۔ (الف کو واؤ سے بدل دیا گیا) اسی طرح مولوی اور مولاء ہم معنی الفاظ ہیں۔

ہندوستان میں غیر مسلموں نے اسمٰعیلی مذہب اختیار کیا تو خوجے کہلائے

مسلمانوں سے ملنے جلنے کے لئے خواجہ بن گئے اور اس کو شخصی اعزاز کی علامت قرار دیا ان کا دیکھا دیکھی مسلمانوں نے بھی اپنے ناموں کے ساتھ خواجہ کے " سابقہ " کو استعمال کیا بالکل اسی طرح مولائی بھی شناخت کو چھپانے اور مسلمانوں سے گھلنے ملنے کے لئے مولوی کی اصطلاح استعمال کرنے لگے۔ انھوں نے اس بات کو ادعا کیا کہ دین اور شرع کو جاننے والے کو مولوی کہتے ہیں تو مسلمان بھی ان کا دیکھا دیکھی مولوی بننے لگے اور اس کو عوام کے استحصال کا اجازت نامہ (لائسنس) تصور کرنے لگے۔

مولائی اور مولوی عربی زبان کے الفاظ نہیں ہیں۔ یہ الفاظ ہندوستان کی پیداوار بھی نہیں بلکہ بابر (وفات ۱۵۳۰ء) کے ساتھ یہاں آئے۔ مولانا روم وفات ۱۲۷۳ء) کا شعر ہے۔

مولوی ہرگز نہ شد مولائے روم
تا غلام شمس تبریزی نہ شد

یعنی مولا علی کو پوجنے والا مولوی مولائے روم نہیں بن سکتا جب تک وہ شمس تبریزی جیسے باطنی بزرگ کی غلامی نہ اختیار کرے۔ شمس تبریزی " کیا بزرگ " کے خاندان سے تھے جو اسمعیلیہ فرقہ کے امام تھے۔ شمس تبریزی کے والد علاء الدین کی نسبت بھی بیان کیا گیا ہے کہ وہ فرقہ اسمعیلیہ سے تعلق رکھتے ہیں اور یہ کہ شمس تبریزی نے یہ مذہب ترک کر دیا۔

لفظ ملا بھی مولانا کو بگاڑ کر بنایا گیا ہے۔ جو ایک مہمل اور مشرکانہ خطاب ہے جو ہمارے علماء کو کبھی تحقیر کے لئے کبھی عزت کے لئے دیا گیا۔

مولینا یا مولانا عربی ہے اور مذکر ہے۔ یہ علماء و فضلا کا اعزازی خطاب ہے لیکن اگر صرف مولانا کہا جائے تو اس سے مراد جلال الدین رومی ہوتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیائے اسلام میں پہلے مولانا جلال الدین رومی تھے۔ جن کا ربط اور جن کی ہمدردیاں فرقہ ہائے باطلہ اور مشکوک عناصر سے تھیں۔ اس لئے ان کو رومیوں کے مولانا بنا دیا گیا اور عجمیوں کے ملا علیؓ کے مقابل ان کو کھڑا کیا گیا کیوں کہ انہوں نے فارسی میں قرآن پیش کیا تھا جب کے مولانا علیؓ کا قرآن غائب ہو چکا ہے

چنانچہ مولانا روم کو ان عجمیوں نے بھی اپنا مولانا تسلیم کر لیا۔ حضرت علی کو صرف مولا علی کہتے ہیں (عربی اصطلاح میں مولا آزاد کردہ غلام کو کہتے ہیں) اور مولانا سے مراد پیر رومی سمجھے جاتے ہیں حالانکہ مسلمان کا مولا اور مولانا تو صرف اللہ ہے۔

وَاَنْتَ مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ

(عزیز احمد صدیقی کی کتابوں سے اقتباس)

سیدنا یزید کی بحیثیت جانشین نامزدگی

امیر معاویہ نے اپنی زندگی میں مغیرہ بن شعبہؓ کی تحریک اور اسلامی ریاست کے گوشہ گوشہ سے استصواب رائے، نیز (۵۰ ھ) کے اواخر مدینہ میں منعقدہ اجلاس کے متفقہ فیصلہ کے مطابق اپنے فرزند یزید کو اپنے جانشین خلیفہ کی حیثیت سے نامزد کیا اس سلسلہ میں جو اعتراضات کئے جاتے ہیں وہ یہ ہیں۔

(۱) یزید کے کردار اچھے نہ تھے (۲) امیر یزید نامزدگی سے خلیفہ ہوئے جو درست نہ تھی۔ (۳) چوتھے نواسہ رسول حضرت حسین کو یزید نے قتل کروا دیا۔

منافقین عجم اور مخالفین اسلام نے اسلام کی مرکزی قوت کی مخالفت کے مقصد سے امیر یزید کے کردار کو اس انداز سے پیش کرنے کی کوشش کی اور اس میں بڑی حد تک کامیاب رہے کہ یزید شرابی اور زانی تھے۔ ان کی اعلیٰ صلاحیتوں اور ان کے فضائل و مناقب کو یکسر نظر انداز کیا گیا۔

حضرت یزید کے کردار کے تعلق سے جتنی باتیں شیعوں نے پھیلا رکھی ہیں ان کی حیثیت محض بہتان کی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں۔

" بلاشبہ حضرت معاویہ کے فرزند اپنے خاندان کے نیکو کاروں میں سے ہیں "۔

" امیر یزید پر سلف میں سے کسی نے لعنت نہیں کی سوائے رافضیوں، خارجیوں اور بعض معتزلہ کے جنہوں نے فضول گوئی میں مبالغہ سے کام لیا ہے (علامہ علی قاری)

حضرت حسین کے بھائی حضرت محمد ابن حنفیہ فرماتے ہیں۔

" میں خود ان (امیریزید) کے پاس گیا اور ان کے یہاں مقیم رہا۔ میں نے انہیں ہمیشہ پابند صلوٰۃ، مسائل خیر کا متلاشی اور سنت رسول پر کاربند پایا" (تاریخ ابن کثیر جلد ۸)

امام غزالی فرماتے ہیں:۔

" رہا ان (امیریزید) کو رحمتہ اللہ علیہ کہنا، سو یہ نہ صرف جائز ہے بلکہ مستحب ہے۔ اور ہم تو اپنی صلوٰۃ میں تمام مسلمانوں کے ساتھ ان پر رحمت کی دعا کرتے ہیں۔ (ابن کثیر جلد ۱۲ صفحہ ۱۷۳)۔

حضرت یزید وہ ہیں جن کے حقیقی پھوپا رسول اکرم ہیں۔ جن کے خسر عبداللہ بن جعفر طیار ہیں۔ جن کے بہنوئی حضرت حسین بن علی ہیں۔ امیریزید کی قیادت میں حضرات حسین بن علی عبداللہ بن جعفر طیار، عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن عباس اور میزبان رسول ابو ایوب انصاری جیسے جلیل القدر صحابہ و تابعین نے جہاد کیا۔ یہ وہ جہاد قسطنطنیہ تھا جس کے تعلق سے بہت پہلے زبان رسالت نے پورے لشکر کے لئے مغفرت کی بشارت دی تھی۔ اس طرح امیریزید حدیث نبوی کی روشنی میں قطعی جنتی قرار پاتے ہیں۔ امیریزید کی امامت میں متذکرہ بالا حضرات نے فریضہ صلوٰۃ ادا کیا اور ان کی امامت میں فریضہ حج ادا کیا۔

جہاں تک نامزدگی کا سوال ہے رسول اکرمؐ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو مصلائے امامت پر کھڑا کرکے اشارتاً اپنا خلیفہ نامزد کیا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے حضرت عمر فاروقؓ کو صراحتاً نامزد کیا۔ حضرت عثمان غنیؓ کو نامزد کرنے کا موقع نہیں ملا۔ حضرت علی نے اپنے فرزند حضرت حسن کو مصلائے امامت پر کھڑا کرکے اشارتاً نامزد کیا۔ حضرت حسن نے حضرت معاویہ کو اپنے بعد کے لئے نہیں بلکہ زندگی ہی میں نامزد کرکے خلافت سپرد کردی اور خود بیعت کرلی۔ پھر حضرت معاویہ نے اسی سنت رائجہ کے مطابق اپنے فرزند سیدنا یزید کو نامزد کیا۔ اصولی طور پر نامزدگی کوئی غلطی نہیں تھی، بلکہ یہی وہ سنت متواتر تھی جو عہد نبوی سے چلی آرہی تھی۔ باپ کے بعد بیٹے کا خلیفہ ہونا بھی کوئی معصیت نہ تھی ورنہ حضرت علی کے بعد حضرت حسن خلافت کا دعویٰ نہ کرتے۔ پس جب نامزدگی بھی جائز ہے اور باپ کے بعد بیٹے کا خلیفہ ہونا بھی

جائز ہے تو ان دو جائز باتوں کے ملاپ کو کیونکر ناجائز قرار دیا جائے گا؟

جہاں تک حضرت حسین کو قتل کروانے کی بات ہے۔ حضرت یزید اس سے قطعاً بری ہیں۔ امیر معاویہ نے سیدنا یزید کو وصیت کی تھی:۔

" حسین بن علی کم سواد شخص ہیں۔ اہل عراق ان کا پیچھا نہیں چھوڑیں گے جب تک تمہارے خلاف کھڑا نہ کردیں۔ اگر وہ خروج کریں اور تم ان پر قابو پالو تو معاف کر دینا کیونکہ ان سے تمہارا اقربی رشتہ ہے۔ ان کا بڑا حق ہے اور وہ رسول اکرم کے عزیز ہیں" 336

حضرت حسینؓ کے قاتل وہ ساٹھ کوفی تھے جو انھیں بہکا کر کوفہ لے جارہے تھے لیکن جب حضرت حسین کو ان کی غداریوں کا حال معلوم ہوگیا تو انھوں نے خروج کے اقدام سے رجوع کرکے اپنے سفر کا رخ بدل دیا اور خلیفۂ وقت کی بیعت کے ارادہ سے دمشق کی جانب چل پڑے۔ ان ہی کوفی دوستوں نے جو خلیفۂ وقت کے باغی تھے اپنی حرکتوں کی سزا کے خوف سے حضرت حسین کو قتل کردیا اور ان قاتلوں کو خلیفۂ وقت کی فوج نے ختم کیا۔ کوفی غداروں کو یہ خطرہ تھا کہ اگرچو تھے نواسہ رسول نے دمشق پہنچ کر یہ راز فاش کردیا کہ ان افراد نے ان کو بغاوت پر اکسایا تھا تو پھر ان غداروں سے سخت بازپرس ہوگی۔

اس بات کے قطع نظر کہ حضرت یزید حضرت حسین کے قتل سے بری تھے نامزدگی کے سلسلہ میں تو ہمیں اس حقیقت کو پیش نظر رکھنا ہے کہ کربلا کا حادثہ تو ۶۱ ہجری میں پیش آیا جب کہ نامزدگی اس سے تقریباً دس سال پہلے ہوئی تھی۔ حضرت امیر معاویہ کے اقدام کو آئندہ ہونے والے حادثہ کو بنیاد بنا کر کیسے غلط قرار دیا جاسکتا ہے؟

جس وقت حضرت امیر معاویہ نے حضرت یزید کو اپنا جانشین نامزد کیا اس وقت تقریباً ایک ہزار صحابہ رسول بقید حیات تھے۔ جن میں سے اکثر صحابہ نے یزید کی

بیعت بھی کی۔اگر امیر یزید کو شیعہ عقیدہ کے مطابق خلافت کا نااہل تسلیم کیا جائے تو اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تقریباً ایک ہزار صحابہ رسول نے ایک بدکردار اور غیر موزوں شخص کو بحیثیت خلیفہ برداشت کرلیا۔اس طرح صحابہ کرام کو گمراہ بے دین باطل پرست، تارک حق اور دنیا پرست تسلیم کرنا پڑتا ہے اس بات کے قطع نظر کہ حضرت یزید کیسے تھے ان کی خلافت کو نہ ماننے سے صحابہ پر الزام عائد ہوتا ہے۔ صحابہ کرام کی عزت وناموس کی حفاظت ہمارا ایمان ہے۔قرآن اور سنت رسول ان ہی کے ذریعہ ہم تک پہنچے۔اگر یہ باطل پرست ہوسکتے ہیں تو پھر قرآن کے حق ہونے کی کیا دلیل ہوگی؟

یہ ایک مصدقہ حقیقت ہے کہ امیر یزید کے مقابلہ میں حضرت حسین کا کسی صحابی نے ساتھ نہیں دیا۔سبائی طبقہ اور ان کے ہمنوا اس بات کے دعویدار ہیں کہ یہ تمام صحابہ، امیر معاویہ اور امیر یزید کے ہاتھوں بک گئے تھے اور ان لوگوں نے باطل کا ساتھ دیا یا ڈر کر خاموش ہوگئے حالانکہ بنو ہاشم کے اہم افراد حضرت عبداللہ ابن عباس حضرت محمد بن علی (ابن الحنیفہ) نے بھی بخوشی امیر یزید کی بیعت کرلی۔ حضرت حسین جب کوفہ کے لئے روانہ ہوئے تو سارے ہی صحابہ اور مخلص احباب نے انہیں سختی سے روکا۔ فرزندان حضرت علی میں اس وقت موجود پندرہ میں سے گیارہ نے حضرت حسین کے ساتھ چلنے سے انکار کردیا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے حضرت حسین کو افتراق اور پراگندگی کے گناہ سے محفوظ رکھا اور انھوں نے حق واضح ہوتے ہی اپنے موقف سے رجوع فرمالیا اور امیر یزید کے ہاتھ پر بیعت کے اردہ سے سفر کا رخ کوفہ سے دمشق کی طرف موڑ دیا۔

امیر یزید کو خلافت یقیناً جائز راستہ سے ملی تھی۔ حضرت علی خلیفہ برحق اور خلیفہ راشد تھے۔ حضرت علی پر قاتلانہ حملہ کے بعد جب ان کے بچنے کی توقع نہ رہی تو جانشینی کے تعلق سے پوچھا گیا تو انھوں نے کہا نہ تو میں حسن کو جانشین مقرر کرتا

ہوں اور نہ ہی منع کرتا ہوں گویا حضرت حسنؓ کو اشارتاً جانشین قرار دیا تو حضرت حسن بھی خلیفہ برحق ہوئے۔ حضرت حسن نے امت مسلمہ میں اتحاد کی خاطر امیر معاویہ سے صلح کرلی اور ان کے حق میں خلافت سے دستبردار ہوگئے تو امیر معاویہ خلیفہ برحق ہوئے سیدنا معاویہ نے اپنے فرزند سیدنا یزید کو اپنا جانشین بنایا تو ان کی جانشینی یقیناً جائز تھی اور امیر معاویہ کے انتقال کے بعد تقریبا ایک ہزار صحابہ نے ان کی خلافت کو تسلیم کرلیا۔تو امیر یزید بھی خلیفہ برحق قرار پائے۔

ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ امیر معاویہ نے یزید کو خلیفہ نامزد کیا حالانکہ وہ اس کے اہل نہ تھے سچ بات تو یہ ہے کہ اگر اہلیت کا معیار یہ ہے کہ خلیفہ کی سیرت میں استقامت ہو۔ شریعت کا احترام ملحوظ ہو۔ اس کے احکام پر عمل ہو۔ لوگوں میں انصاف کیا جائے ان کی مصلحت کو مدنظر رکھا جائے۔ دشمنوں سے جہاد کیا جائے۔ دعوت اسلامی کو دنیا میں پھیلایا جائے۔ لوگوں سے انفرادی اور اجتماعی طور پر نرمی کی جائے تو جس دن یزید کی سیرت اپنی اصلی شکل میں سامنے آئے گی تو اس دن معلوم ہوجائے گا کہ بہت سے ایسے لوگوں سے جن کی تعریف میں مورخ رطب اللسان ہیں اور جن کی توصیف میں زمین وآسمان کے قلابے ملائے جاتے ہیں امیر یزید کسی طرح کم نہ تھے۔

("فتی العرب" اور "یزید ابن معاویہ" سے اقتباس)

کتابیات

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی

ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء

حضرت شاہ عبدالعزیز

تحفہ اثنا عشریہ

حضرت شاہ محمد اسمٰعیل شہید

تقویۃ الایمان

نواب محسن الملک

آیات بینات

امام اہل سنت مولانا عبدالشکور فاروقی

شیعہ اور قرآن موسوم بہ تنبیہ الحائرین

علامہ تمنا عمادی

اعجاز القرآن و اختلاف قرات

تاریخ القرآن

انتظار مہدی و مسیح

العقیدۃ الزہراء حصہ اول و دوم

مذاکرہ (عقیدہ ایصال ثواب)

امام زہری و امام طبری ـ تصویر کا دوسرا رخ

سبیل المومنین

کیا اختلاف امت رحمت ہے؟

مولانا محمود احمد عباسی

خلافت معاویہ ویزید

تحقیق مزید

تحقیق سید و سادات

مرزا حیرت دہلوی

کتاب الشہادت

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

دین اسلام اور اولین مسلمانوں کی دو متضاد تصویریں

المرتضیٰ

مولانا عبدالعلی فاروقی

تاریخ مذہب شیعہ

مولانا حبیب الرحمن صدیقی کاندھلوی

مذہبی داستانیں اور ان کی حقیقت حصہ اول تا چہارم

کیا ہمارا قرآن ایک ہے

شب برات کا تحقیقی جائزہ

شب برات کیا ہے

عمر عائشہؓ پر ایک تحقیقی نظر

صحابہ کرام قرآن کی نظر میں

مہدویت نے اسلام کو کیا دیا؟

کیا متعہ حلال ہے؟

عقیدہ ایصال ثواب قرآن کی نظر میں

مولانا محمد منظور احمد نعمانی

ایرانی انقلاب، امام خمینی اور شیعیت

مولانا محمد جعفر شاہ پھلواری

حق کی تلاش

مولانا فیض عالم صدیقی

عترت رسول

حقیقت مذہب شیعہ، مقام صحابہ، شہادت ذوالنورین

الظنون (جلاء العیون پر تبصرہ)

جناب عزیر احمد صدیقی

سبائی سبز باغ، ارمغان عرب، ارمغان عجم

فلسفۂ آل محمد و کرامات درود شریف

ہمارا علم تفسیر، انمٹ باتیں، احسن الحدیث، اشرف الحدیث

مولانا تقی عثمانی

حضرت معاویہ اور تاریخی حقائق

مولانا شاہ بلیغ الدین

رزم حق و باطل

روشنی، تجلی، طوبیٰ

پروفیسر زاہد علی

ہمارا اسماعیلی مذہب اور اس کی حقیقت، تاریخ خلافت فاطمیین

محمد عظیم الدین صدیقی

حیات سیدنا یزید، اصحاب رسول، دلدل، ذوالغفار

مولانا ابو صہیب رومی مچھلی شہری

شہید کربلا اور یزید

مولانا خان محمد ربانی

کونڈوں کی حقیقت

مولانا خلیل الرحمن سجاد ندوی

خمینی اور اثنا عشریہ کے بارے میں علماء کرام کا متفقہ فیصلہ

ڈاکٹر مسعود الدین عثمانی

توحید خالص، یہ مزار یہ میلے، عذاب برزخ

مولانا نذیر احمد شاکر

شمائل علی (مشکلات مشکل کشا)

مولانا محمد نافع

بنات اربعہ یعنی چار صاحبزادیاں، مسئلہ اقربا نوازی، حدیث ثقلین

پروفیسر یوسف سلیم چشتی

اسلامی تصوف میں غیر اسلامی نظریات کی آمیزش

مولانا حافظ سید محمد علی حسینی

جوامع الکلم (ملفوظات حضرت خواجہ سید محمد گیسو دراز، حسینی پر ضروری تنقید و تبصرہ)، رجب کے کونڈے، اہل سنت والجماعت کی حقیقت، شیخ محی الدین ابن عربی ایک تعارف، قادیانی ہی کافر کیوں؟، یزید ابن معاویہ، آیات قرآنی اور احادیث صحیحہ کا شاندار فیصلہ، استعانت بالاولیاء کی حقیقت

ڈاکٹر محمد اعظم علی خاں ایمن زئی

بیعت رضوان

خالد محمود شاہ کوکنی
فتح العرب۔ یعنی عرب کا شجاع

جناب ابوالقاسم رفیق دلاوری
ائمہ تلبیس، رجب کے کونڈے

پروفیسر حکیم علی احمد عباسی
حضرت امیر معاویہ کی سیاسی زندگی، مقتل الحسین (المشہور بہ مقتل ابی مخنف، معہ ترجمہ، تحشیہ و تعلیقات)، مذہب امام اعظم ابو حنیفہ۔ اتہام، شیعیت کی حقیقت

مولانا عبداللہ خطیب
دو زندگیاں

ہوش بلگرامی
ہماری بت پرستیاں

شیخ عبدالرحمن عبدالخالق
اہل تصوف کی کارستانیاں (ترجمہ از مولانا صفی الرحمن مبارک پوری)

حاجی عیسیٰ
روایت افک کا تجزیہ، جادو اور قرآن

مولانا محمد اسحق صدیقی ندوی
اظہار حقیقت حصہ اول تا سوم

اکبر شاہ خاں نجیب آبادی
تاریخ اسلام

شاہ معین الدین احمد ندوی
تاریخ اسلام

پروفیسر محمود علی قیصر
ملت اسلامیہ کی تاریخ حصہ اول تا سوم

ضیاء الدین کرمانی
ابدی پیغام کے آخری پیغامبر

صفوۃ الرحمن صابر
مروجہ بدعات

شمس پیرزادہ
موضوع اور ضعیف حدیثوں کا چلن

ڈاکٹر محمد ذکی
تصوف اور شیعیت (ضمیمہ از قاضی محمد علی)

مولانا رشید احمد گنگوہی
فتاویٰ رشیدیہ کامل

محمد مسعود عالم ہاشمی
فتنہ وضع حدیث اور موضوع احادیث کی پہچان

پروفیسر محمد نسیم عثمانی
گلدستہ احادیث

عطاء اللہ پالوی
مآل بصیرت

محمد اقبال کیلانی
کتاب اتباع السنت

علامہ ابوالخیراسدی
مقام نبوت کی عجمی تعبیر

مولانا مفتی محمد یوسف لدھیانوی
یزید اور مسلک اہل سنت والجماعت
(ماہنامہ بینات کراچی شمارہ اگست ۱۹۸۱ء)

محمد حسن الدین سہروردی
خون عثمان

حکیم نیاز احمد
رسول اکرمؐ سے شادی کے وقت حضرت عائشہؓ کی عمر

محمد احمد الہ آبادی
تحفہ کربلا (ترتیب و تلخیص قاضی محمد علی)

محمد ابراہیم علی خاں
صراط نجات، موعود بشر تا حشر

حضرت مولانا اللہ یار خاں
تحذیر المسلمین عن کید الکاذبین (مرتبہ حافظ عبد الرزاق چکوال)

ڈاکٹر محمد اقبال
تاریخ تصوف (ترتیب پروفیسر صابر کلوروی)

سید مسعود حسن رضوی ادیب
تعزیے اور شبیہیں / عبادت یا ڈراما